ٹیلیفون نمبر آفس:۔ ۲۴۵۵۹

ٹیلیفون نمبر رہائش:۔ ۲۵۳۴۴

گذشتہ ۴۸ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں

ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

یادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ فہرست مضامین ماہ فروری ۱۹۷۷ء نمبر ۲

اڈیٹر و نگراں: نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ ـــــ جانی بیگم ردولوی

ـــــ قیمت سالانہ ـــــ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	بیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	اٹھارہ "
معمولی خریداری	"	پندرہ "

وی،پی سے پرچہ منگانے پر دو روپیہ ۹۰ پیسے زائد۔ فی پرچہ ایک روپیہ غیر ممالک سے بقدر ۳۰ روپیہ یا دو پونڈ برائے سی میل ایر میل سے مختلف ممالک کے لیے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵ ر ۶ ر کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں ۲۰ تاریخ سے پہلے کی گئی شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

آفس اور ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو۔ ۲۵، لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

نسیم انہونوی۔ مالک ناشر: سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ پرنٹر...........

مجھے فکر جہاں کیوں ہو........

جب میرے پاس سال بھر کام دینے والی

بخشی جنتری ۱۹۷۷ء

موجود ہے۔ جس میں دوازدہ بروج یعنی تاثرات منازل فلکی فالنامہ۔ تاریخ اسماء اقوال صلحا۔ نعت پاک۔ عملیات قرآنی کے علاوہ بخشی کی تیار کردہ حسن افزا مصنوعات اور محافظ صحت۔ معیاری ادویات کی فہرست بھی موجود ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل حسین طباعت کا یہ مرقع آج ہی قریبی اسٹاکسٹ سے خریدئیے۔ اگر آپ کے شہر میں دستیاب نہ تو پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیجکر براہ راست ہم سے طلب فرمائیے۔

منیجر،

بخشی جنتری پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۴۵ کلکتہ نمبر ۷۳

لمعات

ایک زمانہ تھا کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں پر انگشت نمائی ہوتی تھی۔ کالج اور یونیورسٹی میں تو اس وقت لڑکیوں کے جانے کا کوئی تصور بھی نہ تھا، جو لڑکیاں تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کر لیتی تھیں، انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ خیال یہ کیا جاتا تھا کہ پڑھنے لکھنے سے لڑکیاں خط و کتابت کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ اور جب خط کتابت کا شعور پیدا ہو جائے گا تو پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے اعزہ سے ہی خط و کتابت کریں۔ عشق و محبت کے لئے بھی خط لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس وقت تعلیم نسواں ایک طرح کا جرم تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ تعلیم بڑھی اور اعتراض کرنے والوں اور انگلی اٹھانے والوں نے بھی محسوس کیا کہ عورت کو تعلیم نہ دینا ایک جرم ہے۔ ایک ظلم ہے۔ اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر سب ہی نے تعلیم نسواں کو تسلیم کر لیا —— لیکن اس کے بعد اکثر گھرانوں نے ابتدائی تعلیم تک ہی لڑکیوں کی تعلیم کو مناسب جانا، یعنی ایسی تعلیم جو کمسنی ہی میں لڑکی حاصل کر سکے —— اس کے بعد کچھ لوگوں میں اپنی لڑکیوں کو اس سے زیادہ تعلیم دینے کا رجحان پیدا ہونے لگا اور انھوں نے لڑکیوں کو ہائی اسکول اور انٹر تک پڑھانا شروع کیا۔ ایسے لوگ بھی کچھ عرصہ تک ہدف ملامت بنے۔ ان کی زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو بھی بری نظروں سے دیکھا گیا۔ لیکن اعلیٰ تعلیم دلانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ ان تمام خاندانوں کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگیں، جو اعلیٰ تعلیم دلانے کی اہلیت رکھتے تھے اور اس کے اخراجات و لوازمات کو برداشت کر سکتے تھے۔

حالات کس طرح بدلتے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں معمولی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی میں بھی دشواری ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ معمولی تعلیم کو سب نے قبول کر لیا ہو۔ اور اسے بری نظر سے دیکھا جانا ختم ہو گیا۔ اسی طرح جب اعلیٰ تعلیم لڑکیوں کو دی جانے لگی تو شروع میں ہائی اسکول اور انٹر کر لینے والی لڑکیوں کے سلسلے میں بھی وہی دشواری پیش آنے لگی۔ جن خاندانوں کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکی تھیں، ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ایک ہی حمام میں سب برہنہ ہو گئے تو پھر اعلیٰ تعلیم بھی کوئی عیب کی بات نہ رہی۔ بلکہ اس کے بعد تو ایک ایسا رجحان پیدا ہوا کہ غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادیوں میں اسی طرح دشواری ہونے لگی، جس طرح کچھ عرصہ قبل تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی میں ہوتی تھی۔ لڑکے والوں نے لڑکیوں کے حسن، سیرت اور گن ڈھنگ کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم کرنا شروع کر دیا تھا کہ لڑکی پڑھی کہاں تک ہے۔ اس تفتیش نے لڑکی والوں کو اتنا مجبور کیا کہ جو خاندان اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے اخراجات برداشت نہ کر سکتے تھے انھوں نے بھی مصیبتیں اٹھا اٹھا کر لڑکیوں کو پڑھانا شروع کر دیا، تاکہ ان کی شادیوں میں دشواری نہ ہو۔

سنہ [illegible] تک تعلیم یافتہ دلہن حاصل کرنے کا شوق لڑکوں کو صرف اس لئے تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی معاشرت سے متاثر ہو گئے تھے، چاہتے تھے کہ وہ بھی بیوی کو لے کر گھوموں پھریں اور سوسائٹی میں سربلند ہوں۔ افسوس کہ انگریزوں کے کردار۔ ان کی وقت کی پابندی، اور دوسرے اوصاف کی تقلید شاید ہی کسی نے کی ہو، لیکن ان کی مخرب اخلاق باتیں سب کو بھا گئیں۔ اکبر الہ آبادی جیسا معلم شاعر انھیں ہوشیار کرتا رہا۔ انھیں بتاتا رہا کہ مغربی تہذیب کیا ہے، لیکن کسی نے سننے، سمجھنے اور عمل کرنے کی کوشش نہ کی۔ بہر حال تعلیم نسواں زور و شور سے ہوتی رہی اور یہ بڑا ہی اچھا رہتا، اگر تعلیم نے آزادی کا رنگ نہ اختیار کر لیا ہوتا۔ عرصہ دراز کی پابندیوں کے بعد نفس

> **اچھے صحت مند بچے**
> پیدا کرنا اور انھیں ایسی
> تعلیم دینا جو انھیں فخر قوم
> بنا سکے۔
>
> **ماں باپ**
> کا فرض ہے۔ نسیم انہونوی

سے نکلے ہوئے پرند کی طرح لڑکیاں بھی اڑنے لگیں اور رفتہ رفتہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم میں اور لڑکوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہم جو شرم و حیا کی پتلیاں تھیں۔ عفت و عصمت کی مورتیاں تھیں تو صرف اس لئے کہ ہم لڑکوں کی طرح تعلیم نہ پاتے تھے۔ ان کی طرح گھروں سے نکلنے میں آزاد نہ تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکیاں جو بڑی بوڑھیوں کے بغیر گھر سے قدم باہر نہ نکال سکتی تھیں۔ تنہا کسی عزیز قریب کے یہاں بھی نہ جا سکتی تھیں۔ بکس دشترک، پکنک پارٹیوں تک میں جانے لگیں۔ یہاں تک بھی زیادہ خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ایک اور بات ہوئی حالات سے مجبور ہو کر یا معاشرتی اصولوں کے تحت سندھی اور پنجابی لڑکیوں اور خواتین نے ملازمت کرنا شروع کیا۔ کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بکڑتا ہے۔ ہماری لڑکیوں نے بھی سوچا کہ پڑھنے لکھنے کے بعد گھر میں بیٹھ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ ملازمت کرنا شروع کر دیا۔ پہلے حسب قاعدہ انگلیاں اٹھیں۔ برے انداز میں چرچے ہوئے، لیکن جب بیٹیاں کما کر لانے لگیں۔ گھروں کے نقشے بدلے تو پھر یہ فعل بھی معیوب نہ رہ گیا۔ اس کے باوجود عام طور پر مسلم لڑکیاں اور خواتین ملازمت کو پسند نہیں کرتی تھیں، لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ اب شوہروں نے شادیاں کرنے سے پہلے یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ بیوی کما سکتی ہے یا نہیں۔ بہتوں نے تو یہ بھی کیا کہ بیوی کو ایسی تعلیم خود دلادی جس سے وہ ملازمت کر کے ہر ماہ ایک خاصی رقم گھر لا سکے۔ اتنا ہی نہیں ہوا، اکثر ایسے لوگ بھی میری نظر میں ہیں جو خود کچھ نہیں کرتے۔ گھر کا خرچ بیوی کی کمائی پر چلتا ہے اور ان گھروں میں شوہر واقعی جورو کے غلام نظر آتے ہیں، اس لئے کہ بیوی ناراض ہو جائے تو پھر کیا کھائیں۔

بلاشبہ ہماری خواتین کا بیشتر طبقہ تعلیم یافتہ ہو گیا ہے۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں، لیکن تعلیم کو ذریعہ ملازمت بنانا کم از کم میری نظروں میں تو اس وقت تک ہرگز مناسب نہیں ہے جب تک کوئی مجبوری نہ ہو۔ تعلیم سے زندگی کے ہر شعبہ میں مدد ملتی ہے اور عورت بہ زیادہ مسائل کسی کو بھی حل نہیں کرنا ہوتے، بشرطیکہ وہ عورت بنکر رہے۔ چراغ خانہ بنکر گھر کو روشن کرے۔ قدم قدم پر اسے تعلیم سے مدد مل سکتی ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

ایک ناقابل تلافی نقصان

اردو زبان کو حال ہی میں ایک ایسا عظیم نقصان ہوا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں اور اس طرح سال نو یعنی ۱۹۷۷ء کی ابتدا ہی ہمارے لئے منحوس ثابت ہوئی۔ ۶ر جنوری سے پہلی شب کو تقریباً ۴ بجے اردو کے صاحب طرز ادیب مفسر و نقاد جناب مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ ۷ر جنوری کو مسجد ندوہ میں مولانا علی میاں صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد جسد خاکی مرحوم کے وطن دریاباد لے جایا گیا۔ جہاں انھیں ۴ بجے شام کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

نماز جنازہ میں صدہا اکابرین، معززین، علماء، فضلاء، ادباء اور شعراء نے شرکت کی۔ تدفین کے وقت بھی ایک جم غفیر اس عظیم انسان کو مٹی میں ملتے دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا تھا۔

عبدالماجد صاحب ایک عرصہ سے مفلوج تھے۔ اسی حالت میں ایک روز گر پڑے جس سے ٹانگ کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جس نے اور بھی معذور بنا دیا تھا۔

عبدالماجد صاحب مرحوم گذشتہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ اپنے ہفتہ وار سچ اور صدق میں سچی باتوں کے نام سے جو مضامین مرحوم نے لکھے تھے وہ آب زر سے شائع کیے جانے کے قابل ہیں۔ کاش انھیں کتابی شکل دے دی جائے۔ مجھے مولانا مرحوم کی چند کتب شائع کرنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ کئی بار شرف نیاز بھی حاصل ہوا تھا۔ موصوف کی علمی ادبی قابلیت پر مجھ جیسا جاہل، اجہل بھلا کیا روشنی ڈال سکتا ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ دنیائے ادب ہمیشہ مرحوم کے رشحات قلم سے منور رہی اور ہمیشہ رہیگی۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یہ خبر ابھی چھپ بھی نہ سکی تھی کہ ۱۶ر جنوری کے اخبارات میں اردو کے مشہور ادیب اور صاحب طرز مزاح نگار جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے انتقال پر ملال کی خبر شائع ہوئی۔ مرحوم کی عمر ۸۱ سال کی تھی۔ یعنی مولانا دریابادی کی طرح یہ بھی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، لیکن جسطرح خاندانوں میں بزرگوں کی برکت سے شیرازے قائم رہتے ہیں اسی طرح ان بزرگوں سے اردو کی بزم کو تقویت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان شخصیتوں کی جگہیں اب پُر نہیں ہو سکتیں۔ ایسے لکھنے والے اب اردو میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ ۱۹۷۷ء کی نحوست نے شاید اردو دنیا پر ہی اپنا سایہ ڈالا ہے کہ ۱۵ روز کے اندر دو عظیم شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔

نسیم انہونوی

تبصرے

(ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

جذبہ دل } مجموعۂ کلام قمر شمس آبادی۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ غیر مجلد صفحات ۹۲۔ قیمت تین روپیہ پچیس پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ ایم جہاں ایم۔ رفیق حیات قمر شمس آبادی۔ پورن پور۔ ضلع پیلی بھیت۔ کتابت وطباعت معمولی۔

قمر صاحب اردو کے خوشگو شاعر ہیں۔ یہ کتاب موصوف کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں کچھ اشعار گاندھی جی آنجہانی نہرو صاحب ۲۰ نادر وطن کے شہیدوں کے نام اور شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی پروگرام پر بھی شامل ہیں۔ غزلوں کے چند منتخب اشعار ذیل میں دیئے جا رہے ہیں جن سے قمر صاحب کے حسن کلام کا اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا۔

ہمارے عزم صادق کے اثر سے
بھنور کو بھی پسینے آ گئے ہیں

ترے جنون محبت میں اپنے ہوش و خرد
ہم ایک بار نہیں بار بار کھو بیٹھے

کوئی حسرت نہ لپٹی رہ گئی ہو تیغ سے یارو
مری گردن کٹے تو پوچھ لینا جا کے قاتل سے

چاند پہ جا کے ٹھہر جاؤں مرا کام نہیں
اس سے آگے بھی مرے عزم کی منزل ہوگی

غم ترا تھا کائنات زندگی
اس کے جانے سے مصیبت ہوگئی

اندھیرے اجالے کا رشتہ نہ پوچھو
جہاں چاند ہوگا وہیں رات ہوگی

جبین شوق جھکے خود بخود جہاں واعظ
تو اس مقام کے سجدے حرام کیسے ہیں

سچی باتیں

آپ تصوف کے قائل ہوں یا منکر لیکن حضرت بایزید بسطامیؒ کے مرتبہ کے منکر تو یقیناً نہ ہوں گے کبھی آپ نے اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ وہ خود سب سے بڑا کمال کس شے کو سمجھتے تھے؟ فرماتے تھے کہ جس کام کو میں سب سے ادنیٰ سمجھتا تھا سب سے بڑھ کر وہی نکلا، اور وہ کام ماں کی خدمت تھی "اور پھر فرماتے تھے کہ جس چیز کی تلاش میں جنگل جنگل پھر کر مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعہ کرتا رہا، وہ ماں کی خدمت میں ملی" قول یہ تھے، عمل یہ تھا کہ ایک مرتبہ رات کے وقت والدہ ماجدہ نے پانی مانگا۔ آبخورہ خالی تھا۔ گھڑا دیکھا وہ بھی خالی تھا۔ دریا سے پانی لانے کے لئے گئے جب لوٹ کر آئے والدہ صاحبہ کی آنکھ لگ چکی تھی شدت کی سردی تھی، ہاتھ میں آبخورہ لئے کھڑے رہے یہاں تک کہ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بایزید کھڑے ہوئے ہیں اور سردی کی شدت سے آبخورہ ہاتھ پر جم کر رہ گیا ہے۔ فرمایا کہ آبخورہ رکھ کیوں نہ دیا۔ سعادت مند فرزند نے جواب دیا کہ دل نے یہ کہا کہ نہ معلوم آپ کب بیدار ہوں اور میں اس وقت موجود نہ ہوں۔ شفیق ماں کی زبان پر اس وقت جو دعائیں آئیں، کیا وہ دعائیں عرش الٰہی کے ادھر کہیں ٹھہری ہوں گی؟

یہ ساری روایتیں۔ فریدالدین عطار کے تذکرۃ الاولیاء میں درج ہیں۔ اسی کتاب میں یہ روایت بھی ہے کہ مدرسہ میں بایزیدؒ قرآن مجید کا درس دے رہے تھے جب سورہ لقمان کی اس آیت پر پہونچے۔ ان اشکرلی ولوالدیک

اور استاد اس کے معنی سمجھانے لگے تو استاد سے عرض کی ذرا چھٹی دیجئے کہ گھر جا کر ماں سے ایک بات کہہ آؤں، اجازت مل گئی۔ گھر آکر والدہ ماجدہ سے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی اور آپ کی دونوں کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ مجھ سے دو مالکوں کی غلامی ممکن نہیں یا آپ ہی اپنی خدمت لیجئے یا اللہ کی خدمت کے لئے آزاد کر دیجئے۔ ماں نے کہا "اپنے حقوق معاف کرتی ہوں اللہ ہی کی اطاعت میں لگے رہو"۔ بایزید وطن سے نکل گئے اور تیس برس تک جنگلوں میں گھوم پھر کر وہ

شدید ریاضتیں اور وہ سخت مجاہدے کیے کہ آج کسی کو ان کا یقین کرنا بھی دشوار ہے۔ بالآخر مدینہ منورہ حاضر ہوئے حکم ملا کہ وطن جا کر ماں کی خدمت کرو۔ وطن پہونچے اور آدھی رات اندھیرے اور سناٹے میں گھر میں اچانک داخل ہوئے۔ دروازہ سے دیکھا کہ بوڑھی ماں وضو کرتی جاتی ہیں اور دعا کرتی جارہی ہیں کہ یا اللہ میرے پردیسی کی خیر، اسے نیکی کی توفیق دینا اور بزرگوں کو اس پر مہربان رکھنا: بایزید آنکھوں میں آنسوؤں کا تحفہ لئے ہوئے اندر داخل ہوئے اور عرض کیا کہ لیجئے آپ کا پردیسی حاضر ہوگیا۔ اس پر وہ ماستا کی ماری جس کی آنکھیں روتے روتے بے نور ہوچکی تھیں آگے بڑھی اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو آغوش میں لے لیا۔

•

صوفیوں کے ایک سردار متقیوں کے ایک امام کے قول آپ سن چکے، عمل آپ دیکھ چکے۔ آج بھی بہت سے صوفی اور مشائخ موجود ہیں۔ خانقاہیں اور محفلیں تو آج کی زمانہ سے کہیں زائد آباد ہیں، ندرونیاز کی آمدنیاں ماشاءاللہ ترقی پر ہیں۔ سماع وحال کی مجلسیں گرم ہیں۔ کشف وکرامت کا چرچا ہر زبان پر ہے۔ درگاہوں اور آستانوں کی عمارتیں ایک سے ایک بڑھ کر آراستہ وعالی شان ہیں۔ "بایزید وقت سیکڑوں ہیں مگر کوئی ایک بایزید بھی ہے؟ شیخ کے یہاں آج اطاعت والدین کی بھی تربیت ملتی ہے؟ کسی خانقاہ کے نصاب تصوف کا جزو آج اس مجاہدہ کو رکھا گیا ہے۔ محفل سماع میں فرش پر لوٹ جانے والے بے شمار ہیں۔ لیکن گھر کی تنہائیوں میں آج ماں کے قدموں پر لوٹنے والا بھی کوئی جواں مرد ہے؟ بایزید کے مرتبہ پر سب کو رشک آتا ہے۔ "بایزید کی طرح اپنے نفس کو مردہ کردینے کی ہمت بھی کسی میں ہے؟ (بشکریہ صدق جدید)

خواتین کے بہترین ناول

دھوپ چھاؤں	۔ نجم اعزاز	۔ پندرہ روپیہ
اپنے بیگانے	۔	۔ سات روپیہ پچاس پیسے
ریحانہ	۔ سیدہ جمیل	۔ سات روپیہ پچاس پیسے
کشور	۔	۔ سات روپیہ پچاس پیسے
کانٹوں سے محبت کرنیے	۔ نوشابہ سیدناز	۔ دس روپیہ پچاس پیسے
گودڑ کا لال	۔ والدہ افضال علی	۔ بیس روپیہ

اقوال زریں

۱۔ حکمت اور دانائی کی بات جہاں کہیں بھی پاؤ قبول کرو۔
(حضرت محمد صلعمؐ)

۲۔ غریب کا ایک روپیہ جو خیرات کرتا ہے امیر کے سو روپیوں کی خیرات سے زیادہ ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

۳۔ ظالم کو معاف نہ کر، کیونکہ یہ مظلوموں پر ظلم ہوگا۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

۴۔ جو شخص حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا وہ خوشگوار زندگی سے ہمکنار رہتا ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

۵۔ عقلمند سوچ کر بولتا ہے اور بیوقوف بول کر سوچتا ہے۔
(حضرت حسن بصری)

٦۔ زبان کو اس طرح بند رکھو۔ جیسے خزانے میں سونا چاندی بند رکھتے ہیں۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

۷۔ مجھے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو دوسروں کے عیوب کو تلاش کرتا ہے، لیکن اپنے عیوب سے غفلت برتتا ہے۔
(حضرت غوث پاک)

۸۔ اس مال میں خیر نہیں۔ جس میں سخاوت نہ ہو۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

۹۔ عبادت پر توبہ مقدم ہے اس لئے توبہ کے بغیر عبادت بے سود ہے۔ (حضرت امام جعفر صادقؓ)

۱۰۔ سب سے کامل ان کے ایمان ہیں جن کے اخلاق پسندیدہ ہیں اور جو اپنے گھر والوں پر مہربان ہیں۔ (حضرت محمد صلعمؐ)

مرسلہ: سلمہ پرشانہ ایم۔ اے۔ جلالپور اعظم گڑھ

حیرینی یعنی پنیر بنانے کا طریقہ کسی بہن کو معلوم ہو تو تحریر فرمائیں۔ تاکہ حریم میں شائع کیا جاسکے۔

نعت

"جہاں میں بہشت بریں دیکھ لوں میں"

رخسانہ نکہت لاری

ان آنکھوں سے وہ سرزمیں دیکھ لوں میں
جہاں میں بہشت بریں دیکھ لوں میں

محبت سے بھر دے مرا آبگینہ
سکھا دے مجھے زندگی کا قرینہ
ہم آغوش ساحل ہو میرا سفینہ
دکھا دے مجھے بھی دیار مدینہ
ان آنکھوں سے وہ سرزمیں دیکھ لوں میں
جہاں میں بہشت بریں دیکھ لوں میں

نظر آئی جب حاجیوں کی جمعیت
بڑھا اور انھیں دیکھ کر درد فرقت
بدل جائے اے کاش میری بھی قسمت
کہ مجھ پر بھی سایہ کرے تیری رحمت
ان آنکھوں سے وہ سرزمیں دیکھ لوں میں
جہاں میں بہشت بریں دیکھ لوں میں

بھٹکتی رہی ہوں اندھیروں میں اب تک
ملے گی مجھے روشنی جانے کب تک
زمین مقدس کو دیکھوں نہ جب تک
مری روح پہنچے فضائے عرب تک
ان آنکھوں سے وہ سرزمیں دیکھ لوں میں
جہاں میں بہشت بریں دیکھ لوں میں

[illegible]
عجب بیقراری ہے آنکھیں ہیں پرنم
ہے میری چشم تصور میں ہر دم
مدینہ کا وہ نور و نکہت کا عالم
ان آنکھوں سے وہ سرزمیں دیکھ لوں میں
جہاں میں بہشت بریں دیکھ لوں میں

حریم کا دسترخوان

غزالہ، بیگم نسیم انجم نوہ

قیمہ بریانی

سامان :- چاول پرانے آدھا کیلو، قیمہ آدھا کیلو، گھی دو سو گرام، پیاز ۲۵۰ گرام، لہسن آدھی گٹھی، ادرک ایک گرہ، گرم مسالہ سب ملا کر ۱۲ گرام، ہری دھنیا یا پودینہ چند پتیاں۔ ہری مرچ حسب خواہش۔ نمک حسب ضرورت انڈے ۲ عدد۔ جہاز مار کر رنگ چلنے کا نصف چمچ۔ روح کیوڑہ بڑے دو چمچے، ٹماٹر دو تین پکے ہوئے، دہی ۱۰۰ گرام۔

ترکیب :- پیاز کے لچھے کاٹ لیں، لہسن باریک پیس لیں۔ ادرک کے مہین مہین ٹکڑے کر لیں۔ گرم مسالہ پیس کر رکھ لیں

گھی میں پیاز کو تل کر بادامی کر لیں اس کے بعد قیمہ دو تین بار پانی سے دھو کر ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر بھونیں، تھوڑی دیر بعد لہسن ادرک اور تھوڑا نمک ڈال کر بھونیں پھر دہی ڈال کر بھونیں پھر ٹماٹر کے ٹکڑے کر کے ڈالیں اور تھوڑا پانی بھی ملا دیں۔ پانی خشک ہو جانے پر پھر بھونیں۔ جب قیمہ گھی چھوڑ دے تو گرم مسالہ اور ہرا دھنیا اور ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں اور تھوڑا سا بھون کر اتار لیں۔

چاولوں کو پکانے سے ایک گھنٹہ پہلے بھگو دیں۔ پھر علیحدہ پانی میں تھوڑا نمک ڈال کر جوش دیں اور بھیگے ہوئے چاولوں کو دھو کر ابالیں۔ جب چاول نصف گل جائے تو اسے اتار کر سینی میں یا کسی کپڑے میں چھان کر نصف چاول کسی تلی دار پتیلی میں رکھیں اس پر قیمہ بچھا دیں اور بقیہ چاول بھی ڈال کر ڈھکن کو سخت آٹا گوندھ کر پتیلی کے منہ پر بتی بنا کر لگائیں اور ڈھکن بند کر کے ڈھکن پر انگارے رکھ دیں۔ ہلکی آنچ پر کچھ دیر تک پکائیں۔ اس کے بعد ڈھکن کھول کر دیکھیں اگر چاول حسب منشا گل گئے ہوں تو ٹھیک ورنہ دودھ کا چھینٹا دیکر پھر انگاروں پر دم کریں۔ بالکل تیار ہو جانے پر کیوڑے میں رنگ گھول کر نصف پتیلی میں چھڑک دیں تاکہ ایک طرف چاول رنگدار ہو جائیں ایک طرف سفید رہیں نکالتے وقت اسطرح نکالیں کہ رنگدار سفید چاول دونوں نکلیں سب سے آخر میں انڈوں کو سخت ابال کر چھیلیں اور ٹکڑے کر کے پلیٹ پر رکھ کر خوشنما چاولوں پر سجا دیں۔

حسینؑ اور زینبؑ

ہادی عابدی

محرم کا چاند نیلگوں آسمان پر ظاہر ہو کر شہید اعظم کی یاد دلوں میں تازہ کر دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہزار دل بنام نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے زریں واقعات ایک ایک کر کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ گو تیرہ سو برس سے زاید ہو گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کربلا کے ریگستان میں رسول کے دلبند نے اپنے صبر و استقلال اور علو ہمتی کا امتحان دیا ہے۔)

حسین ایک مکمل انسان تھے۔ کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں۔ انھوں نے بنی نوع انسان کو عملی زندگی سے آگاہ کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کی سخت ضرورت تھی۔ یزید کے ایسے جابر حکراں سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا۔ یہ نواسۂ رسول ہی کا دل اور جگر تھا کہ بہیمیت اور بربریت سے جم کر اخلاق و انسانیت کو بچانے کے لیے جنگ کی۔ اگر فاطمہ کا لال میدان کارزار میں نہ آجاتا تو ظلمت کے گھنا ونے بادل سارے عالم پر چھا جاتے۔ فسق و فجور کا بول بالا ہوتا بہیمیت کا پرچم لہراتا اور یزید کا اخلاق سوز کردار دنیا پر اقتدار حاصل کر کے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتا۔ بظاہر فتح یزید کی ہوئی۔ لیکن اب۔ نام یزید داخل دشنام ہو گیا اور ہر جگہ ہر قوم و ملت میں حسینؑ ہی کے اسوۂ حسنہ اپنا سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ ان کی عظیم الشان قربانی حق بینوں کو درس و تدریس دے رہی ہے۔ منزل کی طرف قدم بڑھانے والا اسی مصلح اعظم کے کارناموں کو مشعل راہ بناتا ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں۔ میں نے عدم تشدد کا سبق حسینؑ ہی سے سیکھا۔ انگریز مورخین لکھتے ہیں۔ حسینؑ کے کارنامے او بلند کردار زندگی کے ہر شعبہ میں سالک کا کام دیتے ہیں۔ شاید یہی خیال کر کے شاعر انقلاب نے کہا تھا ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

کربلا کے شہید نے بیک وقت بہت سی قربانیاں پیش کیں۔ جو ب کا چٹیل میدان، بلا کی گرمی۔ انیسؔ نے اس کا نقشہ کس بلند تخیل سے کھینچا ہے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

کڑی دھوپ، دلوں میں کئی دن کی بھوک اور پیاس اپنی بھوک و پیاس کسی حد تک برداشت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اپنے سے زیادہ گود کے پالے عزیز ہوتے ہیں۔ حسین کے ننھے ننھے بچے العطش کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ اس وقت بوڑھے حسینؑ کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی کتنا عظیم امتحان تھا۔ اور صابر حسینؑ کس خندہ پیشانی سے مصیبتوں کو جھیل رہے تھے لیکن پر اکتفا نہیں ہوئی۔ دل کے ٹکڑوں کی جدائی کا وقت آیا۔ طبل جنگ بجا۔ دشمن کے قوی ہیکل جنگجو مبارز طلب ہوئے۔ حسین مسکرائے۔ باری باری اپنی مختصر سی فوج کے آزمائے اور پرکھے ہوئے جانبازوں کو بھیجا تاکہ باطل سے حق کی فیصلہ کن جنگ کریں۔ ان میں بوڑھے بھی تھے۔ جوان بھی۔ اور ستم ہے کہ معصوم بچے بھی تھے۔ یہ کوئی معمولی معرکہ نہیں تھا جس میں حسین کسی ایک کو بھی رکھتے۔ شرافت اور انسانیت پر آنچ آ رہی تھی۔ نانا کے لگائے باغ پر خزاں کا حملہ تھا۔ فرض شناس نواسہ گوارا کر سکتا تھا کہ وہ اصول زندگی جو بڑی محنتوں سے قائم کیے گئے ہیں یزید کے ظالمانہ ہاتھوں سے مٹ جائیں۔ کبھی نہیں۔ حسین نے بلاؤں کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ پھر مجسم وفا اور حق شناس دوستوں کو دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ جاؤ اور ظلمت پر نور بن کر پھیل جاؤ۔ جانثاروں نے کمریں کس لیں۔ امتحان کی دوسری منزل آگئی۔ سخت ترین لمحات تھے۔ دل و جان سے محبت کرنے والے احباب رخصت ہو رہے تھے۔ سنتے ہی کتنے ان میں کا ہر ایک جلد ہی حقانیت پر فدا ہو گیا۔ اب عزیزوں کی باری تھی۔ امتحان کی تیسری بے مثال منزل۔ بھانجوں کو جو سن میں چھوٹے تھے راہ حق میں قربان کیا۔ کڑیل جوان بیٹے کو میدان میں سج کر بھیجا۔ اس سے قبل بھی ایک باپ نے اپنے بیٹے کو درگاہ رب العزت میں پیش کیا تھا۔ نوعیت ذرا بدلی ہوئی تھی۔ وہاں آنکھوں میں پٹی باندھ کر چھری چلائی گئی تھی۔ یہاں حسین کی آنکھیں کھلی تھیں۔ نیسے بیٹے

کو قربان کر رہے تھے۔ جو شکل و صورت میں رسولؐ سے ملتا جلتا تھا۔ جان بحق تسلیم ہو جانے کے بعد اس کی لاش بھی میدان سے لائے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کبھی ایسی مصیبتیں پڑ جائیں تو صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے ہمت سے کام لے کر مقابلہ کرنے ہی میں مفر ہے تاریخ نے کبھی ایسے واقعہ کو پیش نہیں کیا کہ باپ اس صورت سے اپنے جوان بیٹے کی لاش خود لایا ہو اور پھر ضعیف العمر باپ۔ حسین کے قدم رکے نہیں۔ آگے بڑھتے ہی رہے۔ برابر کے بھائی کو بھی حق کی حفاظت کے لیے عزیز نہیں رکھا۔ عباس عرب کے بڑے بہادر باپ کی اولاد تھے حضرت علیؑ کی شجاعت ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی پھر حسین اور عباس میں قیامت کی محبت۔ اس کے علاوہ حسین کی چھوٹی سی فوج کے جنرل بھی تھے۔ بہت سے خواص تنہا عباس میں میں موجود تھے۔ لیکن حق نواز اور حق شناس نے حق پر بڑے حوصلہ کے ساتھ عباس کو بھی قربان کر دیا۔ سب سے قیمتی اور ننھی قربانی اصغرؑ کی تھی۔ یہی کربلا کے واقعات کی سرخی بھی بنی۔ جب سب کام آچکے تو حسین خدا کے بڑھے اور اپنے کو بھی قربان کر دیا۔ اور شاعر کہہ اٹھا ؎

شہید ظلم کلیجے ہلا دیے تو نے
حسین درد کے دریا بہا دیے تو نے

لیکن حسین نے درد کے دریا اس لیے نہیں بہائے تھے کہ ہم ان کے کارناموں کو فراموش کر دیں۔ جب انھوں نے ہمارے لیے اتنی صعوبتیں برداشت کیں، تکلیفیں اٹھائیں۔ عزیز و اقارب کا خون بہتے دیکھا بھوک و پیاس کی سختیاں جھیلیں تو ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم ان کو نہ بھولیں۔ یقیناً حسین کا غم ہمارے لیے باعث گریہ و زاری ہے۔ ہم کیا ہیں۔ اس شہید کربلا پر ہیر کی چیونٹی تک روئی اور تا قیامت یہ خونی واقعات سب کو رلاتے ہی رہیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے کر دکھایا اس سے ہم کس قدر متاثر ہو کر عملی زندگی میں آ گئے۔ صرف کارناموں کو بیان کر دینا اور گوش دل سے سُن لینا قدر دانی کا مصداق نہیں ہوا کرتا۔ جب تک ہم انھیں راستوں پر چلنے کی کوشش نہ کریں جن پر حسین نے ثابت قدم رہ کر انسانیت کی لاج رکھ لی۔ اور عملی زندگی کا کبھی نہ بھولنے والا سبق دیا۔ اگر ہم عمل کے ساتھ مصلح اعظم کی بے نظیر قربانی اور کربلا کے خونی واقعات پر خون کے آنسو روئیں تو بڑی حد تک ان کارناموں کی داد دے سکتے ہیں۔

شہادت حسین کے بعد قربانیوں اور ایثار کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ان کے امتحان میں حضرت زینب بھی برابر کی شریک تھیں۔ جناب زینب کو اپنے بھائی سے بڑی محبت تھی۔ حسین جس مشن کو لے کر کربلا کے میدان میں آئے تھے۔ اس کی کامیابی کا سہرا زینبؑ کے سر رہا۔ جب سب قتل کر دیے گئے اور مردوں میں سوائے ایک بیمار فرزند کے کوئی باقی نہ بچا تو علی کی بیٹی نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ حسین شہید ہو چکے تھے اور حسینی مشن کا بہت بڑا کام باقی تھا۔ جس کو زینبؑ ہی نے پورا کیا۔

بعد شہادت حسین یزدیوں نے سلطنت کے ہر حصے میں پروپگنڈہ کرا دیا کہ معاذ اللہ ایک خارجی نے خروج کیا تھا۔ جس کو شکست ہوئی اور اس کے گھر والے اسیر کر کے دربار شام میں یزید کے سامنے پیش ہونے کے لیے لے جائے جا رہے ہیں۔ حکومت کا اعلان تھا۔ ہر کس و ناکس کو یقین آ گیا۔ لیکن جب یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ کے بازاروں سے گذرا۔ جہاں بڑی آرائش تھی اور اہل کوفہ یزید کی فتح پر خوشیاں منا رہے تھے اسی وقت زینب کی دور رس نگاہیں حقیقت کو سمجھ گئیں۔ موقع کی متلاشی سیاست داں نے کچھ سوچا اور سمجھا۔ قوت گویائی باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ لوگوں کو مخاطب کر کے ایسی جامع و بلیغ تقریر کی اور شہادت حسینؑ کا راز اس خوبی سے ان تک پہونچایا کہ لوگ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے یزید کے پروپیگنڈے کے بادل چھٹ گئے اور رکنے والے اپنے رسول کے نواسے کا ماتم کرنے لگے۔ یزید اپنے زعم ناقص میں نہ جانے کیا سمجھے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے .... تمام ہتھکنڈے اور گندی پالیسی ایک کمزور ہستی نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ اگر زینب حسین کے ہمراہ نہ آئی ہوتیں تو بعد قتل امام سارے کارناموں پر پردے پڑ گئے ہوتے زینب باوجود عورت ہونے کے علم و فضل میں اپنا جواب آپ تھیں۔ ان کی ذکاوت، ذہانت اور نکتہ چینی کی دوسری مثال ایک اور واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

تاریخیں شاہد ہیں کہ اپنے خیال سے حسین کو مٹا دینے کے بعد یزید نے ان کے اہل بیت کو سخت قید میں ڈال دیا تھا جہاں دن کو شدید گرمی دھوپ اور رات کو بے انتہا اوس پڑتی تھی۔

اس کے علاوہ کھانا و پانی اتنا کم دیا جاتا تھا کہ حسین کے بچے بھوک اور پیاسے ہی رہ جاتے تھے۔ زینب اپنا کھانا بچوں ہی

میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ بھتیجہ عابد بیمار تھا۔ اس لیے سارے فرائض آپ ہی کے سر تھے۔ آپ کا زیادہ وقت خدا کی یاد اور بچوں کی دیکھ بھال میں کٹتا تھا۔

ایک روز حسین کے بیمار فرزند کو یزید نے اپنے پاس بلایا اور پشیمانی کا اظہار کیا۔ کہنے لگا۔ تم حسین کے بڑے بیٹے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے باپ کا خون بہا لے لو۔ یزید کا خیال تھا کہ حسین کا خون بہت ہی سستا ہے۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سرخی رنگ لائے گی بہرحال جناب عابد نے جواب دیا کہ اس خون بہا کے حقدار رسولؐ ہیں۔ ان کو جا کر دے۔ ان کے لخت جگر کو تو نے شہید کیا۔ وہی تجھکو معاف کر سکتے ہیں۔ پھر یزید بولا۔ اچھا! خون بہا نہ لو۔ لیکن آج سے میں تمھیں اور تمھارے اہل بیت کو آزاد کرتا ہوں۔ تم سب کو لے کر اپنے وطن جا سکتے ہو۔

بھائی کی خبر بھتیجے نے پھوپھی کو دی۔ زینب کی رگ سیاست پھڑک اٹھی پھر ایک موقع ہاتھ لگا کہ حسینؑ کی مظلومیت کو منظر عام پر لایا جائے۔ اور یزید کو بتا دیا جائے کہ دیکھ ایسے ہوتے ہیں محمدؐ کے گھرانے والے۔ مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں زینب نے ایک گہری اسکیم کو سامنے رکھ کر جناب عابد سے کہا جاؤ اور یزید سے کہو کہ ایک مکان خالی کرا دے ہمارے عزیزوں کے سر بھی بھیجدے جو اس نے کربلا میں کٹوائے تھے۔ اور عام طریقہ سے عورتوں کو اجازت دیدے کہ ہمیں آکر پرسا دیں۔

یزید مظلوم عورت کی سیاست کو نہ سمجھ سکا۔ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ فوراً اس نے اجازت دے دی۔

مکان میں مجلس برپا ہوئی۔ عورتیں پرسا دینے کے لیے آئیں جب سب جمع ہو گئیں تو زینب نے سروں کو طلب کیا۔ باری باری سر آتے گئے۔ اور زینب تعظیم کو اٹھتی گئیں۔ دو سروں کے بارے میں بڑی خصوصیت سے تحریر ہے کہ جب وہ لائے گئے تو ایک کہرام مچ گیا ایک ننھے علی اصغر کا ننھا سا سر اور دوسرا تاج کربلا کا پُرجلال سر۔ اب زینب نے کربلا کے واقعات بیان کرنا شروع کیے۔ عورتیں نہیں جانتی تھیں کہ یہ کون ہیں اور کس کے سر اس بیدردی سے کاٹے گئے ہیں زینب نے ڈھول کا پول کھول دیا۔

یزید کے تمام جھوٹے پروپیگنڈے اور خون حسینؑ پر پردہ ڈالنے کی ترکیبیں خاک میں مل گئیں۔ عورتوں کا دل فطرتاً کمزور اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ جب انھوں نے کربلا کے واقعات زینب کی زبانی سنے تب ان کو احساس ہوا کہ ان کے دل و دماغ پر کس قدر گہرے پردے ڈال دیے گئے تھے۔ اصلیت کیا تھی اور بتایا کیا گیا۔ سب سے پہلی مجلس زینبؑ نے یزید ہی کے پایۂ تخت میں برپا کر کے باطل کے اندھیرے میں حق کا نور پھیلا دیا۔

جب عورتیں اپنے اپنے گھروں میں گئیں تو سب نے اپنے مردوں سے کربلا کے صحیح واقعات بیان کیے۔ جس سے ان کی بھی آنکھیں کھل گئیں اور ان کی سمجھ میں آیا کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون۔ یزید نے کس کو مٹا دیا۔ اپنے تشدد کی کس پر انتہا کر دی ان کو معلوم ہوا کہ حسین نے کن کن چیزوں کا مظاہرہ کربلا کے ریگستان میں کیا اور حقیقت میں فتح کس کی ہوئی۔

یہ تھی ایک کمزور لیکن عالی دماغ ہستی کی غیر معمولی سیاست اگر حسین نے کربلا کے میدان میں صبر و استقلال کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ اور یزید کی بیعت نہ کر کے اپنا خون دے کر ریگستان میں پھنسی ہوئی کشتی کو ساحل مراد سے لگایا تھا تو زینب نے اپنے تدبر اور عدیم المثال کوششوں سے حسینؑ کے کارناموں میں دوامی روح پھونک دی۔ یہ بھائی بہن کی محبت کی اعلیٰ مثال ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی جس چیز کی بھائی نے ابتدا کی تھی اس کو بہن نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اِس کی ممانعت کرتا ہے۔
davp 76/678

کارٹون

جلال ملیح آبادی

کردار

منشی جی .... دو مرحوم، ایک زندہ بیوی کے بوڑھے شوہر
بیگم .... منشی جی کی شوخ طرار زندہ دل بیوی
پریم .... منشی جی کے دوست کا لڑکا
غفور .... گھر کا قدیمی نوکر

منشی جی۔ (اونچی آواز سے) اماں بیگم ——— ارے بھئی بیگم! ———
سن رہی ہو؟ میں نے کہا اماں وہ میری لال ٹائی کہاں ہے!؟

بیگم۔ ارے اب تو اپنے بوڑھاپے پر ترس کھاؤ۔ اس عمر میں لال
ٹائی باندھ کے تصویر کھنچوائیں گے۔ تھوڑا سا تو شرماؤ!

منشی جی۔ اجی کیوں شرماؤں جی!..... لال نہیں تو نیلی ٹائی باندھوں
گا۔ مگر تصویر کھنچے گی ضرور

بیگم۔ (ہنستے ہوئے) مگر یہ جو منھ پر جھریاں ہیں نا۔ کم از کم ان پر
کسی دھوبی سے "استری" تو کرا لیجئے۔

(بیگم کا قہقہا)

منشی جی۔ (بگڑ کے) تم میرے ہر شوق پر جلتی ہو..... تم ہمیشہ میری جوان
امنگوں کا مذاق اڑاتی ہو بیگم

بیگم۔ (ہنس کر) جوان امنگیں؟ اور آپ!؟ کبھی سچ مچ جوانی ہو
تو امنگیں بھی اچھی لگتی ہیں، اب اس عمر میں تصویر کھنچوانے کی کیا
ضرورت ہے؟

منشی جی۔ ضرورت؟ — اماں ضرورت چہ معنی دارد!؟ میں پوچھتا
ہوں تصویر کسی ضرورت سے کھنچوائی جاتی ہے؟!

بیگم۔ اور میں پوچھتی ہوں کیا آپ اپنی تصویر کسی اخبار میں چھپوائیں
گے یا کسی فلم کمپنی میں بھیجنے والے ہیں؟

منشی جی۔ اجی میں کہتا ہوں میں اپنی تصویر اپنے کمرے میں لگاؤں گا
کیا کر لیجئے گا آپ؟

بیگم (دبی دبی ہنسی) میں بچوں کو منع کر دوں گی کہ آپ کے کمرے میں
نہ جائیں۔

منشی جی۔ کیا مطلب؟ یعنی کہ میرے کمرے میں، میری تصویر لگی
ہوگی تو تم میرے کمرے میں جانے سے یعنی کہ میرے بچوں کو کیوں
منع کرو گی؟

بیگم۔ (ہنستے ہوئے) بچے آپ کی تصویر دیکھ کے ڈر جائیں گے۔

منشی جی۔ (ڈانٹ کر) یعنی کہ تمہارا مطلب ہے میں بھوت لگتا ہوں؟
میں بندر ہوں؟ گویا کہ میں لنگور ہوں!؟

بیگم۔ (سادگی سے) کیا آپ کو اس بات کا یقین نہیں؟

منشی جی۔ (گرج کر) اماں میں کہتا ہوں "تم" بھوت لگتی ہو تمہاری
"صورت" اور "تم" ایک دم بندر ہو۔ بلکہ تم ہو لنگوری بندر؟

بھیانزی

بیگم۔ (معصومیت سے) مگر سارے محلے والے تو آپ کو کہتے ہیں۔

منشی جی۔ (غصے میں) محلے والے: محلے والے کیا کہتے ہیں مجھے؟

بیگم۔ پرانا لنگور۔

منشی جی۔ (ڈپٹ کر) پرانا لنگور؟ اور میں کہتا ہوں سارے محلے
والے مجھ سے زیادہ پرانے لنگور ہیں۔
غصہ نہ دلاؤ جان سے مار دوں گا سارے محلے کو — اور پھر
خودکشی کر لوں گا۔

بیگم۔ اجی خودکشی نہ کیجئے گا سارا محلہ یتیم ہو جائے گا۔

منشی جی۔ ہمارا محلہ یتیم ہو جائے گا؟ کیا مطلب ہے تمہارا یعنی کہ؟

بیگم۔ یعنی کہ اس محلے کے بزرگ آپ ہیں۔ مطلب یہ کہ سب سے پرانے بوڑھے آپ ہیں نا؟

منشی جی۔ (اکڑ کے) میں ہرگز سب سے پرانا بڈھا نہیں ہوں ایک سے ایک بڈھا پڑا ہے اس محلے میں، میں صرف پینسٹھ کا ہوں۔ کیا پینسٹھ برس کا کوئی آدمی تصویر نہیں کھنچوا سکتا؟ اور میں ضرور تمہاری ضد پر تصویر کھنچواؤں گا۔

بیگم۔ مگر منہ میں بتیسی لگا کے گال میں پان دبا کے تصویر کھنچوائیے گا۔

منشی جی۔ تم سے مطلب؟ میں منہ میں بتیسی لگاؤں کہ سر پر خضاب۔

بیگم۔ اجی شوق سے تصویر کھنچوائیے میں کب منع کرتی ہوں میں تو بس اتنا کہتی ہوں۔

منشی جی۔ کیا اتنا کہتی ہو جی؟

بیگم۔ بس اتنا کہتی ہوں کہ جس کمرے میں آپ کی جوانی کی تصویر لگی ہے وہاں اس بڑھاپے کی تصویر نہ لگائیے گا۔

منشی جی۔ کیوں نہ لگاؤں؟ دونوں تصویریں وہیں رہیں گی۔

بیگم۔ میں کہتی ہوں جوانی میں آپ کی صورت کیسی بھلی، کتنی سڈول تھی۔

منشی جی۔ (اچانک خوش ہو کر) جوانی میں میری صورت کیسی تھی بیگم؟

بیگم۔ بڑی بھلی۔

منشی جی۔ (خوشی سے ہنستے ہوئے) میری صورت بڑی بھلی تھی نا بیگم؟۔ بھئی بیگم! ابھی میں تم پر غصہ کر رہا تھا تو دل میں سوچ رہا تھا کہ تم مجھے چھیڑ رہی ہو۔ جوانی میں تھا نا میں چھیلا جوان کیوں؟ ارے بولو نا بیگم!؟

بیگم۔ ہوں۔

منشی جی۔ (ہنستے ہوئے) جب میں اب سے چھتیس برس پہلے تم سے شادی کرنے کے لئے دولہا بن کے گیا تھا۔ تو تمہاری سہیلیاں، میری صورت دیکھ کے، ضرور کچھ کہتی ہوں گی کیوں؟ کیا کہتی تھیں تمہاری سہیلیاں!؟

بیگم۔ میری سہیلیاں کہہ رہی تھیں یہ دولہا کا باپ کیوں سہرا باندھے گھوم رہا ہے؟۔ (بیگم کا قہقہہ)

منشی جی۔ (غصے سے) اماں لعنت ہے تمہاری سہیلیوں کی سمجھ پر کسی نے یہ نہ سوچا کہ دولہا کا باپ سہرا باندھ کے آخر کیوں گھومتا پھرے گا؟

بیگم۔ جب میری شادی آپ سے ہوئی اس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی اور آپ پینتالیس برس کے، اس لئے میری سہیلیاں آپ کو، آپ کا باپ سمجھیں۔

(بیگم کا قہقہہ)

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

منشی جی۔ کون؟ ارے شاید پریم آگیا۔ وہی پریم، تم تو جانتی ہو بیگم میرے دوست کا بیٹا۔ بہت اچھا فوٹو کھینچتا ہے پریم

بیگم۔ میں کہتی ہوں ابھی خیریت ہے تصویر نہ کھنچوائیے اس بڑھاپے کی

منشی جی۔ اماں پھر وہی لاحول ولا قوۃ مذاق؟ دیکھو بیگم! پریم کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا ورنہ وہ سمجھے گا۔ میاں بیوی میں پیار نہیں۔

بیگم۔ اچھا تو آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میرا آپ کا رومانس چل رہا ہے۔

(بیگم کا قہقہہ)

منشی جی۔ اماں پھر وہی لاحول ولا قوۃ بھئی میں دروازہ کھولتا ہوں تم اپنا منہ بند کرو۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

پریم۔ نمستے آنٹی

بیگم۔ جیتے رہو

پریم۔ آداب انکل

منشی جی۔ خوش رہو۔ بھئی میں تیار ہوں پریم کیمرہ ایرہ تو ٹھیک ہے نا؟

پریم۔ ایک دم ریڈی انکل۔ بس آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیے آدھے منٹ میں فوٹو ہوتا ہے۔

منشی جی۔ اماں بھئی ذرا میں ٹائی تو باندھ لوں پریم

پریم۔ انکل، ٹائی آپ پر اچھی نہیں لگے گی کوئی بو (BOW) لگا لیجئے۔

بیگم۔ بو؟ (BOW) لگا کے تو یہ نرے خانساماں لگیں گے پریم۔

منشی جی۔ اماں لاحول، میں کہتا ہوں ناطقہ بند۔ پھر وہی بیہودہ مذاق اپنا کیا تھا یعنی کہ

پریم۔ اچھا انکل، آپ ٹائی باندھئے نہ بو (BOW) لگائیے آپ یونہی اچھے لگتے ہیں۔ ہاں۔ اب ذرا کیمرے کی طرف دیکھئے اس جگہ نظر رکھئے — ہاں — ہاں اور آپ اپنے ہاتھ کہاں

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر پڑھیں)

بیگم۔ غصہ کرے میری جوتی۔ مگر مجھے یہ بڈھے چونچلے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

منشی جی۔ بڈھے چونچلے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ تو دونوں سے دیکھو (ہنسی) بھئی بیگم کہتا ہوں یہ لکھنوی زبان جب غصے میں بولی جاتی ہے تو تلوار کی کاٹ کرتی ہے اور جب محبت سے بولی جاتی ہے تو جیسے پھول برس رہے ہوں۔ بیگم! تم نے مجھ سے زندگی بھر محبت سے بات نہیں کی۔ واللہ ارمان رہ گیا بیگم

بیگم۔ عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے آپ کی یہ بات سُن کے میرا دل موم سا پگھل گیا۔ میں آپ سے کیا محبت کی بات کروں؟

منشی جی۔ (خوشی سے بے قابو) بیگم! بیگم بس!! بس ایک بار محبت سے کہہ دو۔ میرے سرتاج۔ میرے دل وجان کے مالک۔ آئی؟ کہہ دو ایک بار میرے سرتاج، میرے دل وجان کے مالک

بیگم۔ ٹھہریئے نا، میں شرما رہی ہوں۔

منشی جی۔ بھئی بیگم ذرا جلد ہی شرما چکو کہہ دو سرتاج

بیگم۔ کہہ دوں؟

منشی جی۔ (خوشی سے کھل کر) ہاں کہو بیگم۔ میرے سرتاج میرے جان ودل کے مالک

بیگم۔ کہوں

منشی جی۔ (بے قراری سے) کہو نا بیگم۔ میرے سرتاج

بیگم۔ میرے کالے بچوں کے کالے باپ..... ایک جوان بیوی کے دل جان کے بڈھے مالک مطلب دقیانوسی سرتاج

منشی جی۔ (چیخ کر) یعنی کہ وحدہ لاشریک کی قسم۔ آج خودکشی کر لوں گا یا تمہیں جان سے مار دوں گا

بیگم۔ پہلے خودکشی کر لیجئے پھر مجھے جان سے مار ڈالئے گا

(قہقہہ)

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

پریم۔ (اونچی آواز) انکل انکل

(قدموں کی آواز)

منشی جی۔ ارے پریم کیسی تصویر آئی بیٹا۔

پریم۔ ابھی میں کہتا تھا نا انکل۔ میرا کیمرہ ہندوستان میں ایک کیمرہ ہے آپ کی تصویر بس بالکل آپ جیسی آئی ہے۔

منشی جی۔ کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ تصویر! بھئی میں بھی تو دیکھوں پریم بیٹا

پریم۔ ذرا صبر کیجئے انکل یہ لفافہ لیجئے۔

منشی جی۔ اماں لاحول ولاقوت!! اس پر لعنت یہ میری تصویر ہے —— یہ کسی مرے ہوئے بن مانس کی تصویر ہے کہ میں ہوں؟؟

بیگم۔ (قہقہہ) یہ آپ ہی تو ہیں۔

منشی جی (ڈانٹ کے) تم چپ رہو جی

پریم۔ اجی آپ بھی کمال کرتے ہیں انکل یہ تو نیگیٹو ہے، یہ لیجئے۔ یہ ہے آپ کی تصویر دیکھئے نا زبردست فوٹوگرافی۔ کیسی خوبصورت تصویر آئی ہے انکل

منشی جی۔ یہ —— یہ۔ اماں یہ تصویر؟ یہ میری تصویر ہے؟؟

پریم۔ جی انکل ہوبہو آپ کی تصویر۔ دیکھئے نا۔ یہ گردن کی اُبھری ہوئی ایک ایک رگ دکھائی دیتی ہے یہ منہ کی ہڈیاں نظر آرہی ہیں اور یہ گالوں کے گہرے کھانچے کیسے صاف دکھتے ہیں نا؟

منشی جی۔ (ڈپٹ کے) چپ بدتمیز۔ میں جانتا تھا تو اتنا بدتمیز ضرور ہوگا یہ میری تصویر ہے؟ یہ میری صورت ہے؟؟

پریم۔ انکل جیسی آپ کی صورت ہے ویسی ہی تصویر آئی ہے۔

منشی جی۔ خاموش۔ پھر وہی بدتمیزی؟ میں تیرے باپ کا دوست ہوں۔ جانتا ہے؟

پریم۔ مگر انکل اس میں میرا اور تصویر کا کیا قصور ہے؟

منشی جی۔ قصور؟ پھر کیوں کہتا تھا میرا کیمرہ ہندوستان میں ایک کیمرہ ہے، تیرا کیمرہ بزرگوں کی تصویر ایسی بدتمیزی سے کھینچتا ہے؟

پریم۔ مگر انکل کیمرے نے تو وہی کھینچا ہے جو اس کے سامنے تھا۔

بیگم۔ ٹھیک ہی تو ہے کیمرے کے سامنے آدمی ہوگا تو آدمی کی تصویر ہوگی اور بن مانس ہوگا تو؟

منشی جی (چلا کے)! اپنی جان تمہاری جان ایک کر دوں گا۔ زبان کو لگام دو تم ہو بن مانس

(پریم کی ہنسی)

منشی جی۔ (ڈپٹ کے) ہنسی روک پریم تو بھی ہنستا ہے۔ دیکھ تیرے باپ سے کہوں گا۔

پریم۔ انکل! انٹی نے ہنسا دیا۔

منشی جی۔ میں کہتا ہوں بدتمیز انٹی نے تجھے ہنسایا تو تو کیوں ہنسا، بول

(اب صفحہ ۱۶ دیکھئے)

رکھیں گے ؟

منشی جی۔ ہٹ ؟ بھئی ہات اپنے گھٹنوں پر رکھوں گا اور کیا سر پر رکھوں گا۔

پریم۔ چلئے ٹھیک ہے۔ ہاں انکل پلیز ریڈی ہاں ہلئے گا نہیں ریڈی۔ وَن۔ ٹو۔ ریڈی۔

بیگم۔ ٹھہرو پریم ٹھہرو۔ (منشی جی سے) ارے یوں نہ بیٹھئے آپ کو دیکھ کر مجھے رونا آرہا ہے۔

منشی جی۔ آئیں ؟ اماں یہ کیا بکواس ہے تم پر لاحول بیگم۔ اماں مجھے دیکھ کے تمہیں رونا کیوں آرہا ہے ؟

بیگم۔ (روتی آواز) آپ اس طرح اسٹیچو بن کے۔ سانس روک کے بیٹھتے ہیں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ آپ مرے ہوئے بیٹھے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کے رونا آتا ہے بہت رونا آتا ہے۔

پریم۔ (ہنستے ہوئے) انکل آنٹی مذاق کر رہی ہیں۔ آپ ایسا کیجئے کہ زیادہ اکڑ کر نہ بیٹھئے۔

منشی جی۔ (بگڑ کے) مجھے ایسا مذاق بالکل پسند نہیں بیگم یہ کیا واہیات باتیں ہیں تمہاری۔

بیگم۔ بس میں تو اتنا کہتی ہوں کہ ایک دم سانس روک کر نہ بیٹھئے تھوڑی تھوڑی سانس لیتے رہیئے کہ آپ زندہ معلوم ہوں۔

منشی جی۔ (ڈانٹ کے) اماں کیا بیہودہ موڈ ہے اس وقت تمہارا بیگم

پریم۔ ارے انکل چھوڑیئے بھی نا آنٹی کی تو مذاق کرنے کی عادت ہے۔

منشی جی۔ اجی یہ کیا بکواس عادت ہے ابھی تصویر خراب ہو جاتی تو ؟

پریم۔ اب ایسا کیجئے انکل کہ ذرا نرم ہو کے بیٹھئے اور اپنی سانس بالکل ہی بند نہ رکھیئے۔

بیگم۔ تاکہ مجھے یہ خیال رہے کہ میں بیوہ نہیں ہوں۔

منشی جی۔ پھر وہی۔ دیکھو پریم یہ پھر بولیں انھیں منع کرو ورنہ میں یعنی کہ

پریم۔ (ہنستے ہوئے) آنٹی پلیز ذرا آپ خاموش رہیں۔ پلیز ایک منٹ۔ ہاں انکل ایسے ہی رہئے کیمرے کے اوپر یہاں (کیمرہ بجا کے) یہاں دیکھئے۔ ہاں بس ریڈی۔ انکل وَن ریڈی ٹو۔ (کیمرہ کلک ہونے کی آواز) تھینک یو انکل

منشی جی۔ آئیں ؟ اماں آگئی تصویر پریم ؟ اماں واللہ پلک جھپکتے ہی کھنچ گئی ؟ کیسی آئی ؟ اچھی تصویر آئی ہے نا پریم

بیگم۔ کیمرہ توڑ کر ابھی دیکھ لیجئے

پریم۔ آنٹی آپ کو بہت ستاتی ہیں انکل

منشی جی۔ اماں ان کی بک بک چھوڑو تم بتاؤ تصویر کیسی آئی ہوگی ؟

پریم۔ اجی ایک دم فرسٹ کلاس انکل

منشی جی۔ اماں تم کیمرے کے اندر تو بیٹھے نہیں تھے کہ کہہ دیا ایک دم فرسٹ کلاس۔ بھئی شک شبہ ہو تو دوسری کھینچ لو

پریم۔ اجی نہیں انکل۔ جب میں ولایت گیا تھا تب یہ کیمرہ لایا تھا بڑا قیمتی کیمرہ ہے ہندوستان میں یہ صرف ایک کیمرہ ہے جو فقط میرے پاس ہے۔

منشی جی۔ بھئی بہت خوب، اماں تو جلدی نکالو تصویر کیمرے سے دیر کیا ہے ؟

پریم۔ اجی انکل۔ تصویر اندھیرے کمرے میں کیمرے سے باہر نکالی جاتی ہے پھر دھوئی جائے گی۔

منشی جی۔ اماں لاحول یعنی کہ پہلے کاجل کی کوٹھری میں تصویر کیمرے سے باہر آئے گی پھر دھلائی ہوگی اماں یہ تمہارا کیمرہ ہے ؟ کہ واشنگ کمپنی۔

پریم۔ (ہنس کے) اجی انکل بس (چٹکی بجا کے) یوں آیا دو منٹ میں دھو کر سکھا کر لاتا ہوں۔

منشی جی۔ اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ آکے ساتھ چائے پینا... میں چائے بنواتا ہوں۔

پریم۔ اچھا انکل میں چلا... ابھی آیا۔

منشی جی۔ (اونچی آواز) بھئی ہو سکے تو ایک ہی منٹ میں آجانا چائے تیار ملے گی پریم

(چند سکنڈ وقفہ)

منشی جی۔ (پکار کے) اماں غفور۔ غفور میاں !!

غفور۔ (دور کی آواز) جی حضور

منشی جی۔ اجی ذرا تین چار کپ چائے بنائیے۔ جلدی

غفور۔ بہت اچھا حضور ابھی لیجئے

منشی جی۔ (پکار کے) اماں بیگم...... بیگم۔ اماں سن رہی ہو بیگم ؟

بیگم۔ نہیں میرے کان بٹم ہو گئے ہیں۔ بہری ہوں بہری۔

منشی جی۔ اماں بیگم ! میں کہتا ہوں کہ میں نے تصویر کھنچوائی ہے تو تمہیں غصہ کیوں آرہا ہے ؟

(اب صفحہ ۴۲ دیکھیئے)

تو کیوں ہنسا؟

بیگم۔ اجی اس پر کیوں غصہ اتار رہے ہو میں نہ کہتی تھی کہ نہ کھنچوایئے فوٹو۔ شتر مرغ لگتے ہیں آپ فوٹو میں۔

منشی جی۔ (چیخ کے) کیا؟ میں۔ میں شتر مرغ! ؟ میں کہتا ہوں یعنی کہ تم شتر تم ہو شتر مرغی ہو۔

(پریم کی ہنسی)

منشی جی۔ (ڈپٹ کر) پریم پھر ہنسا تو ؟ پھر ہنسا نالائق بدتمیز بے ہودہ بدتمیز نالائق بے ہودہ۔

غفور۔ میاں چائے

منشی جی۔ چائے نہیں غفور، ٹھنڈا پانی۔

غفور۔ میاں، آپ خواہ مخواہ تصویر کھنچوا کے اپنی جان تباہ کرتے ہیں۔

منشی جی۔ کیا مطلب ؟۔ کیوں نہ تصویر کھنچواؤں ؟ تو کیا کہنا چاہتا ہے ؟

غفور۔ میاں آپ جب بھی تصویر کھنچوائیں گے یہی حال ہوگا۔

منشی جی۔ ابے کیا حال ہوگا ؟ صاف صاف کیوں نہیں بکتا

غفور۔ مطلب یہ مطلب یہ میاں کہ آپ کھنچوائیں گے تصویر۔ اور۔

بیگم۔ اور آئے گا "کارٹون"

(قہقہے قہقہے)

ایسی عورتیں

مناظر عاشق ہرگانوی

میں اسٹیشن پہونچا تو گاڑی آچکی تھی اور مبینہ بھابھی، شہیر اور فرزانہ کے ساتھ میری منتظر تھیں۔ قریب پہونچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ ایک محترمہ اور بھی ہیں۔ بھابھی نے ان کا نام شاکرہ بتایا۔

جب دوسری ٹرین سے پٹنہ کا سفر شروع ہوا تو شہیر نے مجھے نکہت آرا کا خط دیا۔ سہارنپور سے نکہت نے دیگر باتوں کے علاوہ لکھا تھا۔

"آنٹی کے ساتھ ایک دلچسپ شخصیت سفر کر رہی ہے۔ آپ ان سے مل کر شاید خوش ہوں گے اور لکھنے کے لیے مواد ملے گا..."

میں نے شاکرہ کی طرف دیکھا، بغور دیکھا۔ ساڑی میں ملبوس چوبیس پچیس سال کی یہ محترمہ مجھے عجیب سی لگیں۔ اپنے آپ میں مگن۔ اپنی انا کے خول میں گم۔ اپنے وجود کو بالاتر سمجھنے والی۔

میں نے فرزانہ کی طرف سوالیہ نگاہ ڈالی تو اس نے میرے سوال کو تاڑتے ہوئے کہا "انکل! آپ نے گھونگھا دیکھا ہے؟"

"گھونگھا؟" میں چونک پڑا "ہاں! کیوں؟ اس وقت گھونگھا کی یاد کیسے آئی...؟"

"بدھو، چھوٹی سی بیٹی فرزانہ مجھے کم عقل سمجھتے ہوئے آنکھوں کی زبان استعمال کرنے لگی۔ اس نے اشارے سے گھونگھا کا مطلب 'شاکرہ' بتایا۔ تب میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ گھونگھا بھی تو اپنے خول میں گم رہتا ہے اس کی دنیا بھی تو محدود رہتی ہے۔

لیکن شاکرہ کی دنیا محدود نہیں تھی۔ اس نے میری باتوں کا... بہت کم جواب دیا۔ مگر اس کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا اس سے میرے خیالات کی تائید ہوئی۔

اس نے جواب میں کہا۔ میرے انکل مجسٹریٹ ہیں۔ میرے خالو انکم ٹیکس آفیسر ہیں۔ میرے نانا زمیندار تھے۔ میرے ماموں لکچرر ہیں۔ میرے ایک رشتہ دار امریکہ میں رہتے ہیں، یہ ساڑی جو میں پہنے ہوئی ہوں، انھوں نے ہی امریکہ سے بھیجی ہے۔ جلد ہی امریکہ سے مجھے وہ ٹیپ ریکارڈ بھیجیں گے۔ میں سری نگر گھومنے گئی تھی۔ میں ہر سال سیاحت ضرور کرتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاکرہ کی باتیں سن کر آس پاس بیٹھے لوگ بیحد مرعوب ہوئے لوگوں کو مرعوب دیکھ کر اس نے اپنا بیگ کھولا۔ بیگ سے چشمہ (یہ چشمہ رنگین تھا) نکالا، اسے رنگین رومال سے صاف کیا۔ پھر آنکھوں پر سجا کر اپنے کٹے ہوئے بال شانے پر بکھیرنے لگی۔ بیگ سے اس نے چھوٹا سا آئینہ بھی نکالا اور اپنے چہرے کا زاویہ ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگئی یا منہک نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے پوچھا "آپ کچھ کام کرتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ ابھی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"اسٹوڈنٹ؟" مجھے ایک طرح سے شاک لگا۔ پھر بھی میں نے پوچھا "کس یونیورسٹی میں ہیں؟"

"اس سے آپ کو کیا لینا دینا ہے" اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ تو بعد میں بھابھی مبینہ نے بتایا کہ اگلے سال بی اے کا امتحان دے گی۔

میں نے شاکرہ سے ایک اور سوال کیا "آپ کے ہسبنڈ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا میں آپ کو شادی شدہ نظر آتی ہوں؟" اس کی آنکھیں خشمگیں ہوگئیں۔

"جی... جی ہاں" میں ہکلا کر بولا۔

"نان سنس۔ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے"

"اچھا!" میں خاموش رہ گیا۔

بعد میں مبینہ بھابھی نے یہ بھی بتایا کہ شاکرہ اکیلے سیاحت کرتی ہے۔ اسے تنہا گھومنے میں زیادہ مزہ ملتا ہے۔ وہ اسے ایڈونچر کا نام دیتی ہے!

ایسی عورتوں سے میرا سابقہ اس سے قبل نہیں پڑا تھا۔ سماج میں ایسی ایڈونچر پسند عورتیں نہ جانے کتنی ہوں گی جو دنیا جہان کا تجربہ حاصل کرنے کے باوجود کنواری ہیں اور جو اپنے رشتہ داروں کی خوشحالی اور ان کے جھیمے کا نام لے کر اپنی زندگی سنوارنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں۔

آج سے کچھ سال قبل جب پردہ کا رواج تھا۔ عورتیں گھرداری کو ہی دنیاداری سمجھتی تھیں تب بھی مردوں کے عہدوں پر فخر کرتی تھیں اور اس فخر کرنے میں ایک وقار محسوس کرتی تھیں۔ لیکن آج کی شاکرہ جیسی عورتوں کے فخر کرنے میں جو تصنع، جو خودنمائی اور ظاہری نمائش ہے اسے ہر آپ محسوس کر سکتے ہیں۔ آزادی پیدائشی حق ضرور ہے مگر وقار کا خیال بھی اس سے کم نہیں۔ جہاں اصول نہیں وہاں سکون نہیں۔ اور جہاں عظمت نہیں، وہاں زندگی نہیں۔

شاکرہ جیسی عورتوں سے جن کا مقصد صرف سیر و سیاحت ہے اور جنام لیوا رشتہ داروں کی بلیاکمی کے سہارے اپنی عظمت کو سرعام تماشہ بنا رہی سماج کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ سماج تو دور کی بات ہے، خود وہ جب عملی زندگی میں داخل ہوں گی تب نہ جانے ان کا وقار کہاں ہوگا۔ ان کی شخصیت کون سا رخ اختیار کرے گی اور وہ اپنے گھر، خاوند اور بچوں کی دیکھ ریکھ کس طور پر کر سکیں گی، اس کا اندازہ کرنا بھی محال نظر آتا ہے۔

تمثیل

نشاط حیدری دیادی

باورے نین

[کردار]

انجم ۔ ۔ ۔ ۔ آئی اسپیشلسٹ
صفیہ ۔ ۔ ۔ ۔ انجم کی منگیتر
رضیہ ۔ ۔ ۔ ۔ صفیہ کی سہیلی

(اور دوسرے افراد)

پہلا منظر

ایک متوسط طبقے کا گھر۔ غیر معمولی طور پر صفائی اور سجاوٹ ہے۔ چوکیوں اور پلنگوں پر صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے ہیں۔ میز کرسی لوٹا اگالدان سب چیزیں چمک رہی ہیں۔ دالان میں تخت پر سفید چاندنی اور گاؤ تکیہ لگا ہوا ہے۔ تپائی پر چاندی کا پاندان رکھا ہوا ہے ایک معمر سی خاتون گلوریاں بنا رہی ہیں۔ سینی پائی پر ایک کشتی میں خشک میوے اور پھل رکھے ہوئے ہیں۔ رنگین چمکیلے کپڑے جھلملا رہے ہیں۔ چند خواتین صفیہ کو دیکھنے میں مصروف ہیں۔ کوئی بالوں کا جائزہ لے رہی ہے کوئی پیر ٹٹول رہی ہے۔ ایک محترمہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح دانت دیکھ لیں۔ صفیہ ۔ گلنار جوڑے میں ملبوس ہے بالوں میں گلاب کی کلیاں سجی ہوئی ہیں۔ جڑاؤ آویزوں کی رنگ برنگی جوت رخساروں پر پڑ رہی ہے۔ آنکھیں بند ہیں کافی حسین لگ رہی ہے]

ایک خاتون :۔ (صفیہ کی بلائیں لیتے ہوئے) "ماشاء اللہ! جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا"

دوسری خاتون :۔ بند آنکھیں تو اتنی خوبصورت ہیں کھلنے پر نہ جانے کیا حال ہوگا"

صفیہ کی پھوپھی :۔ (مطلب سمجھ کر) "صفیہ! آنکھیں کھول دو بٹیا" (صفیہ چپ چاپ ہے)

صفیہ کی پھوپھی :۔ شرمانے کی کیا بات ہے بیٹی کھول دو آنکھیں!"

(صفیہ آنکھیں کھول دیتی ہے کاجل لگی بادامی آنکھیں بے حد رنگین سحر انگیز ہیں)

دوسری خاتون (خوش ہوکر) خدا نظر بد سے بچائے"

تیسری خاتون :۔ "بیٹی کچھ سینا پرونا بھی تو جانتی ہوں گی"

صفیہ کی بہن :۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں یہ بڈکور، یہ ٹیبل کلاتھ، یہ ریڈیو کا غلاف یہ تکیہ کا غلاف پردوں کی پینٹنگ سب اسی کے ہاتھ کی تو ہے"!

چوتھی موٹی خاتون :۔ (عینک درست کرتے ہوئے) "کیا بیٹی سچ کہہ رہی ہو"؟

صفیہ کی خالہ :۔ "تو کیا آپ کو یقین نہیں (پکار کر) لے آؤ تو! صفیہ کے ہاتھ کے دو چار اور نمونے۔ اور وہ سوئٹر بھی جو اس نے پرسوں شروع کیا ہے"!

پہلی خاتون :۔ (جلدی سے) "ارے نہیں بہن بھلا یقین کیوں نہ ہوگا در اصل آج کل کی لڑکیاں خانہ داری کی طرف کم ہی توجہ دیتی ہیں اس لئے ذرا ۔۔۔"

صفیہ کی ماں :۔ میری صفیہ تو لکھنے پڑھنے سے لے کر سینے پرونے پینٹنگ ڈھنگ اور پکانے ریندھنے تک میں ماہر ہے"

موٹی خاتون :۔ (حیرت سے) "اے بہن حیرت ہے"

صفیہ کی بہن :۔ (مسکرا کر) حیرت کی ضرورت نہیں۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ جو کام کہو ہوا کر دکھلا دوں۔

دوسری خاتون :۔ "تم بڑی خوش قسمت ہو انجم کی ماں! اتنی سگھڑ اور خوبصورت بہو مل رہی ہے مبارک ہو"

پہلی خاتون :۔ (صفیہ کی انگلی میں انگشتری پہناتے ہوئے) "یہ سب

خدا کی مہربانی ہے۔

شگفتہ دلہن: (صفیہ کی ماں سے مخاطب ہو کر) بہن اب تاریخ بھی مقرر کر لو۔

صفیہ کی ماں:۔ میرے خیال میں تو ۱۹ رشعبان المعظم مناسب رہیگا۔

انجم کی ماں:۔ لیکن یہ تو بڑا طویل عرصہ ہے۔

صفیہ کی ماں:۔ مجھے تیاری بھی تو کرنی ہے، ورنہ جلد کرنے میں کیا عذر تھا۔

انجم کی ماں:۔ اچھا جیسی تمہاری مرضی۔

(مبارک سلامت کے شور میں دونوں گلے ملتی ہیں)

انجم کی ماں:۔ بہن اب ہمیں اجازت، وہ اب تو ہم بارات ہی لیکر آئیں گے۔

(سب مہمان عورتیں رخصت ہوتی ہیں)

دوسرا منظر

[ڈاکٹر انجم شام کی ہوا خوری سے واپس آرہا ہے۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ہیں۔ اپنی کوٹھی میں داخل ہوتا ہے۔ گھر میں ہر طرف رنگ کے ڈبے، بتیاں، رنگین کاغذ اور شادی کے دوسرے لوازمات بکھرے پڑے ہیں۔]

انجم:۔ (ماں سے) "امی جان یہ تیاریاں روک دیجئے۔"

ماں:۔ (حواس باختہ ہو کر) "کیا؟ کیا کہا؟"

انجم:۔ یہی کہ شادی کی تیاری نہ کیجئے۔

ماں:۔ (چیخ کر) "تیرا دماغ تو نہیں چل گیا" یہ کیا بک رہا ہے۔

(اندر سے انجم کے والد وکیل صاحب نکلتے ہیں)

وکیل صاحب:۔ "کیا ہوا؟ کیوں چلا رہی ہو؟"

انجم کی ماں:۔ چلاؤں نہ تو اور کیا کروں صاحبزادے فرمارہے ہیں کہ شادی کی تیاری نہ کیجئے۔

وکیل صاحب:۔ (گھبرا کر) کیا؟ مگر کیوں آخر ہوا کیا!؟"

انجم:۔ ہوا کچھ نہیں ابا جان میں شادی نہیں کروں گا۔

وکیل صاحب:۔ تاریخ مقرر ہو چکی، دعوت نامے جا چکے اور تم یہ کہہ رہے ہو۔

انجم:۔ میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔

وکیل صاحب:۔ (برافروختہ ہو کر) "نالائق! بیوقوف ہماری کتنی بے عزتی ہوگی۔

ماں:۔ "ہم لوگوں کو کیا منھ دکھائیں گے۔

انجم:۔ کچھ بھی ہو میں بے عزتی کے ڈر سے اندھی لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔

وکیل صاحب:۔ (حیرت سے چیخ کر) "اندھی!! لڑکی اندھی ہے؟ تجھ سے کس نے کہا؟"

انجم:۔ جس نے کہا ہے وہ اُسے اچھی طرح جانتا ہے۔

ماں:۔ بیٹا یہ کسی نے بے پر کی اڑائی ہے۔ تجھے مجھ پر اعتبار نہیں۔ میں لڑکی کو دیکھ چکی ہوں نہایت خوبصورت آنکھیں ہیں بڑی بڑی کٹورے جیسی۔

انجم:۔ ممکن ہے انھوں نے دوسری لڑکی دکھادی ہو۔

وکیل صاحب:۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ماں:۔ (غصے سے) کچھ بھی ہو میں زبان دے کر پھر نہیں سکتی۔

انجم:۔ خیر آپ لوگوں کو ضد ہی ہے تو میں خود سے لڑکی دیکھوں گا۔

ماں:۔ (حیران ہو کر) لیکن ہمارے یہاں اس کا رواج نہیں۔

وکیل صاحب:۔ یہ ایک نئی بات ہے وہ لوگ ہرگز نہ تیار ہوں گے۔

انجم:۔ تیار نہ ہوں گے تو شادی بھی نہ کریں۔

ماں:۔ انجم! ہوش میں ہو یا نہیں اگر مرضی نہ تھی تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔

وکیل صاحب:۔ خدایا کیسا زمانہ آگیا ہے والدین کے سامنے بیاہ کی باتیں! بے شرمی کی انتہا ہے انتہا!

انجم:۔ (جھنجھلا کر) تو کیا میں شرم ہی شرم میں اپنی زندگی کو وبالِ جان بنا لوں۔

(بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

[صفیہ کی والدہ انیسہ بیگم اور صفیہ کے والد قرار صاحب اپنے گھر میں مغموم بیٹھے ہیں۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی ہے سب خاموش ہیں۔]

انیسہ بیگم:۔ تو اب کیا کہتے ہو!"

قرار صاحب:۔ کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا عجب مشکل ہے۔"

انیسہ بیگم:۔ "اس مشکل کا تو کوئی حل نکالنا ہی پڑے گا۔"
قرار صاحب:۔ "کیا حل نکالا جائے وکیل صاحب نے تو انوکھی سی شرط لگائی ہے۔"
انیسہ بیگم:۔ اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں دراصل یہ لڑکے کی خواہش ہے۔
قرار صاحب:۔ (غصے سے) لیکن اس کی خواہش ہرگز پوری نہیں ہوسکتی۔
انیسہ بیگم:۔ ہماری کس قدر ذلت ہوگی ہم لوگوں سے کیا کہیں گے۔
قرار صاحب:۔ پتہ نہیں آخر انجم ایسی بیجا ضد کیوں کر رہا ہے؟"
انیسہ بیگم:۔ "تم نے وکیل صاحب سے پوچھا نہیں؟"
قرار صاحب:۔ بہت پوچھا وہ یہی کہتے رہے کہ مجھے خود پتہ نہیں بس آپ سے بے حد شرمندہ ہوں خدا جانے اسے کس نے بہکا دیا۔"
انیسہ بیگم:۔ میں تو کہتی ہوں کہ کوئی حرج نہیں بلکہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ ہی لیں تو زیادہ بہتر ہے۔
قرار صاحب:۔ "ہمارے یہاں آج تک ایسا نہیں ہوا۔"
انیسہ بیگم:۔ (جھکے ہوئے لہجے میں) لیکن آج کل تو لڑکے مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتے ہیں، انکار کرنا مناسب نہیں۔"
قرار صاحب:۔ "مناسب ہو یا نہ ہو مجھ میں اتنی جرأت نہیں لوگ کیا کہیں گے۔"
انیسہ بیگم:۔ لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے پریشانی تو ہمیں اٹھانی پڑے گی۔"
قرار صاحب:۔ کیا کیا جائے ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔

(وقفہ)

(رضیہ آتی ہے) اب انیسہ بیگم اکیلی ہی بیٹھی ہوئی ہیں)
رضیہ:۔ آداب عرض ہے ممانی جان۔"
انیسہ بیگم:۔ (دکھے ہوئے لہجے میں) جیتی رہو بیٹی!"
رضیہ:۔ "کیا بات ہے آپ بہت اداس نظر آرہی ہیں۔"
انیسہ بیگم:۔ "کیا کہوں یہ سب تقدیر کی بات ہے!"
رضیہ:۔ "آخر ہوا کیا؟"
انیسہ بیگم:۔ "وکیل صاحب نے کہلا بھیجا ہے کہ انجم خود لڑکی کو دیکھے بغیر بیاہ نہیں کرسکتا۔"
رضیہ:۔ (حیرت سے) ہیں! یہ کیا ـــــ تو آپ لوگوں نے کیا کہا"
انیسہ بیگم:۔ کیا کہا جائے اس کا رواج ہوتا تو ایک بات تھی۔ میں تو پھر بھی حامی بھر لیتی لیکن تمہارے ماموں رضامند نہیں ہوتے۔"
رضیہ:۔ یہ تو واقعی ذلت کی بات لیکن مجبوری میں کیا کیا جائے آپ ماموں جان کو سمجھائیے۔"
انیسہ بیگم:۔ "سمجھا کر ہار گئی لیکن وہ بھی کیا کریں، برادری کا خوف بھی تو الگ جان مارے ہوئے ہے۔"
رضیہ:۔ میں کہہ کر دیکھوں۔
انیسہ بیگم:۔ "اب کہنے سے کیا فائدہ انھوں نے تو انکار کہلوا بھی دیا"
رضیہ:۔ "ہائیں! یہ آپ لوگوں نے کیا غضب کیا؟"
انیسہ بیگم:۔ (آہ بھر کر) "اور کیا کرتی؟"
رضیہ:۔ تو گویا اب کوئی راستہ نہیں۔
انیسہ بیگم:۔ نہیں بیٹی! اتنی مشکلوں سے تو یہ نسبت ہاتھ لگی تھی اور وہ بھی ...... (آواز بھرا جاتی ہے)
رضیہ:۔ "آپ پریشان نہ ہوئیے"
انیسہ بیگم:۔ "پریشانی تو اب ہے ہی"
رضیہ:۔ "صفیہ کہاں ہے"
انیسہ بیگم:۔ "دلشاد کے وہاں گئی ہے اس سے ان باتوں کا ذکر نہ کرنا۔"
رضیہ:۔ نہیں کہنے سے کیا فائدہ اچھا اب میں چلتی ہوں۔"
(رضیہ چلی جاتی ہے)

چوتھا منظر

(ڈاکٹر انجم کا کلینک، مریضوں کا ہجوم۔ سفید ریشمی پردہ ہٹا کر اسسٹنٹ ڈاکٹر اندر آتا ہے)
اسسٹنٹ:۔ "سر دو خواتین آئی ہیں انھیں ذرا جلدی ہے"
انجم:۔ اچھا پہلے انھیں کو بھیج دو"
(دو عورتیں سیاہ برقعے میں اندر داخل ہوتی ہیں)
انجم:۔ "تشریف رکھیے"
پہلی:۔ "یہ میری بہن ہیں ان کی آنکھیں کچھ کمزور ہیں۔"
انجم:۔ "ٹھیک ہے، لیکن برقع تو اتاریئے۔"
(دونوں نقاب الٹ دیتی ہیں اور برقعے سے گویا چاند جگمگا اٹھا ہو۔ انجم بغیر پلکیں جھپکائے یک ٹک دونوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔)
پہلی:۔ کیا دیکھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"
انجم:۔ ک۔ کک۔ کچھ نہیں چلیئے آپ آپ ہی ـــــ

دوسری :ـ "جی ہاں میں ہی آنکھیں چیک کرانے آئی ہوں "
انجم :ـ آیئے دوسرے کمرے میں معائنہ ہوگا ۔

(وقفہ)

انجم :ـ "لیکن آپ کی آنکھوں میں تو کوئی خرابی نہیں ۔
دوسری :ـ یہ کیسے ہوسکتا ہے آپ دوبارہ معائنہ کیجئے ڈاکٹر صاحب!"
انجم :ـ آپ لوگوں کو خواہ مخواہ وہم ہوگیا ہے جب کچھ خرابی ہی نہیں تو معائنہ کیا خاک کروں ۔
پہلی :ـ آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں ؟"
انجم :ـ "تو گویا اب تک گھاس کھودتا رہا ہوں ۔
پہلی :ـ خدا نہ کرے آپ گھاس کھودیں لیکن ایک بار پھر کہہ دیجئے کہ کیا واقعی اس کی آنکھیں اچھی ہیں ۔
انجم :ـ ہاں بھئی اچھی ہیں بالکل صحت مند میں کتنی بار کہوں "
پہلی :ـ تو پھر نوشہ میاں آپ شادی سے کیوں انکار کر رہے ہیں ۔
انجم :ـ (حیرت سے) کیا ؟ ـــ کیا مطلب "
(دوسری لڑکی جلدی سے نقاب گرا لیتی ہے)
رضیہ :ـ "آداب عرض ہے جی ہاں! میں رضیہ ہوں اور یہ صفیہ
انجم :ـ "یعنی ـــ یعنی کے ......"
رضیہ :ـ "یعنی کہ آپ کی ہونے والی بیگم صاحبہ اور میری پیاری سہیلی ۔
انجم :ـ "کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں ۔
رضیہ :ـ (ہنستے ہوئے) سن لو صفیہ! یہ حضرت اسے بھی مذاق سمجھ رہے ہیں ۔
صفیہ :ـ "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا رضیہ!"
رضیہ :ـ "یہ نہ کرتی تو تمہارے دولہا میاں کو یقین کیسے آتا ۔
انجم :ـ (جلدی سے) آپ لوگ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیئے نا "
رضیہ :ـ "شکریہ! اب تو آپ نے صفیہ کی آنکھیں دیکھ ہی لیں اس لئے انیس شعبان کو ہمارے یہاں آکر ٹپکنے کا خدا حافظ!!

(دونوں چلی جاتی ہیں)

پانچواں منظر

[انجم کی کوٹھی ۔ حجلۂ عروسی خوب سج دھج ہے ۔ کارنس اور بک شیلف پر نازک کھلونے ، دستکاری کے نمونے اور قیمتی جلد بند کتابیں رکھی ہوئی ہیں پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی ہیں ۔ سرخ کامدانی ریشمی بستر پر صفیہ سرخ دوپٹے میں منہ چھپائے بیٹھی ہے ۔ سامنے کے صوفے پر رضیہ اور دو تین لڑکیاں براجمان ہیں اور قہقہے لگا لگا کر صفیہ کو چھیڑ رہی ہیں]

(انجم داخل ہوتا ہے)

انجم :ـ "اخاہ! تو رضیہ صاحبہ بھی تشریف فرما ہیں "
رضیہ :ـ (مسکراتے ہوئے) جی ہاں! صرف میں ہی نہیں بلکہ نکہت ، دیبا ، اور نرگس بھی ہیں آپ نے انھیں دیکھا نہیں ۔
انجم :ـ (جھینپ کر کھسیانی ہنسی) اتنے سارے چاند جگمگا رہے ہوں آنکھوں میں چکا چوندھ تو ہوگی ہی "
نرگس :ـ "صحیح فرماتے ہیں جناب!"
دیبا :ـ "اری صفیہ! ان بیچاروں کو ذرا آنکھیں تو دکھا دے "
انجم :ـ خدا کی پناہ! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں یعنی روز اول سے ہی مجھے آنکھیں دکھائی جائیں اللہ بچائے آپ لوگوں سے "

(سب کا زوردار قہقہہ)

افسانہ

خودکشی

از مائل ملیح آبادی

بوڑھے مسعود نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ جمال سلمیٰ کی زندگی میں شامل ہو رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سلمیٰ اپنے کو اور اپنے حالات کو بھول کر جمال کو اپنی زندگی میں داخل کرے۔ انھوں نے حامد کو منتخب کر لیا تھا۔ وہ خود ایک دولت مند آدمی تھے اور سلمیٰ کی شادی بھی ایک دولت مند ہی کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ یہ رشتہ جوڑنے کے لیے انھیں حامد سے اچھا امکان نہیں سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سلمیٰ حامد کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف متوجہ ہو جائے۔ اسی لیے انھوں نے سوچا کہ معاملہ کو جلد سے جلد صاف کر لیا جائے اور سلمیٰ کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ جمال سے تعلقات بڑھا کر غلطی کر رہی ہے۔

شام کو چائے کے وقت جب بوڑھے مسعود اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو سامنے کی کوچ پر بیٹھی ہوئی سلمیٰ بھی صبح کا اخبار دیکھ رہی تھی۔ سلمیٰ کا چہرہ کسی طرح کے جذبات سے بالکل خالی تھا لیکن بوڑھے مسعود کے چہرے پر بےچینی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ان کی بےچینی کا سبب یہ تھا کہ بات چیت شروع کرنے کے لیے ان کو کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد انھوں نے پوچھا۔

"تم نے چائے نہیں پی بیٹی!"

سلمیٰ نے اخبار کی طرف سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں پی چکی ہوں ابا میاں"

مسعود خاموش ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی، آگے بڑھ نہ سکی۔ تب انھوں نے ایک دوسرا سرا پکڑا۔ بولے "آج ٹہلنے نہیں جا رہی ہو؟"

سلمیٰ نے اخبار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤں گی"

باپ نے پوچھا "تم تو اس وقت باہر چلی جایا کرتی تھیں!"

سلمیٰ نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جمال کی۔ آج انھی کے ساتھ باہر جانے کا وعدہ ہے" یہ

کہہ کر اس نے شرم سے سرخ پڑ جانے والے اپنے چہرے کو اخبار سے چھپانے کی کوشش کی، لیکن بوڑھے مسعود کی تیز نظروں نے سب کچھ دیکھ لیا اور یہ سب دیکھ کر انھیں لڑکی پر کسی قدر غصہ بھی آیا۔ لیکن اپنے غصے کو چھپا کر انھوں نے آہستہ سے پوچھا۔ "جمال آج کل کرتا کیا ہے؟"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "اس سال وہ بی اے کر لیں گے"

مسعود کچھ دیر تک خاموش رہے پھر انھوں نے سب کچھ کہہ ڈالنے کے لیے زبان کھولی، بولے۔ "جمال کی ظاہری حالت تو بہت ہی خراب ہے۔ کپڑے لتے تک درست نہیں ہیں۔ بہت ہی غریب معلوم ہوتا ہے"

ان کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ سلمیٰ بیچ ہی میں بول اٹھی۔ "ابا میاں، وہ غریب ہی ہیں، تعلیم کا خرچ بھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن وہ ہمیشہ وظیفہ پاتے رہے ہیں اور ان کے چچا بھی مدد کرتے ہیں ان کی تعلیمی حالت اتنی اچھی ہے کہ کوئی ساتھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

باپ کو بیٹی کی یہ جسارت پسند نہیں آئی۔ وہ جمال کو حقیر ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ چھوکری بیچ ہی سے ان کی بات کو اچک لیتی ہے اس بات نے انھیں برافروختہ تو بہت کچھ کیا لیکن پہلے ہی کی طرح اس مرتبہ بھی وہ سب کچھ پی گئے، بولے۔ "ذہین ہونا اور بات ہے۔ تم سمجھتیں نہیں کہ غریب ہونا کتنا برا ہے۔ اب تمھیں بتاؤ کہ بھلا اس کی کسی جگہ پر بھی عزت ہو سکتی ہے جب تک وہ اچھے قیمتی کپڑے اور موٹر وغیرہ نہ رکھتا ہو۔ سچ تو یہ ہے بیٹی کہ"

سلمیٰ نے ایک بار پھر ان کی بات کو کاٹ دیا۔ سر جھکا کر بولی "سب ہمیشہ ہی سے دولت مند تو نہیں ہوتے ابا میاں! جمال کو بھی امید ہے کہ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد کوئی اچھی نوکری ضرور حاصل کر لیں گے" یہ کہہ کر جب اس نے کن انکھیوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو وہ ایک طرح سے سہم سی گئی۔ بوڑھے باپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ۔ "سچ تو یہ ہے بیٹی کہ میں جمال کا تمھارے ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھتا" یہ کہہ لینے کے بعد وہ ایک طرح سے مطمئن ہو جاتے۔ ان

کے دل پر سے ایک بوجھ اتر جاتا۔ لیکن لڑکی نے ان کے اس بوجھ کو اترنے نہیں دیا اور اسی لیے مارے غصے کے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید وہ سلمیٰ کی اس بدتمیزی پر اس سے سختی کے ساتھ بات چیت کرتے مگر یک بیک ان کی نظر دروازے کی طرف گئی اور انھوں نے دیکھا کہ دروازے پر حامد کھڑا ہے۔ وہ سلمیٰ کو جواب دینے کے بجائے حامد سے کہنے لگے۔ "آؤ حامد! سب خیریت تو ہے۔؟"

"خدا کا شکر ہے" کہہ کر حامد کمرے میں داخل ہوا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھے مسعود نے حامد کے لیے چائے بناتے ہوئے کہا۔ "تمھارے سول سروس کے امتحان کا کیا ہوا حامد؟"

حامد نے جواب دیا: "ابھی نتیجہ نہیں نکلا ہے"

"مجھے تمھاری کامیابی کا یقین ہے" بوڑھے مسعود نے حامد کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔ "انسان کا عزم و حوصلہ بلند ہونا چاہیے نہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو اپنی غربت کو دیکھتے ہوئے بھی عزم بلند سے کام نہیں لیتے"

حامد نے اثبات میں سر ہلایا لیکن سلمیٰ سمجھ گئی کہ اس کے بوڑھے باپ نے...... کہاں پر چوٹ لگائی ہے۔ اس لئے ایک طرح سے منافقت ہی کرتے ہوئے کہا: "جو غریب ہیں ان کے حوصلے امیروں سے زیادہ بلند ہیں ابا میاں! لیکن ذرائع اس قدر محدود ہیں کہ وہ اپنے عزائم کو پورا نہیں کر سکتے۔ مثلاً حامد صاحب ہی ہیں، سول سروس کے امتحان میں یہ صرف اس لیے شریک ہو سکے کہ ان کے دور کے کوئی عزیز کونسل کے ممبر تھے۔ خود حامد صاحب سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چمڑے کی تجارت میں زیادہ کامیاب رہیں گے"

ابا نے بھی بیٹی کی ضرب محسوس کی اور جل بھن کر کہنے لگے "غریبی ایک طرح کا عذاب ہے جس کا تعلق اعمال سے ہے۔ بد اعمالوں کو خدا دنیا میں بھی ذلیل کرتا ہے اور آخرت میں بھی میرا خیال ہے"

بوڑھے مسعود ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کرنے پائے تھے کہ جمال نے دروازے پر آ کر اندر آنے کی اجازت چاہی اور بوڑھے مسعود نے جواب میں کہا "آؤ۔ آؤ جمال! سلمیٰ تمھارا انتظار ہی کر رہی تھی۔ آج تم لوگوں کی باہر جانے کی بات ہے شاید؟"

جمال "سلام علیکم" کہہ کر کمرے میں داخل ہوا اور جواب میں مسعود نے "وعلیکم السلام" بھی کہا، لیکن حامد نے اس کے سلام کا جواب دیا یا نہیں، اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔ مختلف چیزوں پر بات چیت ہونے لگی لیکن معلوم نہیں کیوں جمال سے کسی نے بھی چائے کے لیے نہیں پوچھا اور نہ تو کوئی مخصوص طور پر اس کی طرف متوجہ ہی ہوا۔ سلمیٰ اس زیادتی پر بے چین سی ہو گئی اور جب یہ سب اس سے برداشت نہ کیا جا سکا تو وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے واپس بھی آ گئی۔

باہر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی اور ابر کے گہرے ٹکڑے یکجا ہو کر جیسے روشنی کا گلا گھونٹے دے رہے تھے کمرہ ہلکی تاریکی سے بھر گیا تھا اور حاضرین میں سے ہر ایک تھکا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ بات چیت میں نہ تو گرمی ہی تھی اور نہ جوش ہی۔ جیسے سب زبردستی ہی باتیں کر رہے ہوں۔

سلمیٰ کے باہر جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد نوکر نے آ کر ایک ہلکی میز سلمیٰ کے سامنے رکھ دی اور اس پر چائے کا سامان رکھ کر باہر چلا گیا۔ سلمیٰ نے چائے پلاتے ہوئے جمال کو مخاطب کر کے کہا: "شاید آپ نے ابھی چائے نہیں پی ہوگی، لیجئے!" کہہ کر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پیالی جمال کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگی "آج بارش کی وجہ سے باہر جایا نہیں جا سکے گا، اگر حامد صاحب آمادہ ہوں تو شطرنج کھیل کر ہی وقت گذارا جائے"

جمال نے کہا "ہے تو اچھا ہی۔ حامد صاحب شطرنج کے اچھے کھلاڑی بھی تو ہیں"

حامد خاموشی کے ساتھ باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بولا "مجھے معاف کیجئے۔ طبیعت حاضر نہیں ہے۔ پھر میں نے ان سب باتوں کو چھوڑ بھی دیا ہے"

بوڑھے مسعود جو سلمیٰ کے برتاؤ سے دل ہی دل میں تلملا رہے تھے اور ان کی دلی تکلیف کو کسی طرف سے بھی نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا یک بیک موقع پا کر چوٹ کر بیٹھے۔ بولے "انسان کو اپنی ترقی کی فکر کرنی چاہیئے۔ شطرنج گنجفہ وغیرہ ایسے کھیل ہیں جو انسان کو ایک طرح سے فریب میں ڈال کر اس کا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ تم نے اچھا کیا حامد، جو ان لغویات سے ہاتھ اٹھا لیا"

ابھی ابھی جمال نے بھی شطرنج سے دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اب بوڑھے مسعود صاحب نے ان کھیلوں کے کھیلنے والوں سے ایک طرح سے بیزاری کا اظہار کیا اور یہ خیال بھی نہ کیا کہ ان کے اس جواب سے ایک مہمان کو

کتنا صدمہ ہوگا ۔ جمال کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہوگیا اور اس شرم کو باقی تینوں آدمیوں نے اچھی طرح محسوس بھی کیا ۔ لیکن باقی تین میں سے ایک کے دل میں آگ سی بھڑک اٹھی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے باپ اس کے مہمان کی برابر توہین کر رہے ہیں اور یہ توہین اس کے لیے ناقابل برداشت ہے ۔ وہ چاہتی تھی کہ باپ کو اس کا کوئی سخت جواب دے یا جمال سے کہے کہ آؤ جمال دوسرے کمرے میں چل کر باتیں کریں ، لیکن بوڑھے باپ نے اپنی بیٹی کی اس حالت کو دیکھ لیا اور وہ سمجھ گئے کہ لاڈ پیار میں خراب کی ہوئی یہ لڑکی اس وقت ان کا ذرا بھی خیال نہ کرے گی ، چنانچہ انھوں نے لڑکی کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی کہا ۔" لیکن جن لوگوں کو ان کھیلوں کا شوق ہے ان کو بھی برا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کا یہ نظریہ کہ کام کے بعد دماغ کو غذا ملنی ضروری ہے ، بھی ناقابل تردید ہے "

سلمیٰ نے باپ کی بات کو سمجھ لیا اور کہا " نہیں ابا میاں ، دماغی سکون کے لیے کھیل ضروری ہیں اور جو لوگ کھیل و تفریح کو چھوڑ کر ہر وقت کمانے کھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں ان کی زندگی کسی طرح بھی جانوروں سے بہتر نہیں کہی جا سکتی ۔

جو آگ بھڑک کر براہ راست جلا دینا چاہتی تھی وہ بھڑکی تو ضرور لیکن جلانے کے بجائے ایک ہلکا سا چرکا لگا کر رہ گئی ۔

اس بات کو بوڑھے باپ نے محسوس کیا لیکن پھر بھی سلمیٰ کی بات اتنی کڑوی اور نامناسب تھی کہ حامد اس کو برداشت نہ کر سکا اور اس بات کو سراسر اپنی توہین سمجھ کر سخت لہجہ میں کہنے لگا " میں دیکھ رہا ہوں سلمیٰ کہ آج تم برابر میری مخالفت ... توہین کر رہی ہو ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی وجہ کیا ہے ؟ اگر اس وقت میرا یہاں موجود رہنا تمھارے کسی مقصد کی راہ میں حائل ہو رہا ہے تو مجھے اجازت دو ۔ میں چلا جاؤں " یہ کہہ کر وہ کرسی پر سے اٹھنے لگا اور اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو کسی طرح بھی چھپا نہ سکا ۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ، ہوا تیز تھی اور بوچھار نے سامنے کے برآمدے کو بھی تر کر دیا تھا ۔ ابھی ابھی تیز چمک کے ساتھ زور کی کڑک ہوئی تھی ۔ مجموعی طور پر شام بالکل طوفانی تھی ۔ لیکن کمرے کے اندر جو طوفان آنے والا تھا اس کے مقابلے میں باہر کے طوفان کی کوئی حقیقت نہ تھی ۔ بوڑھے مسعود اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے اور وہ اس طوفان کو روکنے کے لیے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ یکایک سلمیٰ گرج اٹھی " آپ بھول رہے ہیں حامد صاحب ، آپ کسی حالت میں بھی میرے کسی مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے آپ کو آپ کی دولت مندی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۔ جتنی جلدی آپ اس دھوکے کو سمجھ لیں اتنا ہی اچھا ہے ۔ میں آپ کو اتنی اہمیت دینا نہیں چاہتی کہ کبھی کسی حالت میں بھی آپ میری راہ میں حائل ہو سکیں ۔ میں نے تو آپ کو یہاں آنے کی دعوت دی ہے اور نہ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب آپ یہاں سے تشریف لے جائیں ۔ جو شخص اپنی خوشی سے آیا ہے وہ اپنی خوشی سے جا بھی سکتا ہے "

کمرے میں ہولناک سناٹا چھا گیا ۔ سب کے چہرے یہی کہہ رہے تھے کہ آنے والے چند لمحے کسی بڑی بات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں ... حامد یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بوڑھے مسعود تمتمائے ہوئے چہرے سے کہہ اٹھے ۔

" بس سلمیٰ ! تم بہت بڑھتی جا رہی ہو ، حامد سے تم کو معافی مانگنی چاہیئے "

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی سلمیٰ بھرائے ہوئے گلے سے کہہ اٹھی " نہیں ابا میاں ، یہ کسی طرح بھی نہ ہوگا ۔ حامد صاحب نے میری توہین کی ہے انھیں مجھ سے معافی مانگنی چاہیئے .. " کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی ۔ لیکن باپ نے ان ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو دیکھا نہیں یا دیکھا لیکن ان آنکھوں نے ان کے دل پر کچھ اثر نہیں کیا وہ پہلے سے بھی زیادہ غصے کے ساتھ بولے " بس ، چپ رہو " پھر حامد کی طرف مخاطب ہو کر کہا " حامد تم بیٹھو ۔ اس کمرے میں جو نہ بیٹھنا چاہتا ہو وہ خوشی سے باہر جا سکتا ہے لیکن حامد نہیں جائیں گے ، یہ ان کا اپنا گھر ہے "

حامد بیٹھ گیا لیکن معلوم نہیں کس طرح بیٹھتے بیٹھتے اس کی نگاہیں جمال کی نگاہوں سے مل گئیں ۔

باپ کی بات کتنی تلخ اور دور رس تھی اس بات کا اندازہ بیٹی کے سوا کوئی دوسرا نہ کر سکا ۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایک دبی ہوئی سسکی کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا اور دوسرے ہی لمحے برآمدے کی بوچھار کا خیال کیے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل

گئی۔ سلمیٰ کمرے سے باہر چلی گئی اور قریب اس کے ساتھ ہی جمال بھی کوئی بات کئے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا اور آندھی پانی چمک کڑک کا خیال کئے بغیر سامنے کی لامتناہی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

کل جو حادثہ گذر گیا ہے اس کی اہمیت کو کس طرح کم کیا جائے بڑھے مسعود اس الجھاؤ کو کس طرح بھی سلجھا نہ سکے۔ انھیں جمال اور سلمیٰ کے متعلق شک تو پہلے ہی سے تھا لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی بیٹی خود انہی کے منھ پر اپنے اور جمال کے رشتے کی اس طرح حفاظت کرے گی۔ انھوں نے حامد اور سلمیٰ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی تھی لیکن کل کے واقعہ نے ان دونوں کو اتنی دور کر دیا ہے کہ شاید اب وہ ان کو کسی طرح بھی قریب نہ لا سکیں گے حامد بھی ایک طرح سے خفا ہی ہو گیا ہے۔ شاید اب وہ ادھر کا رخ بھی نہ کرے گا۔ مالدار اور پڑھا لکھا لڑکا تھا اسے کھو کر سلمیٰ کبھی کسی دوسری جگہ آرام نہ پا سکے گی۔ بوڑھے مسعود اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر سلمیٰ اپنی ضد سے باز آجائے، اگر وہ جمال کا خیال چھوڑ دے اور حامد کو اس گھر میں آنے کا موقع دے تو ابھی معاملات سدھر سکتے ہیں۔ لیکن سلمیٰ کو کس طرح راضی کیا جائے یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ کل کے آندھی پانی نے ابھی تک چین نہیں لیا تھا ٹھیک اسی طرح جس طرح کل کے چاروں آدمیوں کے دلوں کا طوفان ابھی تک نہیں ٹھہرا تھا۔ بوڑھے مسعود اپنی لاڈلی اور ضدی لڑکی سے واقف تھے۔ وہ کل خفا ہو کر چلی گئی ہے اور مستقبل قریب میں اس کے ملنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ انھیں اس بات کا یقین تھا۔ لیکن وہ، جو باپ ہیں، جن پر لڑکی کے مستقبل کو اچھا بنانے کی ذمہ داری آپڑی ہے وہ اپنے فرض کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں کنگال جمال شادی کر کے نہ خود خوش رہ سکتا ہے اور نہ سلمیٰ کو آرام دے سکتا ہے۔ دوسری طرف حامد ہے جو دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی کے ذرائع بھی رکھتا ہے۔ غیب کا حال تو خدا ہی جانتا ہے لیکن بظاہر وہ آنکھیں بند کر کے اپنی لڑکی کو کنوئیں میں ہرگز نہ ڈھکیلیں گے۔ اگر سلمیٰ یہی ضد کرتی رہی کہ وہ جمال کے ساتھ شادی کرے گی تو اسے آزادی ہے، وہ شوق سے شادی کرے لیکن خود وہ نہ تو اس شادی میں شریک ہوں گے اور نہ کسی طرح کا تعلق ہی رکھیں گے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ جب تو میرا کہا نہیں مانتی تو میری بیٹی نہیں ہے۔ جا، جمال کے ساتھ جا۔ لیکن یاد رکھ کہ باپ کو ناراض کر کے تو کبھی خوش نہ رہ سکے گی، تجھے کبھی سکون نہ ملے گا۔

اتنا سب سوچنے کے بعد انھیں خیال آیا کہ کل سے انھوں نے سلمیٰ کو نہیں دیکھا ہے اور نہ اس کی خبر ہی لی ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ سلمیٰ کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئے اور دروازے پر پہونچ کر دیکھا کہ دن کے آٹھ بجنے کو آ گئے ہیں لیکن سلمیٰ کا کمرہ ہنوز اندر سے بند ہے کیسی خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے بے چینی کے ساتھ دروازے کو دھکا دے کر پکارا: "سلمیٰ!"

"چار مرتبہ اسی طرح دھکے دینے کے بعد جب دروازہ کھلا تو انھوں نے دیکھا کہ سلمیٰ ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے اور اس کے الجھے ہوئے بال سوگواروں کی طرح چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ باپ کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کی لڑکی رات بھر سو نہیں سکی اس نے یہ کڑکتی گرجتی رات رو رو کر کاٹ دی ہے۔ لیکن جب انھوں نے اس بات پر غور کیا کہ لڑکی کا یہ جاگنا اور رونا سراسر نامناسب تھا تو ان کے پورے جسم میں آگ سی لگ گئی اور ابھی ایک لمحہ پہلے اس کی صورت دیکھ کر ہمدردی کے جو الفاظ کہنا چاہتے تھے وہی الفاظ ایک لمحہ لعنت ملامت بن کر اس کی زبان سے نکلنے لگے: "میں سمجھتا تھا کہ تم اپنی کل کی حرکت پر شرمندہ ہو گی لیکن دیکھ رہا ہوں کہ شرمندہ ہونے کے بجائے تم مجھ کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ کل ایک معمولی آدمی کی وجہ سے حامد کی توہین کی اور وہ خفا ہو کر یہاں سے چلا گیا جب تم اس بات پر غور کرو گی کہ کل تم نے جو کچھ کیا ہے وہ خود تمہارے لیے اور ہمارے سب کی آئندہ ترقی کے لیے کتنا نقصان دہ ہے تو اپنے رویے پر تمھیں خود شرم آئے گی۔"

سلمیٰ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا: "غلطی کس کی ہے اس بات کو میں اچھی طرح محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن ابا میاں، اس بات کو یہیں پر ختم کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔"

باپ نے قدرے تعجب کے ساتھ پوچھا: "اس کے معنی؟"

بیٹی نے جواب دیا: "اس کے معنی بالکل صاف ہیں۔ کل کی بات

جہاں پر ختم ہو گئی ہے اسے وہیں پر ختم ہو جانا چاہیئے تھا اب اسے دوبارہ چھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

بیٹی کے خشک جواب کو سن کر باپ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ انھوں نے کڑک کر کہا:" بات ختم نہیں کی جائے گی تمھیں میری بات ماننا پڑے گی۔ حامد اس گھر میں آئے گا، برابر آئے گا اور اگر وہ خود نہ آئے گا تو میں اس کو بلانے جاؤں گا۔ تمھیں یہ بات کان کھول کر سن لینی چاہیئے کہ حامد کے سوا اس مکان میں کوئی دوسرا قدم نہیں رکھ سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے تاکہ معلوم کریں کہ ان کی بات نے اس پر کہاں تک اور کیا اثر ڈالا ہے۔ لیکن سلمیٰ کے سخت چہرے پر غصے یا افسوس کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی وہ جیسی تھی ویسی ہی بنی رہی اور آخر میں آہستہ سے کہا:" یہی تو کہہ رہی ہوں ابا میاں، کسی دوسرے کو تو آپ کل ہی اس گھر سے نکال چکے ہیں۔ اب اسے یہاں آنے کی نہ تو فرصت ہی ہے اور نہ ضرورت ہی۔ آپ جس کو بلانا چاہتے ہیں اسے لائیے۔ گھر آپ کا ہے میرا نہیں:" یہ کہہ کر اس نے انگلی پر سے تولیا کھینچ لیا اور باپ کی طرف دیکھے بغیر ہی دوسرے دروازے سے سیدھی غسل خانے کی طرف روانہ ہو گئی۔

بہت بابا وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا میں نے بھی ابھی تک اپنی لڑکی کو پہچانا نہیں ہے۔ وہ ضدی اور خود دار ضرور ہے لیکن کیا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یک بیک اپنی ضد کو چھوڑ دے گی اور باپ کی خواہش کے سامنے جھک جائے گی؟ لیکن یہاں تو وہ یہی دیکھ رہے ہیں۔ سلمیٰ نے ان کے سامنے ہتیار ڈال دیے ہیں اور ہر اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہے جس کا باپ حکم دے۔

وہ بہت دیر تک کھڑے کھڑے یہی سوچتے رہے۔ آخر انھوں نے ایک گہری سانس کے ساتھ کہا:" عجیب لڑکی ہے:" اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلنے لگے۔

دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی گیا لیکن رات نہ کٹ سکی۔ بوڑھے مسعود کسی طرح حامد کو گھر لے ہی آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چائے پر سلمیٰ بھی شریک ہو۔ لیکن سلمیٰ جو آج دو روز سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی ہے کسی طرح اس دعوت میں شریک ہونا نہیں چاہتی۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ باپ کے مقابلے میں بیٹی کو ایک مرتبہ پھر شکست ہو گئی۔ مرجھائی ہوئی سلمیٰ آہستہ آہستہ آ کر دعوت کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ لیکن دونوں

میں سے، جن کی صلح کی بوڑھے باپ کو اتنی بے چینی تھی کسی نے بھی ایک دوسرے کی طرف نہ تو دیکھا ہی اور نہ بات چیت ہی کی۔ بوڑھے مسعود ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور جب انھوں نے دیکھا کہ محفل میں بالکل جوش نہیں ہے تو وہ کسی کام کا بہانہ کر کے باہر چلے گئے۔ وہ شخص جو ایک دوسرے سے ناراض بیٹھے ہوئے ہیں وہ اسی وقت بات کریں گے جبکہ ان کو بالکل تنہا بیٹھنے پر مجبور کر دیا جائے۔ یہ سناٹا ان کی روح کو بے چین کر دے گا۔ بوڑھے مسعود اس بات کو جانتے تھے اور اسی لیے وہ باہر چلے بھی گئے تھے۔

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ حامد سلمیٰ کو بالکل پسند نہیں ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے بیزار ہے۔ ابھی کل ہی تو اس نے باپ کے سامنے بیٹی پر اتنا بڑا الزام لگایا تھا۔ لیکن سلمیٰ ابھی اتنی نہیں گر گئی ہے کہ گھر پر آئے ہوئے یہاں کی کس طرح عزت کرنی چاہیئے یہ بھی نہ سمجھ سکے۔ سامنے میز پر چائے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ سلمیٰ نے پوچھا۔ آپ کو چائے دوں؟

حامد نے چونک کر کہا۔ مسعود چچا بھی آ جاتے تو اچھا تھا۔

کیا ضرورت ہے؟ کہہ کر سلمیٰ میز کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور دو پیالی چائے بنا کر ایک حامد کو دی اور ایک خود پینے لگی۔

کل اسی چائے پر سلمیٰ کے غصے کی ابتدا ہوئی تھی۔ سلمیٰ کے مہمان جمال سے اس کے والد نے چائے کے لیے پوچھا تک نہیں تھا تب سلمیٰ کو مجبوراً خود چائے بنا کر جمال کو دینی پڑی تھی اور اس بات نے بوڑھے باپ کو آگ بگولا بنا دیا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے باپ کے مہمان کو چائے پلا رہی ہے۔ اس مہمان کو جس سے اسے ذرا بھی رغبت نہیں ہے؛ جسے وہ اپنے دل میں تلاش کرنے کے بعد بھی نہیں پاتی۔

پھر جب بوڑھے مسعود کمرے میں داخل ہوئے تو انھوں نے دونوں کو بات چیت کرتے ہوئے پایا اور یہ دیکھ کر ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دن پر دن بیتتے چلے گئے۔ بوڑھے باپ شادی کے انتظام میں مصروف رہے اور سلمیٰ کو کسی نے اپنے کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ پچھلے چند روز سے اسے بخار آ رہا ہے لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ باپ نے بیٹی کی اس تبدیلی کو گہری نظروں سے دیکھا ہے

لیکن وہ مطمئن ہیں، سمجھتے ہیں کہ شادی ہونے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسی لیے انھوں نے شادی میں جلدی بھی کی ہے اور آیندہ جمعہ کے متبرک دن پر رسم ادا بھی کر دی جائے گی۔

بیچ کے پانچ چھ دن باپ اور بیٹی دونوں نے جس طرح کاٹے ہیں اس کو عالم الغیب کے سوا کوئی جان نہیں سکا ہے لیکن شادی سے ایک دن پہلے جب باپ نے بیٹی کو دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بال آج بھی الجھے ہوئے ہیں، چہرہ پیلا پڑ گیا ہے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ وہ دل جو ہر وقت مسکرایا کرتا تھا آج رو رہا تھا، چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"ابا میاں، انسان کی زندگی جب دوسرے کے اختیار میں دے دی جاتی ہے تو یہی ہوتا ہے۔ میں آپ کے اختیار میں تھی، آپ میرے جسم پر حکومت کر سکتے تھے لیکن روح تو میری اپنی تھی اور وہ تو آپ کے اختیار میں نہیں تھی۔ میں نے اپنی روح کو بچا لیا ہے۔ یہ مردہ جسم رہ گیا ہے اس کو جس کے بھی حوالے کر دیجئے، کر دیجئے آپ مختار ہیں"

بوڑھے مسعود نے آج پہلے دن اپنی غلطی محسوس کی۔ اور ان کی آنکھوں سے دو بوند آنسو نکل کر سفید داڑھی میں غائب ہو گئے۔

دوسرے دن نکاح تھا اور ہو بھی گیا لیکن سلمیٰ کو نکاح کے دن جس نے بھی دیکھا اس نے کوئی زیادہ خوشی محسوس نہیں کی بلکہ ایک طرح کی مایوسی ہی سے دوچار ہونا پڑا۔ عورتوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیں کسی نے کہا کہ لڑکی دورے کی مریض ہے اور کسی نے معمولی جاڑا بخار تجویز کیا لیکن آخر میں سب اس بات پر متفق ہو گئیں کہ لڑکی کو دق ہے۔

شام کو رخصتی کے وقت بوڑھے باپ نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ آج پہلے دن ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی اور انھوں نے زبان سے کہا بھی کہ بیٹی اچھا برا جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا، اب اس بوڑھے باپ کی عزت تمھارے ہی ہاتھ ہے۔

سلمیٰ نے ایک سسکی کے ساتھ باپ کو سلام کیا اور عورتیں اس کو کار پر سوار کرنے کے لیے لیکر چلی گئیں۔

سلمیٰ سوار ہو کر چلی گئی لیکن شاید سوار ہوتے وقت اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو کسی نے بھی نہیں دیکھا اور نہ کوئی یہ دیکھ سکا کہ گھونگھٹ کی آڑ میں جس کی آنکھیں تھیں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے اس طرح بھر گئی تھیں کہ ان میں روشنی کا نام تک نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے نہیں دیکھا کہ وہ کہاں بٹھا دی گئی ہے اور کس راستے پر اس کی سواری اڑی چلی جا رہی تھی۔ (حریم ۱۹۵۴ء سے)

عفّت مُوہانی

پھر آپ کی دلچسپی کے لئے اپنا نیا ناول

تقدیر

پیش کر رہی ہیں

ناول کا مبحث اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ لکھنا فضول ہے کہ عفت کا ہر ناول ایک نیا پلاٹ پیش کرتا ہے اور دلچسپ سبق آموز اور پاکیزہ بھی ہوتا ہے۔

قیمت مجلد — بارہ روپیہ

عفّت مُوہانی کے دوسرے ناول

محبت نام ہے غم کا ـ لے نام کبھی آہستہ ـ پیماں ـ سزا
8/- 12/- 8/- 7/-

سویرے ـ آہوں کے گیت ـ سچّے بندھن ـ داغ دل ـ صنم
10/- 7/50 6/- 10/- 9/50

درد و درماں ـ راز ـ شرارت ـ زود پشیماں ـ ہمسفر
12/- 10/- 7/- 8/50 7/-

اک چراغ دور کا ـ بھنور ـ ستم کے سہارے ـ وفا کا دکھ
6/50 6/50 10/- 10/-

درد کا رشتہ ـ صہبا ـ شام تمنا
9/- 14/- 14/-

قسطوار ناول

پھول کا دل

اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ——— قیمت:۔ 7/50

جن بہنوں نے اسے مکمل نہ پڑھا ہو اب طلب فرمالیں۔

خانم کی ڈائری

وہ خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے۔ مگر اس کی شادی کہیں نہیں ہوئی ہے۔ اس کی طرح کتنی ہی قبول صورت، تعلیم یافتہ، صوم و صلوٰۃ کی پابند، خاندانی لڑکیاں ہیں جو شادی کے لیے موزوں عمر ہونے کے باوجود ابھی تک کنواری بیٹھی ہوئی ہیں۔ گاہے گاہے ان کے لیے اخباروں میں ضرورت رشتہ کے اشتہار بھی چھپتے ہیں اس کے باوجود ان کی شادیاں نہیں ہو پاتیں روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اشتہاروں کی اشاعت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لڑکیاں شادی کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتیں۔ بظاہر ممکن طور پر اپنے والدین کی فکرمند نظروں سے بچنا چاہتی ہیں۔ تجاہل عارفانہ سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بیشتر لڑکیوں کی شادی نہ ہونے کی وجہ بھاری جہیز ہے جو لڑکے والے مانگتے ہیں مان لیا کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے اپنے بیٹے کی شادی کی تو ایسا مطالبہ نہیں کیا اور نہ آئندہ کوئی ایسا ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر آپ کی تعداد ہزار میں ایک ہے۔ دنیا میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں لڑکی والوں پر جہیز کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔ لڑکی کی شادی کی تیاری کے لیے لڑکا خود رقم مہیا کرتا ہے۔ لیکن ان کی تعداد ایسے لوگوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ جن کی جہیز کی رسم نے جینا دوبھر کر دیا ہے۔ جہیز کے لین دین کی وجہ سے لڑکیاں ماں باپ پر بوجھ بن گئی ہیں۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے لوگ کثرت اولاد سے زیر بار ہیں۔ کسی نے اگر پہلے ہی دن سے بیٹیوں کے جہیز کے لیے بچت شروع کی تو ضروریات زندگی سے نپٹنے کے بعد بوقت ضرورت بہت ہی کم روپیہ جمع ہو سکے گا اس لیے ایک ہی لڑکی کے لیے جہیز مہیا ہو سکے۔ باقی تین چار لڑکیوں کا جہیز اکٹھا کرنے کے لیے خضر کی عمر چاہیے۔ یوں جہیز کی بری رسم کی وجہ سے لڑکیاں ماں باپ کے گھر تمام عمر اپنے بالوں کی سفیدی چھپانے میں گذار دیتی ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں عام طور پر لڑکیوں کی قسمت ہی خراب ہوتی ہے۔ ان کی پیدائش پر ہی والدین کے سر جھک جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی یا تو شادیاں نہیں ہو پاتیں یا پھر وہ اغوا کر لی جاتی ہیں۔ گذشتہ اطلاعات کے مطابق سولہ دنوں میں اٹھارہ لڑکیاں اغوا کر لی گئیں اور اگر لڑکیوں کے اغوا ہونے کی رفتار یہی رہی تو جلد والدین اپنی بچیوں کی شادی کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جائیں گے کیونکہ لڑکیوں کے اغوا ہونے کی رفتار تو بہت تیز ہے۔ مگر ان کی برآمدگی کی اطلاعات شاذ و نادر ہی شائع ہوتی ہے۔ یوں تو اغوا کنندہ کے لیے پھانسی کی سزا مقرر ہے۔ مگر مجرم کو سر راہ کس نے پھانسی پاتے دیکھا ہے جو اس کے دل میں خوف پیدا ہو گا اتفاق سے جس روز پھانسی کی سزا کے متعلق خبر چھپی ہے اغوا کی وارداتیں اس روز سے کچھ زیادہ ہونے لگی ہیں کچھ لوگ شاید اس طریقہ سے والدین کی مشکلات میں کمی کرنا چاہتے ہیں لیکن کب تک؟ لڑکیوں کی کھیپ جب سر پر پڑے گی تو گھبرا اٹھیں گے اور چھپتے پھریں گے۔ یا پھر لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے اشتہارات چھاپیں گے۔

برازیل کی ایک اسٹیٹ میں تین بہنیں تبدیلی جنس کا آپریشن کرا رہی ہیں۔ تینوں کی عمریں اٹھائیس سے اڑتالیس سال کے درمیان ہیں وہ پیشہ کے اعتبار سے کسان ہیں اور انھوں نے اپنے لیے مردانے نام کا انتخاب بھی کر لیا ہے۔ اس طریقہ کے رواج سے لڑکیوں کی تعداد میں کمی واقع ہوگی اور ان کی شادی کا مسئلہ بھی از خود حل ہو جائے گا جہاں لڑکی کو پتہ چلا کہ جہیز کی وجہ سے وہ ماں باپ کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ فوراً ہی ہسپتال پہنچ گئی اور چند دنوں بعد مونچھیں بڑھائے، حجامت بنائے تانگہ چلانے لگے یا جھاڑو اٹھائے۔ گلی گلی آوازے کسنے لگے۔ پڑھی لکھی ہے تو کسی دفتر میں نوکری کر لے۔ کھانا پکانا اور کپڑے سینا بھی کام آ سکتا ہے کہیں خانساماں بن جائے یا پھر اپنا درزی خانہ کھول لے۔ ایسی صورت میں اگر شادی نہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کوئی یہ تو نہیں کہے گا کہ جوان لڑکی ماں باپ کے گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو گئی۔

ان عورتوں کی بھی مشکل آسان ہو جائے گی جن کے ہاں لڑکے کی بجائے ہر سال لڑکی پیدا ہوتی ہے ایسی عورتیں کم از کم سسرال والوں کی نظر میں مورد عتاب تو نہ ٹھہریں گی۔ لیکن کاش ہمارے ہاں ایسا ہونے لگے۔ (اخبار خواتین)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو اور مختصر سے مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو۔ نمبر خریداری کا لکھنا اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کرنا ضروری ہے۔ خبر کی اشاعت میں غلطی ہو جانے کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا، البتہ اطلاع ملنے پر اسے دوبارہ شائع کیا جاسکتا ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

قمر جہاں خانم انور حال (راجوری) "میرے ماموں اور ممانی فہمیدہ عنایت ناخدا کے گلشن حیات میں پہلی بار کیم دسمبر ۷۶ء بروز بدھ بوقت ۵ بجے صبح ایک پھول کھلا۔ دعا ہے کہ وہ ماموں اور ممانی کے زیر سایہ اپنی مہک پھیلاتا رہے۔

• شاہینہ تبسم اڈگانوی "میری خالہ زاد بہن ثریا جبیں اور نوشے بھائی مقصود احمد صاحب کے گلشن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۳ دسمبر ۷۶ء بوقت ۸ بجے صبح ایک پھول کھلا۔ نام یوسف سالک قرار پایا۔ اللہ پاک اسے والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

• صفیہ ابراہیم "دولائے ۔۔۔۔ میرے بھائی محمد امین نقی لائے اور بھابی رشیدہ خاتون کے گلشن حیات میں ۸ اکتوبر ۷۶ء بوقت شام اللہ پاک نے ایک چاند سی بچی عطا فرمائی۔ نام مبشر قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب کرے۔

• گوہر شیخپوری صاحب کو اللہ پاک نے ۸ دسمبر ۷۶ء بروز سنیچر بوقت ۳ بجے دن ۔ ۔ ۔ ۔ ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام صادق اختر قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔
نسیم انہونوی

• نجم پروین صدیقی (کانپور) میری بڑی بہن مسرت جہاں اور بہنوئی محمد محمود صاحب سی۔ آر۔ پی کے گلشن حیات میں بمقام پور خاص، الہ آباد، بتاریخ ۱۰ جنوری ۷۷ء بروز دوشنبہ بوقت ۷ بجے صبح ایک فرزند پیدا ہوا۔ نام عیاض محمود رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر خضر اور اقبال سکندری عطا فرمائے۔

• فریدہ ۔ حسن نیازی (کلکتہ) "میرے بڑے بھائی عزیز حسن نیازی صاحب و بھابی نصرت النساء صاحبہ کے چمن حیات میں مدت کی تمنا کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک پیاری سی کلی کھلائی۔ نام سعدیہ عزیز قرار پایا، دعا ہے کہ اس کلی سے بھابی کا چمن مہکتا رہے اور وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• مس معصومہ قمر صاحب (نمبر خریداری نہیں لکھا ٹکٹ صرف ۲۵ پیسے کے ملے)

• مسرت افروز (اعظم گڈھ) "میری پیاری آپی عشرت افروز اور دولہا بھائی ارشد مصطفیٰ صاحب کو مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ اللہ پاک نے انھیں ۳ دسمبر ۷۶ء بروز جمعہ پہلی بار ایک دختر نیک اختر عطا فرمائی۔ نام عائشہ مصطفیٰ قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

• عرفانہ نسیم صاحبہ (نمبر خریداری نہیں لکھا)

پیغامات نشاط

• مسز امینہ عزیز صاحب (نمبر خریداری نہیں لکھا)

• ایم الطاف صاحب میسوری (خبر میں آپ کی بہن کا نام نہیں پڑھا گیا۔ ٹکٹ بھی نہیں ملے۔

• میمونہ بائی (بنگلور) میرے عزیز دیور محمد عمر کا نکاح کلثوم بائی عرف نیلوفر کے ساتھ ۱۰ اکتوبر ۷۶ء بروز اتوار بمقام بنگلور بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• مسز نجمہ اقبال سیٹھ حیدرآبادی "میرے چھوٹے دیور محمد سعود جعفر حیدرآبادی کی شادی خانہ آبادی، شاہینہ بیگم (بلگام) کے ساتھ ۹ دسمبر ۷۶ء بروز جمعہ بوقت ۹ بجے شب بخیر و خوبی انجام پائی اللہ پاک سے دعا ہے کہ یہ جوڑی اپنی ازدواجی زندگی میں ہمیشہ شاد و خرم رہے۔

• اے۔ آر احمد سیٹھ کے سب سے چھوٹے بھائی اے آر سعود سیٹھ کی شادی شاہینہ بیگم دختر جناب داؤد عبدالستار سیٹھ۔ بلگام، کے ساتھ ۹ دسمبر ۷۶ء بروز جمعرات بوقت ۸ بجے شام بمقام بلگام، بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• یوسف ایم بھورا کے فرزند سلیم سلمہ کی شادی احمد طیبہ صاحبہ

کی دختر نیک اختر نجمہ سلمہا کے ساتھ ۸ر دسمبر ۷۶ء بروز بدھ بوقت شام بمقام تلاکلم مدراس بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

نسیم انہونوی

انتقال پر ملال کی خبریں

• کوثر بانو (بھوپال) :- افسوس میرے والد محترم حاجی عزت محمد خاں صاحب پرستار حریم ۱۵ر جنوری ۷۷ء کی رات میں ۱۱ بجے انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ نیک سیرت، ملنسار اور بے ریا شخصیت تھی ان کی۔ حریم کا نہ صرف خود مطالعہ کرتے بلکہ دوسروں کو بھی اس کے پڑھنے کی تاکید کرتے۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال تھی، (ایسے حریمی بھائی کی دائمی جدائی، مرحوم کے اعزہ ہی کے لئے نہیں میرے لئے بھی باعث افسوس ہے۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

نسیم انہونوی

• کہکشاں جمال۔ آصفہ پروین (آنولہ) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے شفیق نانا محمد یوسف صاحب ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۶ء بروز اتوار بوقت ۴ بجے صبح اس دار فانی سے رحلت فرما کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اللہ تعالےٰ مرحوم کو غریق رحمت فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

• پروین جمال (گورکھپور) بیحد رنج و افسوس کے ساتھ لکھتی ہوں کہ میری شفیق خالہ صاحبہ (اہلیہ ڈاکٹر انوار احمد صاحب) ۳۱ر دسمبر بروز جمعہ رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ نیک، ملنسار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ حریم کا مطالعہ پابندی سے کرتی تھیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین (حریمی بہن کی موت میرے لئے بھی ایک حادثہ ہوتی ہے۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے۔ نسیم انہونوی)

• مس شاہدہ سب (رحیم آباد) افسوس کے ساتھ عرض ہے کہ میرے پھوپھی زاد بھائی صابر افتخار صرف ۴۳ سال کی عمر میں یکم نومبر ۷۶ء بروز دوشنبہ جیپ حادثہ میں جائے حادثہ پر ہی انتقال کر گئے۔ مرحوم پی ڈبلو ڈی کے ایگزیکیوٹیو انجینیر تھے۔ بڑے ہی نیک و پارسا تھے۔ اپنی یادگار بیوہ کے ساتھ ہی چار لڑکیاں اور تین لڑکے چھوڑے ہیں۔ (حریمی بہنیں) مرحوم کے حق میں دعائے خیر کریں (حادثاتی موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ واقعہ بڑا ہی المناک ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ ماشاء اللہ سات بچے ہیں۔ اللہ پاک اپنا کرم کرے اور ان کی پرورش پرداخت میں مدد فرمائے۔

نسیم انہونوی

• رفعت صفی (مظفرپور) افسوس صد افسوس کہ اباجان کے چچازاد بھائی اور دوست چچا چودھری محمد عتیق اللہ کلیمی صاحب عرف مشر بابو۔ صرف دو ماہ کی مختصر علالت کے بعد ۱۰ر جنوری ۷۷ء کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اس دنیائے فانی سے سدھار گئے۔ نہایت متقی پرہیزگار اور پابند صوم و صلوٰۃ ہی نہیں تہجد گذار اور سنت رسول اللہ کے پیرو تھے۔ اللہ بخشے اور بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• خورشید ڈولارے صاحب کلیان سے تحریر فرماتے ہیں "افسوس ۸ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو کلیان کے میونسپل کونسلر مسعود فرید صاحب کے گھر میں اسٹوو پھٹ جانے سے ان کی سالی شیریں صاحبہ موقعہ ہی پر ہلاک ہو گئیں، بیگم صفیہ صاحبہ جوان بیٹی تحسین اور بچی فاطمہ صاحبہ زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہوئیں، لیکن افسوس فاطمہ صاحبہ اس روز، تحسین ۱۲ر دسمبر کو اور صفیہ صاحبہ ۲۳ر دسمبر کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

(یہ خبر اتنی دردناک ہے کہ پڑھ کر ہی دل بھر آیا۔ ایسے دردناک حادثات شاذ و نادر ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسعود فرید صاحب سے کن الفاظ میں تعزیت کی جائے اور کیسے صبر کی تلقین۔

(نسیم انہونوی)

• رضیہ سلطانہ (جنجیرہ مُرود) "مجھے یہ لکھتے ہوئے بڑا دکھ ہو رہا ہے کہ میری چچی بیگم عبدالعزیز عیدروس کا بمقام کرجت ۱۶ر جنوری بروز اتوار کو انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ بڑی ملنسار اور بہت بارعب خاتون تھیں۔ بچوں میں بچہ اور بڑوں میں بڑی یہ ان کی خاص عادت تھی۔ حریم کے ذریعے اپنے سب بھائی بہنوں اور خاص کر عابد بھائی کو پرسہ دیتی ہوں۔

• شاکرہ بیگم نظیری۔ راجپوری "میں نہایت دکھ و غم کے ساتھ یہ لکھ رہی ہوں کہ میرے نانا سید زین العابدین قادری صاحب کا ۱۰ر جنوری بروز منگل بوقت صبح انتقال ہو گیا۔ مرحوم تقریباً ایک سال سے بیمار تھے۔ اللہ تعالےٰ ان کی روح کو جنت فردوس میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے اور میری نانی جان، امّی اور دونوں ماموں صاحبان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!!

افسوس صد افسوس کہ حضرت گنج کے مشہور تاجر نادلیٹر نورالدین صاحب کا ۱۷ر جنوری ۷۷ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم نہایت نیک نفس اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور ان کی بیوی اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر جاری مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں اور سنجیدہ ہو، شعر کے ساتھ نمبر خریداری حریم لکھنا ضروری ہے۔ مارچ کے لئے عنوان ہے "حبیب" اور اپریل کے لئے "صورت" ـــــــ ادارہ

زندگی نکلی مسلسل امتحاں در امتحاں
زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھے تھے ہم

مرسلہ:۔ مس نسیمہ بیگم بھولی (کھا گپور)

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مرسلہ:۔ مس روبینہ یاسمین شمسی (آگرہ)

وہ دنیا تھی جہاں تم روک دیتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

مرسلہ:۔ غوث الدین فاریسٹ نرسا لوری وعادہ نسرین ثانی (کامٹی)

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

مرسلہ:۔ ریحانہ پروین تہامی ثروت (رائے سین)

آفتاب سفیر (جن بٹن)

محبت نے کیا بدنام و رسوا اس قدر مجھکو
کہ ہر محفل میں میری داستاں دہرائی جاتی ہے

مرسلہ:۔ مسز نکہت منیر (لکھنؤ)

مختصر یہ ہے ہماری داستان زندگی
اک سکون دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کیئے

مرسلہ:۔ مکرم النساء لاری (بجرولی)

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

مرسلہ:۔ انجم فرح فردوس شاہین (آگرہ)

مرتب کر رہا ہوں آنسوؤں کو اور آہوں کو
کہ میری زندگی کی داستاں تیار ہو جائے

مرسلہ:۔ قمر نگار جلیلی (آمبور)

سننے کو جب نہ کوئی ملا داستان غم
آئینہ رکھ کے سامنے خود کو سنا لیا

مرسلہ:۔ احمدی جمالی (آمبور)

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (جمشید پور)

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

مرسلہ:۔ مس فاطمہ زہرہ (بہار شریف) و رشیدہ تسنیم لکھنوی

ابھی سے کیوں چھلک آئے تمہاری آنکھ میں آنسو
ابھی چھیڑی کہاں ہے داستانِ زندگی میں نے

مرسلہ:۔ رفیعہ یاسمین۔ ذکیہ اشفاق (بیلا۔ سیتامڑھی)

آج بھی ہے لکھی مری سرخ حروف میں مجاز
دفتر شہریار میں مرے جنوں کی داستاں

مرسلہ:۔ انیس قادر (مدراس)

سمن گھنٹوں کے لیے کا ہلکا ٹفن " ہاجرہ نے کہا۔ "اب کھائے گی اپنے ساتھ۔ ایسے مزیدار کوفتے میں اپنی بچی کے لیے لائی ہوں " فرحت بولیں " لو۔ ایک چکھو۔"

ترنم نے دل ہی دل میں بیزار ہوتے ہوئے مگر بظاہر ہنس کر کہا: "اچھا آنٹی۔ منہ ہاتھ دھولوں۔"

صحن سے لازم لڑکے نے ہانک لگائی: "اے لو۔ وہ نیلے پھاٹک والی بی بی بھی آگئیں۔" ایک گرمی سی فرحت کے سینے میں اٹھی۔ انھوں نے کبھی سچے دل سے بیگم یزدانی کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ انھیں تو ہاجرہ بیگم کا بے پناہ خلوص بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے مراسم بہت پرانے اور گہرے تھے۔ لہٰذا کچھ نکتہ چینی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ہاجرہ بیگم نے صحن ہی سے ان کا استقبال کیا اور ان کی گردن میں اپنی بانہہ حمائل کر دی۔ پھر شکایت کے لہجے میں بولیں: "سچ کہتی ہوں۔ اس وقت کوئی دوسری دعا مانگتی تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ فرحت آگئی ہیں۔ تم بھی ہو تیں تو کیا اچھا لگتا!"

"آج میں بھی قائل ہو گئی کہ دل سے راہ کیونکر ہوتی ہے۔" فرحت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہمارا جذبہ جھوٹا نہیں۔" بیگم یزدانی بولیں۔ "میں تو سویرے سے آنا چاہتی تھی لیکن رات سے ابا میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ صبح سے تاپ کو حرارت ہو رہی ہے۔"

لازم دالان میں دسترخوان بچھا رہے تھے۔ ہاجرہ نے ان کا ہاتھ تھام کر دسترخوان پر بٹھا دیا۔

"یقین کرو۔ میں ابھی ابھی کھا کے اور چائے وائے پی کے آئی ہوں۔" انھوں نے

یہاں انگوٹے کرنے آئے ہو۔ ہنسو بولو۔ اس عمر میں بزرگوں کی سی خاموشی اچھی نہیں لگتی!"

"نہیں تو۔ ڈیڈی۔ میں سوچ رہا تھا۔ بالا حصار پر آنٹی اور امی چڑھ بھی سکیں گی یا نہیں۔" وہ ہنستا ہوا بولا۔

"ان کے منہ سے آپ کو ڈیڈی کہنا کتنا اچھا لگتا ہے۔" فرحت نے گویا نظروں نظروں سے تابش کو پیار کرتے ہوئے کہا: "بے چارہ بدنصیب بچہ۔ اپنے باپ کو تو پکار ہی نہ سکا۔" اچانک شمسہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ساجد صاحب کو ان کا یہ کہنا بہت ناگوار گزرا اور تابش تیوریوں سکڑ گیا جیسے اسے فرحت نے تھپڑ مار دیا ہو۔ ہاجرہ نے ان سب کے چہروں کے تغیر بھانپ لیے۔ تابش کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولیں: "کیا ہوا۔ یہ ہمارے بچے سے کیا کہہ بیٹھیں۔ فرحت کو تو موقع بے موقع بات کرنے کا کبھی سلیقہ نہیں۔"

فرحت نے جان بوجھ کر گلوگیر لہجے میں کہا: "میرا مطلب تم نے غلط سمجھا ہے۔"

"اچھا خیر۔" ساجد صاحب نے ناخوشگوار لہجے میں بات کاٹ دی: "تم شروع کرو تابش۔"

"اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔" تابش نے کھانس کر گلا صاف کیا۔

"اچھا تو ہمارے اشعار پر گرہ لگاؤ۔" ساجد صاحب نے ماحول کی تلخی ختم کرنے کے لیے موضوع تبدیل کر دیا۔

"کیا امی اور آنٹی بھی اس مقابلے میں شریک ہیں؟" ترنم نے پوچھا۔

"ہاں اور کیا۔" ساجد صاحب بولے۔ "دیکھنا چاہتا ہوں۔ چولھا ہانڈی کرتے کرتے بالکل ہی کند ہو چکی ہیں کہ کچھ ذوقِ لطافت بھی باقی رہا ہے۔"

"آنٹی فرحت اور ممی کو فلم کے تمام ہیرو، ہیروئنوں کے نام اور شجرے زبانی یاد ہیں۔" ترنم کھلکھلا کر ہنس دی۔

"چپ رہ۔ شیطان کہیں کی۔" فرحت نے اسے للکارا۔ (باقی آئندہ)

تھا۔ چلو ہمارے ساتھ ایک آدھ نوالہ ادھر بھی۔" فرحت نے اصرار کیا۔ "پھر ہم سب مل کر چلیں گے تابش اور ابا میاں کو دیکھنے۔"

اتنے میں ترنم بھی لباس بدل کر آگئی۔ بیگم یزدانی کی نظریں اس پر جم گئیں۔ اس کا لباس خاصہ ترقی پسند تھا۔ بڑے بڑے پائینچوں کا پاجامہ، چھوٹا سا کرتا، گلے میں لپٹا ہوا دوپٹہ۔ لیکن وہ جامہ زیب اتنی تھی کہ اس پر یہ سب بہت پیارا لگ رہا تھا۔ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

انھوں نے سوچا۔ ان کے تابش کے لیے وہ کتنی اچھی رہے گی۔

"کیا ہوا ہے ابا میاں کو۔" فرحت پوچھ رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں۔ دیر تک بیگم یزدانی ترنم کو تنقیدی یا تعریفی نظروں سے دیکھیں۔

"بڑھاپے کے عوارض ہیں۔" انھوں نے اپنے تصورات سے چونک کر کہا۔ "کچھ نہ کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔ دوا دارو کرتے ہیں۔ انگلش دواؤں سے پرہیز ہے۔"

"تو یہ صورت کیسے ہوئی؟" ساجدہ نے پوچھا۔ ملازم نے کھانا لگا دیا تھا۔ مجبوراً بیگم یزدانی کو بھی ساتھ بیٹھنا پڑا۔

"وہ تو اپنی زندگی ہی سے بیزار ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ان کی زندگی تو بہت ضروری ہے۔" فرحت نے دلداری کے پیرائے میں ان کے دل میں نشتر سا اتار دیا۔ "ان کی پنشن اور مکان سے تمہارا کتنا سہارا ہے۔"

"توبہ کرو فرحت۔" ساجدہ نے دیکھ لیا کہ بیگم یزدانی کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ "ابا میاں ان کے باپ ہیں۔ یوں بھی ان کی زندگی قیمتی ہے۔ مکان اور وظیفہ نہ بھی ہوتے تو کیا۔"

"فرحت بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" بیگم یزدانی نے کچھ سوچتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میرا کون سا سہارا ہے۔ ابا میاں کا مکان نہ ہوتا تو بڑی مشکلوں کا سامنا

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہ غزل تابش نے متعدد مرتبہ پڑھی تھی۔ لیکن اس وقت ماحول اور خاص قسم کے تاثر کی وجہ سے اس غزل نے اور پُر درد آواز نے اس کے دل میں آنسوؤں کے سمندر موجزن کر دیے۔ اس نے سب کی طرف سے چہرہ پھیر لیا اور آنسو پینے کی کوشش میں جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا۔ غزل ختم ہوئی بے ساختہ ساجدہ صاحبہ کی زبان سے داد نکلی۔

"غالب ایک شاعر تھے۔ ان سے پہلے کوئی نہ ان کے بعد کوئی ہے۔ اچھا بھئی۔ موسم بہت اثرانگیز ہے۔ ہمیں اچھے اچھے اشعار سناؤ۔"

"میں سائنس پڑھتا ہوں۔ مجھے تو ایک شعر بھی یاد نہیں۔" خرم نے کہا۔

"میاں اشعار، شعر کی جمع ہے۔" ساجدہ صاحبہ ہنسیں۔ "تم اپنا فقرہ صحیح کر لو۔"

وہ جھینپ کر ہنسا تو گیا لیکن۔ "آج کل مجھے کورس کی کتابیں پڑھنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔" "یہ جو ادھر ادھر دوستوں کے ساتھ ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے بجائے تم کچھ پانی میں وقت خراب کرتے ہو۔ اسی میں اساتذہ کی چیزیں پڑھا کرو۔" ساجدہ نے اچانک کہا "تابش نہیں کہتا تھا کہ وہ اس کی بیوی بن کر تنگ میں گی۔" دفعتاً وہ کچھ سوچ کر اندر پھر گیا۔

"تابش۔ میاں تم سناؤ۔ کوئی شعر۔" ساجدہ صاحبہ نے فرمائش کی۔ "بھئی یہ کیا بات

خرم نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ تم لیکچر دو۔" ثمسہ نے بیٹے کو جھڑک دیا۔

"او بھائی۔ یہ کس قسم کی مہمل باتیں شروع ہو گئیں۔" ساجد صاحب نے جلدی سے دخل دیا: "اگر تابش نے سرسری طور پر ایک بات کہہ دی ہے تو کیا ضروری ہے کہ اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ درحقیقت وہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ انسان کو ہمیشہ اپنے اسلاف کی داستانوں سے عبرت ہی حاصل کرنی چاہیے۔ انسان فانی ہے۔ لاکھ وہ زمین پر سینہ تان کر چلے لیکن اسے ہر وقت زمین کے نیچے کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔"

"ساجد بھائی آپ بھی ویسی ہی باتیں کرنے لگے" ثمسہ نے بات ختم کر دی۔ "آیئے میٹھے اگر کہیئے تو میں کافی بنا دوں۔"

"کافی تو پی کے آئے ہیں۔" ساجد صاحب نے کہا۔ "ابھی تک معظم بھائی کا پتہ نہیں۔" اور دری پر نیم دراز ہو گئے۔

"خدا جانے آئیں گے کہ نہیں۔ کہہ رہے تھے کہ کسی افسر سے ملنے کا وقت دے رکھا ہے" فرحت نے کہا۔

"کیا خیال ہے تمہارا تیس ہزار میں یہ گاڑی مہنگی تو نہیں پڑی۔" ساجد صاحب بولے۔

"میں تو کہتی ہوں، بہت اچھی ہے۔" فرحت نے جواب کی ذمہ داری خود لے لی بے انتہا خوش ہو کر بولیں۔ "اللہ مبارک کرے۔ ہمیشہ آپا کا خالی گیراج دیکھ دیکھ کر میں دعا مانگا کرتی تھی یا اللہ اس میں خوبصورت گاڑی کھڑی ہوا کرے۔"

ساجد صاحب ہنسنے لگے!

ترنم نے دفعتہً ٹرانسسٹر آن کر دیا۔ مرزا غالب کی غزل تھی طلعت محمود اور ثریا کی آواز میں۔

ہوتا۔ ابھی تابش زیر تعلیم ہیں۔ انہیں ملازمت ملنے میں پتہ نہیں کتنی مدت ہے۔"

بڑھ بڑھ کر رکابی میں ہاتھ مارتے ہوئے فرحت نے کہا: "ملازمت ملی بھی کہاں ہے۔ پتہ نہیں کتنے ڈگری ہولڈر یونہی جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ ویسے خدا کرے کہ تابش کو ملازمت مل جائے۔ میرے دل پر بہت چوٹ لگتی ہے جب میں تمہیں دیکھتی ہوں۔ شوہر کا سہارا مدتیں ہوئیں۔ نہ رہا۔ نہ جانے کتنی مشکلیں اٹھا کر بچے کی پرورش ـــــ!"

"میں نے اس کی پرورش میں کوئی مشکل ہی برداشت نہیں کی۔" بیگم یزدانی نے ان کی بات ان سنی کی۔ "خدا کے فضل و کرم سے ان دنوں حالات بہت اچھے تھے۔ یہ تباہی تو اب آئی ہے۔ تابش کے چچا کے ہاتھوں آئی ہے۔ بھائی کی جائداد مقدمہ بازی میں لگا دی۔ وعدہ کیا تھا کہ واپس کر دیں گے مگر آدمی کہتا کچھ ہے کرتا کچھ اور ہے۔ خدا کی مرضی تھی کہ چچا بھی جوان ہی چل بسے۔"

"ابا میاں نے گھر تو شاید تابش کے نام کر دیا ہے۔" ہاجرہ نے موضوع بدل دیا۔

"ہاں۔ اسی کے کرائے سے تابش کی تعلیم ہو رہی ہے۔" بیگم یزدانی بولیں۔ وہ بہت نیک صاف گو اور بے ریا خاتون تھیں۔ کسی کے شر سے اس کی طینت کا اندازہ کرنا انہیں آتا نہیں تھا۔ یہ سوچے بغیر اپنے حالات سب سے کہہ دیتی تھیں کہ مخاطب ان کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔ اپنی سادگی کے ہاتھوں انہوں نے بہتیری جگہ دھوکے کھائے تھے۔ لیکن ہر مرتبہ خلوص دلی کی امید میں نیا دھوکا کھاتی تھیں۔ ہاجرہ نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان کے حالات کسی غیر کو معلوم ہوں۔ کھانا ختم کر کے سب واپس آ بیٹھے۔ ترنم اپنے گملوں کے درمیان کوئی کتاب لے کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے"۔ ہاجرہ نے کہا۔ "تابی یہاں نہیں آ رہا۔ کیا کسی سے لڑائی ہو گئی ہے میں نے پرسوں ترنم کو بھی بھیجا تھا۔ وہ اس کی بہت شاکی تھی۔"

مجھے نہیں معلوم۔ بچوں میں کیا کچھ باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ تابش اپنے نانا کی بیماری سے بھی پریشان ہے۔ میں جاؤں گی تو کہہ دوں گی۔ بیگم یزدانی بولیں۔

کچھ دیر بعد وہ واپسی کے لیے اٹھیں ان کے ساتھ فرحت اور ہاجرہ بھی ہولیں۔ بیگم یزدانی بہت خوش تھیں کہ ان کی دُکھ درد میں ہمدرد ہیں۔ وہ تنہائی اور اکیلے پن سے گھبراتی تھیں۔ ابھی تک تو فرحت نے بھی بہت زیادہ خلوص کا ثبوت دیا تھا۔ ان کے پاس پہروں بیٹھی رہتی تھیں۔ غمگساری کے بہانے ان کے سارے راز اور سارے حالات اچھی طرح جان لیے تھے۔

تابش اپنے نانا کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جسمانی طور پر اس جگہ بے شک تھا لیکن ذہنی طور پر نجانے کہاں۔ اسے آہٹوں کی بھی خبر نہیں لگی۔ بدستور بند مٹھی پر گال ٹیکے فرش کو تکتا رہا۔

جب ہاجرہ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ تب وہ یکبارگی سیدھا ہوا۔ ایک شرمندہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری پھر اس نے سلام کی خاطر ہاتھ اٹھا کر پیشانی پر رکھ لیا۔

"میں تم سے خفا ہوں۔" ہاجرہ نے کہا۔ "عمر بھر تم سے بات نہیں کروں گی۔" وہ ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "پہلے آپ تشریف تو رکھیے خالہ امی۔" "کچھ خفا ہو تم ہم سے۔" فرحت نے پوچھا۔

"کیوں ہو جاتا۔ خوامخواہ۔"

بیگم یزدانی کچن میں چائے بنانے چلی گئیں۔ دونوں دالان میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں سلطان صاحب بھی ان کی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کی مزاج پرسی کے بعد وہ اندر کمرے میں چلی آئیں تابش ساتھ تھا اور سوچ رہا تھا تم نہیں آئیں۔ شاید خفا ہی ہو گئی ہو۔

تو یہ کرو میاں۔" فرحت بھی یوں استقبال کو جھپٹیں جیسے غریب خانہ پر آقا کے قدم آئے ہوں۔

"آپ ہم سے پہلے کیسے پہونچ گئیں۔" ساجد صاحب اترتے ہوئے بولے۔

"نہ پہونچتی تو آپ کے تشریف رکھنے کے لیے ایسی پُرفضا جگہ پر فرش کون بچھاتا۔" فرحت نے کہا۔

"سچ۔ فرحت آنٹی۔ آپ نے بڑا اچھا مقام چنا ہے۔" ترنم گھوم گھوم کر دیکھتی ہوئی بولی۔ "اللہ۔ کیسے اونچے اونچے درخت ہیں۔ یہ سامنے والی دیوار تو دیوارِ چین معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہاں سناٹا کیوں ہے!"

"عبرت کی جگہ ہے۔" تابش نے کہا۔ "یہ کبھی ایک بادشاہ کا قلعہ ہے۔ اسی نے اپنا شہر حیدرآباد بسایا ہے۔ پہلے یہاں کیا کیا راگ رنگ نہ ہو چکے ہوں گے۔ دربار سجتا ہو گا۔ بادشاہ اپنے طلائی تخت پر بیٹھتا ہو گا۔ اس کے سامنے درباری صف باندھے سر جھکائے کھڑے رہتے ہوں گے۔ آج اس کا صرف نام باقی ہے۔ وہ قبر کی تاریکیوں میں گم ہو چکا!"

"یہ کون سا موقعہ ہے کہ اس قسم کی بھیانک باتیں کی جائیں۔" خرم نے ساجد صاحب کی خوشنودی میں کہا۔ "ہم یہاں تفریح کرنے آئے ہیں۔ وعظ و نصیحت کی باتوں کا یہ کون سا وقت ہے!"

"اے ہاں اور کیا۔" فرحت نے جھرجھری لے کر کہا۔ "تابش۔ بیٹے تم ہر وقت اس قدر اداس رہتے ہو۔ مایوسی کی باتیں کرتے رہتے ہو۔ آخر کیوں؟"

"یوں تو ہر مقام سے ایک داستان عبرت وابستہ ہے۔ انارکلی کا مقبرہ۔ نورجہاں کا مزار، رنگوں کی تفریح گاہیں۔ اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ہے۔ لوگ وہاں محض تفریح کرنے جاتے ہیں۔ یہ تو ضروری نہیں کہ ہر جگہ کی داستان گائیڈ کے انداز میں سنائی جائے

پہلے فرحت قلعہ پہونچیں۔ انھوں نے ایک اچھی سی جگہ منتخب کرکے دری بچھا دی تھی۔ اور بڑی رازداری سے خرم سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے ساتھی ادھر ادھر گھومنے لگے تھے۔

"مجھے تو ان کے سلوک سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ تم پر اسی تنوطی کو ترجیح دیتے ہیں:" وہ بولیں۔ "ایک آگ سی لگ گئی تھی میرے تن بدن میں جب تمھیں نظرانداز کرکے اس گینڈے نے تابش کو اپنے پہلو میں چپکا لیا:"

"ارے اسی کو کیا چپکا لیا۔ امی:" خرم نے دانت پیس کر کہا: "اس کی ماں کو بھی چپکا لیا۔ صورت حرام عورت کہیں کی۔ میرا بس چلے تو میں اس کے چہرے پر تیزاب چھونک دوں۔ آنکھیں اتنی اداس بنائے رکھتی ہے کہ خواہ مخواہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ڈائن ہے بالکل۔ اپنے شوہر کو تو ہضم کر گئی۔ میں سمجھتا ہوں اب اس پہاڑی بھینسے پر ڈورے ڈال رہی ہے:"

ساجد صاحب بہت بھاری ڈیل ڈول رکھتے تھے! انھیں ان بیٹے کی سرکار سے اکثر اسی قسم کے خطابات ملتے!

"ہم لوگ باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے!" بھڑکانے اور اشتعال دلانے والے لہجے میں فرحت نے کہا: "میں تو شروع ہی سے تم سے کہہ رہی تھی کہ ساجد صاحب کے دماغ میں گھسنے کی کوشش کرو ان کے آس پاس رہو۔ مگر تم اپنی اکڑ میں بات خراب کرتے ہو:"

"اگر میں ان کے دماغ میں گھسنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ جاؤ بیٹے اب تم اپنا کام کرو۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔"

"اے لو۔ ان کی سواری آگئی:" فرحت چونک کر بولیں۔

"امی پتہ نہ چلے آپ ان سے خفا ہیں:" خرم اٹھ کر گاڑی کی طرف لپکا۔

فرحت کی نظریں تابش کے سراپا پر دوڑ رہی تھی۔ پھر انھوں نے سوچا کتنی جلدی یہ بڑا ہوا ہے۔ اونچا پورا ڈیل ڈول۔ چوڑی چکلی پیٹھ۔ صورت شکل پر وقار۔ اونچی کلاس میں پڑھ رہا ہے کسی نامناسب مشغلے کے قریب نہیں پھٹکتا۔ نہ سینما بازی نہ سگریٹ۔ بھائی اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ کل کلاں کو کسی اچھے پوسٹ پر پہونچ گیا تو پھر بازی ان کے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ ترنم باپ کی دولت کی تنہا وارث ہو۔

انھوں نے سوچا کہ اسے نروس کرنا چاہیئے۔

بیگم یزدانی ٹرے میں چائے مع لوازمات لے آئی تھیں۔ چائے کے دوران میں فرحت نے بڑی خیر خواہی سے کہا: "پڑھنے والے بچوں کا حال بھی عجیب ہوتا ہے۔ جیسے سر پر تلوار لٹک رہی ہو۔ وہ مارا ماری کہ خدا کی پناہ۔ ادھر خرم کو بھی چین نہیں۔ یہاں تابش کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی ہیں۔ ہونٹ سوکھے جاتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دو۔ بعد کو چاہے جو بھی ہو۔ ایسا بھی کیا غضب ہے!"

بیگم یزدانی نے سوچا۔ بے چاری کتنی ہمدرد ہیں۔ مگر ہاجرہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ تابش نے بھی بھانپ لیا۔ وہ خیر خواہی کے پردے میں دل برا کر رہی ہیں۔ اس نے بڑے ادب سے کہا: "یہ تو جوئے شیر نکالنے کی بات ہے۔ آنٹی جب تک کوہ کنی نہ کی جائے محنت کا صلہ بھی نہیں ملتا!"

"کوہ کنی کرکے فرہاد نے کیا پایا تھا:" فرحت نے بکا سا قہقہہ لگایا۔ مگر جلد ہی سنبھل گئیں! "ہاں بھیا۔ تمھیں تو بہت محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن خرم کا خیال ہے کہ پڑھ لکھ کر جھک مارنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ وہ ذاتی بزنس کریں گے۔ کوئی جنرل اسٹور کھول لیا جائے۔ بس۔"

"اس کے لیے بھی تجربہ چاہیئے۔ آنٹی۔ مجھے دوکانداری کا کوئی تجربہ نہیں۔"

تابش سے وعدہ لے لیا کہ وہ ان کے یہاں ضرور آئے گا۔!

ان کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹے پھر دالان میں آبیٹھے۔ تابش کا منہ کھنچا ہوا تھا۔ "میری کچھ میں نہیں آتا۔ امی۔ یہ دونوں عورتیں آپ کا وقت خراب کرنے کے لیے کیوں آجاتی ہیں۔ انھیں کوئی فکر نہ ہو۔ نہ سہی۔ لیکن آپ کو تو فکریں گھیرے ہوئے ہیں۔ کیا ان کا یہ مطلب ہے آپ کی پریشانیوں کا آپ کو ہر وقت احساس دلایا کریں"۔

میں سمجھتی ہوں۔ تابی۔ تم کچھ چڑچڑے ہو کر رہ گئے ہو"۔ شمسہ بیگم نے خوشگوار لہجے میں کہا: "وہ دونوں بے چاریاں آخر ہم سے کچھ ہمدردی ہی کرتی ہیں۔ ہم سے انھیں کیا لینا دینا ہے۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ ہمیشہ تنہائی میرا مقدر رہے۔ کوئی مجھ سے ملنے والا نہ رہے۔ دکھ درد میں کوئی ساتھ نہ دے۔!"

"وہ لوگ دکھ درد میں ساتھ دیتے ہیں یا آپ کے دکھ درد بڑھاتے ہیں۔ ایک محترمہ ہیں وہ اپنی امارت کے قصیدے پڑھتی ہیں۔ دوسری اپنی اولاد کے اونچے پروگرام آپ کے سامنے رکھ کے آپ کی محرومیاں واضح کرتی ہیں۔ کیا یہ ساتھ دینا ہے؟۔ آپ اسے اچھا سمجھتی ہیں۔"

"ہاجرہ ہی کی دوستی کی وجہ سے ان کے میاں نے وعدہ کیا ہے وہ تمھاری نوکری ۔"

"مجھے نہیں چاہیئے ان کا رحم و کرم"۔ تابش نے تیز لہجے میں جواب دیا: "میں جو کچھ کروں گا اپنے زور بازو سے کروں گا۔ آپ اپنی تباہ حالی کا رونا ان سے کیوں روتی ہیں۔ کیا آپ کو یہ پسند ہے کہ لوگ آپ کو مفلس پریشان حال اور محتاج سمجھیں۔ آپ کو ان کی مدد گوارہ ہے امی۔ کیا آپ ہمیشہ ہی سے ایسی ہیں!"

"تمھارا کیا مطلب ہے۔ نہ ملوں کسی سے۔ کیا اسی لیے تم نے سب سے ملنا چھوڑ دیا ہے"۔

"آپ نے وہ شعر نہیں سنا۔ امی —"

"ایسا نہ کرنا شمسہ۔ وہ نا سمجھ ہے تم اکیلی ہو۔ لوگ کم از کم ریاکاری تو کرتے ہیں۔ خدا جانے کل مجھ پہ کیا وقت آئے۔ تم تو اپنا دُگی۔"

"کیوں ابا میاں۔ خیر تو ہے۔ آپ خود کو کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"میری عمر ستر سے اوپر ہو چکی ہے۔ جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ یہ سینے اور پسلیوں کا درد مستقل جم کر رہ گیا ہے۔ ادھر سے ادھر کروٹ بدلتا ہوں دل میں ٹیس اٹھتی ہے۔"

"خدا آپ کی تکلیفیں دور کردے۔ ابا میاں۔" شمسہ بیگم نے گلوگرفتہ آواز میں کہا بہت دیر سے ان کا دل بھرا آرہا تھا۔ بے آواز رونے لگیں۔

ترنم بن ٹھن کے پورچ میں آئی۔ کیا ٹھنڈ میں اس کے ڈیڈی کی نئی گاڑی کھڑی تھی۔ کار کے خریدنے کی خوشی میں انھوں نے سب کو آؤٹ ڈور پکنک پر مدعو کیا تھا ترنم کے چہرے پر احساس تفاخر کی گلابی جھلکی پڑ رہی تھی!۔ بڑے انداز سے وہ اپنا پرس جھلا رہی تھی!۔

برآمدے میں خواتین تھیں۔ ہاجرہ بیگم کا انداز بھی اس وقت کچھ معتبر سا لگ رہا تھا۔ انھوں نے بڑی قیمتی ساڑی پہنی تھی۔ بلاؤز سے آدھی پیٹھ اور کمر جھانک رہی تھی۔ دبیز لبوں پر برائے نام سرخی تھی۔ فرحت بھی تھیں وہ اپنی سہیلی کے گھر گاڑی آنے کی خوشی میں جامے سے باہر ہوئی جارہی تھیں۔ بار بار اظہار مسرت کے طور پر دانت نکالتیں۔

خرم نے گہرا فالسئی سوٹ پہنا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک تھی

یا مکن جا بفیل باناں دوستی

یا دڑ افراد بر باسئے پیسل!

ہاں میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ شمسہ برہم لہجے میں بولیں۔ لیکن یہ بات اچھی نہیں۔ آج ہم ان سے ملتے جلتے ہیں۔ کل وہ ہمارے دکھ درد میں کام آئیں گے۔ انسان کے کام انسان سے اٹکے رہتے ہیں۔ تمھیں کیا خبر۔ تم چلے جاتے ہو کالج۔ میں دن بھر اکیلے بیٹھے بیٹھے پاگل ہوتی رہتی ہوں۔ ایک تو فکریں۔ تنہائی۔ بیماریاں۔ اچھا ہو میں بھی جلد مر کے ٹھکانے لگوں۔ ابا میاں کا کیا ہے۔ آج ہیں کل نہیں۔ تم آزاد ہو جاؤ گے۔ اپنی من مانی کیا کرنا۔

میں نہیں سمجھتا تھا امی۔ کہ آپ ایسی ناسمجھ ہیں۔

عقل ماری گئی ہے۔

خرم میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر انھیں ہمارے اندرونی حالات کا علم ہو جائے گا تو وہ تمھیں نظروں سے گرا دیں گے۔ ان کے دوستوں کا بہت بڑا حلقہ ہے ان سب میں یہ بات پھیل جائے گی کہ ہم محض اوپر سے بھاری بھرکم ہیں۔ اندر ڈھول کا پول کیا وہ ذلت اچھی ہے جو اپنے ہاتھوں مول لی جائے۔ پھر انگلیاں اٹھیں گی۔ مجھ پر لوگ ہنسیں گے۔ میں اگر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤں گا تو پھر کبھی اوپر نہ ابھر سکوں گا۔ آگے آگے بات بڑی دور تک پہونچے گی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کی یہ نئی سہیلی نہیں چاہتیں کہ میں ہاجرہ خالہ کے پاس آیا جایا کروں۔ انھوں نے اپنے دل میں کچھ اور سوچ رکھا ہے۔

بیکار کسی پر تہمت نہ رکھو۔ شمسہ نے کہا۔ ابھی فرحت اس دن کہہ رہی تھیں کہ وہ تمھیں اپنے خرم سے کم نہیں سمجھتیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ تمھارے اخراجات کی بھی کفالت ...!

سام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سام

خدا کی قسم گھر چھوڑ کے چلا جاؤں گا اگر اس قسم کا کوئی سلوک انھوں نے مجھ سے کیا۔ تابش کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپ کو اپنی سہیلی مبارک۔ ان کی ہمدردیاں سینتے رکھیے اب ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے!

معلوم ہوتا ہے کچھ خاص کھٹ پٹ ہوئی ہے۔

ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ ہماری عزت کے مونا نہ تھی وہ لوگ کسی قسم کے بکھیڑے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

تم ان کے گھر اسی لیے نہیں جا رہے ہو۔

آپ جو کچھ سمجھیے۔

اس دن ترنم سے کیا گفتگو ہوئی تھی؟

ترنم میری کیا آپ کی کون ہے امی۔ اس کی گفتگو کو آپ اس قدر اہمیت نہ دیجیے ہاجرہ کا خیال کچھ اور تھا۔

کیا تھا؟

وہ تمھیں بہت پسند کرتی ہیں۔

ان کی پسند پر پورے اترنے کے لیے بہت سے لڑکے دنیا میں موجود ہوں گے آپ ایسی باتیں مت کیجیے امی۔ جن سے میری زندگی بسر ہے حق میں ناسور بن کر رہ جائے۔

سلطان صاحب کراہنے لگے تھے۔ تابش چلا گیا۔ بجھے دل سے شمسہ بیگم باپ کے پاس آ بیٹھیں۔ انھیں دوا پلائی۔ اور سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگیں۔

کیا بحث کر رہا تھا تابش تم سے؟

ابا میاں وہ خواہ مخواہ ایک ایک سے بدظن ہو جاتا ہے۔ کچھ ترنم سے جھگڑا بیٹھا تھا اب مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں سب سے قطع تعلق کر لوں۔

/ /

شادی ایک ایسا سماجی مسئلہ ہے جو ہر قوم میں رائج ہے۔ دنیا میں خالص انسانی اور پاکیزہ معاشرہ قائم رکھنے کے لئے شادی سے زیادہ اہم کوئی بات نہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر شادی کا دستور انسان پر مسلط نہ کیا گیا ہوتا تو ہماری دنیا کا کیا حال ہوتا ـــــ یقیناً اس وقت انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہ رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب نے شادی کرنے کی ہدایت کی ہے اور اس پر عمل بھی ہوتا آیا ہے۔

شادی کے طریقے مختلف ہیں۔ رسم و رواج جداگانہ ہیں لیکن نفس مطلب واحد ہے یعنی یہ کہ دو جنس مخالف (مرد، عورت) ایک معاہدہ کرکے اپنے تئیں ایک دوسرے کا پابند بنا لیں۔ پیشوایانِ مذاہب نے اس عمل کے لئے ایسے ضوابط مرتب کیے تھے، جن سے بآسانی ایسا ہو سکے خصوصیت سے اسلام نے شادی کے فرض کی ادائگی کو اتنا سہل بنایا تھا کہ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ خود بانی اسلام حضرت محمدؐ نے متعدد شادیاں کرکے لوگوں کو سکھایا کہ شادی کم و بیش عمر والے بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت بی بی خدیجہؓ آپ سے عمر میں کافی بڑی تھیں، لیکن آپ نے ان سے نکاح کرکے ثابت کر دیا کہ نکاح عیش پرستی نہیں۔ دو مخالف جنسوں کے ایک ہو جانے کا نام ہے۔ لیکن آج ہمارے معاشرے میں مردوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ کم سن خواتین ہی سے شادی کرتے ہیں۔ خود پچاس برس کے ہی کیوں نہ ہوں، بیوی سولہ سال ہی کی چاہتے ہیں۔ خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

[illegible] نے بیوہ عورتوں سے بھی شادی کرنے کی ہدایت فرمائی اور اس کے لئے خود کو نمونہ بنا کر پیش کیا۔ حضرت بی بی خدیجہؓ بھی بیوہ ہی تھیں۔ بیوہ اور مطلقہ خواتین سے نکاح کرنے سے حضور صلعم کا یہی مقصد تھا کہ مسلمان اس سے سبق لیں۔ آپ نے گیارہ خواتین سے نکاح کیے جن میں صرف حضرت بی بی عائشہ صدیقہ ہی کنواری تھیں۔ لیکن آج حضور صلعم کے نام لیوا اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن اس سنت کو بھول جاتے ہیں۔ آج تو یہ عالم ہے کہ تعلیم کے چکر میں اکثر لڑکیاں ۲۲-۲۴ برس کی ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق خبط کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد شادی کی فکر ہوتی ہے تو حساب اور موزوں لڑکے نہیں ملتے۔ والدین سوچتے ہیں کہ ہماری لڑکی بی۔ اے بی ایڈ یا ایم۔ اے ہے۔ لڑکا بھی اسی کی ٹکر کا ہونا چاہئے۔ لڑکوں میں عموماً تعلیم حاصل کرنے کا شوق لڑکیوں کے مقابلے میں کم ہے۔ تھوڑے ہی لڑکے زیادہ تعلیم حاصل کر پاتے ہیں۔ جبکہ ان کے برخلاف لڑکیوں کی بڑی تعداد بی۔ اے، ایم۔ اے کر لیتی ہے۔ اس طرح توازن برقرار نہیں رہتا اور بر تلاش میں اکثر برسوں گزر جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی عمریں بڑھتی جاتی ہیں اور پھر رشتے آنا کم ہو جاتے ہیں۔ تیس سال کی کنواری لڑکیوں کو بھی بوڑھا تصور کر لیا جاتا ہے۔ آج ایسی نہ جانے کتنی لڑکیاں غیر شادی شدہ پڑی ہیں اور وہ دن بھی دور نہیں جب یہ [illegible] بڑی تیزی سے [illegible] گا۔

ایک دوسری لعنت جہیز وغیرہ کی بھی شادیوں میں داخل ہونے لگی ہے۔ برادران وطن میں یہ رسم عرصے سے چلی آ رہی ہے کہ شادی کے وقت لڑکے کی قیمت لڑکی والوں سے وصول کی جاتی ہے۔ لڑکا جس معیار کا ہوتا ہے، اسی معیار سے اس کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ یہی [illegible]
[illegible]

> **دُلہن**
>
> تلاش کرتے وقت صرف حُسن صورت ہی نہ دیکھئے عورت کا اصلی جوہر اس کی نیک سیرت ہوتی ہے۔
>
> ـــــ نسیم انہولوی

یہ رسم مسلمانوں میں لعنت بن کر لگ گئی ہے اور سب سے زیادہ دشواری مسلم لڑکیوں کی شادی میں بہار ہی میں پیش آتی ہے۔ بہار کے علاوہ بھی یہ رسمیں پھیلتی جارہی ہیں اور دن بدن جہیز کا مسئلہ ناقابل برداشت بنتا جا رہا ہے۔ حکومت کوشاں ہے کہ اس رسم کو ختم کیا جائے، لیکن کسی بات میں قانون سے کمتر ہی دور ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اخلاقی تعلیم دی جائے۔

یہی نہیں ایک اور بھی دشواری لڑکیوں کی شادی کے سلسلہ میں پیش آنے لگی ہے اور وہ ہے شکل و صورت۔ تقریباً پچاس سال پہلے شادیاں اس طرح دیکھ بھال کر نہیں ہوتی تھیں۔ اکثر گھرانوں میں تو لڑکی کو دکھانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ لڑکے والے دوسرے ذرائع سے لڑکی کے متعلق معلومات حاصل کر لیتے تھے اور بس یا زیادہ سے زیادہ دو چار عورتیں جا کر لڑکی کو دیکھ لیا کرتی تھیں اور ان کی پسند لڑکوں کو بھی پسند کرنا پڑتی تھی۔ لڑکی کو بس اسی حد تک دیکھا جاتا تھا کہ کسی عضو سے معذور تو نہیں اور یہ کہ گھر گرہستی کے کاموں میں مشاق ہے یا نہیں۔ لیکن اب صرف حسن دیکھا جاتا ہے۔ تعلیم سے لڑکیوں کو فرصت ہی نہیں کہ گھر گرہستی کے کاموں میں تجربہ حاصل کر سکیں۔ اس میں تو ولی صدی لڑکیاں کوری ہوتی ہیں اور شادی کے بعد ہی گھرداری سیکھتی ہیں۔ حسین ہونا ضروری شرط ہے۔ حسن بھی ہر زاویے سے جانچا جاتا ہے۔ رنگ ناک نقشہ، جسم کی ساخت، آنکھیں بال غرض سبھی چیزیں اور حور ہو۔ پہلے بوٹا قد بھی عورت کا حسن ہوتا تھا اب اسے عیب کہا جاتا ہے۔ اب جو ہے وہ سرو قد دلہن چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر لوگ تو ناپ کر دلہن حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک صاحب کے صاحبزادے ملٹری میں ہیں انھوں نے دلہن کی ناپ بتا دی ہے۔ اب جہاں بھی والدین جاتے ہیں۔ فیتہ لے کر جاتے ہیں لڑکی حسین و جمیل بھی ہوئی اور ناپ میں کم و بیش نکلی تو "ان فٹ" ہو جاتی ہے۔ غرض لڑکیوں کی شادی میں طرح طرح کی دشواریاں پیدا ہوتی جارہی ہیں جو ان والدین کے لئے مستقل دردِ سر ہے جو کسی لڑکی کے باپ ہوتے ہیں۔ ان مسائل پر ملت کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خواتین چاہیں تو بڑی آسانی سے یہ خرابیاں دور کی جاسکتی ہیں، اس لئے کہ انھیں کی گود میں بچے پلتے بڑھتے ہیں وہ انھیں جس طرح کا سبق چاہیں پڑھا سکتی ہیں۔ لیکن میں افسوس اور ندامت کے ساتھ کہوں گی کہ ان تمام باتوں میں زیادہ ہاتھ ہماری بہنوں ہی کا رہتا ہے۔ مرد تو نام کو ہے، لیکن عورت سے زیادہ عورت کی دشمن ہستی کوئی اور نہیں ہوتی۔ ساس بہو اور ساس دو کے حالات پر غور کرنے سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔

دو خط

۱۔ بہن نسرین صادق صاحبہ نے میسور سے لکھا ہے کہ سالنامہ میں مسلسل ناول کی قسط نہ دی جائے تو اچھا ہے۔ آگے نکالنے کے لئے سالنامہ کی جگہ توڑنا پڑتی ہے۔

مشورہ بہت مناسب ہے۔ آئندہ سال، بشرط زندگی اس پر عمل کروں گا۔

۲۔ سعد ہاشمی صاحب (دیوبند) نے تحریر فرمایا ہے کہ حریم کے صفحات بڑھا کر قیمت بڑھا دی جائے۔ ساتھ ہی اسکو اشتہار کا پلندہ نہ بنائیں۔

جواباً عرض ہے کہ اس قیمت پر عام طور پر اس کی خریداری گراں گذرتی ہے۔ قیمت کا اضافہ ممکن ہے کہ اور اثر انداز ہو۔ پھر بھی حریم کی بہنوں اور بھائیوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دیں۔

اشتہارات کے سلسلہ میں عرض ہو کہ اشتہار پر ہی دنیا بھر کے اخبار و رسائل کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگر اشتہار کی رقم نہ آئے تو ان کی زندگی مشکل ہو جائے۔ حریم میں تو بہت کم اشتہار چھپتے ہیں۔ انھیں بھی ختم کرنا بہت ہی گراں پڑے گا۔ موجودہ حالت میں بھی قیمت سالانہ بڑھانا پڑے گی۔

دین کی بقا عورتوں کی ذمہ داری
شعبۂ خواتین تعلیمی کونسل کا جلسہ

لکھنؤ۔ ۲۰ فروری۔ دینی تعلیمی کونسل کے شعبۂ خواتین کے اجتماعی جلسے کی آج یہاں صدارت کرتے ہوئے کونسل کے صدر قاضی محمد عدیل عباسی نے تہذیب کی بقا کے لیے دینی تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام ہزاروں آزاد خود کفیل مدرسے اور مکتب چلتی چلتی آنا جمع کرکے چلائے جا رہے ہیں۔ اسی طرح شہر کی عورتیں بچیوں کی تعلیم کا بندوبست کر سکتی ہیں۔

قاضی صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ لڑکیوں اور لڑکوں کو عام تعلیم سے پہلے قرآن اور دین کی تعلیم دی جائے اور مائیں اپنی بچیوں کو عام اسکولوں میں بھی اسلامی وضع میں بھیجیں۔ اس میں کوئی قانون یا ضابطہ مانع نہیں ہے۔ انھوں نے شعبہ خواتین کو دیہات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ گاؤں کا دورہ کیا جائے۔ اس لیے کہ دیہات میں دین سے ناواقفیت شہروں سے زیادہ ہے۔

عدیل عباسی صاحب نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو خاص طور پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھیں کی تحریک پر دینی تعلیمی کونسل کا شعبہ خواتین قائم کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر قریشی نے اس شعبے کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مذہب تہذیب اور زبان کا تحفظ سب سے اچھی طرح عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ شعبہ خواتین کا پروگرام یہ ہے کہ ہر محلے میں لڑکیوں کے لیے دینی تعلیم کے مکتب مسجد یا کسی گھر میں کھولے جائیں۔ اس کے علاوہ نرسری اسکول کھولنے کی بھی تجویز ہے جن میں دینی تعلیم کے ساتھ عام تعلیم دی جائے گی اور ان اسکولوں کی بچیوں کو عام پرائمری اسکولوں میں داخل کر لیا جائے گا۔ اگر ایسے اسکول نا کافی ہوں تو شعبے کی طرف سے پرائمری اسکول کھلے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پڑھی لکھی عورتیں اپنے محلوں میں انفرادی طور پر بھی دوسری عورتوں کو قرآن اور دین کی باتیں بتائیں۔

چاق و چوبند بچیاں

جلسے میں تعلیم [illegible] [illegible] کا [illegible] ہوا۔ اس موقع پر بچیوں نے بھی بہت سے [illegible] [illegible] شرکت کی۔ کئی اسکولوں کی بچیوں نے قرأت، نعت خوانی اور مکالمے پیش کیے ان میں پانچ چھ سال سے لے کر دس گیارہ سال تک کی لڑکیاں شامل تھیں۔ یہ لڑکیاں اسلامی وضع قطع میں تھیں اور اتنی ہی چاق و چوبند تھیں جتنی کہ کسی کانونٹ اسکول یا نرسری اسکول کی لڑکیاں عام طور پر ہوتی ہیں۔

ان میں تعلیم گاہ نسواں کی عفت فاطمہ، مدرسہ دین عظیم کی صبیحہ خاتون، چاند گرلس اسکول کی عشرت جہاں، مدرسہ نورالاسلام کی شاہدہ اور شبانہ اور مدرسہ اصلاح الاطفال کی زرین فاطمہ، خورشید بانو، شبانہ بانو، فضیہ خاتون، حبیب بانو اور شہناز فاطمہ شامل تھیں۔

مولانا محمود الحسن سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اور محمد نقی فاروقی صاحب مشیر شعبہ خواتین نے بھی تقریریں کیں۔ آخر میں مولانا محمد اشرف زنگی محلی اور بیگم سیدہ اصغر حسین صاحبہ صدر شعبہ خواتین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

جلسہ میں شرکت کے لیے لکھنؤ کے علاوہ دوسرے شہروں اور قصبوں سے بھی عورتیں خاصی تعداد میں آئی تھیں اور کانگ کی عمارت میں پردے کے پیچھے سے لاؤڈ اسپیکر پر کارروائی سن رہی تھیں۔ سب سے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہمشیرہ کے انتقال پر تعزیت کی تجویز منظور کی گئی۔

محفل میں اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ

* مس نسیمہ بیگم بھولی۔ بی۔ اے *

* بڑہ پورہ، بھاگل پور *

جس سے ملو ادب سے ملو۔ نرمی سے بولو۔ محفل میں تھوکو نہیں وہاں ناک صاف نہ کرو۔ اگر اس کی ضرورت ہو تو وہاں سے الگ چلی جاؤ۔ وہاں اگر جمائی یا چھینک آئے تو منھ پر ہاتھ رکھ لو آواز بلند نہ ہونے دو۔ کسی کی طرف پشت نہ کرو۔ کسی کی طرف پاؤں مت پھیلاؤ۔ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر مت بیٹھو۔ انگلیاں نہ چٹخاؤ۔ بلا ضرورت بار بار کسی کی طرف نہ دیکھو۔ ادب سے بیٹھی رہو۔ زیادہ نہ بولو۔ بات بات میں قسم نہ کھاؤ۔ جہاں تک ممکن ہو خود کلام نہ کرو۔ جب دوسرا شخص بات کرے تو خوب توجہ سے سنو۔ تاکہ اس کا دل نہ بجھے۔ البتہ اگر گناہ کی بات ہو تو نہ سنو۔ منع کر دو۔ وہاں سے اٹھ جاؤ۔ جب تک کوئی شخص بات پوری نہ کرلے بیچ میں نہ بولو۔ جب کوئی آوے اور محفل میں جگہ نہ ہو تو ذرا اپنی جگہ سے کھسک کر بیٹھ جاؤ کہ جگہ ہو جائے۔ جب کسی سے ملو یا رخصت ہونے لگو، السلام علیکم کہو اور جواب میں وعلیکم السلام کہو اور کچھ نہ کہو۔

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں ہلکے پھلکے کپڑوں کے بغیر دلہن کسی کو نہیں بھاتی لیکن سونے چاندی کی گرانی سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے موٹی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔ پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔

شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لیے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر بھی شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں، خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں ہلکے پھلکے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سوتی بیلیں اور چھپا پٹھکی وغیرہ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا، یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم، نائلون کے ستارے سنہرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولے میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔

سلام

محمد ثانی حسنی

بیشک تجھ پر ہے مجھ کو بہت اے صبا
تو مدینہ کو جاتی ہے صبح و مسا
ایک میں ہوں سراپا گناہ و خطا
کاش مجھ کو بھی حاصل ہو خاکِ شفا

میرے لب پر بھی رات دن صبح و شام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

دیر سے کہہ رہی ہے درود و سلام
آگیا اے زباں فدویت کا مقام
اب نبیِ مکرم کا لے پاک نام
ہاں مگر با ادب اور بصد احترام

جس کے صدقے میں عالم کا سارا نظام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

وہ حبیبِ خدا طاہر و مصطفےٰ
قاسم و حامد و حجۃ و مرتضےٰ
صادق و رحمت و طیبؐ مجتبےٰ
طٰہٰ، یٰسین، مکی وہ خیر الورےٰ

وہ شفیع و منیر و شہید و امام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

(بشکریہ رضوان لکھنؤ)

قطعہ

از جوہر سیوانی

ایک صاحب جن کے گھر بچوں کی تھی اک پوری ٹیم
وہ جو نکلے شام کو بازار سے لانے افیم
راستے میں ایک بچی رو رہی تھی زار زار
وہ یہ سمجھے ہے بچاری کوئی لاوارث یتیم
گود میں اس کو اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑے
صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں ان کی بیگم بی نسیم
گود میں بیگم کی بچی کو انھوں نے ڈال کر
یہ کہا، لو میں لے آیا ہوں اک درِ یتیم
دیکھ کر بچی کو بیگم نے مسرت سے کہا
زوج، یہ تو اپنی بیٹی ہے خدا رکھے شمیم

کثرتِ اولاد نے کیا تم کو اندھا کر دیا
اپنی نازو کو یتیم اور مجھ کو بیوہ کر دیا

(غیر مطبوعہ)

ترانہ نعت

جناب عمر انصاری کا نعتیہ کلام
جس پر میلاد کمیٹی نے ایک ہزار کا گرانقدر انعام بھی دیا تھا۔

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رُخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

- اناج کی ۱۱ کروڑ ۸۵ لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ ۸۵ لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔
- مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فی صد کی شرح سے ترقی ہوئی جبکہ پچھلے سال کی اس مدت میں یہ صرف تین فی صد ۷۷-۱۹۷۶ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فی صد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع ہے۔
- اپریل سے ستمبر ۱۹۷۶ تک کے عرصے میں ۱۹۷۵ کی اس مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار ۱۶.۴ فی صد بڑھی ہے۔
- اپریل سے اکتوبر ۱۹۷۶ء تک کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں ۳۴.۹ فی صد کا قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور اس مدت میں درآمدات میں ۹ فی صد تک کمی ہوئی ہے۔
- بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکے کا ریزرو حصول آزادی کے بعد پہلی بار ۲،۵۰۰ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔
- پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فی صد۔
- روپے کی قوت خرید میں ۱۷ سے ۲۱ فی صد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لئے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

شگفتہ دل غالب

جلال ملیح آبادی

طلعت۔ ہم ہیں اور افسردگی کی آرزو، غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

رنگین صاحب! اس شعر سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب دنیا والوں سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور ہر وقت افسردہ دل ہی نہیں رہا کرتے تھے بلکہ افسردگی کی آرزو میں زندگی گزار رہے تھے۔

رنگین۔ یہی تو مرزا کی عظمت ہے۔ یہی تو مرزا کا کمال ہے مس طلعت کہ ہزار مصیبتیں جھیلیں، لاکھ دنیا والوں نے دل توڑا مگر مرزا غموں میں قہقہے لگاتے رہے بلکہ زندگی بھر اپنے غم کا مذاق اڑاتے رہے۔
شعر ملاحظہ ہو مس طلعت۔

طلعت۔ ارشاد

رنگین۔ اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

میر شعلہ (ہنس کر) بہت خوب رنگین صاحب! شعر کیا ہے اپنے گھر کی ویرانی پر غالب نے لطیفہ کہا ہے۔

رنگین۔ آپ صحیح سمجھے میر شعلہ! آپ بھی غور فرمائیے مس طلعت
ع اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
۔ یعنی غالب کہتے ہیں لوگ تو اپنے دوستوں کو بہار کے تماشے کی دعوت دیتے ہیں مگر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ میرے گھر کی ویرانی کی بہار کا تماشا کیجئے اور غور فرمائیے کہ وہ گھر کس قدر ویران ہوگا جس میں ہر طرف سبزہ اُگا ہو اور دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں۔
ع مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
یعنی اب میرا دربان گھر کی چوکی داری کم کرتا ہے گھر کی گھاس زیادہ کھودا کرتا ہے۔

طلعت۔ (ہنس کر) بہت خوب رنگین صاحب!

رنگین۔ دوسرے مصرعے پر دوبارہ غور کیجئے مس طلعت!
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
گھاس پر ہے مطلب یہ کہ دن بھر دربان گھر کی گھاس کھودتا رہے اور شام کو گھاس منڈی میں گھاس بیچ کر اپنا پیٹ پال رہا ہے۔

طلعت۔ (ہنس کر) بہت خوب رنگین صاحب! واقعی بڑے زندہ دل تھے مرزا غالب

میر شعلہ۔ ایک پہلو۔ اس شعر سے یہ بھی نکلتا ہے کہ مرزا کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب گھر کا کرایہ ایک سال سے نہیں دے سکا تو گھر کے دربان کو تنخواہ کہاں سے دوں۔ دربان گھاس کھود کے روٹی کھائے۔ (قہقہہ)

رنگین۔ بھئی خوب سمجھے میر شعلہ! یہی شعر پھر سنیئے۔
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

شعلہ۔ (ہنس کر) بہت خوب رنگین صاحب! اجی مرزا صاحب نے بڑی شوخ طبیعت پائی تھی۔

شگوفہ۔ اجی شوخ طبیعت ہی نہیں مرزا بڑے حوصلے کے انسان تھے اب ان کا ایک شعر مجھ سے سنیئے۔

شعلہ۔ ارشاد شگوفہ صاحب!

شگوفہ۔ رنگین صاحب! ابھی آپ نے بجا ارشاد فرمایا تھا کہ غالب اپنے غموں کا مذاق اڑاتے تھے اور میں کہتا ہوں کہ غالب اپنے غم ہی سے مذاق نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اپنے رونے کا بھی مذاق اڑایا کرتے تھے فرماتے ہیں۔
شعر حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

رنگین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
شگوفہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ع مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

فرماتے ہیں کہ غم سے دل و جگر خون ہو گیا اب حیران ہوں کہ دل کو روؤں کہ جگر کو۔ کس کس کو پیٹوں۔ اور کتنا روؤں۔

ع مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مطلب یہ کہ اگر مجھے اتنی مقدرت ہوتی اور مال و زر پاس ہوتا تو میں ایک نوحہ گر (یعنی رونے والے کو) نوکر رکھ لیتا جو وقت ضرورت رونے کا کام کرتا رہتا۔

طلعت ۔ (ہنس کر) یعنی مرزا نوکر کو حکم دیتے کہ رونا شروع کر دو اور وہ رونے لگتا ؟

شگوفہ ۔ جی ہاں

شعلہ ۔ یہ حکم تو غالب کہیں بھی دے سکتے تھے ۔

شگوفہ ۔ جہاں مرزا حکم دیتے نوکر کو رونا پڑتا ۔

رنگین ۔ روتے ہوئے نوکر کو دیکھ کر لوگ پوچھتے میاں آپ پر کیا آفت آپڑی ہے کہ تمہیں مار مار کر رو رہے ہیں ؟

شگوفہ ۔ نوکر کہتا میں نہیں رو رہا ہوں یہ مرزا صاحب رو رہے ہیں ۔

شعلہ ۔ ابھی لوگ نوکر سے کہتے کچھ واہی ہو گئے ہو رو تم رہے ہو مرزا صاحب تو چپ بیٹھے ہیں ۔

شگوفہ ۔ (ہنس کر) نوکر جواب دیتا میں مرزا صاحب کی طرف سے رو رہا ہوں ۔

طلعت ۔ (ہنس کر) لوگ پوچھتے ۔ کہیں کوئی کسی کی طرف سے رویا کرتا ہے ؟

شگوفہ ۔ نوکر کہتا مجھے مرزا صاحب نے اسی لئے نوکر رکھا ہے کہ جب مرزا صاحب کو رونے کی ضرورت ہو تو میں اُن کی طرف سے رویا کروں ۔

شعلہ ۔ (ہنس کر) لوگ قہقہے لگا کر کہتے ۔ بھئی اس دنیا میں یہ نئی قسم ہے نوکری کی ۔ پھر لوگ نوکر سے کہتے ۔ مگر تم تو اس طرح روتے ہو جیسے تمہارا ہی معاملہ ہو ۔

شگوفہ ۔ نوکر کہتا ہاں اس میں میرا ذاتی غم بھی شامل ہے ۔

طلعت ۔ ذاتی غم ؟ وہ کیا ؟

شگوفہ ۔ نوکر رو کر لوگوں سے کہتا کہ ایک سال سے برابر رو رہا ہوں مگر ایک مہینے کی بھی رونے کی تنخواہ نہیں ملی ہے مرزا صاحب سے

(قہقہے)

شگوفہ ۔ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

شعلہ ۔ رنگین صاحب آپ کا خیال ہے کہ مرزا اپنے غم سے مذاق کرتے تھے اور مرزا شگوفہ کہتے ہیں کہ مرزا اپنے رونے پر قہقہے لگایا کرتے تھے اور میرا کہنا ہے کہ رونے ہی کا مذاق نہیں ۔ مرزا صاحب تو اپنی موت کو بھی لطیفہ بنا کر پیش کرتے تھے ۔

رنگین ۔ وہ کیسے میر شعلہ

شعلہ ۔ شعر ملاحظہ ہو

رنگین ۔ ارشاد ۔

شعلہ ۔ ع نامے کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ

رنگین ۔ ع نامے کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ

شعلہ ۔ یعنی مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ محبوب کا خط کیا آیا گویا میری موت کا پیغام آ گیا مطلب یہ ہے کہ محبوب کا خط پڑھتے ہی خوشی سے ہارٹ فیل یعنی حرکت بند اور اس پر غضب یہ ہوا کہ

ع رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

شگوفہ ۔ (ہنس کر) یعنی مرزا صاحب کا خیال یہ ہے کہ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ایک تو گویا صدیوں بعد محبوب نے مہربان ہو کر ہمیں خط لکھا اور ہم محبوب کا خط پڑھتے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

رنگین ۔ مرزا صاحب کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہوئی کہ لوگ دوڑے ، دیکھا تو ہمارا انتقال ہو چکا ہے خیر ۔ ہمیں اپنے انتقال پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا ۔

شعلہ ۔ مگر مرنے کے بعد محبوب کی رسوائی کا بہت رنج ہوا ۔

شگوفہ ۔ کہ ہماری چھاتی پر محبوب کا خط رکھا رہ گیا ، وہ بھی کھلا خط ۔

طلعت ۔ (ہنس کر) شائد مرزا صاحب کا مطلب یہ ہو کہ محبوب کا خط اس لئے چھاتی پر کھلا رہ گیا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت ، ہمارا ہارٹ فیل ہونے کی رسید کے کام آئے ۔

شگوفہ ۔ خوب کہا مس طلعت نے

(قہقہے)

شعلہ۔ نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

شگوفہ۔ یہی زندہ دلی تھی جس کے سہارے مرزا بوڑھاپے تک جی لئے

رنگین۔ حالانکہ بہت دُکھ اٹھائے بے چارے نے

طلعت۔ مگر۔ ہر زہر غم کا تریاق تھی غالب کی زندہ دلی

طلعت۔ اس میں کیا شک ہے۔

رنگین۔ مرزا صاحب کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

شعلہ۔ ارشاد

رنگین۔ ع بہرا ہوں میں تو چاہئیے دونا ہو التفات

شگوفہ۔ ع بہرا ہوں میں تو چاہئیے دونا ہو التفات

رنگین سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

شعلہ۔ (ہنس کر) خوب ــ یعنی غالب اپنی محبوب سے کہتے ہیں کہ اگر آپ میری طرف التفات کیجئے تو دو مرتبہ التفات فرمائیے۔ ایک مرتبہ کے التفات سے کام نہیں چلے گا۔

رنگین۔ جی ہاں۔ اس لئے کہ ع سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

طلعت۔ یعنی غالب اپنی محبوب سے کہتے ہیں کہ اگر آپ مجھ سے کہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں تو دو مرتبہ کہئے۔ کیونکہ ایک مرتبہ اگر آپ کہیں گی کہ "میں آپ سے محبت کرتی ہوں تو میں کہوں گا۔ "جی ؟ کیا کہا آپ نے ! ؟"

شگوفہ۔ اس لئے دو بار کان کے قریب چیخ کر کہے "میں آپ سے محبت کرتی ہوں" (قہقہے)

رنگین۔ بہرا ہوں میں تو چاہئیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

شعلہ۔ بھئی خوب، جواب نہیں مرزا صاحب کی شوخیوں کا

شگوفہ۔ رنگین صاحب! مرزا صاحب کی اس شوخی کا کیا جواب دیا!

رنگین۔ اجی مرزا صاحب کی محبوب بھی شوخ تھیں مرزا صاحب کو جواب تو نہیں دیا مگر ایسا بدلہ لیا کہ مرزا صاحب زندگی بھر یاد کرتے ہوں گے۔

طلعت۔ کیا بدلہ لیا۔

رنگین۔ خود مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اپنا حالِ دل اپنی محبوب سے کہنے لگا کہ صاحب! آپ کی فرقت میں شام سے تارے گننا شروع کرتا ہوں تو صبح کے مرغ بولنے لگتے ہیں ــ گریبان پھاڑ کے ٹہلتا ہوں اور ٹہلتے ہوئے نہ جانے کیا کیا اوَل فوَل بکتا ہوں۔ اور یہ شعر پڑھتا ہوں ــ
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شگوفہ۔ یہ شعر سن کر غالب کی محبوب نے کیا جواب دیا ؟

رنگین۔ وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں غالب نے پوچھا کیا سمجھیں تو وہ بولیں "کیا ؟

طلعت۔ پھر غالب نے کیا کہا

رنگین۔ غالب نے پھر شروع سے حالِ دل کہا "تارے گنتا ہوں مرغے بولتے ہیں گریبان پھاڑ کے ٹہلتا ہوں اور نہ جانے کیا کیا خاک بلا۔ اور مرزا صاحب نے اپنی محبوب سے پھر پوچھا" اب آپ سمجھیں ! ؟ ــ محبوب نے کہا "شا نہیں ــ کیا" ؟ ؟

شعلہ۔ (ہنس کر) محبوب کی اس شوخی پر مرزا صاحب تو بہت سنجیدہ ہوگئے ہوں گے۔

رنگین۔ اجی سنجیدہ تو تھے ہی رنجیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا ــ
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

اور یہ شعر سن کر اُن کی محبوب فرمانے لگیں مرزا صاحب بے نیازی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جیسا آپ نے کہا تھا نا ؟ کہ
ــ بہرا ہوں میں تو چاہئیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

تو بات در اصل یہ ہے کہ جب سے آپ بہرے ہوگئے ہیں میں بھی بہری ہوگئی ہوں اور آپ دو بار بات کہنے پر سنتے ہیں تو میں تیسری بار بات کہی جائے تب سنتی ہوں۔ (قہقہے)

طلعت۔ خوب بھئی خوب "مرزا صاحب کی محبوب بھی بڑی زندہ دل محبوب تھیں۔

شگوفہ۔ بہت زندہ دل ہی نہیں بہت ستم ظریف بھی تھیں۔

طلعت۔ وہ کیسے شگوفہ صاحب ؟

شگوفہ۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ ع

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا

رنگین۔ ع در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا

شگوفہ۔ ع جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

طلعت:۔ (ہنس کر) واقعی یہ تو محبوب نے بڑی زیادتی کی مرزا صاحب پر۔

شگوفہ۔ مرزا صاحب کا مطلب ہے کہ ایک دن میں نے اپنی محبوبہ سے درخواست کی کہ اگر آپکو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے در دولت پر بستر ہی کیوں نہ لگا لوں؟"

شعلہ۔ محبوب اس وقت نیکی کے موڈ میں ہوں گی کہہ دیا ہوگا کہ شوق سے عمر بھر سوتے رہئے میرے دروازے پر۔

شگوفہ۔ جی ہاں اور مرزا کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی میں لپکا اپنا بستر لانے کے لیے اپنے گھر کی طرف

رنگین۔ اور گھر پہنچتے ہی دری تکیہ چادر لپیٹ بغل میں بستر مار کے آپہنچے در یار پر

شگوفہ۔ اور اپنا لپٹا ہوا بستر کھول ہی رہے تھے کہ محبوب تیکھی ہو گئیں بولیں

طلعت۔ یہ آپ یہاں بستر کیوں بچھا رہے ہیں۔

شگوفہ مرزا نے حیرت سے کہا اجی واللہ ابھی آپ ہی نے تو کہا تھا کہ شوق سے عمر بھر سویا کیجئے میرے در دولت پر۔ محبوب بولیں

طلعت۔ غلط۔ یہ میں نے ہرگز نہیں کہا تھا۔

شعلہ۔ (ہنس کر) غضب ہوا۔ اس پر غالب نے کیا کہا؟

شگوفہ۔ اجی کہتے کیا۔ اپنا کھلا ہوا بستر پھر لپیٹنے لگے۔

رنگین۔ (ہنس کر) اور بستر لپیٹ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے ہوں گے۔

شگوفہ۔ جی ہاں۔ بستر بغل میں مارے گھر جا رہے ہوں گے راستے میں یار آشنا ملے ہوں گے تو پوچھا ہوگا مرزا صاحب کہیں پردیس جا رہے ہیں یا پردیس سے آ رہے ہیں؟

شعلہ۔ مرزا صاحب نے کہا ہوگا میاں نہ پردیس جا رہا ہوں نہ پردیس سے آ رہا ہوں۔

طلعت۔ مجھ پر جو سانحہ گزرا ہے۔ مت پوچھو۔

شگوفہ۔ بس یہ شعر سنو ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

طلعت۔ واقعی مرزا کی محبوب بڑی ستم ظریف تھیں۔

رنگین۔ اجی ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے غالب کہتے ہیں۔

ع۔ کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے

طلعت۔ ع۔ کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے

رنگین۔ ع۔ تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے۔

یعنی مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جیسے ہی میں اپنے دل کا حال کہنے لگتا ہوں تو محبوب تپاخ سے بول اٹھتی ہیں کہ "مدعا کہئے بس ایک تڑاخے میں اپنے دل کا مدعا کہہ ڈالیے۔

طلعت۔ (ہنس کر) یعنی محبوب فرماتی ہوں گی، مرزا صاحب! آپ حالِ دل کیا کہتے ہیں گویا طلسم ہوش ربا شروع کر دیتے ہیں۔

رنگین۔ جی ہاں شائد محبوب یہ چاہتی ہوں گی کہ مرزا صاحب حالِ دل پھٹا پھٹ کہہ ڈالیں۔

حالِ دل نہ ہوا کباڑیے کی دوکان پر کاٹھ کباڑ کا نیلام ہوا۔

شعلہ۔ کر تڑ بڑ بولی ہوئی اور مال دوسروں کا

رنگین۔ خوب کہا شعلہ صاحب۔ اسی لئے غالب نے تنگ آکر کہا کہ

؎ کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

طلعت۔ (ہنس کر) بھئی بڑی شوخ و جفا کار تھیں غالب کی محبوب

شعلہ۔ اجی غالب کے اس شعر میں غالب کی محبوب کی شوخی اور ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔

شگوفہ۔ ارشاد شعلہ صاحب

شعلہ۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا

شگوفہ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم منھ تجھے دکھلائیں کیا

یعنی مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میری محبوب کہتی تو یہ ہیں کہ اب ہم جور سے باز آ گئے ہیں۔ مگر اب جور کا ایک نیا پہلو نکالا ہے یعنی ع۔ کہتے ہیں ہم منھ تجھے دکھلائیں کیا

شگوفہ۔ (ہنس کر) یعنی مرزا صاحب محبوب کا رُخ روشن دیکھنے کے لئے پروانے کی طرح تڑپے جا رہے ہیں۔

طلعت۔ اور محبوب فرما رہی ہیں کہ میں آپ پر اتنے جور کر چکی ہوں کہ اب آپ کو منھ دکھانے میں شرما رہی ہوں۔

شگوفہ۔ منھ نہ دکھلانے کا یہ بہانا بڑا جان لیوا تھا۔

شعلہ۔ اجی کہئیے مرزا تھے جو یہ ستم جھیل گئے معمولی شاعر ہوتا تو گریبان پھاڑ کے پاگل خانے چلا جاتا

طلعت۔ (ہنس کر) خوب بہت خوب (قہقہہ)

شگوفہ۔ واقعی غالب کی محبوب بڑی ستم گار تھیں فرماتے ہیں:

ع کبھی جو یاد بھی آجاتا ہوں تو کہتے ہیں

رنگین۔ ع کبھی جو یاد بھی آجاتا ہوں تو کہتے ہیں

شگوفہ۔ یعنی ایک تو میں انھیں یاد ہی نہیں آتا اور کبھی دھوکے دھڑی میں یاد آبھی جاتا ہوں تو فرماتی ہیں۔

ع کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

شگوفہ۔ غالب کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھے یاد بھی کیا تو اس انداز سے کہ غیروں سے پوچھا، "آج محفل میں کچھ فتنہ و فساد نہیں ہو رہا ہے شائد مرزا غالب نہیں آئے ہیں۔

طلعت۔ (ہنس کر) کیا مرزا کی محبوب کا مطلب یہ تھا کہ غالب کے آنے سے محفل میں دھاچوکڑی مچی رہتی ہے؟۔

شگوفہ۔ جی ہاں مرزا صاحب کو اسی کی تو شکایت ہے فرماتے ہیں مجھے یاد کرنے کا یہ کوئی طریقہ ہے صاحب۔۔۔ کہ کہتے ہیں فساد نہیں فتنہ نہیں۔ گو یا میں ان کی بزم میں دھینگا مشتی، لپا ڈگی کرنے جایا کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ (قہقہے)

طلعت۔ خوب بہت خوب

شعلہ۔ ہائے مرزا صاحب کی ظرافت اور زندہ دلی جواب نہیں۔ فرماتے ہیں۔

ع میں نے کہا کہ بزم ناز، چاہئیے غیر سے تہی

رنگین۔۔۔۔۔ ع میں نے کہا کہ بزم ناز، چاہئیے غیر سے تہی

شعلہ۔ یعنی، میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی رہنا چاہیے مگر میں نے یہ کہا ہی تھا کہ

ع سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

طلعت۔ غضب ہوا یعنی محبوب نے مرزا صاحب ہی کو غیر کہا؟

شعلہ۔ جی ہاں مرزا فرماتے ہیں رونا تو یہی ہے کہ اس نے مجھے غیر سمجھا اور کہا "واقعی میری بزم ناز غیر سے خالی رہنا چاہئیے اور یہ کہہ کر مجھ کو محفل سے اٹھا کے کہا۔ یوں"

طلعت۔ (ہنس کر) بہت خوب ۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئیے غیر سے تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

شگوفہ۔ مگر اُس دن مرزا صاحب نے ایک بات ضرور سوچی ہوگی۔

طلعت۔ کیا بات ؟

شگوفہ۔ سوچے ہوں گے جوانی ڈھل رہی ہے کہیں ایسا تو نہیں چہرہ بگڑ چکا ہو۔

شعلہ۔ مگر مرزا تو بڑے شکیل انسان تھے۔

شگوفہ۔ جب محبوب اس قدر بے نیاز ستم ظریف اور جفا گر تھا تو مرزا کے دل میں یہ شک گزرنا فطری بات تھی۔ کہ میں حسینوں کی محبت کے قابل بھی ہوں یا نہیں۔ فرماتے ہیں۔

ع۔ چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسدؔ

رنگین۔۔۔۔۔ ع۔ چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ

شگوفہ۔ ع۔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہئیے

شعلہ۔ (ہنس کر) بہت خوب

شگوفہ۔ یعنی مرزا صاحب نے دل میں کہا کہ اے اسد اللہ خاں غالب اور اسد اللہ خاں اسدؔ، آپ خوب رویوں کو چاہئیے تو ہیں مگر آپ کو اپنی تو صورت دیکھنا چاہئیے۔

شعلہ۔ کہیں مضحکہ خیز تو نہیں ہوگئی ہے

طلعت۔ کہ محبوب اس وجہ سے کترانے لگے ہیں۔

رنگین۔ اور آئینہ دیکھا تو ؟

شگوفہ۔ سب خیریت تھی۔

طلعت۔ یعنی چاہے جانے کے قابل تھے۔

شگوفہ۔ جی ہاں بالکل۔

طلعت۔ (ہنس کر) بہت خوب ۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ

آپ کی صورت تو دیکھا چاہئیے

شعلہ۔ شگوفہ صاحب! جب مرزا صاحب نے اپنی صورت چاہے جانے کے قابل پائی تو خوب رویوں کی ستم گری کے متعلق کیا فیصلہ کیا۔

شگوفہ۔ فیصلہ یہ کیا مرزا صاحب نے کہ محبوب لوگوں کی قوم

انتہائی دل آزار قسم کی قوم ہوتی ہے ۔
رنگین ۔ اور تنگ آ کر مرزا صاحب نے یہ شعر کہا
شعلہ ۔ کیا شعر کہا
رنگین ۔ ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
شعلہ ۔ ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
رنگین ۔ خوبیٔ قسمت سے یہ حوریں اگر واں ہو گئیں
شعلہ ۔ (ہنس کر) کیا خوب یعنی مرزا صاحب کا مطلب ہے کہ اگر دلی کی یہ پری زادیں ہماری قسمت سے جنت میں حوریں ہوئیں اور ہماری خدمت پر مقرر کر دی گئیں تو ہم ان سے ایک ایک ستم گاری ایک ایک ستم ظریفی کا بدلہ ضرور لیں گے ۔
شگوفہ ۔ غالب کا یہی مطلب ہے نا رنگین صاحب ؟
رنگین ۔ جی ہاں
طلعت ۔ تو مرزا صاحب نے ان پری زادوں سے بدلہ لینے کے کیا کیا پہلو سوچے ہوں گے رنگین صاحب ؟
رنگین ۔ سوچے ہوں گے کہ ان پری زادوں کو حکم ہوگا کہ سویرے چار بجے جاگ جاؤ ۔
شعلہ ۔ برتن مانجو بھجی آلو
طلعت ۔ روغنی روٹی پکاؤ حلوہ بناؤ
رنگین ۔ ناشتہ کراؤ
شگوفہ ۔ لان میں پانی لگاؤ ۔
طلعت ۔ بچے کو بچہ گاڑی میں گھماؤ ۔
رنگین ۔ خوب بہت خوب کہا ۔
(قہقہے)
شعلہ ۔ اور رنگین صاحب ! غالب اپنی محبوب کو اور کیا حکم دیں گے ۔
رنگین ۔ گھر کا سودا سلف لاؤ ۔
شگوفہ ۔ کیا تربوز لاؤ تو سارا خود کھاؤ ۔
طلعت ۔ اور منہ نہ بناؤ ۔
رنگین ۔ بجلی کی چکی پر گیہوں نہ پساؤ
شعلہ ۔ گھر میں خود چکی چلاؤ
طلعت ۔ اور چکی پر میری غزل گاؤ ۔

شگوفہ ۔ خوب (قہقہے)
طلعت ۔ اور رنگین صاحب ؟
رنگین ۔ دھوبی آئے تو میلے کپڑے لکھو ۔
شعلہ ۔ کپڑوں کی کاپی کھو جائے تو ڈانٹ سنو
شگوفہ ۔ اور ہمیشہ ہاتھ جوڑ کے معافی مانگو
رنگین ۔ بیمار ہو اور صحت میں میرا ہر حکم بجا لاؤ
طلعت ۔ دن کو دوا شام کو دارو لاؤ ۔
شگوفہ ۔ بہت خوب (قہقہے)
شعلہ ۔ اور رنگین صاحب ؟
رنگین ۔ لب اسٹک لگانا ناخون بڑھانا موقوف
شگوفہ ۔ جوڑا باندھو تو بالوں کی جھاڑو باہر نہ لٹکاؤ
شعلہ ۔ سارا زیور بحق مرزا غالب ضبط ہو جائے ۔
طلعت ۔ تو ٹسوے نہ بہاؤ ۔
شعلہ ۔ بہت خوب ۔ (قہقہے)
شگوفہ ۔ اور فرمائیے رنگین صاحب ۔
رنگین ۔ مرزا صاحب کا حکم ہوگا گھر میں سخت صفائی رکھو
شعلہ ۔ یعنی کیلا کھاؤ تو کیلا کا چھلکا فرش پر نہ گراؤ
طلعت ۔ بلکہ کیلا کھا کے کیلے کا چھلکا بھی چبا جاؤ ۔
شگوفہ ۔ بہت خوب بہت خوب (قہقہے)
طلعت ۔ رنگین صاحب اور کیا حکم دیں گے مرزا صاحب اپنی محبوب کو
رنگین ۔ حکم ہوگا مجھے نیند آنے لگے تو میرے پاؤں دباؤ
شعلہ ۔ اور اس وقت تک پنکھی لگاؤ ۔
طلعت ۔ کہ اونگھ کر پلنگ سے نیچے نہ گر جاؤ ۔
(قہقہے)

جینے کی سزا

عفت موہانی

(یہ کہانی ایک خبر سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

رات کے دو بجے بڑی بی کے دل دہلا دینے والے بین سناٹے میں گونجے...... اور سارا محلہ چونک اٹھا۔ آج یہ نئی بات تھی۔ ورنہ وہ اور ان کی لڑکی اتنی خاموشی اور مردہ سی زندگی گزار رہے تھے کہ کسی کو پتہ تک نہ چلتا تھا اس گھر میں کوئی رہتا بھی تھا کہ وہ بوسیدہ دلکشتہ کواڑ والا ٹوٹا پھوٹا گھر خالی ہی پڑا رہتا ہے!۔

بہرحال ایک ایک کر کے قرب و جوار کے دروازے کھلے۔ کئی ایک مرد اور عمر عورتیں تیزی سے اس گھر کی طرف بڑھیں۔ کنڈی دروازے میں نہیں تھی۔ پتھر اٹکا رہتا تھا۔ کسی نے راہ کا پتھر سرکایا اور سب اندر داخل ہوئے۔ عجیب منظر تھا۔ چھوٹا سا صحن۔ ادھر ادھر کاٹ کباڑ موری کے پاس کیچڑ۔ اور اس کے کچھ اور آگے کچا دالان۔ جس کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے اندھے طاق میں زرد زرد روشنی بکھیرنے والا ننھا سا چراغ... پلکیں جھپکا رہا تھا!۔

کچھ دیر پہلے تک بارش ہوتی رہی تھی۔ ابھی تک کھپریل کی چھت سے متواتر ٹپ ٹپ ہو رہی تھی مرد صحن میں رک گئے۔ عورتیں دالان میں آئیں۔

بڑی بی سینے پر دونوں ہاتھ رکھے زار و قطار رو رہی تھیں۔ منھ سے بے ترتیب الفاظ بھی نکل رہے تھے۔

میری بیٹی۔ معاف کر دے مجھے۔ اپنے ہاتھوں میں نے تجھے جنت میں بھیجا ہے۔ تیرا ٹھکانا اس دنیا میں نہیں تھا۔ میری لاڈلی۔ اب جا کے اللہ میاں سے پوچھیو۔ تیرا جنم کیوں ہوا تھا...... ہائے میں تو اس آرزو میں اپنی سانسیں پوری کر رہی تھی کہ تجھے دلہن بنی دیکھ لوں گی تو قبر کا کونا آباد کر لوں گی۔ مگر یہ کیا وقت آیا ہے میری بی بی کہ میں تیرے بدن پر سفید کپڑے دیکھیں گی... تو نے چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ کتنی دیر بے چین کر دینے والی تھی۔

تیرا منھ سفید ہو گیا تھا۔ تیری پیاس کربلا والوں کی پیاس تھی۔ ہائے ہائے۔ تو مجھے آماں آماں پکار رہی تھی۔ پر میں کچھ نہ کر سکی تیرے لیے... تو خاموش ہو گئی ہمیشہ کے لیے۔ میری لالی بی!"

دالان میں بڑی بی کی جوان سال بیٹی بی بی کی لاش پڑی تھی لیکن اسے لاش کون کہہ سکتا تھا۔ ویسا ہی نکھرا نکھرا معصوم چہرہ تھا۔ دھلی دھلی سفید سفید رنگت۔ جو ہلکی روشنی میں زیادہ سفید ہو گئی تھی۔ نیم وا لب تھے۔ دانتوں کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ یوں ہی پڑی ہوئی تھی!۔

کسی عورت نے آگے بڑھ کر لاش کے ہاتھ پاؤں درست کیے۔ دوسری نے سر سے پیر تک چادر ڈال دی۔ اور پھر سب کی سب بڑی بی کو دیکھنے لگے۔ جو اپنے غم کے پہاڑ تلے جھکی جھکی چور نظر آ رہی تھیں۔! ان سے کچھ پوچھنا دشوار بلکہ ناممکن تھا۔

سب کو تعجب تھا۔ ابھی کل ہی مغرب کے وقت بی بی اپنے آنگن میں چل پھر رہی تھی۔ ہمسائے میں نذر انڈے بیچنے گئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے دال پکائی تھی۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ چاول کھاتی۔ اس نے اپنی ماں سے اپنی خواہش کا ذکر کیا تھا۔ اماں نے عجیب لہجے میں جواب دیا تھا۔

"بیٹی میں تجھے بہشت بریں کی نعمتیں کھلاؤں گی۔"

اس رات بڑی بی کچھ مبہوت اور پاگل سی لگ رہی تھیں۔ یا پھر بی بی ہی کو ایسا محسوس ہوا تھا۔ اس رات وہ تھوڑی سی برفی لائی تھی۔ لبیک سے پیار سے بی بی کو دے رہی تھی۔ لیکن جب برفی اس نے کھائی تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑی تھیں۔!

مرد پریشان تھے۔ بی بی صحت مند الھڑ نوجوان تھی۔ یکایک کیسے مر گئی عورتیں پیچھے چپکے سرگوشیاں کر رہی تھیں
[illegible]

وحشت ناک رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔!

آناً فاناً محلے بھر میں خبر پھیل گئی کہ بی بی اچانک مر گئی۔ بہت سے مرد گلی میں جمع ہو گئے۔ چھوٹا سا گھر عورتوں سے اٹ گیا۔

فجر کو موذن کی پرکیف آواز سُن کر بڑی بی اٹھ بیٹھیں۔ دھندلی روشنی میں وہ بی بی کو تکتی رہیں۔ پھر بڑبڑائیں۔ بی بی اذان ہو چکی۔ کچھ خبر ہے کیا پڑی سوتی رہو گی۔ اٹھو نماز پڑھو۔"

عورتیں رونے لگیں۔ بڑی بی نے خالی خالی نظروں سے انھیں دیکھا اور بولیں۔

"نہ رو۔ چپ ہو جاؤ۔ آج ہی تو وہ اپنے سارے دکھوں سے بے نیاز ہو کر آرام سے سوتی ہے۔ اسے جگا نہ دینا۔ اسے اس کے غم بھر سینہ لیوں کی طرح ڈسنے لگیں گے۔ تم سب نے بچپن ہی سے بی بی کو دیکھا ہے نا کیا وہ کبھی روتی تھی۔ کیا وہ اپنے دکھوں کا شکوہ کرتی تھی۔ ابھرا سے کس بات کی سزا ملی۔ وہ میرا اولاد بن کر دنیا میں آئی تھی۔ میری بی بی۔"

"بڑی بی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ" کسی نے کہا۔ "اور کچھ کہو تو۔ آخر یہ ہوا کیا ہے؟"

"بی بی کو آرام ہو گیا اور کچھ نہیں ہوا۔" انھوں نے جواب دیا اور گھٹنوں میں سر دے لیا۔

بی بی کو آخری منزل پر پہونچانا محلے پردیسیوں ہی کا فرض تھا۔ بڑی بی کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ بیٹی کے سرہانے لوبان ہی سلگا تیں۔

بہرحال جب وہ نہلا دھلا کر تیار کر دی گئی تو بڑی بی اسے دیکھ کر ہوش کھو بیٹھیں۔ اب تک تو رو رہی تھیں۔ اب ہنسنے لگیں۔ اس طرح ہنسیں کہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

اب تجھے کوئی غم نہ ستائے گا۔ میری جان۔ جا سکھ کی نیند سو جا۔ جنت کے گھر میں آرام کر۔ بی بی۔ معاف کر دینا اپنی دکھیاری ماں کو۔ اس نے جان بوجھ کر تیرا پاپ نہیں سینا۔ وہ مجبور تھی بیٹی۔ غریب تھی بے بس اور مجبور تھی۔"

محلے والے جنازہ لے کر چلے گئے۔ دکھیاری بدنصیب بڑھیا کو سر پیٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔

یہ واقعہ ایسا نہیں تھا۔ جو آسانی سے دب سکتا۔ لوگوں نے علانیہ ایسی باتیں سنی تھیں جو بڑی بی کو اس حادثہ میں ملوث کر رہی تھیں۔ ان کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ وہ اب مبہوت تھیں۔ پاگلوں کی طرح ایک ایک کو گھورا کرتیں۔ اور ایسی حیران کن باتیں کرتیں کہ سننے والے ششدر رہ جاتے!۔ عورتیں انھیں پرسا دینے آئیں۔ تب وہ آپ ہی آپ کہہ رہی تھیں۔

"میں نے تو دیکھا ہی نہیں۔ اس نے برفی کب کھائی۔ ارے وہ تو حیران ہو رہی تھی کہ اماں آج کہاں سے پیسے لائی ہیں۔ اس کی وہ آنکھیں مجھے نہیں بھولتیں۔ کیسے دیکھا تھا میری طرف۔ بیچاری کو ذرا سی بھی شبہ نہیں ہوا۔ ہوتا کیسے؟ کوئی مجھے بتائے کیا ماں بھی اپنی اولاد کو زہر دے سکتی ہے۔ مگر میں نے تو اسے دنیا کے دوزخ سے نکال کر جنت میں بھیجا ہے۔ اب جنت میں آرام سے بہشتی میوے کھا رہی ہوگی۔"

ان کی بکواس کو محض دیوانے کی بڑ یا مجذوب کی باتیں نہیں کہی جا سکتی تھیں۔ جب مرد تدفین کے بعد واپس آئے تھے تب انھوں نے ان لوگوں سے بھی پوچھا تھا۔

"بھائی۔ وہ قبر میں آرام سے سو گئی تھی نا۔ میری کوئی شکایت تو نہیں کر رہی تھی کہ جیتے جی اماں نے مار ڈالا۔"

"آپ نے مار ڈالا؟" ایک آدمی نے ان سے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ مار نہیں ڈالا۔ جنت کی راہ ڈھونڈ دی اس کے لیے۔ بہت دنوں سے اپنے ارمانوں کے جہنم میں جل رہی تھی میری بی بی۔"

مردوں اور عورتوں میں علانیہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"یہ تو ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ماں اپنی بیٹی کو زہر دیدے۔

ارے بڑی بی اپنے منھ سے کہہ رہی ہیں۔ اب اور کیا ثبوت چاہیئے۔

یقین نہیں آتا

بڑھیا کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی۔

پولیس کو خبر کرنی چاہیئے۔

سارے محلے کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ کیونکہ ہر گھر میں آنا جانا ہے۔ اور کوئی گھر ماشاءاللہ بچوں سے خالی نہیں۔"

عورتیں الگ حیران تھیں۔ بڑھیا کی بکواس زیادہ تر انھیں لوگوں نے سنی تھی۔

"وہ تو اللہ کے دربار میں میرا گلا پکڑے گی۔ پوچھے گی کہ اماں میں نے کیا قصور کیا تھا۔ مگر نہیں۔ مجھے یقین نہیں ہے۔ ارے وہ تو شروع ہی سے بہت خاموش، صابر شاکر رہی ہے۔ وہ تو الٹی میری احسان مند ہوگی۔ میں نے اس کے سارے دکھوں کا خاتمہ کر دیا۔۔ مگر لوگو خدا کے واسطے مجھے بتاؤ۔ اب میں اس کے بغیر کیسے جیوں گی؟"

محلہ والوں کا متفقہ گمان تھا کہ یقیناً بڑی بی نے بی بی کو کچھ کھلا دیا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں اندازہ کر سکتے کہ انھوں نے کیا کھلایا ہے۔

بڑی بی کی عمر پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ حالات نے انھیں سو سال کی بوڑھی کا حلیہ دے دیا تھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ جسم خشک ٹہنی کا سا جھلسی ہوئی رنگت تھی۔ ماتھے کے نیچے گڑھوں میں ملتی ہوئی دھندلی دھندلی آنکھیں رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ان پر خشک بھورے بھورے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ دن بھر بے چاری گدلی سی چادر لپیٹے محلے بھر میں پھرا کرتیں۔ پردہ نشین عورتوں کے لیے سودا سلف لانا ان کی ذمہ داری تھی۔ بڑی ایماندار ہوتی تھیں۔ کبھی کسی کے پیسے انھوں نے نہیں مارے۔ سب ان پر اعتبار کرتے تھے خوددار اتنی تھیں کہ کسی کے گھر کا کھانا چائے یا پان بھی قبول کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔ اکثر صاحب حیثیت لوگ انھیں بھینے بعد چار چھ پیسے دے دیتے کہ پان کھا لیجئے۔ مزدوری کے نام سے لینا ان کی غیرت برداشت نہ کرتی۔ انھیں اپنے کام سے کام تھا۔ انھوں نے کبھی ایک گھر کی بات دوسرے گھر تک نہیں پہونچائی۔ بہرکیف وہ ایک زندہ بے زبان اور تمام حسیات و جذبات سے یکسر عاری چلتی پھرتی لاش تھیں؟ کسی قسم کی بدی یا برائی کا تصور ان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔!

اب بھی لوگ باور کرنے پر آمادہ نہیں تھے کہ بڑی بی کوئی سنگین جرم کر سکتی ہیں۔ انھوں نے تو شاید زندگی بھر کسی چیونٹی یا مکھی کی بھی جان نہیں لی تھی نہ کہ ان کی اپنی لڑکی۔ جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ اس کی زندگی کیونکر اس سے چھین لیتیں۔

ایک وقت تھا جب بڑی بی اپنے میاں اور دو بچوں کے ساتھ ساتھ کہیں سے آکر اس محلے میں رہی تھیں۔ ان کے شوہر باورچی تھے کہیں نوکر چاکر نہیں تھے۔ کہیں تقریب ہوتی تو آدمی انھیں بلا لے جاتے۔ وہ ایک دو دن کے لیے بیوی بچے پیٹ بھر کھاتے اور پھر دو فاقہ کشی

بڑی بی محلے کے ایک کارخانے میں جاتی تھیں۔ جہاں چاکلیٹ اور پیپرمنٹ پیکٹوں میں بند کرنے کا کام ان کے سپرد تھا۔ روزانہ ایک روپیہ ملتا تھا۔ بہرحال نہایت تنگی ترشی سے گذر بسر ہو رہی تھی اس محلے میں آئے انھیں سال بھر ہوا تھا کہ ان کا پندرہ برس کا نوخیز لڑکا مسجد کے کنوئیں میں گر کر مر گیا۔ چھ ماہ بعد بڑی بی کے میاں بھی دمہ میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ بڑی بی کے مختصر سے کنبہ میں بھیانک خلا ہو گیا۔ اب وہ تھیں اور ان کی بارہ تیرہ برس کی بچی بی بی! دونوں ماں بیٹی نہایت کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہی تھیں بڑی بی جب تک کارخانہ میں رہتیں۔ بی بی کو ساتھ رکھتیں۔ وہاں مرد بھی کام کرتے تھے کسی شخص نے ان سے کہا کہ وہ اپنی لڑکی کو پانچ سو میں بیچ دیں۔ بڑی بی نے اسی روز سے کارخانہ جانا بند کر دیا۔ سائے کی طرح بچی کے ساتھ رہتیں۔ حالانکہ بے چاری بی بی جانتی بھی نہیں تھی کہ اس کی ذات اس کی ماں کے لیے ایک اہم اور خطرناک مسئلہ بن چکی ہے!

بی بی غریب لڑکیوں کی طرح ننگی بدیدی یا پھوہڑی نہیں تھی۔ وہ بھی ماں کی سی خاموش، کم سخن اور خوددار تھی۔ مسلسل دکھ اٹھاتے اٹھاتے وہ چھوٹی سی عمر میں زندگی کی حقیقت سمجھ چکی تھی۔ اسے پتہ چل گیا تھا۔ راحت و آرام، عیش و مسرت، خوشحالی اور فراغت اس کے مقدر کے لیے نہیں بنے اس لیے وہ بچپن ہی سے صابر و شاکر بن گئی تھی۔ کبھی بڑی بی دن بھر محلے کے چکر لگا کر شام کو تھکی ہاری آتیں اور بی بی صرف ان کا چہرہ دیکھ کر رہ جاتی سمجھ جاتی تھی کہ۔ آج کچھ نہیں ملا۔ چپ چاپ ماں کا کثیف و خستہ برقع اٹھا کر الگنی پر ڈال آتی۔ اور خاموش جا کر اپنے بستر پر لیٹ جاتی کہ آج پھر خالی پیٹ ہی سو جانا ہے۔ اماں کو چار چھ آنے بھی کہیں سے نہیں ملے کہ چنے ہی کھا کر پانی پی سکتے! گھر میں تو کچھ تھا ہی نہیں تھا!۔ بڑی بی دکھ سہتے سہتے۔ غم اٹھاتے اٹھاتے اور اپنی معصوم بے زبان بچی کے صبر و مجبوری پر کڑھتے کڑھتے دق میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ان کا کلیجہ رنج و غم سے چھلنی ہو چکا تھا۔ پھر ساری رات بی بی بھوک سے بے چین ہو کر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی تھی اور ساری رات بڑی بی روتے روتے سویرا کر دیتی تھیں۔

ان کے بس میں کچھ نہ تھا!

بہت مجبور ہو کر ایک گھر میں روٹیاں پکانے پر نوکری کر لی۔ کچھ دن کرتی بھی رہیں۔ پھر ان کی مسلسل کھانسی سے مشکوک ہو کر بیگم نے انھیں ملازمت سے الگ کر دیا۔ ایک جگہ تلعی گر کے برتن مانجھنے پر رہیں۔ لیکن اس کے برتن کہاں اور ان کی طاقت کہاں۔ ہفتہ بھر میں بیمار ہو کر پڑ گئیں۔

شباب، امیر کا ہو یا مفلس کا۔ اس حسین و نازک کونپل کے مانند جو

بے بو شباب ہے جس پہ مفلسی شاہد ہو گیا۔ اور غریب کا شباب بے لوث ہوتا

ہے۔ غازہ و سرخی کے تکلف سے بالکل پاک۔ شباب کے سیل بے پناہ

پر کوئی بند نہیں باندھ سکتا! بی بی پر بھی شباب آیا۔ سوکھے ٹکڑے کھانے

والی، خشک چنے چبانے والی اور فاقہ کشی کی صعوبتیں سہنے والی بی بی پر

اس طرح شباب آیا جیسے خزاں کے ٹھٹھرے ہوئے پودے میں اچانک کوئی

نرم و نازک کونپل پھوٹے اور سارے پودے کو نیا حسن نئی رعنائی بخش

دے۔ اسے خوشخبری دے کہ اس کی بہار دور نہیں ہے!

اب تک بڑی بی نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ ان کی لڑکی ایک دن

جوان ہو سکتی ہے۔ وہ سہم گئیں۔ یہ پودا بڑھے گا۔ پھیلے گا۔ اور شاید اس

کی شاخیں اور پتیاں آنگن کی حد سے باہر نکل جائیں۔ تب کیا ہوگا۔ انھیں

اپنی لڑکی کے جوان ہونے سے اس قدر صدمہ ہوا کہ شاید اکلوتے بیٹے کی اچانک

موت کا بھی نہیں ہوا تھا۔

جس طرح مرغی گھٹتی بڑھتی دھوپ کو کبھی چیل کا سایہ سمجھتی ہے۔

اسی طرح بڑی بی اپنے گھر کے آس پاس آگے پچھواڑے کسی لڑکے یا مرد کی

آواز یا ہنسی قہقہے کی گونج سن کر یوں چونکی ہوتیں اور اس طرح بی بی کو

گھورنے لگتیں کہ کہیں یہ ترغیب آمیز آواز یا قہقہہ اس کے کانوں تک یا

کانوں کے راستے دل تک تو نہیں پہونچ گیا؟۔

بی بی بہت معصوم تھی۔ بہت بھولی بھالی تھی۔ وہ مکر و بات دنیا

سے بالکل الگ بہت دور تھی۔ لیکن بڑی بی پر وہم و بدگمانی کے بھوت سوار

تھے۔ آدمی کو اس کے اندر کے تقاضوں سے کوئی آگاہ نہیں کرتا۔ آدمی کو

اپنی بھوک پیاس آپ لگتی ہے! اور کھائے بغیر پیاس بجھائے بغیر وہ رہ

نہیں سکتا بی بی کو برائیوں سے دور رکھنے کی تاکید کرنا اسے کچھ نئے سبق

پڑھانا ہے۔!!

جب وہ بے چاری بھوک کے بہلانے کو کلام پاک کھول کر بیٹھتی تو

بڑی بی کو خیال آتا۔ شاید اس نے شیطان کے بھگانے کے لیے یہ دواستعمال

کی ہے۔ بیچاری اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں پیوند لگانے بیٹھتی اور اس

کا ننھا سا معصوم ذہن سوچا کرتا۔ کیا سبھی لڑکیاں ایسے ہی کپڑے پہنتی ہیں

زرد پاجامے میں کالا پیوند لگا ہے۔ لال کرتے میں سفید ٹکڑا چپکا ہوا ہے

یہ کیا زندگی ہے؟ کب میرے پاس اچھے اچھے پھول دار ریشمی کپڑے ہونگے؟!

اسے سوچ میں گم دیکھ کر بڑی بی کو خیال آتا کہ کہیں وہ کوئی نئی بات تو

نہیں سوچ رہی ہے۔!

بس وہ بی بی کا سایہ بن کر رہ گئیں۔ اتنی استطاعت نہیں تھی کہ

کسی سے نکاح ہی کر دیتیں۔ کوئی بھلا مانس صرف شکر چھوہارے دل پر یہ بوجھ

اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ اور بھلا خود سے وہ کیسے کہتیں کہ کوئی اللہ کا بندہ اللہ

کے نام پر ان کی لڑکی سمیٹ لے جائے۔

ماہ و سال گزرتے اور بی بی کو نکھارتے سنوارتے ختم ہوتے رہے!

کہیں سے اس کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ انھوں نے خود ادھر ادھر بات

کی تو پہلا سوال ہوا۔ لڑکی کو دو جوڑے کپڑے اور تولہ بھر چاندی تو بہر حال

ملے گی! اور رشتے تانگے والے جب یہی بات پوچھنے لگے تب وہ بی بی کے مستقبل

سے مایوس ہو گئیں۔

غریب لڑکی ہمیشہ ماں باپ کے لیے عذاب الٰہی رہی ہے۔ اور بی بی کے تو

باپ بھی نہیں تھا۔ ماں بیچاری نیم پاگل تھی۔ اس کے غم بے پایاں تھے۔ دور دور

تک کوئی غمگسار، چارہ ساز، پوچھنے والا نہیں اچھے برے دکھ سکھ کا ساتھی

نہیں تھا! ان کے سامنے بس اندیشے ہی اندیشے تھے۔ سوالات تھے کٹھن حالات

تھے۔ پرسان حال کوئی بھی نہ تھا!۔

ان کا یہ خدشہ بڑا قوی تھا کہ ان کے مرنے کے بعد بی بی کو بڑا ناگوار ذریعہ

معاش اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ بڑی بی کے گھر میں جوان

لڑکی موجود تھی۔ اگر کوئی امرود شاخوں میں چھپ کر بھی پک جائے تو اسکی

خوشبو چھپ نہیں سکتی!۔

ان کے گھر میں جوان مرد گھس آئیں گے۔ ان کا پاکیزہ گھر چکلہ بن جائے

گا۔ اس کے سوا بی بی کا اور مصرف ہی کیا ہے۔!

وہ ایک جوان لڑکی کی ماں ہونے پر اٹھتے بیٹھتے پچھتانے لگیں۔ عورتوں

کے مشورے مستزاد تھے۔ ان کے گھر میں بھی ادھر ادھر کی عورتیں آتی جاتی

تھیں۔ ان کی نظریں بی بی پر پڑتیں۔ اور وہ بڑے سہل لہجے میں بڑی بی

سے کہتیں۔

لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دو بوا۔ دیر تک بٹھانا اچھا نہیں۔

تم ہی کوئی اچھا لڑکا دیکھو۔

اچھے لڑکے چوری چھپے اب بھی اچھے داموں پر نیلام ہوتے ہیں...

یہ بتاؤ کہ جہیز میں کیا دے رہی ہو تو پھر بات چلائیں۔

وہ کیسے کہتیں کہ وہ اتنی حقیر ہیں کہ لڑکی کے نام کے اٹھنگے پاس نہ تو دو جوڑے

کپڑے ہیں نہ تولہ بھر زیور۔ ایک پیوند لگے کپڑوں میں ان کی بیٹی کسی فقیر

کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے رخصت ہو گئی ہے۔

بی بی سن شعور کو پہنچنے کے بعد عمر سے زیادہ سمجھدار، صابر شاکر اور عقلمند ہو گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مفلس ماں پر وہ ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ اس کا وجود بیکار ہے۔ اس کی زندگی کسی کام کی نہیں... وہ اپنے آپ محجوب اور شرمندہ رہتی جیسے وہ ماں کی گنہگار ہو۔ اس نے جان بوجھ کر خدا سے اپنا وجود مانگا ہے۔ اس کے لبوں پر تالے پڑ گئے! بڑی بی اٹھتے بیٹھتے اللہ کے رحم کو آوازیں دیا کرتیں۔ ان کی بوڑھی کپکپاتی ہوئی آواز بی بی کے وجود پر ہتھوڑوں کی طرح برستی اور اس کے کمزور نازک حساس دل کو چکنا چور کیا کرتی! لیکن اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا!

بی بی نے کچھ مرغیاں پالی تھیں۔ ان کے انڈے وہ پاس پڑوس میں بیچ آتی۔ اس دن منشی صاحب کے بڑے لڑکے نے بی بی کے ہاتھ سے انڈہ لیا اور اس کے ہاتھ پر چار پیسے رکھ دیئے۔ بڑی بی نے جھٹپٹے سمے میں دیکھ لیا کہ منشی صاحب کے صاحبزادے بڑے گہرے انداز میں مسکرا رہے تھے۔

بڑی بی اندھے کنویں میں اتری جا رہی تھیں۔ بی بی پیسے لائی — انھوں نے اس سے کہا۔

لا بیٹی۔ کچھ لے آؤں۔ رات کے لیے۔

اماں۔ آج تھوڑے سے چاول لانا۔ کتنے دن سے نہیں کھائے۔

صبر کرو بیٹی۔ اللہ تمھیں جنت کی نعمتیں کھلائے گا!

اسی رات انھوں نے بی بی کو بڑے پیار سے برنی کھلائی تھی۔ اور خود چولھے کے پاس بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں۔

پاگل عورت کا وجود محلے والوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ عورتوں کو دن بھر اندیشہ ستایا کرتا کہ کہیں پاگل بڑی بی گھروں میں نہ گھسنے لگیں۔ مردوں کی راتوں کی نیندیں حرام ہوا کرتیں۔ بڑی بی ساری ساری رات گلیوں اور سڑکوں پر چلاتی پھرا کرتی تھیں۔

یہ انجام تو ان کا ہونا ہی تھا۔ لیکن کوئی کیوں ان کی وجہ سے پریشان ہو لیتا۔ کسی منچلے نے اپنی زبان سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ بڑھیا نے خود اپنی لڑکی کی جان لی ہے! ان کی باتوں سے تو صاف ظاہر ہی تھا۔ بڑی بی کو پولیس نے پکڑ کر حوالات میں ڈال دیا۔

وہاں ان کی چیخ پکار پر کوئی کان نہ دھرتا۔ ظالم لڑکے ذہن میں جرم کا شبہ تھا ان پر سختی کی گئی۔ اور کڑے لہجے میں پوچھا گیا کہ اصلی واقعہ کیا تھا۔ انھوں نے کیوں اپنی لڑکی کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔ بڑی بی نے کوئی شاعرانہ استدلال پیش کیا ہی تھا کہ سپاہی نے ڈپٹ کر یہ واقعات دریافت کیے۔

سخت گیری نے بڑی بی کے ہوش درست کر دیئے۔ تب بہت سے لوگوں کے سامنے انھوں نے بیان کیا۔

— کوئی ماں اپنی اولاد کی جان نہیں لیتی۔ جانوروں کی بھی ممتا ہوتی ہے۔ میں تو انسان ہوں۔ مجھے بنانے والے نے صرف انسانی شکل دی۔ دل و دماغ دیا تاکہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے میری سزاؤں میں اضافہ ہوتا رہے۔ میں اپنی تقدیر ایسی ہی لائی تھی۔ نہ مجھے شوہر کا سکھ ملا نہ اولاد کا۔ میں ہمیشہ سے بڑی بدنصیب ہوں۔ لوگ کہتے ہیں تقدیر کو برا بھلا نہ کہو۔ تقدیر خدا نے لکھی ہے۔ آدمی آدمی سے شکایت کرتا ہے۔ تقدیر کی شکایت میں خدا کے سوا کس سے کرتی۔ اس نے میری بدبختیوں پر مہر لگا دی۔ مجھے ایک لڑکی دیدی۔ معصوم، بے زبان میری بچی۔ ہائے وہ قبر کی تاریکیوں میں سو رہی ہے۔ میں اس کے ساتھ کچھ نہ کر سکی۔ بچپن میں وہ ہر چیز کو ترستی تھی اماں مجھے اچھے کھانے دو۔ اماں میں میٹھا کھاؤں گی۔ اماں مجھے بھی پھولدار کرتی سی دو۔ وہ میرا منہ تکتی تھی — میرے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا تھا۔ آہ میرے اللہ تو نے مجھے اس قابل کیوں نہ کر دیا کہ میں اپنی بچی کو کبھی تو اس کے حسب خواہش کھلا پلا سکتی، پہنا سکتی! جو کچھ وہ چاہتی تھی وہ میں کچھ نہ کر سکی۔!"

بڑی بی کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ اس کی ماہ سیاں مجھ سے دیکھی نہیں گئیں۔ اس کے ارمان مجھے کچلے ڈالتے تھے۔ وہ بھی اسی دنیا میں رہتی تھی جہاں قدم قدم پر رنگینیاں، رعنائیاں اور ترغیب ہے۔ بچپن ہی سے وہ محروم تھی۔ جوانی میں بھی نامرادیوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اب تو وہ سوچنے سمجھنے والی ہو چکی تھی۔ اپنی محرومیوں کو بڑھا چڑھا کر سوچنے لگی تھی۔ اس کے لیے۔ میں بدنصیب تو اسے عمر بھر پیٹ بھر کھلا بھی نہ سکی۔ میں اس کی کوئی آرزو پوری نہ کر سکی۔ اب تو وہ شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ اللہ کی اس بھری پری دنیا میں کوئی فرشتہ ایسا نہیں تھا جو ایک بوڑھی مفلس کی غریب بچی کا ہاتھ تھام سکتا۔ مجھ غریب بے بس سے سب لوگ جہیز کا مطالبہ کرتے تھے۔ جہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں وہاں جہیز کہاں؟ سب کہتے ہیں لڑکی جہیز دیئے کی نہیں

کھا چکے ہیں مگر لینے والے اب بھی لیتے ہیں۔ جب خدا سے لوگ نہیں ڈرتے تو بندوں سے کیا ڈریں۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو گئی تھی۔ دور دور تک میرا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں بی بی کا برا انجام دیکھ رہی تھی۔! مجھے اسکی آبرو، اپنی غیرت زندگیوں سے زیادہ پیاری ہے۔ میں مدقوق ہوں۔ میری زندگی کا بھروسہ نہیں ہے۔ کیا اپنے بعد میں بی بی کو طوائف بننے کے لیے چھوڑ جاتی۔ نہیں میں اپنی روحانی آنکھوں سے ہرگز نہ دیکھ سکتی کہ بی بی نے اپنی آبرو بیچ دی ہے۔!

میں نے دل میں ٹھان لی کہ اب میں اسے اپنے سامنے انجام کو پہونچا دونگی اس رات میں نے چوہوں کے مارنے کا بہانہ کر کے کیلا خریدا اور تلا تند میں گھیپ کر بی بی کو کھلا دیا۔ آہ۔ میری بی بی مٹھائی کو برسوں سے ترسی تھی اس نے سب بڑی کھالی۔ تب میں دیوانی ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ بی بی حلق میں انگلی ڈال کر کھایا پیا نکال دے لیکن اسے خود سے پیاس ستانے لگی تھی۔ پھر پہر رات گئے بے چینی شروع ہو گئی۔ میری معصوم لڑکی تب تک نہ سمجھ سکی کہ اس کی ماں نے اسے قتل کیا ہے۔ وہ تڑپنے لگی ماں ماں کی پکار پر میرا دل بکھرنے لگا۔ ہائے میں نے یہ کیا کیا تھا۔ گیارہ بجے سے دو بجے رات تک تڑپتے تڑپتے اور اماں اماں پکارتے میری بچی ٹھنڈی ہو گئی! میں نے اسے دنیا کے جہنم سے نکال دیا۔ جنت میں پہونچا دیا۔ خود اپنے ہاتھوں اپنی دوزخ مول لی۔ لیکن اب مجھے سکون ہے۔ میری بچی کے پاک و مطہر بدن تک کسی کے ناپاک ہاتھ نہیں پہونچ سکتے!!

دنیا میں رہنے والو دے دو مجھے کوئی سزا۔ مگر پہلے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر سوچو کہ تمہارے دل اتنے کٹھور اتنے چھوٹے کیوں ہیں جن میں غریبوں کے لیے کوئی درد، کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں آج بھی غریبوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں ہر وقت کوئی بی بی اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے تحت روح و جسم کا سودا کرتی اور مر مر کر جیتی رہے گی!

نمری بی بی کی باتوں کا کوئی جواب کسی کے پاس نہیں تھا!۔ انھیں سزا دینے کے بجائے دماغی ہسپتال میں شریک کر دیا گیا۔ جہاں وہ ہر وقت زار زار روتی اور بی بی کو پکارتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹروں نے ان کا روحانی دماغی اور جسمانی مرض لاعلاج قرار دیا تھا۔ کوئی ہفتہ بھر بعد یہ بدنصیب بڑھیا اپنی بی بی کو آوازیں دیتی ہوئی اس کے پاس پہونچ گئی۔ اچانک اس کا دل پھٹ گیا تھا! جبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!!!

کیا آپ کو علم ہے کہ لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیب اور مشرقی تمدن کے لیے مشہور ہے جس کا کہیں جواب نہیں۔ گو یہ تہذیب اب زمانے کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹ گئی ہے پھر بھی ہاتھی لاکھ گھٹے تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ گری حالت میں بھی ایک نمونہ ہے۔ لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے اور پھل و میوہ جو دیکھنے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں۔ اصل اور نقل میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔

آصف الدولہ (جن کے متعلق مشہور تھا، جس کو نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ) کا مشہور تاریخی امام باڑہ۔ چھوٹا امام باڑہ۔ ریزیڈنسی۔ مارٹین صاحب کی کوٹھی۔

بوٹانیکل گارڈن بنارسی باغ اور زندہ عجائب گھر۔ چھتر منزل قیصر باغ۔ ریوڑیا جسے گھنٹیاں بھی کہتے ہیں۔ عطریات اور چکن کا کام اور ان سب سے زیادہ زردوزی۔ کامدانی، اور بادلہ وغیرہ کے کاریگر جن کا کام سارے ہندستان میں مشہور ہے اور ان کاریگروں کا بہترین کام درشنو لال آتمارام اینڈ سنس گوٹے والے، راج کمل ہوٹل بلڈنگ امین آباد روڈ لکھنؤ میں ہوتا ہے۔ صدہا حریمی بہنیں اب تک اس فرم کی خدمات کا تجربہ کر چکی ہیں۔ اپنی ضروریات کے لئے خط و کتابت کیجئے۔ یا فون نمبر ۳۳۴۶۶ پر بات کیجئے۔ ایمانداری، خوش معاملگی اور وقت کی پابندی خصوصیات ہیں۔

برق آشیانوی

مزاحیہ

"خط لکھیں گے ....."

برسوں ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ خط لکھنے یا خط کا جواب دینے میں ہم سے زیادہ کاہل اور لاپروا انسان اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اور ہم اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے لیکن اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ کوئی فن یا ہنر کسی کی میراث نہیں ہے۔ ہر فن اور ہر ہنر کا دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنے اس ہنر پر اب فخر کرنے کا حق نہیں رہا۔ کیونکہ ہم نے اس فن کے ایسے ایسے ماہرین دیکھے ہیں کہ ان کے سامنے ہم جیسے اس فن میں کچے نہ صرف پانی بھرتے ہیں بلکہ گھر کا سودا لاتے ہیں اور ضرورت کے وقت کھانا بھی پکاتے ہیں، برتن دھوتے ہیں حتیٰ کہ بچوں کو بھی سنبھالتے ہیں۔ ہم میں تو صرف یہی خوبی ہے کہ اگر کسی کو ہفتہ میں ایک خط لکھنا ضروری ہے تو ہر مہینے میں ایک خط لکھتے ہیں۔ اگر کسی خط کا بوالیسی پٹہ جواب دینا ہوتا ہے تو اس شخص کے واپس آنے پر ہم خود بہ نفس نفیس اس سے مل کر خیریت دریافت کر لیتے ہیں جو بوالیسی پٹہ جواب کا طالب ہوتا ہے۔ اب ہم اپنی اس خوبی پر نازاں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ایسے ایسے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں کہ انھوں نے قسم کھا کر اپنی اس بے گناہی کا اظہار کیا ہے کہ عمر بھر میں انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ اور اقرار کیا کہ جب تک زندہ رہیں گے کسی کو کوئی خط نہیں لکھیں گے۔

خط لکھنا جس قدر آسان کام دکھائی دیتا ہے۔ اسی قدر مشکل بھی ہے۔ جب خط لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ طے کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے کہ کس کو پہلے خط لکھا جائے۔ بیوی کو پہلے خط لکھتے ہیں تو والدین ناراض ہو جاتے ہیں کہ زن مرید ہوگیا۔ اور والدین کو پہلے لکھتے ہیں تو بیوی کے پاس وہ تمام دعوے جھوٹے ہو جاتے ہیں جو شادی سے پہلے کئے تھے اور یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ "ہم کو دنیا میں سوائے ان کے کسی اور سے محبت نہیں ہے"۔ دونوں کو ایک ساتھ خط لکھے میں تو بھی شکایت کا موقع باقی رہتا ہے۔ یعنی والدین اس بات سے ناراض ہو جاتے ہیں کہ بیٹے نے ان کو اپنی بیوی کے برابر کا درجہ دے دیا۔ اور بیوی اس بات پر خفا ہو جاتی ہے کہ شوہر اپنے والدین کو اس کے برابر سمجھنے لگا ہے۔ ان تمام باتوں سے گھبرا کر جب نہ بیوی کو خط لکھتے ہیں اور نہ ہی والدین کو تو دونوں الگ الگ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ والدین سمجھتے ہیں کہ بیوی کو "اندر ہی اندر" خطوط لکھے جا رہے ہیں اور انھیں بھلا دیا گیا ہے۔ بیوی اس گمان میں مبتلا کہ والد صاحب کو ان کے دفتر کے پتے پر نہ صرف خط ہی لکھے جاتے ہوں گے بلکہ منی آرڈر بھی روانہ کیا جاتا ہوگا۔ بیوی تو اس معاملے میں ایک قدم ہی نہیں دس قدم اور آگے بڑھ کر یہ سوچنے لگتی جاتی ہے کہ نہ معلوم شہر میں کس سے دل بہلا رہے ہوں گے۔ کہ اس کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ان باتوں کی پروا کئے بغیر جب ہم عدل و انصاف پر اتر آتے ہیں۔ اور بیوی اور والدین کو ایک ساتھ خط لکھتے ہیں تو بدحواسی کے عالم میں بعض وقت بیوی کے لفافے پر والد صاحب کا پتہ اور والد صاحب کے لفافے پر بیوی کا پتہ لکھ دیتے ہیں۔ نتیجۃً وہ تمام راز و نیاز جو بیوی سے وابستہ ہوتے ہیں والد صاحب کو معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ جملہ سعادت مندانہ حرکات جو بیوی سے چھپا کر والدین سے روا رکھی جاتی ہیں۔ بیوی کو معلوم ہو جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو لکھا تھا کہ "تم ناحق ناراض ہو گئیں اگر یہی بات تم پہلے لکھ دیتیں تو میں والد صاحب کو ایک پیسہ بھی نہ بھیجتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ ماہ سے والدین کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں بھیجوں گا۔ کہو اب تو خوش ہو نا؟"

اس کے بعد کی عبارت نقل کرنے کی نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ والد صاحب کے ہاتھ لگ گئی جس کو پڑھ کر نہ معلوم والد صاحب پر کیا گذری۔ برخلاف اس کے والد صاحب کا خط بیوی صاحبہ کو مل گیا جس میں لکھا تھا: "قبلہ گاہی۔ آپ کے حسب منشا میں فوراً اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تیار ہوں۔ آپ نے دوسری شادی کی بات

چیت جہاں شروع کی ہے اس کو بہ عجلت ممکنہ طے فرما دیجئے:

ایڈیٹر اور مضمون نگار کے خطوط میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایڈیٹر کا خط جتنا مختصر ہوتا ہے۔ ادیب کا خط اتنا ہی طویل ہوتا ہے۔ مثلاً ایڈیٹر کا خط دو سطر کا ہو تو ادیب کا خط دو صفحے کا ہوتا ہے۔ یہ دو صفحے بھی فل اسکیپ سائز کے ہوتے ہیں۔ جبکہ ایڈیٹر کے خط کی دو سطریں ... پوسٹ کارڈ پر ہوتی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ ایڈیٹر کو ایسے دو دو سطر کے سیکڑوں خطوط لکھنے پڑتے ہیں جن کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو ادیب کے فل اسکیپ سائز کے دو صفحوں سے کئی گنا زیادہ ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگ بھی ہیں جن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خط میں کیا لکھیں۔ جب وہ خط لکھنا چاہتے ہیں، تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ کہ کس طرح شروع کریں۔ خط لکھنا تو درکنار انھیں آداب و القاب بھی نہیں معلوم ہوتے۔ ایسے ہی ایک صاحب نے خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ آداب القاب سے ناواقف تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ مختلف لوگوں کے خطوط کے القاب دیکھ کر نقل کر لیے جائیں۔ چنانچہ چند خطوط فراہم کر کے القاب یاد کر لیے اور جب بیوی کو خط لکھا تو "قبلہ گاہی" سے شروع کیا اور والد صاحب کو خط لکھا تو "جانِ من" سے مخاطب کیا۔

بعض لوگ خط لکھنے کے معاملے میں ایسے پابند ثابت ہوتے ہیں کہ مجرا لیہود نمازیں قضا کرنے کے معاملے میں اور دعوتوں میں وقت سے پہلے پہنچ جانے میں پابند ہیں انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی ان کے خط کا جواب بھی دیتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی تنگ آ کر ایک آدھ خط کا جواب دے دیتا ہے تو وہ خط اپنے دوست احباب عزیزوں اور رشتہ داروں کو دکھانے کی غرض سے جیب میں اس طرح رکھتے ہیں جیسے ناک میں مرغی کا پر آدھا ادھر آدھا ادھر یعنی آدھا خط جیب کے اندر ہوتا ہے اور آدھا خط جیب کے باہر۔ غالباً انھی کے لیے مرزا غالبؔ نے یہ شعر فرمایا تھا ؎

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب خط لکھنے کے معاملہ میں نہایت پابند تھے بلکہ بعض وقت تو یہ خیال آتا ہے کہ مرزا صاحب کو خط لکھنے کے سوائے اور کوئی کام نہ تھا۔ انھوں نے محبوب کو خط لکھنا شروع کیا تو اتنے خطوط لکھے کہ مزید کوئی خط لکھنے کے لیے مضمون یا مطلب باقی ہی نہ رہا کیونکہ جتنی باتیں لکھنے کی باتیں تھیں وہ سب لکھ چکے تھے بلکہ وہ باتیں بھی لکھ چکے تھے جو لکھنے کی نہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے لفافوں کا ایک بنڈل خرید لیا اور ان پر اپنے محبوب کا پتہ لکھ کر یکے بعد دیگرے یا یوں کہیے ہر گھنٹے کے وقفہ سے ایک لفافہ پوسٹ کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے اس خیال کی تائید مرزا غالب کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

ایک صاحب خط کا جواب دینے کے معاملے میں کاہلی کا الزام ہمیشہ اپنے مخاطب پر رکھنے کے عادی تھے۔ چار پانچ خطوط وصول ہونے کے بعد صاف یہ لکھ دیتے تھے کہ اس سے پہلے یہاں کوئی خط نہیں ملا۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے کسی دوست کو اپنے خط کے جواب میں" سہواً یہ لکھ دیا۔ بھائی صاحب یقین مانیے اس سے پہلے مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ بالفعل آپ کے چوتھے خط سے معلوم ہوا کہ آپ ایک طویل عرصہ سے بیمار ہیں:

بعض لوگ اتنے طویل خط لکھنے کے عادی ہوتے ہیں کہ ان کا خط پڑھنے کے لیے کسی تعطیل کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور جب کوئی تعطیل آتی ہے تو دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے خط پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس طرح کئی تعطیلات گذر جاتی ہیں۔ اس درمیان دو چار خطوط اور وصول ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام خطوط بغیر پڑھے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ آخر میں یا تو وہ جائے بنانے کے کام آتے ہیں یا پھر جمع کر کے ردی کے طور پر فروخت کر دیے جاتے ہیں تاکہ ایک روز آفس جانے کا بس کا کرایہ تو نکل جائے۔ اگر خطوط کی تعداد کچھ اور بھی زیادہ ہو تو۔ کسی پکچر کا ٹکٹ خرید لیا جاتا ہے۔ آخر میں ایک مختصر جوابی خط لکھ دیا جاتا ہے کہ: بھائی صاحب آپ جواب کا انتظار نہ کریں خط پابندی سے لکھتے رہیں۔ میں آپ کے تمام خطوط پڑھ چکا ہوں۔ لیکن حافظہ اتنا کمزور ہے کہ ان تمام خطوط میں سے ایک بھی بات یاد نہ رہی چنانچہ آپ ان تمام باتوں کو پھر اپنے خطوط میں لکھئے جو پچھلی بار لکھ چکے ہیں:

خط لکھنا اک آرٹ ہے ہر شخص کو اس میں مہارت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ خط لکھنے کو اس طرح لکھ لیتے جس طرح ہر شخص گاتا اور روتا ہے حالانکہ یہ دونوں بھی آرٹ کی تعریف میں آتے ہیں۔ گانے کے آرٹ میں گویا ماہر ہوتا ہو تو رونے کے آرٹ میں نوحہ گر ماہر ہوتا ہو۔ بعض لوگ خط لکھنے کے معاملہ میں اتنے کچے ہوتے ہیں کہ لکھنا کچھ چاہتے ہیں اور لکھتے کچھ ہیں جس کی وجہ سے عبارت کے معنی غلط نکلتے ہیں یا پھر کوئی معنی ہی نہیں نکلتے۔

اِنعام

رونق صبا

جب باجی نے یہ خوشخبری سنی کہ بھابی کا پاؤں بھاری ہے تو وہ فوراً دوڑی آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا خوشی سے پاگل ہو جائیں گی۔ میں جب بھی باجی سے ملنے گئی انھیں کاموں میں مصروف پایا۔ کبھی تو وہ بھابی کی پسندیدہ چیزیں بنا رہی ہوتیں تو کبھی منے کے لیے سوئٹر بن رہی ہوتیں۔ اور کبھی اس کے سوٹ تیار کرنے میں لگی نظر آتیں۔ باجی کے آجانے پر بھابی کو بالکل اطمینان ہو گیا تھا۔ سارا کام باجی کے ذمہ ہی تھا۔ وہ اتنی خوش تھیں کہ انھیں کاموں کی زیادتی کا خود بھی احساس نہ ہوتا تھا۔ جب میں آنے لگی تو باجی بے حد لجاجت سے کہتیں۔ معاف کرنا صبا! آج میں تم سے بات بھی نہ کر سکی! لیکن میں جانتی تھی کہ باجی آج کل کتنی خوش ہیں جب شادی کے پانچ سال بعد بھی بھابی کی گود سونی ہی رہی تو باجی کو یہی فکر ہر وقت ستاتی رہتی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب باجی چند دنوں کے لیے اپنے میکے آئی تھیں۔ ان کا میکہ تو انھیں بھابی اور بھیا سے قائم تھا۔ جب چھوٹی ہی تھیں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے ماں نے بیٹے کو ڈاکٹر بنا دیا لیکن بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے سے پہلے ہی وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ آخری سانسوں تک انھیں اپنی بیٹی ہی کا خیال تھا۔ بیٹے کی شادی کے بعد اسے گھر سے بے تعلق دیکھ کر انھیں بیٹی کی فکر زیادہ ہو گئی تھی۔ اور جب کسی کا سہارا نہ دیکھ کر انھوں نے صفیہ کا ہاتھ اپنی منہ کے ہاتھوں میں دے دیا تو انھیں اطمینان ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد رفیہ باجی کی پھوپھی انھیں رخصت کرا کے لے گئیں۔ باجی کی شادی میں کوئی اہتمام نہ ہو سکا تھا۔ تھا ہی کون جو کرتا اس لیے باجی کی زبان پر لفظ شکایت کبھی نہ آیا بلکہ وہ اور بھی خلوص و محبت سے ملتی رہیں۔ ایک بار شب برات منانے چند روز کے لیے آئی تھیں۔ مجھے آج تک یاد ہے وہ شب قدر حلوہ بناتے بناتے تھک گئی تھیں اور ایک سہانی سی تھیں کہ باجی آ گئیں اور انھوں نے آتے ہی سوال کر ڈالا: "ارے صبا! جاگو گی نہیں کیا؟"

"جاگوں گی کیوں نہیں باجی! مجھے تو دعائیں مانگنی ہیں!" میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"کیا دعا مانگو گی" صبا! باجی نے پوچھا۔

"یہی کہ میں فرسٹ ڈویژن لا کر امتحان پاس کروں۔ اور ہاں آپ کیا دعا مانگیں گی باجی!"

"میں تو بس ایک ہی دعا مانگوں گی اور وہ دعا بھابی کی گود بھر جانے کی ہوگی" باجی نے ایسی سنجیدگی سے کہا تھا کہ میرا دل بھر آیا تھا اور باجی کے ساتھ میں نے بھی دعا کی تھی کہ اے خدا باجی کی مراد جلد پوری کر دے، ان کی گود بھر دے! اور خدا نے میری اور باجی کی یہ دعا جلد ہی سن لی اگلے ہی ماہ باجی کو یہ خوشخبری مل گئی کہ بھابی کا پاؤں بھاری ہے پھر کیا تھا باجی کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

منے کی آمد پر ہر طرف خوشیوں کے دیپ جل اٹھے بھابی کو اگلے ہفتہ ہی اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ بھابی کے گھر آتے ہی برہی کی تیاری زور و شور سے ہونے لگیں۔ اس دن کا منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا پورا بزاری بازار امڈ آیا ہے۔ سب کو کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ بالکل بارات کا سا سماں تھا۔ حویلی کوٹھی رنگین بلبوں سے سجی بالکل دلہن نظر آ رہی تھی۔ جتنا اہتمام ہو سکتا تھا اس سے کہیں زیادہ کیا گیا تھا۔ مجھے باجی کی شادی کا سماں یاد آ رہا تھا۔ اس کے مقابل آج کا یہ اہتمام نہ جانے کیوں اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا لیکن باجی تو خوشی سے ناچتی چل رہی تھیں۔

میں نے جب باجی سے کہا کہ باجی! آپ نے اپنی چیزیں مجھے نہیں دکھائیں؟ باجی نے مسکرا کر کہا "ارے صبا! تمھیں دکھا دوں نہیں تو پھر فرصت نہ ملے گی" باجی کا کمرہ سب سے الگ تھلگ تھا۔ وہ مجھے وہیں لے گئیں اور جو کچھ انھوں نے تیار کیا تھا میرے سامنے پھیلا دیا۔

خوبصورت خوبصورت ننھے ننھے کئی سوٹ تھے۔ کئی خوبصورت کھلونے تھے چاندی کی کٹوری، کا جلونی، چُسنی اور جھن جھنا سبھی چاندی کا تھا ایک ننھی سی سونے کی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ ننھے ننھے جوتے بھی تھے بھابی کے لیے خوبصورت نیلکس کی ساری تھی جس پر باجی نے خود ہی سیپ اور موتیوں کا کام بنایا تھا۔ منے کے لیے گدے اور نیلے ننھے کڑھے ہوئے تکیے بھی تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میرے منھ سے داد تحسین کے الفاظ ابل پڑے۔ باجی میری تعریف سن کر خوشی سے کھل اٹھیں۔ بولیں۔ میرا دل تو بہت کچھ چاہتا تھا صبا! لیکن تم تو جانتی ہی ہو کہ تمھارے نوشے بھائی ایک معمولی کلرک ہیں۔"

میں نے کہا آپ کی چیزیں بھابی کے میکے سے آئے ہوئے کپڑوں سے بھی عمدہ ہیں، آپ بیکار ہی احساس کمتری میں مبتلا ہیں پھر بھابی کو کپڑے پہنائے گئے۔ باجی نے اپنے ننھے سے بھتیجے کو کاجل لگایا۔ سبھی لوگ باجی کے لائے ہوئے سامان کی تعریف کر رہے تھے۔ باجی کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ تھی۔ لیکن بھابی کے چہرے سے ناگواری ٹپک رہی تھی۔ بھابی نے باجی سے کچھ کہا۔ باجی پل بھر میں گئیں اور واپس آگئیں کہا "مجھے نہیں ملا"۔ تب بھابی خود گئیں اور پھر اچانک رونے کی آواز سن کر ہم سب دوڑے بھابی پچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں ہر طرف سے کیا ہوا کیا ہوا؟ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اسی وقت بھابی کی امی بیٹی کو سنبھالتے ہوئے بولیں "کیا ہوا کچھ کہو بھی تو؟"

بھابی نے روتے ہوئے بتایا کہ ان کے بکس سے وہ گھڑی غائب ہے جو نیگ میں رقیہ کو دینے کے لیے خریدی تھی وہ گھڑی اور ایک ہزار روپیہ غائب ہے!" آخر کون چور دلن میں آگیا اور صرف یہی دو چیزیں لینے کو چور کیوں آئے گا یہ ضرور گھر کے ہی کسی آدمی کا کام ہے۔"

ہر طرف سے لوگ طرح طرح کی باتیں بولنے لگے۔ باجی حیران سی کھڑی تھیں۔ اچانک بھابی نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چپ کیوں ہو کہتی کیوں نہیں کہ میں نے تمہارے ہی روپیوں سے تمھیں سجایا ہے اپنا ارمان نکالنے کا شوق اس طرح چوری کر کے پورا نہیں کیا جاتا۔"

بھابھی کی امی نے بھابی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "جبھی کہوں کر دو ٹکے کے کلرک کی بیوی اتنا کچھ کیسے کر لائی۔" میرا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا لیکن باجی کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے میں بھی چپ تھی۔ باجی نے کوئی احتجاج نہیں کیا خاموشی سے سب کچھ سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور بھیا کھڑے سنتے رہے بھابی کے دل میں جو آئی سناتی گئیں۔

اچانک باہر سے ساجد بھائی کی آواز گونجی جو اسی وقت بھابی کی چھوٹی بہن شاہینہ کو لے کر آئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "ہم غریب ضرور ہیں بھابی لیکن اتنے نیچ نہیں ہیں۔ رقیہ نے یہ سب کیسے کیا ہے۔ مجھے سب پتہ ہے۔ انسان کا دل بڑا ہو تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ کاش آپ ہماری محبت کو سمجھ سکیں۔"

بھابی کی نفرت آمیز آواز گونجی" تو پھر میرا روپیہ اور گھڑی کہاں گئی۔"

"جائے گی کہاں۔" بھابی کی چھوٹی بہن نے کہا۔ "تمھارے بکس ہی میں ہوگا سب کچھ" اور اس نے بہن کو ساتھ لے کر کمرے کا رخ کیا۔ وہاں بکس ہی میں روپیہ بھی تھے اور گھڑی بھی۔ دراصل بھابی نے جس بکس میں یہ سب رکھا تھا وہ انھیں یاد نہ رہا تھا۔ وہ دوسرے بکس کو دیکھ کر چونک اٹھی تھیں۔ اور اب ان کی پشیمانی قابل دید تھی۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ اور شاہینہ کہہ رہی تھی۔ "باجی سے معافی مانگو آپا گھڑی کیا ہو؟" لیکن اس سے پہلے کہ باجی سے بھابی معافی مانگیں باجی ساجد بھائی کے ساتھ جا چکی تھیں۔ اتنی ذلت کے بعد کون رہتا۔ کس لیے رہتا۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میں نے سوچا بھابی نے باجی کی محبت اور ان کی چاہت کا انھیں کتنا بڑا انعام دیا ہے! جسے باجی شاید کبھی نہ بھول سکیں گی! محبت کا ایسا انعام کوئی بھول سکتا ہے۔!

پچی چھمن کی لاڈلی مرغی

عطیہ پروین

پچی چھمی پیلا سا منہ لال چقندر کئے برقعہ کندھے پر رکھے اندر آئیں تو خالہ جان نے پوچھا

"اے بی خیر تو ہے!"

خیر کہاں بھابی! پچی برقعہ تخت پر پھینک کر بولیں۔ یہ محلے والے جینا دوبھر کیے ہیں ارے اب نئے نئے لوگ آبسے ہیں نا۔ اے وہ پرانے خون تو رہے نہیں۔ جن کی مروت محبت ہو رواداری ہو۔ اب تو بس لاٹھی مار اور لکڑ توڑ بات ہوتی ہے....

"ہوا کیا پچی؟" بھیا نے پوچھا۔

ارے بیٹا میری ددآبدار (پچی کی لاڈلی مرغی) تم جانتے ہو کیسی غیرت دار مرغی ہے....

"جی ہاں خوب جانتا ہوں" بھیا بڑی سنجیدگی سے بولے "ابھی کل ہی کی بات ہے دروازے پر کھڑی تھی میں نے شرارتاً آنکھ مار دی۔ کڑکڑا کر اندر بھاگ گئی"

"اے بیٹا حد ہوگئی بے شرمی کی" پچی فوراً بھیا کے پیچھے دوڑیں۔ "آنکھ مار دی.... کیا ڈھٹائی سے میرے سامنے کہہ رہے ہو" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں "میاں آج کل کی یہ بے حیائی بے شرمی دیکھو کہاں لے جاتی ہے (جوش میں آکر) ارے اب بھی آسمان پھٹ کے زمین میں نہ سمائے گا میں کہتی ہوں قیامت قریب ہے....."

میں بھیا کو آنکھیں دکھا کر پچی کے مقابل بیٹھ گئی اور پاندان کے سامنے رکھ کر بولی۔

"ددآبدار کو کیا ہو گیا پچی؟"

پچی کا غصہ پھر ابال کھا گیا۔

"بیٹی اس کے دشمنوں کو کچھ ہوا نہیں مگر ہو جاتا.... ارے غضب خدا کا مردہ شیر ایسا کتا اس پر لپکا...."

"کتا؟ کس کا کتا؟" خالہ جان نے حیرت سے پوچھا۔ "میرا شامی تو نہیں تھا!"

"نہیں بی۔ تمہارے شامی کو تو نہیں کہہ رہی ہوں وہ سامنے کوٹھی والے وکیل کی بات کہہ رہی ہوں۔ لو اور سنو دسیوں کتے پال رکھے ہیں۔ کوئی منحوس صورت کائی موا چیتا ارے منوں اناج کھا جاتے ہوں گے۔ چلو ایک ہو تو غنیمت تھا۔ پہرے داری کرتا مگر اس فوج کا کیا ضرورت تھی!"

"کتے پالنا ان کی ہابی ہے!" بھیا بولے۔

"اے ہابی ہویا گیند مجھے اس سے مطلب نہیں...."

"ہابی نہیں ہابی!" بھیا نے کہا اور فوراً بات بھی بدل دی "ہاں پچی اناج ہی نہیں دودھ، گوشت بھی کھاتے ہیں وہ کتے!"

"دودھ بھی....؟" پچی حیرت سے بولیں۔

"اور گوشت!" بھیا نے بڑے سکون سے کہا۔

"میرے مولا!" پچی نے سینے پر دو ہتھڑ مارا۔ "مہنگائی کا یہ عالم ہے غریب نگوڑے ایک ایک ٹکڑا روٹی کو ترس رہے ہیں اور یہ مروے ناشا دکتوں کو گوشت روٹی کھلا رہے ہیں۔ دودھ پلا رہے ہیں.... اسے کوئی پکڑ دے اندر اگا ندھی بی بی کو تب پتہ چلے.... پوچھو بال بچے نہیں۔ بس دو میاں بی بی ہو تو نیک کاموں میں دل لگا ؤ یتیموں یسیروں کو کھلاؤ پلاؤ بی بی میری اسکول بنواؤ مسجد بنواؤ...."

"پچی آپ شورہ دیجئے تو وہ ضرور مان لیں گے!" میں نے کہا تو پچی بڑے زور سے بگڑیں۔

"اوئی نوج! میری جوتی دے مشورہ! بھاڑ میں جائیں وہ یہاں کریں عیشیں وہاں تو سزا ملے گی.... ارے میں دونوں وخت اٹھتے اٹھتیں کی اس نیچ کو کوسوں گی پانی پی پی کے کوسوں گی۔ میری ددآبدار کو دوڑا لیا۔ اس خدائی فوجدار نے۔ اللہ اس کی ٹانگوں پر فالج گرائے...."

"وکیل صاحب نے دوڑا لیا؟" بھیا سوکھا سا منہ بنا کر پوچھنے لگے اور پچی نے چڑھ کر کہا۔

"اوئی بھیا ابھی تک سمجھ نہ پائے...

وکیل نے نہیں۔ ان کے کتے نے!"

"بچ گئی ناچی؟" خالہ جان نے پوچھا۔ اور چچی اس طرح برا مانیں جیسے دو آبدار نہ کہہ کر مرغی کہہ کر خالہ جان نے مرغی اور ان کی سخت توہین کی ہے۔

ہاں اللہ کا شکر ہے بچ گئی…… ایسا سہم گئی تھی کہ گھنٹوں دم سادھے میری گود میں بیٹھی رہی۔"

"ارے بچ بچ!" بھیا نے ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا تو چچی کے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی پاندان کھولتی ہوئی بولیں۔

"ہاں بھیا تم جانو دوغلی تیغلی تو ہے۔ نہیں اصلی خون ہے امریکہ سے انڈے آئے تھے اس سے یہ نکلی۔ نہ زیادہ سردی برداشت نہ زیادہ گرمی برداشت جاڑوں میں میرے پاس لحاف میں گھس کر بیٹھتی ہے۔"

"حد کر دی بی تم نے۔" خالہ جان ہنس پڑیں۔ "بیٹ نہیں کرتی!"

"جھوٹ بولوں قیامت کے دن سور کا منہ لے کے اٹھوں۔" چچی نے جوش کے مارے کٹی ہوئی چھالیہ کا بہت بڑا پھنکا مارا اور پھنسی پھنسی آواز میں بولیں۔ "کسی دن آ کے دیکھو۔ بستر کی جیبا پڑا رہتا ہے۔ صبح میرے ہی ساتھ پاخانے جاتی ہے۔"

بھیا کو بڑے زور کی کھانسی اٹھی یعنی ہنسی روکی۔ چچی کتھا چونا چاٹ کر اور تمباکو کی چٹکی پھانک کر کہتی رہیں۔

"گرمی میں بھیا میں اس کو لو، دھوپ سے بہت بچا کے رکھتی ہوں۔ ساری دوپہر اس کے پنکھا جھلا کرتی ہوں شام کو ایک پیالی بانکے کا شربت گھول کے پلاتی ہوں……"

"اور جاڑوں میں چائے!" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ چچی کو اور جوش آ گیا۔

"ہاں بیٹی خوب گاڑھی چائے پیتی ہے میری دو آبدار۔ ارے اس کی بساط ہی کیا ہے۔ ایک بڑا چمچہ چائے…… میں نے اس کی عادت ہی ایسی ڈالی ہے۔ وقت پر ناشتہ وقت پر کھانا۔ بیچ میں کھائے تو… اللہ قسم اس کو بدہضمی ہو جاتی ہے۔"

"یا اللہ، یا اللہ!" بھیا نے کہا نستہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا دیئے اور میں نے بڑی ہی مشکل سے اپنی ہنسی روکی چچی کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"اس وقت بی بلا میں نے ایک چمچہ بھر گرم دودھ پلایا اس کو سہلایا چمکارا، گلے لگایا دعائیں پڑھ پڑھ کے پھونکیں تب جا کے اس کے حواس ٹھکانے آئے……"

"مگر یہ حادثہ ہوا کیسے وہ باہر تو نکلتی نہیں ہے؟" بھیا نے کہا چچی بڑے فخر سے بولیں۔

"اے وہ مثل سنی ہے تم نے تخم تاثیر صحبت کا اثر…… میں نے بچپن سے اس کو ایسا سکھایا کہ وہ دروازے پر چاہے منٹ دو منٹ کھڑی ہو جائے پاؤں باہر نہیں نکالتی ہے…… ہونی بات تھی۔ بیٹا ایک بچہ اس کا باہر نکل گیا۔ وہ نگوڑی بھی ماتا کی ماری نکل گئی وہ مرزا شیر وکیل کا سگا ان کے ساتھ سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ زنجیر چھڑا کر غراتا ہوا دوڑا۔ ایسے بیٹا آواز تھی، اس کی مانو شیر ببر دھاڑ رہا ہو میرا تو دشمنوں کے وہ کیا کہتے ہیں پیٹ نیل — ہوتے ہوتے بچا…… نماز پڑھ رہی تھی دوڑی۔ اب چیخ رہی ہوں چلا رہی ہوں مگر وہ وکیل کا بچہ دانت نکوسے کھڑا ہے۔" چچی دانت پیس کر بولیں۔ "ڈھائی گھڑی کی موت آئے کمبختی کو۔ بی بی کی جھاڑو پھر جائے اس کی صورت پر…… وہ تو کہو اچھن میاں کا نوکر کھڑا تھا دوڑا۔ کتے کو زنجیر پکڑ کر روکا نہیں تو وہ گھر میں گھس آتا اور سنو وہ کہتا کیا ہے وہی وکیل مونڈی کاٹا…… میرا کتا کسی مرغی کو نہیں برداشت کر سکتا آپ کو چاہیئے کہ اندر بند رکھا کریں مرغی کو…… ارے نہ ہوئے جمال کھایا……" چچی کی آواز بھر آگئی۔ "اسی وقت گولی مار دیتے کتے کو، ان کا غصہ پوری نیا میں مشہور تھا۔ غصے میں آ کر چیختے تو جناب امیر کی قسم پیٹ والی عورتوں کے پیٹ گر جاتے تھے!"

"اے بس کر دو بی……" خالہ جان اب زور سے ہنس پڑیں۔ "نادی تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔" چچی خفا ہو گئیں۔ "اچھن میاں سے پوچھو سوٹے والے بڑے میاں سے پوچھو بڑے بڑے ان کے سامنے پیشاب کر مارتے تھے۔"

"خیر چچی،" بھیا بولے۔ "اب تو دو آبدار صاحبہ ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں بھیا کہا نا، اب جا کے غریب کے حواس ٹھکانے آئے ہیں کل ہی مولوی صاحب سے تعویز لکھا کر جان کی سلامتی کا اس کے گلے میں ڈالوں گی……"

"کچھ نذر و نیاز بھی تو ہونا چاہیئے چچی!" بھیا نے چڑھا دیا۔

"ضرور ہو گی۔" چچی خوش ہو کر بولیں۔ "اب اس وقت تو دکانیں بند ہو گئی ہیں کل اللہ نے چاہا رس گلے منگا کر نذر دلاؤں گی!"

"رس گلے!" بھیا نے چٹخارہ بھرا۔

"تو پھر ہم لوگ کل کس وقت آ جائیں چچی؟" میں نے پوچھا۔ چچی چیختی چلاتی آئی تھیں ہنستی ہوئی دروازے کی طرف بڑھتی بولیں۔

سماجی ترقی

گزشتہ 18 مہینوں میں ملک میں ایک پرامن معاشی و سماجی انقلاب رُونما ہوا ہے۔

- نومبر 1976 کے آخر تک تقریباً 71 لاکھ کنبوں کو مکان بنانے کی جگہیں مہیا کی گئیں (اس کے لئے کل مستحق کنبوں کی تعداد 6, 113 لاکھ ہے)
- تمام ریاستوں میں زمین کی ملکیت کی حد کے تقرر کو عمل میں لانے کے لئے قوانین منظور کئے گئے ہیں۔
- گیارہ ریاستوں اور چار مرکزی علاقوں میں دیہی قرضوں کو ختم کرنے کی قانونی کارروائی کی گئی (اس میں قرضوں کی وصولیابی پر روک لگانے کی کارروائی بھی شامل ہے)
- 198, 89 بندھوا مزدوروں کا پتہ لگا کر انھیں آزاد کرا دیا گیا ہے۔

حریمی دسترخوان

از حمیدہ بانو

شیش کباب

ان کبابوں کو شاشلک بھی کہا جاتا ہے۔

اشیاء:۔ بکرے کی ران کا گوشت ایک سیر، سرکہ چار بڑے چمچے، گرم مسالہ پسا ہوا ایک چمچہ، نمک اور سُرخ مرچ حسب ذائقہ، لیموں دو عدد، پیاز ایک گٹھی بڑی، ٹماٹر آدھ پاؤ، گھی آدھ پاؤ۔

ترکیب:۔ گوشت کے ٹکڑے ایک انچ موٹے اور ایک ہی انچ کے برابر بنائیں۔ لیموں کا رس نچوڑ کر اس میں سرکہ، گرم مسالہ، اور نمک مرچ سب خوب ملائیں اور یہ سب کچھ گھی میں ڈال کر حل کرلیں۔ اب اس میں گوشت کے ٹکڑے صاف کرکے دھو کر ڈال دیں۔ اسطرح کہ ٹکڑے بالکل مسالے سے تر ہو جائیں۔ ان ٹکڑوں کو فریج میں کم از کم چھ گھنٹے ضرور رکھیں۔ اگر ایک دو گھنٹے زیادہ بھی گزر جائیں تو کوئی بات نہیں۔

اب ان ٹکڑوں کو سیخوں میں پرو دیں۔ اس طرح کہ ایک گوشت کا ٹکڑا ایک گول کٹا ہوا پیاز، اور ایک ٹماٹر ہو۔ اس طرح پرو کر ان کو کوئلوں پر سینک لیں۔ اور گرم گرم اتار کر سوس اور سلاد کے ساتھ کھائیں۔ بیحد لذیذ شیش کباب ہوں گے۔

ہیمبرگر (بند کباب)

اشیاء: ڈبل روٹی کے بند چھوٹے آٹھ عدد، قیمہ آدھ سیر، ٹماٹر آدھ پاؤ، سلاد کے پتے ایک گٹھی، سبز مرچ آدھی چھٹانک، کالی مرچ بارہ عدد، گھی یا مکھن ایک بڑا چمچہ۔

ترکیب:۔ قیمہ سل پر باریک پیس لیں۔ اتنا باریک کہ گندھے ہوئے میدے کی طرح ہو جائے اب اس میں پیاز باریک کاٹ کر خوب ملائیں۔ اتنا ہاتھ سے گوندھیں کہ یکجان ہو جائے۔

اب فرائی پین میں چمچہ بھر گھی ڈال کر اس قیمہ کی ٹکیاں یعنی کباب بنا کر تل لیں۔ اور بند کے دو دو ٹکڑے کرلیں اور ہلکی آنچ پر معمولی سینک لیں۔ اب اس ٹکڑے پر ایک سلاد کا پتہ گول کرکے رکھ دیں اس میں ٹماٹر اور پیاز کے چند ٹکڑے رکھ دیں اوپر ایک کباب رکھ کر دوسرا ٹکڑا اوپر جما دیں اور کھانے کے لئے گرم گرم استعمال کریں۔

تبصرا

ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا چاہئیں

یادیں

مصنف۔ رحم علی الہاشمی۔ سائز ۱۸ × ۲۲ صفحات ۱۲۰
قیمت آٹھ روپیہ ملنے کا پتہ رحم علی الہاشمی ۶ شبلی روڈ۔ علی گڑھ

یہ کتاب خود نوشت سوانح حیات ہے اور اس میں مصنف نے اپنی یادداشت کے مطابق ان حضرات کا بھی ذکر کیا ہے جن سے انھیں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔

خود نوشت سوانح عمری اگر سچائی کے ساتھ لکھی جائے تو بہت دلچسپ چیز ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات ضرور ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے باعث دلچسپی ہوں۔ ہاشمی صاحب سے ملنے کا اتفاق مجھے بھی ہوا تھا۔ شوکت تھانوی اخبار ہمدم میں موصوف کے اسسٹنٹ تھے، اس لئے اکثر ان کے ساتھ جانا رہتا تھا۔

جو شخصیتیں ہاشمی صاحب کو یاد ہیں ان میں شوکت تھانوی کا بھی ذکر ہے، لیکن اس میں ان کا یہ لکھنا کہ اخبار ہمدم بند ہونے پر کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اسٹیشن پر رہے اور پھر پاکستان چلے گئے درست نہیں۔۔ ہمدم بند ہونے پر شوکت صاحب میرے ادارے سے متعلق ہو گئے تھے اور برسوں اخبار سرپنچ کی ادارت کرتے رہے ان کی شہرت کا باعث اخبار سرپنچ ہی تھا جو ان کی اڈیٹری میں ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوتا تھا۔ یادداشت پر لکھی ہوئی باتوں میں بھول چوک ہوئی ہے۔ خود مصنف نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔ بہرحال دوسروں کے سوانح حیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یادیں ایک اچھی کتاب ہے اس لئے کہ اس میں اکثر مقتدر شخصیتوں کے تذکرے ہیں۔

حریمی دسترخوان

جس کے بہت سے اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ یہ اپنے مبحث پر ایک لاجواب کتاب ہے۔ ——— قیمت:- ۶/-

خوشی اور غم میں شریک حریم

اس عنوان کے تحت حریم بہنوں کی مرسلہ ایک خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف لکھیں مختصر ترین الفاظ میں ہو۔ پچاس پیسے کے ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔

• جنت بی آصفہ (آنولہ) میری پیاری باجی فیروزہ ضیا اور بہنوئی ضیاء الحق صاحب کے گلشن حیات میں پہلی بار اللہ پاک نے ایک کلی کھلائی۔ پیار کا نام فرح غزالی قرار پایا اللہ پاک اس کی عمر دراز کرے اور میری باجی و دولہا بھائی کو اس کی صد ہا خوشیاں دکھینا نصیب کرے۔

• ایک بہن نے گوشت کا کٹلیٹ، مچھلی کا کٹلیٹ اور انڈے کا چوب بنانے کی ترکیب حریم کے ذریعہ معلوم کی ہے۔

• مس نسیمہ بیگم بھولی (بھاگلپور) ۱۰ر جنوری ۸۰ء کی خوشگوار صبح بھیا محمد خلیل الرحمٰن اور بھابی شاکرہ رحمٰن صاحبہ کو اللہ پاک نے ایک نازک سی پیاری گڑیا عطا فرمائی ہم نے پیاری گڑیا کا نام فرزین دیبا رکھا اللہ اسے عمر طویل دے اور والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• مس عرفانہ نسیم (آنولہ) میری پیاری باجی جان و بہنوی کے چمن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ۲۱ر دسمبر بوقت فجر تیسری بار ایک پھول کھلایا۔ نام عدیل احمد قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ پھول ہمیشہ کھلا رہے اور عمر دراز پائے۔

• 9447 آپ کی خبر بلا ٹکٹ ملی پھر سے خبر مع ٹکٹ روانہ فرمائیں۔

• آمینہ شہزاد (بنگلور) پیاری بہن فاطمہ صغرا اور بہنوی ظہیر الدین صاحب کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۸ر فروری ۸۰ء بروز منگل بوقت شام ۶ بج کر ۵ منٹ پر پہلی بار ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ نام شہنواز احمد قرار پایا دعا ہے کہ بلند اقبال ہو اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• ام سلمیٰ بانو (آمیٹھ) میری ہمشیرہ صبیحہ سلطانہ اور بہنوئی سعد اللہ پاشا کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ۲۴ر جنوری ۸۰ء کو پہلی بار ایک ننھی منی کلی کھلائی۔ نام صوفیہ ترنم رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر دراز بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

• ناہید بانو (قلعہ مونگیر) میری بھابی شیریں اور بھیا شکیل احمد کے گلشن حیات میں پہلی بار ۸ر جنوری ۸۰ء بروز سنیچر بوقت ۳ بجے شب اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا منا عطا فرمایا۔ دعا ہے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور بلند اقبال ہو۔

پیغامات نشاط

میری عزیز بہن مشتری شریف صاحبہ اہلیہ مسٹر ایم۔ اے۔ شریف ٹیکنکل ممبر کرناٹک الکٹری سٹی بورڈ بنگلور نے اطلاع دی ہے کہ ان کے فرزند ظفر شریف سلمہٗ کی شادی خانہ آبادی ہمراہ صبیحہ سلمہا دختر نیک اختر جناب نور قاضی صاحب جوہو، بمبئی۔ ۲۷ر فروری کو بمقام بمبئی ہونے جارہی ہے اور دوسرے صاحبزادے مظفر شریف سلمہٗ کی شادی مسٹر ایس، جی محمود (بلاری) کی دختر نیک اختر شمیم سلمہا کے ساتھ بمقام بلاری عمل میں آئے گی۔ ۴ر مارچ کو دونوں دولہا اور دلہنوں کے خیر مقدم کی رسم ادا کی جائے گی۔ مجھے اور غزالہ کو باصرار دعوت شرکت دی گئی ہے مگر افسوس غزالہ بلیڈ پریشر میں مبتلا ہیں اور میں آنکھ کا آپریشن کرانے کی تیاری کر رہا ہوں دفتری حالات بھی اجازت نہ دے سکے کہ اپنی بہن کی مسرتوں میں جسمانی طور پر بھی شرکت کر سکتا بہر حال اللہ سے دعا ہے کہ یہ تقریبات بخیر وخوبی انجام پا گئی ہوں اور مبارک ہوں۔ نسیم انہونوی۔ غزالہ بیگم

• مسز ثریا حمید (فتح گڈھ) میری خالہ زاد نند طیب النسا بنت (جناب عبد القدیر) کی شادی محمد شفیع اللہ کے ساتھ ۹ر دسمبر ۷۹ء بوقت ۱۰ بجے بخیر وخوبی انجام پائی خدا سے دعا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی ہمیشہ پر بہار رہے۔

• شمیمہ (دھنباد) میری خالہ زاد بہن نازش تبسم دختر جناب سید شاہ سلطان احمد کی شادی۔ سید ابرار احمد بی، ایس، سی دبیر جناب اسرار احمد) مارکٹنگ افسر کے ساتھ ۲ ر جنوری ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۷ بجے شام بمقام ارول نہایت شان کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو سلامت اور شاد وخرم رکھے۔

انتقال پُرملال کی خبریں

• اس خبر سے دلی صدمہ پہنچا کہ محترم سجاد حسین صاحب انجینیر پرانا قلعہ لکھنؤ ۳۱ جنوری ۸۰ء کو ۱۱ بجے دن میں انتقال فرماگئے مرحوم کچھ عرصہ سے کینسر میں مبتلا تھے۔ اس موذی مرض نے ساری دنیا میں قیامت مچا رکھی ہے۔ سائنس داں چاند تک پہنچ گئے لیکن کینسر کا علاج معلوم نہ کرسکے۔ اللہ پاک مرحوم کے فرزند بیوہ اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت میں جگہ دے۔

نسیم انہونوی

• طاہرہ بیگم (اچھاپور) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ۵ اکتوبر ۷۹ء بروز پیر رات کے ایک بجے میرے مشفق والد صاحب قبلہ بمقام کراچی میری ضعیف والدہ بہنوں اور بھائیوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دار فانی سے رحلت فرما گئے مجھ بدنصیب کو ان کا دیدار بھی نصیب نہ ہوسکا۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(آپ نے نمبر خریداری لکھا نہ پتہ ورنہ میں خط سے تعزیت کرتا بہرحال خبر انتقال کی تھی اس لئے شائع کردی اللہ پاک آپ کو صبر دے)

• رضیہ سلطانہ (جنجیرہ مرود) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ہمارے مشہور و نامور ڈاکٹر داؤد علی شیخ بمقام مروڈ ۳ فروری ۸۰ء بروز جمعرات بعد نماز فجر انتقال فرماگئے۔ مرحوم بڑے متقی پرہیزگار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ دینی مشاغل کے ساتھ ہی سماجی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے اللہ پاک پیاری خالہ جان کو صبر عطا فرمائے۔

• مس قدسیہ شاہین (رحیم آباد سمستی پور) نہایت افسوس کے ساتھ تحریر کرتی ہوں کہ ۹ جنوری ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۵ بجے صبح بمقام ہریا سرائے اسپتال اپنی بیوی اور بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر میرے پھوپھا ابا محترم عتیق اللہ صاحب بلاسپوری اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے اللہ مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر دے۔

• این۔ زیڈ بیگم (ہاسن) افسوس میرے والد محترم جناب عبدالستار شریف صاحب ۲۶ جنوری ۸۰ء بوقت صبح ۴ بجے بعمر ۸۰ سال انتقال فرماگئے۔ مرحوم گزشتہ ۹ ماہ سے علیل تھے۔ والدہ محترمہ ۱۳ سال پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں اب میں یتیم و یسیر ہوگئی۔ حریمی بہنیں دعا فرمائیں کہ اللہ پاک میرے ابا مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ دین اور دنیا دونوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

• عابدہ بیگم (چھندواڑہ) آہ! یہ خبر آپ کو لکھتے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ ۱۱ جنوری ۸۰ء بروز جمعہ بوقت ۸ بجے شب میرا سہاگ لٹ گیا۔ اور میرے شوہر سید اشفاق علی صاحب نائب تحصیلدار اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شام کو ۷ بجے دورے سے واپس آئے ایک گلاس پانی طلب کیا۔ معمولی کھانسی آئی اٹھ کر باہر چلے گئے اور ایکدم فرش پر گر گئے۔ ڈاکٹر کے آنے کا بھی موقع نہ دیا ہارٹ فیل ہوگیا ہم سب ہاتھ ملتے اور تڑپتے رہ گئے اپنی نشانی میرے سوا دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ہم سب پر اپنا کرم کرے۔

(بہن آپ کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس پر مجھے بڑا دکھ ہے لیکن زندگی ایک حباب ہے اس کا کیا ٹھیک ہے صبر کیجیے بچوں سے دل بہلایئے۔ مرحوم کو قرآن پڑھ کر ثواب پہنچایئے۔

نسیم انہونوی

• افسوس صد افسوس کہ کلیم بکڈپو احمد آباد کے مالک جناب جمیل احمد آبادی ۱۷ فروری کو اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔ مرحوم ایک اچھے انسان اور خوش معاملہ کاروباری تھے۔ احمد آباد میں اردو کتب کا سب سے بڑا کاروبار عرصہ سے قائم کئے ہوئے تھے۔ ادب فروش ہی نہیں شاعر باکمال بھی تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام چھپنے کے بعد بہت مقبول ہوا تھا۔ اللہ پاک ان کی روح کو سکون بخشے۔ جنت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نسیم انہونوی

اس عنوان کے تحت حریم کی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ چھپ سکتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے عنوان کے تحت ہو۔ موزوں پاکیزہ اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری بھی لکھا گیا ہو۔ اپریل کے لئے عنوان ہے "صورت اور مٹی کے لئے خاک"۔

ہر دو جہاں میں ذکر حبیب خدا ہے آج
ہر ذرے کی زبان پر صل علیٰ ہے آج

مرسلہ۔ آفتاب سفیر (رحمن پٹن)

نبی ہیں ان کو نبوت سلام کہتی ہے
رسول حق ہیں رسالت سلام کہتی ہے
حبیب رب ہیں انھیں کو بصد نیاز عطا
ہر ایک چشم محبت سلام کہتی ہے

مرسلہ صوفیہ مظفر (جمشید پور)

• 997 شعر درست آپ نے دوست کی جگہ حبیب کر دیا ہے۔

اے حبیب کبریا، اے شافع روز جزا
آپ کی امت میں جب ہیں کیا غم محشر ہمیں

مرسلہ:۔ قمر نگار جلیلی (آسیور)

نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

مرسلہ:۔ شہناز پروین عراقی (کانپور)

• 935 آپ کا شعر درست نہیں غالباً رقیب کی جگہ آپ نے حبیب لکھ دیا ہے۔

یا حبیب خدا ہے یہ میری دعا
اتنی توفیق مجھ سے وطن کو ملے
خاک طیبہ ملے قبر کے واسطے
کالی کملی کا ٹکڑا کفن کو ملے

مرسلہ:۔ شگفتہ عائشہ صدیقہ (آبعد)

خوب دیکھیں گے روضۂ اقدس اور کوئے نبی میں جھومیں گے
ہم بھی پہنچے اگر مدینے میں، نقش پائے حبیب چومیں گے

مرسلہ:۔ صبیحہ سلطانہ (چھپرا)

ہاں۔ کیا بات ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا: ماجرہ نے کہا!

تم سے کچھ زیادہ ناراض ہیں کیا؟۔

کیوں؟

اب میں کچھ کہہ کے کیا دل برے کروں گی" فرحت نے پھر کہا اور سر جھکا کر پان لگانے لگیں۔ ماجرہ سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے اصرار شروع کیا۔ یہ ٹال مٹول کر کے ان کا اشتیاق اور کرید بڑھاتی رہیں بالآخر ہار جانے کے انداز میں بولیں۔

"ارے اب کیا میرا منہ کھلواؤ گی۔ میں اماں میاں کو دیکھنے گئی تھی۔ کچھ ان کی بیماری کی بات چلی اس پر شمسہ نے ہزار باتیں سنا دیں۔ خاص طور پر تم لوگوں کو گالیاں بددعائیں دے رہی تھیں کہ مذہب میں ہمسائے کا اتنا حق ہے مگر نہ تو ساجد بھائی خیریت پوچھتے ہیں نہ ماجرہ۔ اکیلا تابش کا بچہ بھی جاتا ہے وہی غریب بیمار کی دوا دارو لاتا ہے۔ ماجرہ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ کچھ دیر کے لیے ترنم کو بھیج دیا کریں وہ چولھا چکی دیکھ لے۔ بڑا رفاقت کا دم بھرتی ہیں۔ کہ سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔ جب تک آدمی پر اچھی بپتا نہ پڑے۔ اس کا کلیجہ نہیں سلگتا! ایک نٹ پونجیا گاڑی کیا خرید لی ہے کہ اب زمین پر پاؤں بھی نہیں دھرتے۔ ایسا غرور کس کام کا کہ آدمی اپنے مذہب اور اخلاق کے اصول بھی چولھے میں رکھ دے:

یا خدا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ شمسہ جیسی کم سخن، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ خاتون نے میرے پیٹھ پیچھے ایسی رکیک باتیں کی ہوں گی۔" ماجرہ کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔

میں بھی ان کا منہ تکتی رہ گئی" کانوں میں تیزی سے گلوری کھا کر فرحت نے کہا "مگر مجھے تو یقین کرنا ہی پڑا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ وہ بڑی حاسد اور چھوٹے دل کی عورت ہیں!" (باقی آئندہ)

ترنم کی نظریں تابش پر پڑیں۔ اور وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اس کے دل پر خنجر سے چل گئے ہیں۔ اس کا چہرہ حرماں نصیبی حسرت اور مایوسی کے جذبات سے پُرغبار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غم کے ڈورے لہرا رہے تھے۔ ہونٹ خشک تھے اور صاف ظاہر تھا کہ وہ اس پرفضا ماحول سے رتی بھر سرور حاصل نہیں کر رہا۔ شاید بیزار اور دامن کشاں تھا!

اس کے برعکس خرم اسم بامسمیٰ لگ رہا تھا۔ اپنے بھاری بھرکم سوٹ میں جیسے پھولا نہیں سما رہا تھا! چہرہ تر و تازہ۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ زیرلب مسکرا رہا تھا! ترنم سمجھدار تھی۔ اس کے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ تابش کی اداسی خرم کی مسرتوں کا باعث بن رہی ہے۔ وہ عجیب احساس رکھتی تھی۔ اگر اسے کبھی کبھار خرم کی زندہ دلی اچھی لگتی تھی تو اس وقت تابش کی اداسی اور اس کے غم اسے پریشان کرنے لگے۔ اس نے سوچا۔ کاش۔ یہ سب یہاں نہ ہوتے۔ وہ تابش کے ساتھ تنہا ہوتی!

آدمی کبھی کبھار عجیب و غریب جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو بھی نہیں سمجھتا! وہ بہت دنوں سے اسے جانتی تھی! اس کی فطرت میں رس بس گئی تھی۔ یہ تو خرم کی شخصیت تھی جس نے ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔ خرم اس کا کون تھا وہ تو تابش کے ساتھ کھیل کود کے بڑی ہوئی تھی۔ اسے ایک ایک یاد کانٹوں کی طرح چبھنے لگی۔ سات آٹھ سال کے اس طویل عرصہ میں جب بھی وہ تابش کے ساتھ رہی تھی۔ اس نے کبھی کوئی بات ایسی نہیں کی تھی۔ جو ترنم کی مرضی کے خلاف ہوتی۔ جس قسم کا کھیل ترنم کو پسند ہوتا وہ بھی اس کھیل میں شریک ہو جاتا۔ ترنم اس پر خفا ہوتی تھی۔ اس پر اپنی برتری جتاتی تھی۔ اس سے جھگڑ کر بات چیت بند کر دیتی تھی لیکن ہمیشہ تابش اس کی خوشنودی میں لگا رہا تھا! اس کی خفگی کے جواب میں کبھی خفا نہیں ہوا تھا!

لیکن اب اس کی سنجیدگی اور خفگی کیا اس لیے نہیں تھی کہ خرم ان کے درمیان میں آ گیا تھا۔ وہ تابش کے چہرے پر کبھی حرمان و حسرت، امید و بیم۔ اور آرزو کی نارسائی کی ان گنت لکیریں بکھری پڑھنے لگی۔!!

پھر وہ اپنے باپ کی واہ واہ سے چونکی۔ شاید تابش نے کوئی عمدہ سا شعر سنایا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہے تھے۔

دل خوش کر دیا۔ خدا سلامت رکھے۔ اچھا اسے پھر سے تو پڑھو: تابش نے پھر پڑھا۔

ناکامیاں سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

اچھا بیٹی اب تم سناؤ: فرحت نے کہا۔

ترنم بولی۔
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

دیکھیں ہمارے خرم صاحب کیا فرماتے ہیں: ناجرہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

اوہ مجھے کوئی معقول شعر یاد نہیں۔ آنٹی: خرم نے کہا۔

نامعقول ہی سہی: ترنم نے در پردہ تابش کی ادا کا بدلہ اس سے لیا۔

سب ہنسنے لگے ساجد صاحب نے کہا۔

ہاں ہاں دیکھیں اس سلسلہ میں تمہاری انیت کیسا ہے۔

پھر آپ مذاق نہ اڑائیے گا۔ انکل!:

بالکل نہیں۔ انھوں نے اطمینان دلایا۔

خرم کچھ دیر سوچتا رہا پھر کا دل کی شگفتہ پر وقت صرف کیا اس کے بعد داد طلب انداز میں بولا:

ترنم نے تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اور جواب دیئے بغیر چلی گئی۔ فرحت نے لپک کر اسے گلے سے لگا لیا: آؤ میری لاڈلی۔ کہاں تھیں۔ یہ دیکھو تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔

آپ اس قدر زیر بار نہ ہوا کیجئے: ناجرہ کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں دیکھ کر ترنم نے بے رخی سے کہا: میں بچوں کا کپڑے نہیں پہنتی!: اس کے دل میں خرم کا بدمعاش بچہ چبھ رہا تھا۔

یہ کیا بدتمیزی ہے: ناجرہ نے بناوٹی انداز سے للکارا: بڑے جو کچھ دیا کریں۔ وہ سلام کرکے لے لیا کرو:

مگر کیوں۔ خواہ مخواہ۔ کا: ترنم نے سخت لہجے میں کہا۔

زبان مت لڑاؤ: ناجرہ نے کہا۔ ترنم نے ایک جھٹکے سے کپڑا اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

کیا بات ہے۔ بہت برہم دکھائی دیتی ہو: خرم نے چپکے سے اس کا دوپٹہ تھام لیا۔

یہ کیا نکما پن ہے: ترنم نے غضب ناک ہو کر کہا اور آنچل چھڑا کر بھاگ گئی۔

دیکھ لوں گا۔ دیکھ لوں گا!۔ خرم نے دانت پر دانت جما لیے۔ پھر وہ دالان ہی سے چیخا: امی مجھے کیوں لائی ہیں یہاں۔ میں جا رہا ہوں:

چائے تو پیتے جاؤ: ناجرہ بیگم نے اوپری دل سے دعوت دی مگر خرم دل میں کچھ اور ٹھانے ہوئے تھا۔ وہ جواب دیے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

آج شمسہ نہیں آئیں: فرحت نے رواداری میں پوچھا پھر اپنا دامن اپنے آگے سرکایا اور ہاں چہکتی ہوئی بولیں: !!۔ بے چاری کا مزاج بھی سے ایسی ہو گئی ہیں کہ اب رکھا سکا مروت اور منہ دیکھا اخلاق بھی نہیں برت سکتیں۔ مجھے تو وہ سب سے برگشتہ نظر آتی ہیں:

پر اٹھا کر رکھ گیا۔ اور سیدھی ہو بیٹھیں۔ ان کے ساتھ خرم بھی تھا۔ سفید جھاگ سا
پتلون اور شوخ کلر کی جرسی میں بہت اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سلام کی خاطر
ہلکی سی گردن اٹھائی اور کرسی پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ "ترنم کہاں ہے نظر نہیں آتی"
فرحت نے پوچھا۔

"کچھ کام ہے ترنم سے؟"

"تم دونوں ماں بیٹوں کے مزاج سے میں بے چاری غریب ڈرتی ہی رہتی ہوں"
فرحت نے کہا۔ پھر جیسے کھسیا کر بولیں۔ "پتہ نہیں۔ تم اپنے دل میں کیا سوچتی ہوگی
کہ لونہا لوں کو پڑھا نا سکو ولی۔ ان بے چاری کو بڑی محبت پھٹ پڑی ہے۔ مگر
میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔

"اس بکواس کا مطلب ذرا بھی سمجھ میں نہیں آیا" ناجرہ نے کہا۔

"ہائے اللہ۔ کل شام کو خود افتخار ان کے ساتھ بازار چلی گئی تھی۔" فرحت کہہ کر
برقعہ میں لپٹا بنڈل کھولنے لگیں۔ کاغذ ادھیڑا اور ایک خوشنما پھولدار کپڑے کا پیس
نکال کر ناجرہ کی گود میں پھیلا دیا۔ "یہ اپنی بچی کے لیے لے لیا تھا۔ اب تم ناک بھوں نہ
سکوڑنا اچھا۔ ہائے۔ دیکھو اسے کیسا اچھا لگتا ہے کرتیں۔"

"مگر تم یہ فضول خرچی کیوں کرتی ہو۔ فرحت"

"اچھا بس اب چپ رہو۔ کیسی غیریت برتنے" فرحت نے للکارا۔ "ایسا کون سا
پچیس روپیہ خرچ کرنے سے میں کنگال ہو گئی" انھوں نے پیس دراز میں داخل کر
دیا کہ اگر ابھی سو پیسے کا تھا۔ پھر انھوں نے ترنم کو آواز دی۔ وہ کمرے سے نکلی اور خرم
کی بھوکی نظریں اس پر گڑ گئیں۔

"کہاں چھپی بیٹھی تھیں" خرم نے آہستہ سے کہا۔ "جیسے چاند ابر میں۔ گھنٹہ بھر سے
[illegible]

کوئی حسینہ جب روٹھ جاتی ہے تو
اور بھی حسین ہو جاتی ہے!

"لاحول ولاقوۃ" ساجد صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ "میاں یہ کس
شاعر کا نثری مصرعہ ہے۔ کیا سنایا ہے تم نے۔ استغفراللہ۔ ارے اسے تم نے
شعر کہہ کر سنایا ہے؟"

"انکل آپ نہیں جانتے" خرم نے ان کی جہالت پر ترس کھا کر کہا۔ "یہ بہت
مشہور فلم شعلے کا بہت پاپولر گانا ہے۔ ہر گلی ہر سڑک اور ہر گھر میں آج کل یہی
ایک گیت گونج رہا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ نے نہیں سنا!... کیا آپ شعلے فلم
نہیں دیکھا؟"

ساجد صاحب تاسف انگیز انداز میں اسے دیکھنے لگے۔ "افسوس جس قوم کے
ہونہار لڑکوں کی ذہنی ارتقا کی حد بس اسی شعر تک ہو۔ اس کی ادبی ترقی معلوم۔
خرم۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں یہ مشورہ تمہیں دوں کہ تم فلم بینی کو مطلقاً طلاق دے
کر ادبیت کی طرف توجہ دو۔ کیا تم آج کل کے اچھے اچھے ادبی رسائل نثری
اور شعری مجموعے نہیں پڑھتے!"

"اسی لیے میں کہہ رہا تھا کہ میں نہیں پڑھوں گا" خرم نے شرمندہ ہونے کے
بجائے دھاندلی کی۔ "دراصل مجھے شعر شاعری سے دلچسپی بھی نہیں ہے!"

"اچھا خیر" ساجد صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر کروٹ بدل کر تابش
کی طرف مخاطب ہو گئے۔ "تمہارا ذوق نہایت لطیف اور بلند ہے۔ جب تک
کھانا تیار ہو۔ تم ہمیں کچھ اور سناؤ۔"

خرم نے ٹرانسسٹر اٹھایا اور ایک اونچے ٹیکرے پر جا بیٹھا۔ ترنم بلب کے
[illegible]

فارسی سے آپ کو شغف ہے ڈیڈی؟"

بہت۔ کیا تمھیں فارسی اشعار بھی یاد ہیں۔؟

جی ہاں انٹر میں فارسی پڑھی تھی!۔

اچھا تو سناؤ: بڑے اشتیاق سے وہ بولے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

ساجد صاحب تڑپ اٹھے۔ "سچ کہتا ہوں کہ سینکڑوں بار یہ شعر پڑھ چکا ہوں سُن چکا ہوں۔ لیکن کبھی ذہنی اور روحانی سیری نہیں ہوتی: کیا شاندار کاتب نگاری ہے کہ سبحان اللہ۔"

پتہ نہیں یہ دو شعر کس شاعر کے ہیں۔ مگر بہت اچھے ہیں ڈیڈی۔

سناؤ۔

شنیدم کہ زن فاحشہ مستا گفتی — کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی؟
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم — تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

بہت اچھے بہت اچھے۔ میاں رکو مت۔ سنائے جاؤ۔!"

(دھر عورتوں میں ان کی اپنی کھچڑی پک رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ خدا معلوم" فرحت کہہ رہی تھیں: "ساجد بھائی کچھ خفا ہیں۔

خرم سے!"

"وہم ہے تمھارا" ماجرہ بیگم بولیں: "وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں:

اچھا ماجرہ۔ تم نے ترنم کے بارے میں کیا سوچا ہے۔؟" فرحت نے کہا۔

ابھی اس کے لیے کیا سوچا ہے؟" ماجرہ بیگم نے جواب دیا: "اس کی کیا عمر ہے۔ جب تک وہ پڑھے گی۔ بڑھائیں گے۔ پھر دیکھیں گے۔ کون سے ہمارے دس بچے

نے اپنی مطلب برآری کے لیے نفرت کی جو دیوار شمسہ بیگم کے سامنے اٹھادی تھی وہ اتنی بلند اور دبیز ہو چکی تھی کہ اب اس کے آر پار دیکھنا ماجرہ بیگم کے لیے بھی دشوار تھا۔ وہ شمسہ بیگم کی بے رخی اور سرد مہری سے پریشان تھیں۔

"پتہ نہیں کیوں شمسہ مجھ سے کٹی کٹی پھرتی ہیں۔" ماجرہ نے ساجد صاحب سے کہا: "یا تو وہ شیر را شوری تھی یا یہ بے تکلی ہے۔ پہلے میرے پاس بیٹھ کر اپنے حالوں کا دکھڑا روتی تھیں۔ آپ سے تک اپنی رام کہانی کہہ گزرتی تھیں۔ مگر اب یہ حال ہے کہ میں ابا میاں کی مزاج پرسی کرنے جاتی ہوں وہ کسی کام کا بہانہ کر کے اٹھ جاتی ہیں!"

"تم سوچو کہ اپنی بکواس کی دھن میں کوئی ایسی بات تو نہیں منہ سے نکال دی جو انھیں ناگوار گزری ہو" ساجد صاحب نے کہا۔

ہم میں ہزار طرح کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔" ماجرہ نے جواب دیا: "اول جلول بے معنی باتیں۔ بے تکے مذاق۔ مار پیٹ تک۔ مگر نہ انھوں نے برا مانا نہ میں نے۔ پھر اب یہ کیا ہوا ہے"

میں شام کو جاؤں گا سلطان صاحب کی خیریت پوچھنے کے لیے: ساجد صاحب بولے: "شاید مجھے پتہ چلے کہ ان کی سرد مہری کا سبب کیا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ تو اٹھ گئے۔ مگر ماجرہ بیگم بیٹھی سوچتی رہیں۔ آٹھ برسوں کی رفاقت یک بیک مخاصمت میں کیسے بدل گئی۔ وہ سچ مچ افسردہ تھیں۔

اتنے میں فرحت چپکے سے آئیں اور انھوں نے آہستہ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ماجرہ کے لبوں پر رنگین مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بڑھاپے میں یہ کاہے کے نخرے ہیں:" انھوں نے کچھ کہہ کر ان کے ہاتھ گلے سے ہٹا دیئے۔ "یا اللہ تم کدھر سے بند ٹپک ہوگئیں:" فرحت نے بڑی ادا سے ٹک

بات چیت ہوئی پھر وہ اپنی راہ لگتیں۔ یہ اپنی راہ لیتا!۔ ترنم کی بات ہی اور تھی۔
وہ جیسی حسین تھی اتنی ہی معصوم بھی تھی۔ اس کے دل میں کینہ فریب اور بغض نہیں
تھا۔ اس کی پُر خلوص سادگی تابش کو بہت پسند تھی۔ مگر وہ خود سے بھی کہتے گھبراتا
تھا کہ اسے ترنم سے محبت تھی! اس کے علاوہ فرحت جو بول کا کانٹے بکھیر گئی
تھیں وہ اگرچہ کہ مصنوعی تھے مگر تابش کے تلوے زخمی کر گئے۔

ترنم کو ساجد صاحب اب زیادہ گھومنے پھرنے سے منع کرتے تھے۔ وہ بھی
اپنی جگہ آ بیٹھی تھی۔ بلا سے اگر تابش اس کے گھر نہیں آتا تو وہ اس کے پاس کیوں
جائے!۔ اس کے دل میں بچپن کے زمانے کا دھیمے دھیمے لو دیتا جلا دیا اب بھڑکتا
ہوا شعلہ بن چکا تھا۔ لیکن اس کی تپش اور روشنی سے وہ خود ہی آگاہ تھی۔ اس
کا شریک کوئی نہیں تھا۔ وہ خرم، شاہد اور نوازش سے لاکھ درجے تابش کو بہتر
سمجھتی تھی۔ اس کے اطوار اسے دل سے پسند تھے۔ اس کے سر جھکا کر باتیں کرنے کا
انداز۔ چپکے سے مسکرانے کی عادت۔ چاہے ترنم اسے نوچے کھسوٹے، برا بھلا
کہے۔ گستاخیاں کر بیٹھے لیکن اس نے جارحانہ انداز یا جوابی بدلہ اختیار نہیں کیا
تھا!۔ اس کی یہی عادت اسے جی سے پسند تھی۔

وہ روز اس کی آمد کی منتظر رہتی!۔ صبح دس بجے تک۔ پھر وہ مایوس ہو جاتی
شاید وہ یونیورسٹی چلا گیا۔ شام کو وہ ہر آہٹ پر کان لگائے رہتی۔ تابش کے قدموں
کی چاپ وہ خوب پہچانتی تھی۔ رات کو خوابگاہ میں جانے سے قبل تک وہ آس لگائے
بیٹھی رہتی۔ شاید اب آئے۔ شاید کچھ دیر بعد آئے۔ لیکن پل پل وقت گزر جاتا۔
تابش کے قدم اس کے دروازے تک نہ آتے!۔

ہاجرہ بیگم اور ساجد صاحب کے دل میں شمسہ بیگم اور تابش کے خلاف کوئی کدورت
نہ تھی۔ وہ دونوں جیسے پہلے تھے۔ ویسے ہی اب بھی ان سے پیش آتے تھے۔ لیکن فرحت

ہیں کہ ایک جائے تو ایک رہے۔ لے دے کے ایک بچی ہی تو ہے۔ اگر اسے بھی
سسرال بھیج دیں گے تو پھر ہمارے پاس کیا باقی بچے گا!"

"اے ہے! اسے ایک نہ ایک دن جانا تو پڑے گا"۔ فرحت نے کہا۔ شمسہ بیگم
چپ چاپ پھلکی کے قتلے کڑھائی میں الٹ پلٹ رہی تھیں۔

"ہاں وہ تو اس کا مقدر رہی ہے"۔ بھلائی ہوگا اور میں ہاجرہ بیگم نے کہا۔ "کب
تک وہ میرے سینے سے لگی بیٹھی رہے گی۔ وہ تو جائے گی لیکن ابھی اس کی کیا عمر
ہے۔ سترہ اٹھارہ سال کی جان۔ نہ اسے سسرال میں رہنے کا قرینہ معلوم ہے۔ نہ وہ
شوہر کی حقیقت جانے۔ ابھی اس میں کچھ کیا ہے۔ اللہ رکھے جب بیس اکیس سال
کی ہو گی۔ تب کا مالک اللہ ہے۔"

"کیا کیا تیار کیا ہے ہاجرہ تم نے ترنم کے لیے"۔ فرحت نے پوچھا۔
"کیا تیار کروں۔؟" ہاجرہ بیگم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "میں تو کچھ پہنتی
اوڑھتی نہیں۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میری بچی کا ہے۔"

"ہاجرہ تمھاری باتوں میں کھانا ٹھنڈا ہو کر خراب ہو جائے گا!۔ ترنم سے کہو۔
اگر ساجد بھائی کھانا چاہیں تو دسترخوان بچھا دے"۔ شمسہ بیگم کو ان کی گفتگو
گراں گزر رہی تھی۔ انھوں نے سلسلہ ختم کر دیا۔ تابش کے اشعار بند ہو گئے۔ ترنم
نے باپ سے پوچھ کر دسترخوان بچھا دیا۔ ان کے وہ ساتھی جو ادھر ادھر گھومتے پھر
رہے تھے۔ وہ بھی آگئے۔ سب دسترخوان پر آ بیٹھے۔

"بھئی شمسہ بہن کے ہاتھ کی چیزوں کا جواب نہیں"۔ ساجد صاحب بولے۔ "کیا
پھلکی تلی ہے نمک مرچ کا ایسا تناسب تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔"

وہ بددلی سے مسکرائیں۔ "آپ کو پسند آگیا۔ محنت وصول ہوئی۔ دراصل مجھے کچھ
پکانا ریندھنا نہیں آتا۔ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا پکاتی ہوں وہ سب یونہی اول جلول ہوتا ہے۔"

"آپ نے پوریاں نہیں چکھیں؟" فرحت نے کہا۔

"کھا رہا ہوں۔ مچھلی سے نیت نہیں بھرتی" ساجد صاحب بولے۔ "تم ترنم کو بھی سکھا دو۔ کم از کم اس کے سسرال میں کام آئے گا۔"

"آپ یہ کھائیے۔" فرحت نے اپنی پکائی ہوئی پسندوں کی ڈش ان کے آگے سرکائی۔

"بھئی بہت ہو چکا۔ پیٹ تو مچھلی سے اور تابش کے شعروں سے بھر گیا۔ اب کچھ گنجائش نہیں" ساجد صاحب نے کہا اور بیوی سے بولے: "اب تم کافی تیار کر دو۔"

"ڈیڈی آپ نے خرم سے اس کی بانسری نہیں سنی" اچانک ترنم بول پڑی۔

ساجد صاحب نے اسے گھورا: "یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تم خرم کو اسے کہہ کر مخاطب کرتی ہو بیٹی؟"

ترنم کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا حرج ہے ڈیڈی" تابش اس کی ندامت زائل کرنے کو بولا: "ایسے تکلفات تو غیروں میں ہوتے ہیں!"

"پھر بھی اسے اتنا قرینہ تو چاہیئے کہ وہ چھوٹے بڑے کا فرق و ادب ملحوظ رکھے" ساجد صاحب نے کہا۔ پھر بولے: "اچھا بھئی۔ کیا واقعی تمھیں سازو سنگیت سے بھی دلچسپی ہے۔"

"بچپن میں ایک اسکول ماسٹر سے بانسری بجانی سیکھی تھی" تابش جھینپ کر بولا۔

"بڑھاپے میں بھول گئے" ساجد صاحب نے قہقہہ لگایا۔

کھانے کے بعد اصرار کر کے اس سے بانسری سنی۔ خرم نے ایک آدھ غزل گائی۔ پھر بزرگ لوگ کرسیوں پر لیٹ گئے اور خرم تابش وغیرہ گھومنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بالاحصار پر چلو!" ندیم نے رائے دی۔

اور کہا" فرحت نے کہا: "تم اللہ رکھے ایم اے کر لو۔ پھر کہیں ملازم ہو جانا۔ کیا ضروری ہے کہ تم خدا نہ کرے کسی کا منہ تاکتے رہو۔ عجیب لگ رہا ہے یہ لوگ خود احسان کرتے ہیں پھر احسان جتاتے ہیں۔ ساجد بھائی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تابش کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا؟"

"وہ پھر یہ تابش کے لیے" شمسہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا: "میں بھی اندازہ کر رہی ہوں جب سے ان کے پاس گاڑی آئی ہے وہ جیسے زمین پر پیر نہیں دھرتے۔ اسے وہ ہاتھی خرید کر اپنے دروازے پر باندھ لیں۔ ہمیں کیا۔ تابش نے کب ان کی خوشامد کی تھی۔ جو وہ ایک ایک سے رونا روتے پھرتے ہیں۔"

"میں تمھاری محبت میں ان کی بری بنتی ہوں" فرحت بولیں: "ان سے تذکرہ مت کر دینا۔ وہ مجھے کہیں گی کہ میں ادھر کی ادھر لگائی بجھائی کرتی ہوں"

"میں تو ان سے بولنا بھی پسند نہیں کرتی" شمسہ بیگم کے دل میں کڑواہٹ بھر گئی۔ فرحت کا مقصد حل ہو گیا۔ ماں بیٹے کا دل برا کر گئیں۔

تابش بیچارا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ بھی بہت دنوں سے ساجد صاحب اور ہاجرہ کے انداز دوسرے دیکھ رہا تھا مگر وہ سوچتا تھا کہ آخر اس سے کیا مطلب ہے؟ ان کے سے لاکھوں آدمی اس دنیا میں ہیں اور اس کے جیسے بھی۔ آدمی کے اپنے ذاتی مسائل کچھ کم نہیں کہ وہ دوسروں کے مسائل بھی گلے لگا لے اور سینہ پیٹتا پھرے!

بس ایک خلش جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ ترنم کی الفت تھی۔ اس خلش سے وہ اپنا دامن احساس بچا نہ سکا۔ دیرینہ محبت تھی۔ جو لڑکپن کے دور سے لے کر اب تک پختہ ہو چکی تھی۔ پتھر کا نقش۔ گیلی مٹی کا نشان۔ جو مٹائے نہ مٹتا تھا۔ اس کے کالج میں بھی بہت سی لڑکیاں تھیں۔ کئی ایک اس کے بہت قریب آئیں لیکن وہ انھیں اس قابل بھی نہیں سمجھتا تھا کہ لفٹ دیتا۔ کاش کہ [illegible] ان سے

تک جھیں پتے رہیں اور تب اس کا جی چاہنے لگتا ہے کہ کہیں سے کوئی آجائے۔
سہارا دے۔ راہ دکھائے۔ آرزوؤں کو پورا کر دے یا کم سے کم خشک لبوں
پر مسکراہٹ کی ایک کرن سجا دے۔ کچھ تو کرے۔ کچھ تو۔

[illegible] ناامیدی اور ان کہی تمنا کے دکھ نے اسے مایوس کر رکھا تھا!!
ہر وقت خاموش رہا کرتا۔

فرحت کی آمد و رفت شمسہ بیگم کے گھر پر بہت بڑھ گئی تھی۔ وقت بے وقت
آنکلتیں۔ سلطان صاحب بہت بیمار تھے۔ تیمارداری اکیلی شمسہ سے ہو نہیں سکتی
تھی۔ فرحت کسی زمانے میں نرسنگ کر چکی تھیں۔ وہ ایک بیٹی کی طرح سلطان صاحب
کی تیمارداری میں جٹ گئیں۔ انھیں اپنے وقت پر دوا دینا۔ پرہیزی کھانا کھلانا
پھر شمسہ بیگم سے باتیں کرنے بیٹھ جاتیں۔ ان کا طرز گفتگو بڑا من موہنا ہوتا تھا —
مخاطب یہ سمجھتا کہ وہ اس سے اتنی محبت کرتی ہیں۔

باتوں باتوں میں وہ اسے بہکانے سے بھی باز نہ آتیں "دنیا کا خون سفید ہو
گیا ہے۔ تم آٹھ سال سے اجرہ کی پڑوسن ہو۔ ایک دوسرے کے ظاہر و باطن
سے واقف۔ دکھ درد سے آگاہ۔ مگر اجرہ کا مزاج مجھے بالکل بدلا بدلا لگ رہا
ہے۔ تم اکیلی ہو۔ انھیں چاہیے تھا کہ تمھارا ساتھ دیتیں۔ ابا میاں کبھی بیمار ہیں
مگر انھیں پوچھنے کے لیے ساجد بھائی بھی ایک مرتبہ نہیں آئے۔"

تابش بیٹھا تھا اس کے دل پر ان کی باتیں نشتر کی طرح لگیں۔ مجھے دل سے وہ
بولا "نہ سہی ان کی ساتھ داری۔ فرحت آنٹی۔ ہم ان کے محتاج نہیں ہیں۔ دنیا
میں کبھی بیمار ہوتے ہیں۔ مرتے ہیں۔ یا اچھے ہو جاتے ہیں۔ آدمی اپنا دکھ آپ
بھگتتا ہے۔ ہم کس کے سامنے ہاتھ پھیلانے جائیں۔ کیا ساری کی زندگی دوسروں
سے رحم و کرم کی بھیک مانگتے گزرے گی؟"

چڑھ بھی سکو گی اتنی سیڑھیاں؟ - خرم نے پوچھا۔
جب تم چڑھ سکتے ہو تو پھر مجھے کیا ہوا ہے: ترنم نے کہا۔

فرحت ساجد صاحب کی گفتگو اور ان کے سلوک سے مشکوک ہو گئی تھیں۔ جب
وہ سوچتی تھیں کہ کہیں ساجد صاحب کے خیالات تابش کی طرف نہ جھک جائیں۔
بس دل میں لوکے سے اٹھنے لگتے تھے۔ ان کی گاڑی دیکھ دیکھ کر ان کے دل پر سانپ
لوٹتے۔ حسد کے مارے انھیں اجرہ بیگم سے نفرت ہونے لگتی۔ ساجد صاحب کی دولت
کا بھی انھیں علم تھا۔ ان کے شہر میں تین تین میڈیکل اسٹور تھے۔ دو ٹیکسیاں چلتی تھیں
وہ خود بھی کسی تجارتی کمپنی سے منسلک تھے۔ ان کا رہن سہن شاہانہ تھا۔ انھیں
ضرورت سے زیادہ دولت ملتی تھی۔ ان کے دو دو مکانات تھے۔ جس مکان
میں ان کا قیام تھا۔ وہ بھی بہت خوشنما اور دلکش تھا۔ فرحت نہیں چاہتی
تھیں کہ یہ سارا سرمایہ ترنم اپنے ساتھ سمیٹ کر کسی اور گھر لے جائے۔
حالانکہ اجرہ بیگم کہہ چکی تھیں کہ فی الحال ترنم کا کہیں رشتہ یا نسبت نہیں
مگر فرحت کو پتہ لگا کہ ترنم لڑکی ذات ہے۔ اس کا رشتہ کہیں نہ کہیں ہو گا ضرور۔ اس
کی ایک قریبی پھوپھی بھی اس کی امیدوار تھیں۔ خالہ اس پر نظر رکھے تھیں۔ ساجد صاحب
تابش کو پسند کرتے تھے۔ اجرہ بھی اسے بہت چاہتی تھیں۔ جب اطراف و جوانب
پر فرحت کی نظریں جاتیں انھیں ترنم جال میں پھنسی ایسی چڑیا دکھائی دیتی جسے
کوئی بھی پھر اپنی طرف کھینچے معلوم ہوتی تھی۔ بس وہ بدحواس ہونے لگتیں۔
ایسا نہ ہو کہ کہیں ترنم کو اس کا خالہ زاد یا پھوپھی زاد بھائی لے اڑے۔ یا تابش

کے حق میں ساجد صاحب اپنی آخری رائے دیدیں۔

انھیں منظر صاحب سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ کسی قسم کے جعل فریب میں بیوی کا ساتھ دیں گے وہ کھرے۔ اصول پسند اور صاف گو انسان تھے۔ لہٰذا انھیں اپنے پروگرام سے قطعی الگ کر کے فرحت نے سوچا کہ اپنی اسکیم پر عمل درآمد کیا جائے۔ انھیں ترنم سے بالکل محبت نہیں تھی بلکہ اکثر وہ اس کی رنگت کو سفید چھپکلی کہہ چکی تھیں دلچسپی تو انھیں اس کی وابستہ دولت سے تھی۔

حالانکہ فرحت خود بھی خاصی متمول تھیں۔ منظر صاحب جو کچھ کماتے تھے وہ بیوی کے ہاتھ پر لاکر رکھ دیتے تھے۔ انھوں نے سب سے چرا چھپا کر کافی رقم اکٹھا کر لی تھی۔ مگر جوں جوں اس کے سرمائے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کا حسد بھی ترقی پر تھا۔

انھوں نے سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے سانپ تو مر جائے لیکن ان کی لاٹھی محفوظ رہے۔ انھوں نے تابش کو گڑ سے مارنے کا فیصلہ کیا۔

ہاجرہ بیگم اپنے دل میں ٹھانے بیٹھی تھیں کہ اگر شمسہ بیگم نے بھولے منہ سے بھی ترنم کو مانگ لیا تو وہ سچے دل سے جان بھر دیں گی۔ انھوں نے شوہر کا رجحان دیکھ رکھا تھا۔ وہ بے چینی سے منتظر تھیں کہ کب شمسہ بیگم اپنے منہ سے بیٹے کا پیغام انھیں دیتی ہیں!۔

ادھر شمسہ بیگم بھولے سے بھی یہ نہیں سوچ سکتی تھیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد ان پر اتنے صدمے گزرے تھے اور انھیں ایسے غیروں سے اتنی مرتبہ مدد مانگنی پڑی تھی کہ خود اعتمادی کا ان میں فقدان ہو گیا تھا۔ احساس کمتری نے ان کی روح اور شخصیت کو مکمل طور پر کچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ خود کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھیں کہ کسی دولت مند آدمی کی برابری کا دعویٰ کر سکیں۔ بلکہ

جہاں کہیں نام نہاد بڑے آدمی جمع ہوتے۔ یا کوئی اونچی تقریب ہوتی وہ اس سے گریزاں ہو جاتیں۔ نہ کسی سے بولتی چالتی تھیں نہ اتنا موقع دیتیں کہ کوئی ان سے مخاطب ہو سکے۔ تنہائی۔ انکار۔ گوناگوں مشکلوں نے ان سے ان کی اصلی زندگی چھین کر انھیں بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ اس خیال کے پاس تک نہ پھٹک سکیں کہ ترنم کو پیغام دے سکیں یا وہ دولت مند باپ کی بیٹی ان کے گھر آسکتی ہے!

ماں کی آشفتہ حالی۔ بدقسمتی اور کم مائیگی نے تابش پر بھی خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ وہ بھی نہایت کم آمیز۔ دیر آشنا۔ اور سب سے گریزاں ہو کر رہ گیا تھا۔ ماں بیٹے عجیب سے مبہم ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ تابش تو صرف ماں اور بیمار نانا کی خاطر خود کو صلیب پر چڑھائے ہوئے تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی نیلے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں اڑان بھرے۔ اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر وہ بھی چاہتا کہ قیمتی لباس اس کے بدن پر ہوں۔ اڑانے کے لیے بے تحاشہ روپیہ ہو۔ وہ بھی دوستوں کو اونچے ہوٹلوں میں انوائٹ کرے۔ اور شان سے سر اٹھا کر چل سکے!۔

پڑھنے کے بعد کہاں ملازمت ملے گی۔ گھن بوٹی نپا شوربہ۔ اس میں آخر ہو گا کیا؟۔ مرتے دم تک وہی رفتار بے ڈھنگی۔ آہنگ مسلسل۔ نہ کوئی ہلچل نہ کوئی انقلاب نہ کوئی تبدیلی۔!! اپنے ذہن کی لامحدود صحراؤں میں خیالی آبلہ پائی کرتے کرتے اس کے تصورات کے قدم زخمی ہو چکے تھے۔ اپنا مستقبل اسے سناٹوں میں مدغم نظر آتا۔ تاریکیاں اس کے آگے پیچھے چلتیں۔ کہیں سے کوئی خوف پالے کے مانند اس کے دل پر گر کا رہتا۔ اپنا اداس و زرد چہرہ آئینہ میں دیکھ کر وہ سہم جاتا۔

انسان ازل سے مایوس ہے۔ ظلمتوں کے جنگل میں کون سی آواز کہاں بھٹک رہی ہے ماحول اور حالات بہت بے درد ہوتے ہیں۔ آدمی سے اس کی فطرت

ڈبلنگ بر غزل غالب

سرپٹ حیدرآبادی

جوتے بھی کھاکے شاد اگر دل نہیں رہا — عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
دو کوڑی بھی لگاتا نہیں دام اب کوئی — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے — میں پوٹلی اٹھانے کے قابل نہیں رہا
پھر کس نکالا میرا پتنگوں نے رات بھر — ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — مردار موت مرنے کا قائل نہیں رہا
مدقوق تھا میں پہلے ہی مفلوج ہو کے اب — شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے — چہرہ کسی کا دید کے قابل نہیں رہا
مصروف دھینگا مشتی ہیں ساقی سے بادہ نوش — یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن — مدخول دل خروج پہ مائل نہیں رہا
اعضائے جسم صاف نظر آ رہے ہیں سب — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار — اس پر بھی غنڈہ گردوں میں شامل نہیں رہا
کی میں نے گرچہ اور بھی لوگوں سے عاشقی — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں — دھنگر کوئی بھی کاشت کے قابل نہیں رہا
کنگھی ڈوری تک بھی حسینوں نے لے کے چل دیے — حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
پٹ پٹ کے اور نے بھڑنے کے قابل نہیں رہا
مقطع کا مصرعہ مقطع میں سرپٹ میں آگیا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

فارم نمبر ۴ قاعدہ ۸

۱۔ مقام اشاعت :-	۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
۲۔ وقفۂ اشاعت :-	ماہوار
۳۔ پرنٹر کا نام :-	سید انصار حسین - (ہندستانی)
۴۔ ناشر کا نام :-	سید محمد نسیم انہونوی (ہندستانی)
۵۔ اڈیٹر کا نام :-	" "
۶۔ مالکان :-	سید محمد نسیم انہونوی شوکت جہاں بیگم سید محمد فہیم انہونوی

میں سید محمد نسیم انہونوی اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین میں درست ہیں

نسیم انہونوی

یکم مارچ ۱۹۷۷ء

ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۲۴۵۵۹

ٹیلیفون نمبر رہائش:- ۲۵۲۳۲

اڈیٹر و نگراں:- نسیم انہونوی

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۴۶ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں

ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ — فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۷۷ء — نمبر ۴

معاونین:- شوکت جہاں بیگم غزالہ — جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

[illegible] خریداری	منی آرڈر سے	بیس روپیہ
مخصوص خریداری		[illegible] روپیہ
معمولی خریداری		[illegible] روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر [illegible] روپیہ ۔ ۹ پیسے زائد

غیر ممالک سے

[illegible] ۳۰ روپیہ یا دو پونڈ [illegible] سی میل ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں۔ کسی کے نام مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم جواب دہ نہ ہوگا۔ حریم ہر انگریزی ماہ ۵ ر ۶ کو ڈاک میں روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں ۲۰ تاریخ سے پہلے کی گئی شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• [illegible] کی اطلاع [illegible] سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا [illegible] بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لیے جوابی [illegible]

[illegible]

حریم سیاسی پرچہ نہیں اور نہ ہی ہم نے کبھی اس کے صفحات پر سیاسی خبریں شائع کیں، لیکن اندرا گاندھی صاحبہ کا ذکر ایک بار پہلے بھی سماجی اعتبار سے کر چکا ہوں اور آج حریمی بہنوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی وزیر اعظم اور دنیا کی مشہور ترین شخصیت کو کس طرح الکشن میں شکست ہوئی۔ یہ واقعہ ایک طرح کی عبرت ہے جسے سوچنا اور سمجھنا چاہیئے۔ کیوں انسان ہمہ گیر شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کرتا ہے اور کیوں وہی دنیا والوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ کوئی تو سبب ضرور ہوگا اس کا۔ بلا سبب تو دنیا میں کوئی بات نہیں ہوا کرتی۔ ہر انسان کو یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ کس طرح دنیا میں رہے کہ لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بنا رہے اور کبھی ایسی باتیں اختیار نہ کرے کہ اسے نظروں سے گرنا پڑے۔ اللہ ہی عزت دیتا ہے اور اللہ ہی ذلت دیتا ہے۔ لیکن بلا سبب نہیں۔

گزشتہ ماہ لکھنؤ میں شیعہ سنی جھگڑے ہونے کے باعث ۲۰ روز تک کرفیو آرڈر لگا رہا۔ سرفراز پریس جس میں حریم چھپتا ہے، اسی حصہ شہر میں واقع ہے، اس لئے وہ بھی بند رہا۔ پھر بجلی کی تعطیل کے باعث نہ کھل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاید اپنی زندگی میں پہلی بار حریم تین یوم کی تاخیر سے شائع ہوا۔ حریمی بہنیں اس خبر سے ناواقف نہ ہوں گی، لیکن کم عمر ہی بہنوں نے یہ سوچا کہ کرفیو کے باعث حریم کی اشاعت میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ حریم نہ ملنے کے تقاضے آنے لگے۔ اس لئے کہ اکثر بہنوں کو جو قریبی شہروں میں رہتی ہیں ۸ ۔ ۹ تک حریم مل جاتا ہے۔ جبکہ اس مرتبہ ۹ ار کو رجسٹری نہ ہو سکا۔ ویسے بھی ہر حریم میں یہ بات شائع کی جاتی ہے کہ ۲۰ تک حریم نہ ملنے پر ہی شکایت لکھیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اکثر بہنیں اس تاریخ سے پہلے ہی شکایت لکھ دیتی ہیں۔ انھیں یہ علم نہیں کہ اکثر پرچے ڈاک کی غلطی سے دوسری جگہوں کے بیگ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے پھر واپس ہوتے ہیں، اس طرح بھی تاخیر ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم نے ۲۰ تاریخ مقرر کی ہے۔ حریمی بہنیں نوٹ فرمائیں کہ ۲۰ سے پہلے لکھے جانے والے شکایتی خطوں پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

عورت کی حفاظت کے لئے اسلام نے مرد کو کتنا ضروری سمجھا ہے، اس کا اندازہ صرف اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ حج ایسے فریضہ کی ادائی میں بھی کسی محرم مرد کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ حضرت محمد صلعم کی زندگی ہی میں غزوات شروع ہو گئے تھے۔ ایک شخص نے رسول خدا صلعم سے فرمایا کہ میری بیوی حج کرنے جا رہی ہے اور میں نے اپنا نام غزوہ میں لکھا دیا ہے۔ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ جا کر حج کرو۔ یعنی غزوہ سے زیادہ ضروری حضور صلعم نے یہ سمجھا کہ شوہر بیوی کے ساتھ حج میں رہے حالانکہ اس دور میں غزوات کی جو اہمیت تھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے والے کہیں گے کہ وہ دور جہالت تھا۔ عورت مردوں کے لئے ایک کھلونا تھی اور ذہن باوجود اس کے کہ اسلام کی روشنی پھیل گئی تھی، اتنے بدل نہ سکے تھے کہ عورت محفوظ رہ سکتی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ عورت نے تعلیم و آزادی حاصل کرنے کے بعد کافی ترقی حاصل کر لی ہے اور اب اسے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ وہ

ہر عورت

کا فرض ہے کہ جہیز کی بدرسموں کو مٹائے۔

ہر لڑکے

کا فرض ہے کہ صرف صورت ہی نہ دیکھے۔ سیرت وہ جوہر ہے جو کمتر ہی بدلتی ہے۔ صورت تو ہر وقت ہی خطرے میں رہتی ہے۔

نسیم انہونوی

شوہر کی حفاظت کے بغیر کسی طرح کا خطرہ محسوس کرے ۔ میں کہتا ہوں کہ بہر تعلیم اور بہر آزادی کے باوجود عورت آج بھی مرد کا حفاظت کے لئے اتنی ہی مجبور ہے جتنی اس دور جہالت میں جب اسلام کی روشنی جہالت کی تاریکیوں کو دور کر رہی تھی ۔ اور اس وقت کا ہے یہ بات سمجھی گئی تھی جو کہ یہ جبکہ سارا عرب کلمہ گو بن گیا تھا ۔ اس وقت کا مسلمان خدا اور رسول سے جتنا ڈرتا تھا یا جتنی عقیدت رکھتا تھا اس کا بیان فضول ہے ۔ یہی وہ باتیں تھیں جن کے تحت مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے ڈنکے بجادیئے تھے بے سروسامانی سے جس طرف نکل جاتے تھے مسلح افواج کو خس و خاشاک کی طرح مٹا کر رکھ دیتے تھے ، لیکن عورت کے سلسلہ میں انھیں یہ آزادی نہیں دی گئی تھی جو آج نظر آتی ہے ۔ خدا کے خوف سے لرزاں اور ترساں ہوتے ہوئے بھی ، انھیں محرم عورتوں کے علاوہ کسی کا سامنا کرنے کی اجازت نہ تھی ۔ آخر کیوں ۔ اس لئے کہ عورت کے سلسلہ میں اسلام بھی ان کی فطرت بدلنے سے قاصر تھا اور اسی لئے شاید سب سے سخت سزا اسی گناہ کی رکھی گئی تھی جو مرد و زن کے اختلاط سے سرزد ہوتا ہے یا ہوتا رہا ہے ۔ اور آج بھی ہو رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تا ابد ہوتا رہے گا ، اس لئے کہ مرد کی فطرت جو ہزاروں سال قبل تھی عورت کے سلسلہ میں وہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے ۔ علم و تہذیب کی روشنی بھی اس تاریکی کو ذرہ برابر بھی دور نہیں کرسکی ۔ اس لئے آج بھی عورت کو تحفظ کے لئے مرد کی ضرورت ہے اور آشا بھی وہ اتنی ہی بے بس ہے مردوں کے جبر و استبداد سے جتنی ہمیشہ رہی ہے ۔

حریم بر وقت نہ ملنے کی شاکی بہنوں سے

حریم کبھی ایک روز کی بھی تاخیر سے شائع نہیں ہوا گذشتہ ماہ کرفیو لگ جانے سے پریس بند رہا اور تین روز کی تاخیر ہوگئی ۔ اس مرتبہ بھی کرفیو کے باعث ہوسکتا ہے کہ مقررہ تاریخ سے دو چار یوم بعد پرچہ روانہ ہو ۔

بہت سی بہنیں محکمہ ڈاک کو نظر انداز کر کے صرف دفتر حریم کو ہی یہ الزام دیتی ہیں کہ پرچہ نہیں ملا ۔ ایسی بہنوں کی ذہنیت پر مجھے رونا آتا ہے بہرحال ان سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اسی پر یقین رکھتی ہیں کہ پرچے ڈاک میں نہیں گم ہوتے ادارہ حریم ہی نہیں بھیجتا تو انھیں حریم کی خریداری ترک کر دینا چاہیئے ۔ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے

تبصرا

(ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بالک باغ

علامہ محوی لکھنوی کی منظومات کا مجموعہ۔ مرتب صبر المحوی صدیقی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۴۴۔ قیمت۔ چھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ معیار ادب بکڈپو۔ گلی سا ہزاری گوجر پورہ۔ مجھو پالی۔

علامہ محوی صدیقی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک باکمال شاعر و نثر نگار تھے اور اپنے زمانہ حیات میں اردو دنیا میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ بالک باغ۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے بچوں کے لئے ہے اور اس میں ۲۰ نظمیں شامل ہیں۔ ابتدائی کئی نظمیں اللہ پاک کی ذات بے نیاز سے متعلق ہیں۔ جن کے پڑھنے سے بچوں کو خدا کی قدرتوں کا علم ہو سکتا ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات اُجاگر ہو سکتی ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ اس کے بعد کی کئی نظمیں دعاؤں پر مشتمل ہیں۔ ان کے بعد سچے نبی اور ہمارے نبی کے نام کے عنوان سے دو نظمیں ہیں جس سے پیغمبر اسلامؐ کی ذات گرامی اور مقدس سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ماں باپ کے حقوق۔ ان سے ہمکلام ہونے اور فطرت کے دلکش مناظر وغیرہ پر مفید منظومات ہیں۔ غرض اس کتاب کی تمام نظمیں کوئی بچہ پڑھ لے تو اسے دین اور دنیا دونوں کے متعلق ہر طرح کی معلومات ہو سکتی ہیں۔ تمام نظمیں معلومات اور سبق و نصیحت سے بھرپور ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام والدین اپنے بچوں کو یہ کتاب منگا کر پڑھائیں۔

کتاب اردو اکیڈمی یو پی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔ اور اکیڈمی کا یہ اشتراک قابل داد ہے۔ ایسی کتابوں کی اشاعت کی اشد ضرورت ہے جن سے بچوں کے اخلاق و آداب سنور سکیں اور انھیں اچھے برے کی تمیز ہو سکے۔

آئینہ ویسی

مرتبہ محمد مطیع الرحمٰن صاحب (پٹنہ کالج پٹنہ) سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۵۰۰۔ کاغذ کتابت طباعت اچھی۔ مجلد قیمت پندرہ روپیہ ملنے کا پتہ کوئی درج نہیں، غالباً مؤلف سے ہی مل سکے گی۔

یہ کتاب اسلام آباد (چاٹگام) کے مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ، حسان عجم داؤد عظم، قطب ارشاد حضرت صوفی سید فتح علی صاحب ویسی چاٹگامی ثم مرشد آبادی قدس سرہٗ ان کے والد محترم، پیر و مرشد، خلفا اور متوسلین کے حالات، اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ موصوف کی شاعری کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

حضرت صوفی ویسی ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ء بمقام چاٹگام پیدا ہوئے تھے۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۶ء انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار مقدس مانک تلہ کلکتہ میں ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگی مسلمانوں کے لئے مشعل راہ رہی ہے اردو میں اور بھی چند کتب صوفیائے کرام کے حالات پر مشتمل شائع ہوئی ہیں یہ کتاب ان میں ایک اضافہ ہے جس کے لئے مؤلف قابل داد ہیں جنھوں نے بڑی کاوشوں سے پچاسوں کتب کا مطالعہ کر کے اس کتاب کو پیش کیا ہے۔

ویسیؒ ایک بزرگ صوفی ہی نہیں باکمال شاعر بھی تھے ۱۰۰۷ غزلیں ۲۲ قصیدے اور کچھ متفرقات موصوف کے دیوان میں شامل ہیں جو آپ کے وصال کے ۱۱ سال بعد شائع ہوا تھا۔ تمام کلام فارسی میں حمد، نعت اور منقبت پر محمول ہے۔ اس دیوان کو بھی مؤلف نے اس کتاب میں شامل کر کے شائع کر دیا ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگی سے دلچسپی رکھنے اور سبق لینے والوں کے لئے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

بال بھارتی

اردو کی پہلی کتاب۔ مؤلف ۲ر۔ کے منوچا والی اے ہری مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر۔ شائع کردہ مدھیہ پردیش پاٹھیہ پستک نگم بھوپال قیمت ایک روپیہ پچیس پیسہ۔

بڑے سائز پر ۷۲ صفحات کی یہ کتاب ایک نئے انداز پر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں تصاویر کے ذریعہ بچوں کو حروف اور الفاظ سمجھانے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کے لئے مصنف قابل داد ہے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ سنجیدہ، موزوں اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ مئی کے حریم کے لیے عنوان ہے "خاک" اور جون کے لیے "درد" (ادارہ)

افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں
یہ کہہ رہے ہیں سب تری صورت بدل گئی

مرسلہ مس نسیمہ بیگم بھول (بھاگلپور) دیلو فرگور ے (بلاپور)

سیرت کے ہم غلام ہیں، صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا

مرسلہ۔ قمر نگار جمیلی (آمبور)

صورت دکھا کے پھر مجھے بیتاب کر دیا
اک لطف آ چلا تھا ترے انتظار میں

مرسلہ:۔ وسیم پروین (بھوپال)

تصور سے کہاں تک میں دل مضطر کو بہلاؤں
کسی صورت سے اب صورت دکھا جاؤ تو اچھا ہے

مرسلہ۔ عائشہ صدیقہ بنگی و ماجرہ نسرین لاری (کانپور)

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

مرسلہ:۔ کے نیلوفر غوث (آمبور) حلیمہ فاروقی (کرداؤجبا)

اے حسن کے مائل یہ نصیحت مری سن لے
سیرت پہ نظر چاہیئے صورت سے زیادہ

مرسلہ:۔ نسبت علی دہلوی۔ ایم۔ اے

حسن صورت کے لیے خوبی سیرت ہے ضرور
گل وہی ہے جس میں خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا

مرسلہ:۔ مس فرزانہ انوری (باندہ بستی پور)

بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورت مینا سے

مرسلہ:۔ فردوس شاہین بی۔اے (آگرہ)

ہر اک صورت ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی! کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

مرسلہ:۔ مس ملکہ بانو (رمانس)

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!

مرسلہ:۔ شبانہ۔ نسرین گڑیا (مونگیری)

اے شوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجئے، ہم صورت جاناں بھول گئے

مرسلہ:۔ انیس قادر (مدراس)

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بیتاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماب مجھے

مرسلہ:۔ لاڈلی شمع (پٹنہ)

اچھی صورت کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے
سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتی ہے

مرسلہ:۔ ن عظمت ترنم (آمبور)

تجھے جنت تو واعظ مل ہی جاتی تیری صورت پر
مگر اے کاش طوبیٰ عمل جانچا نہیں جاتا

مرسلہ:۔ فاطمہ زہرا (بہار شریف)

پردہ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورت مینا نہ کر

مرسلہ:۔ آفتاب سنجر (جن پٹن)

شب غم نیند بھی آئی تو اس امید پر آئی
کہ شاید خواب ہی میں دیکھ لوں صورت محمد کی

مرسلہ:۔ مس فضیلت بہار (دربھنگہ)

شیشۂ دل میں تیری صورت ہے
سر جھکانے کی بس ضرورت ہے

مرسلہ:۔ مسز عذرا کلام (دہلی)
(بیگو سرائے)

بشر ہونے پہ جتنا ناز ہو اختر ہیں کم ہے
خدا کی بہترین اولیں تھی انسان کی صورت میں

مرسلہ: محمودہ مظفر (جمشید پور)

اس چاند سی صورت پر مرجاؤں فدا ہو کر
حسرت ہے کہ دم نکلے دیدار بنی ہو کر

مرسلہ: دلآویز سعید خاں (بھاگلپور)

محبت ترک کرنے کی تھیں دل سے بھلانے کی
بہت کیں کوششیں لیکن کوئی صورت نہیں نکلی

مرسلہ: مس شائستہ بدر شمسی (آگرہ)

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل
قفس صورت آشیاں اور بھی ہیں

مرسلہ: تبسم سلطانہ (چھپرا)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

مرسلہ: شیدا نسیم لکھنوی (کلکتہ)

سیرت نہیں ہے جس میں وہ صورت فضول ہے
خوشبو نہیں ہے جس میں وہ کاغذ کا پھول ہے

مرسلہ: مومنہ مختار (میسور)

ہر اک صورت ہر اک شے اجنبی معلوم ہوتی ہے
مری دیوانگی اب کام کی معلوم ہوتی ہے

مرسلہ: نکہت مشیر (لکھنؤ)

حسنِ صورت چند روزہ، حسنِ سیرت مستقل
اس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں، اس سے خوش ہوتا ہے دل

مرسلہ: فہمیدہ اقبال (بنگلور)

ہم سے اچھی کہیں آئینے کی قسمت ہوگی
روبرو اس کے ترے چاند سی صورت ہوگی

مرسلہ: شہناز پروین عراقی (کانپور)

کسی کو کیوں برا جانے کسی پر کیوں ہنسے کوئی
خدا ہی نے بنائی مختلف ہر اک کی صورت ہے

مرسلہ: ق محمدہ خالق
(مہدیہ)

ہلال اور بدر دونوں ہیں تری تصویر کے خاکے
یہ صورت ہے لڑکپن کی، وہ نقشہ ہے جوانی کا

مرسلہ: بی بی صفوان حسن (کھتبکل)

یہی نقشہ ہے، یہی رنگ ہے، ساماں ہے یہی
یہ جو صورت ہے تری، صورت جاناں ہے یہی

مرسلہ: ایس ایس بیگم عباس (امروہہ)

"دورِ ترقی"

رخسانہ نکہت لاری

اس دور ترقی نے بڑا کام کیا ہے
مشرق کی حسینوں کا بہت نام کیا ہے
مذہب کے تصور کو بنایا ہے رواجی
اللہ رے مسلماں کی یہ آشفتہ مزاجی
مغرب نے کیا گلشن مشرق میں اُجالا
ایمان کی حرمت ہوئی آخر تہہ و بالا

اسلام کو اس عہد نے بدنام کیا ہے
اس دور ترقی نے بڑا کام کیا ہے

مریخ پہ افکار کی پڑتی ہے کمند آج
گردش میں نظر آتے ہیں جاہلوں کے سمند آج
لیکن یہ ترقی بھی تو معکوس ہوئی ہے
مردانِ اولوالعزم کو محسوس ہوئی ہے

جو سرکش و جابر تھے انھیں رام کیا ہے
اس دور ترقی نے بڑا کام کیا ہے

جو کچھ ہے ترقی پہ ہے آزادیٔ نسواں
فیشن کی نمائش میں مقید ہوا ایماں
عورت یہ ہوئی ہے جو یہ مغرب کی نوازش
مشکل مساوات کی ہے خوشنما سازش

عصمت کا حیا کا عجب انجام کیا ہے
اس دور ترقی نے بڑا کام کیا ہے

"اقوالِ زریں"

نسیمہ بیگم بھولی بی، اے

برہ پورہ۔ بھاگلپور

قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے۔
تب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے۔

ہر ایک کی جُدا جُدا ہوتی ہیں ۔ صورت ۔ سیرت ۔ قسمت
کسی کا انتظار نہیں کرتیں ۔ وقت ۔ موت ۔ گاہک
اِنسان کو زندگی میں ایک بار ملتی ہے ۔ والدین ۔ حُسن ۔ جوانی
بھائی کو بھائی کا دشمن بنادیتی ہیں ۔ زن ۔ زر ۔ زمین
پردہ چاہتی ہیں۔ کھانا ۔ دولت ۔ عورت
یاد رکھنا ضروری ہیں سچائی فرائض موت
اِنسان کو ذلیل کرتی ہیں۔ چوری چغلی جھوٹ
اصل مقصد سے روکتی ہیں بد چلنی ۔ غصّہ ۔ طمع
ہر ایک کو پیاری ہوتی ہیں۔ عورت ۔ دولت ۔ اولاد
کوئی دوسرا نہیں چرا سکتا۔ عقل ۔ علم ۔ ہنر
غم میں مبتلا رہتے ہیں۔ حاسد کاہل وہمی
نکل کر واپس نہیں آتیں تیر کمان سے۔ بات زبان سے۔ روح جسم سے
اپنی عادت پر مجبور ہیں۔ سچائی پسند سچ پر۔ سخی سخاوت پر۔ ظالم ظلم پر
وقت پر پہچانے جاتے ہیں۔ صابر مصیبت پر۔ سچائی پسند سچائی پر۔ بھائی ضرورت پر

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ کریں اور نمبر خریداری تحریر کریں۔

لیلیٰ مجنوں اور اونٹ

جلال ملیح آبادی

کردار

اُستاد شیفتہ

میر شعلہ

مرزا رنگین

تیسرے زندہ دل سخن فہم

میر شعلہ۔ میں کہتا ہوں مرزا رنگین! اگر جنابِ مجنوں نہ ہوتے تو دنیا میں اس وقت لیلیٰ کا نام لینے والا کوئی نہ ہوتا۔

مرزا رنگین۔ اور میرا دعویٰ ہے میر شعلہ! اگر میں لیلیٰ نہ ہوتیں تو مجنوں صاحب حضرت قبیلۂ بنی عامر کے قیس ہی رہ جاتے۔

(معمولی سے شاعر جو تھوڑی شاعری کرتے تھوڑی سوداگری)

دنیا بھر میں مشہور نہ ہوتے۔)

شعلہ۔ اجی چھوڑیئے بھی رنگین صاحب! کہاں مجنوں۔ ایک شاعر اور بامذاق انسان اور کہاں لیلیٰ۔ ایک معمولی کالی لڑکی۔

رنگین۔ اجی کیا فرما رہے ہیں آپ میر شعلہ! لیلیٰ معمولی کالی لڑکی تھی!؟ معاذ اللہ! کھلتا ہوا رنگ، ہرن کی سی آنکھ اور کمان سے ابرو دیکھے ہیں آپ نے؟

شعلہ۔ (قہقہہ) جی آپ تو لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھنے لگے رنگین صاحب! لیلیٰ ایسی نہیں تھی۔ لیلیٰ کو دراصل مجنوں کی محبت نے حسین بنا دیا۔

رنگین۔ اچھا میر شعلہ! اس بحث کا فیصلہ اُستاد شیفتہ پر چھوڑئیے۔

شعلہ۔ بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ اچھا شیفتہ صاحب! آپ ہی فیصلہ کیجئے، مرزا رنگین صحیح کہہ رہے ہیں کہ میں؟

شیفتہ۔ بھئی میرے خیال میں آپ دونوں غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ لیلیٰ مجنوں کی وجہ سے مشہور نہیں ہوئی اور نہ مجنوں لیلیٰ کے سبب۔ لیلیٰ کو شہرت نصیب ہوئی بلکہ ان دونوں کو اس دنیا میں مشہور کرنے والی ایک اور ہی ہستی تھی۔

رنگین۔ جی! لیلیٰ مجنوں کو مشہور کرنے والی کوئی اور ہی ہستی تھی!؟

کون تھی وہ بزرگ ہستی؟

شیفتہ۔ اونٹ

شعلہ۔ اجی شیفتہ صاحب! اونٹ!؟

شیفتہ۔ جی ہاں اونٹ۔

شعلہ۔ مذاق کر رہے ہیں آپ شیفتہ صاحب! بھلا اونٹ سے لیلیٰ مجنوں کا کیا واسطہ!؟

شیفتہ۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں میر شعلہ! لیلیٰ مجنوں کے زمانے میں ریل تھی؟ یا موٹر چلتے تھے؟؟

شعلہ۔ جی نہیں اس زمانے میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔

شیفتہ۔ اگر اتنی ترقی ہو چکی ہوتی تو آپ کو معلوم ہے کیا ہوتا شعلہ صاحب؟

شعلہ۔ کیا ہوتا؟

شیفتہ۔ اجی جناب قیس پڑھ لکھ کر جوں کے کمشنر ہو جاتے اور قیس مجد کے کمشنر ہوتے تو کیا ہوتا!؟

ذرا آپ پوچھئے رنگین صاحب

رنگین۔ کیا ہوتا شیفتہ صاحب؟

شیفتہ۔ رنگین صاحب!

قسمت بدلے گا، اگر قیس کمشنر ہوتا

بیٹی لیلیٰ کی بیاہ دی کمشنر ہوتا

شعلہ۔ (ہنس کر) واہ واہ شیفتہ صاحب کیا موقع کا شعر سنایا ہے آپ نے

شیفتہ۔ پھر سوچئے میر شعلہ اور مرزا رنگین۔ جب کوئی نہیں تھا تو مجنوں کے ریگستان میں جانے کے لئے لیلیٰ کے پاس کون سی سواری تھی؟

رنگین۔ لیلیٰ کے پاس صرف اونٹ تھا۔

شگفتہ ۔ ع قیس کو لیلیٰ کی صورت دیکھنا منظور ہے

شعلہ ۔ اجی کیا برمحل شعر سنایا ہے آپ نے شگفتہ صاحب! ۔ تو بے چارے مجنوں لیلیٰ کی صورت دیکھ سکے یا مایوس رہ گئے ؟ ؟

شگفتہ ۔ حضور! لیلیٰ نے حد سے سوا مجنوں کو بے قرار پایا تو غرور فرمانے لگیں یعنی اونٹ کو سرپٹ بھگا دیا ۔

رنگین ۔ آئیں ؟ تو بے چارے مجنوں کی کیا حالت ہوئی ؟

شگفتہ ۔ اس مضمون پر ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

رنگین ۔ ارشاد ۔

شگفتہ ۔ ع بھگا نا دیکھ کر یکلخت وہ اس کا اپنے ناقے کو

رنگین ۔ ع بھگانا دیکھ کر یکلخت وہ اس کا اپنے ناقے کو

شگفتہ ۔ ع میاں مجنوں کا چلّانا کہ بی لیلیٰ ٹھہر جانا

رنگین ۔ اجی واللہ واہ کیا شعر سنایا ہے سبحان اللہ

شعلہ ۔ (ہنس کے) شگفتہ صاحب! مجنوں چلّائے کہ بی لیلیٰ ٹھہر جانا" تو لیلیٰ ٹھہریں یا بھاگ گئیں ؟

شگفتہ ۔ اجی کیا مجال جو وہ ٹھہر جائیں ۔ فاقوں کے مارے مجنوں یکلخت بھاگتے ہوئے اونٹ کے پیچھے تھے اور لیلیٰ کو مذاق سوجھ رہا تھا ۔

ع تیز رو ناقہ ہے، مجنوں ناتواں مجبور ہے

شعلہ ۔ ع ۔ تیز رو ناقہ ہے، مجنوں ناتواں مجبور ہے

شگفتہ ۔ ع اس پہ بی لیلیٰ کا فرمانا کہ دلّی دور ہے

رنگین ۔ (ہنس کر) کمال ہے شگفتہ صاحب! مجنوں بے چارے کی یہ حالت اور لیلیٰ صاحبہ کہہ رہی تھیں "دلّی دور ہے" ؟

شعلہ ۔ یعنی محبت کی اس نیاز مندی کے باوجود لیلیٰ کو مجنوں پر رحم نہیں آیا ۔

شگفتہ ۔ رحم ضرور آیا ہوگا شعلہ صاحب مگر حسن کی فطرت سے مجبور تھیں ۔ ناز فرمانے لگیں بے چارے مجنوں کہاں تک اونٹ کے پیچھے دوڑتے آخر تھک کر دھم سے ریت پر گر پڑے ۔ اور لیلیٰ کا اونٹ یہ جا وہ جا یعنی غائب ۔

رنگین ۔ بے چارے مجنوں بہت روئے ہوں گے شگفتہ صاحب ؟

شگفتہ ۔ میاں رنگین! پاگل رویا نہیں کرتے ۔ جب مجنوں کے حواس ذرا درست ہوئے تو پھر اونٹ کی تلاش میں نجد کا ریگستان چھاننے لگے ۔ آخر ایک دن قسمت کا مارا ایک اونٹ والا ۔ اور ایک اونٹ مجنوں کو نظر آ ہی گیا ۔

رنگین ۔ (ہنس کر) چیختے بھاگے ہوں گے اونٹ کی طرف

شگفتہ ۔ اونٹ کی طرف نہیں، اونٹ والے کی طرف ۔ اور دو چار چھلانگوں میں اونٹ والے کے سامنے کھڑے تھے ۔

ع مجنوں یہ پوچھتا تھا لیلیٰ کے ساربان سے

رنگین ۔ ع مجنوں یہ پوچھتا تھا لیلیٰ کے ساربان سے

شگفتہ ۔ ع بتلاؤ مول لائے یہ اونٹ تم کہاں سے

(ہنس کر) اونٹ والے نے اس سوال پر مجنوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اس وقت تک مجنوں، لیلیٰ کی محبت میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے اونٹ والے کو یقین ہو گیا کہ یہی صاحب مجنوں ہیں ۔ اس نے کہا "اونٹ کہاں سے مول لیا ہے ۔ بعد میں بتاؤں گا پہلے آپ بتائیے آپ کا نام ؟ ؟

مجنوں نے پاگلوں والی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا "میرا نام؟ میرا نام مجنوں ہے" ۔ اونٹ والے نے دیکھا کہ مجنوں کرتے کا گلا اور صرف ایک آستین پہنے کھڑے ہیں تو اسے مذاق سوجھا کہنے لگا

ع یہی وحشت اگر جوشِ جنوں میں ہے تو اے بھائی

شعلہ ۔ ع یہی وحشت اگر جوشِ جنوں میں ہے تو اے بھائی

شگفتہ ع ۔ دوپٹہ اوڑھ لو جس میں گریباں ہو نہ دامان ہو

رنگین ۔ (قہقہا) واللہ وہ اونٹ والا بھی آدھا شاعر تھا ۔

شگفتہ ۔ اجی اس زمانے میں ہر آدمی آدھا شاعر ہوا کرتا تھا آدمی کو بھوک لگتی تھی تو شاعری میں روٹی مانگا کرتا تھا ۔

شعلہ ۔ (ہنس کر) یہ خوب کہا شگفتہ صاحب! ۔ خیر پھر مجنوں نے کیا جواب دیا ؟

شگفتہ ۔ مجنوں بہت ہنسے مطلب یہ تھا کہ اگر آدمی کو گریبان اور دامن ہی کا ہوش ہو تو مجنوں کا رتبہ کیسے حاصل کر سکتا ہے وہ اس طنزیہ ہنسی کو اونٹ والا نہ سمجھ سکا ۔ مجنوں نے اونٹ والے کی بیوقوفی کو معاف کر کے اس سے پوچھا ۔ "کیوں میاں" تم کون ہو؟ [illegible] اونٹ والا اس کے منہ سے نکل گیا لیلیٰ کا ساربان ۔ لیلیٰ کا ساربان ؟ ؟

مجنوں نے خیر ابدالآبادی جمع کر کے ساربان کے کاندھوں پر بیٹھ جانے کے لئے اچھلے ۔ بعض مجنوں اچھلے تو ساربان نے غوطہ لگایا ۔ اور مجنوں ساربان کو پھلانگ کے اونٹ کی گردن میں

جانے لگے چلا رہے تھے "لیلیٰ کے اونٹ میرے پیارے اونٹ"

رنگین۔ (قہقہا) اجی اونٹ تو اس واویلا کے حملے سے بوکھلا گیا ہوگا۔

شگفتہ۔ اجی اونٹ اچھلا کودا، اچکا اقلا بچیں بھریں مگر مجنوں اونٹ کی گردن میں لٹکے سفر کر رہے تھے آخر اونٹ نے زور سے گردن جھٹکی میاں مجنوں پٹ سے ریت پر اور اونٹ چھوٹ سے نخلستان میں۔ پلٹ کے جو دیکھا تو اونٹ غائب اونٹ والا پاس کھڑا ہے مجنوں اٹھ کے ہاتھ جوڑتے ہوئے اونٹ والے کی طرف لپکے اور کہنے لگے "اماں اونٹ والے ذرا لیلیٰ کو میرا سلام کہنا"۔

شعلہ۔ (ہنس کے) یعنی اس پٹ خنی پر بھی مجنوں لیلیٰ کو یاد فرما رہے تھے؟

جی ہاں اسی لئے اونٹ والے نے جل کر جواب دیا۔

؏ نکل جائے گا دم کے ساتھ فوراً عشق بی لیلیٰ

شعلہ۔ ؏ نکل جائے گا دم کے ساتھ فوراً عشق بی لیلیٰ

شگفتہ۔ ؏ جو تم پر لات ناقے نے کہیں مجنوں میاں رکھ دی

رنگین۔ (ہنس کے) واللہ کیا برجستہ شعر کہا اونٹ والے نے، پھر کیا بولے جناب مجنوں؟

شگفتہ۔ فرمانے لگے "اے اونٹ والے! میں تو یہی چاہتا ہوں کہ لیلیٰ کے اونٹ کی لات کے نیچے ایک دن شہید ہو جاؤں"۔ اونٹ والا بولا "کیا بکتے ہو جس دن اونٹ ایک لات جھاڑ دے گا اس دن سے شہید ہونے کا نام نہیں لوگے"۔ یہ سن کے مجنوں لمبی بانہیں کر کے اونٹ والے کی طرف یہ شعر کہتے جھپٹے۔

؎ تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

شعلہ۔ (قہقہا) اونٹ والے کو حیرت ہو گئی ہوگی؟

شگفتہ۔ اجی وہ مجنوں کو بہت ہی خطرناک قسم کا پاگل سمجھ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجنوں نے اسے کافی دوڑایا (مگر اونٹ کی صحبت کا اثر) وہ چھلانگوں میں اونٹ والا بھی غائب۔

رنگین۔ (ہنس کے) اور پھر وہی لق و دق میدان۔ آدم نہ آدم زاد

شگفتہ۔ جی ہاں وہی نجد کا ریگستان وہی مجنوں۔ اور وہی لیلیٰ کے اونٹ کی پھر تلاش۔ ادھر لیلیٰ کے اونٹ والے نے مجنوں کی حالت جو لیلیٰ سے بیان کی تو بے چاری کو بہت ترس آیا۔ ایک دن اونٹ پر سوار ہو کے نجد کی طرف چلی ادھر لیلیٰ کا اونٹ قریب ہی سے آتا نظر آیا۔

شعلہ۔ گریباں پھاڑ کے دوڑے ہوں گے میاں مجنوں؟

شگفتہ۔ گریباں تو مدت سے پھاڑ کے پھینک چکے تھے ہاں گلا پھاڑ کے چلائے۔ "لیلیٰ" ـــــ اور سرپٹ اونٹ کی طرف بھاگے۔ پاس پہنچے تو اونٹ نے گردن لمبی کر کے مجنوں کو پہچانا۔ کان پھڑپھڑائے۔ کوتیاں بدلیں۔ اچھلا اور دم بند ڈگ بھاگا مگر مجنوں پیچھے تھے آخر۔

؏ ناقۂ لیلیٰ نے مستی میں جڑی مجنوں کے لات

شعلہ۔ (ہنس کے) ؏ ناقۂ لیلیٰ نے مستی میں جڑی مجنوں کے لات

شگفتہ۔ ؏ یہ شتر غمزہ بہ رنگ لغزش مستانہ تھا۔

شعلہ۔ (قہقہا) مجنوں تو زمین میں لوٹ گئے ہوں گے اونٹ کی لات کھا کے

شگفتہ۔ اجی اونٹ کی لات کوئی معمولی لات ہوتی ہے۔ بیچارے مجنوں کئی قلابازیں کھا گئے اور اونٹ بھڑک کے بھاگا۔

رنگین۔ لیلیٰ نے اونٹ روکا نہیں شگفتہ صاحب

شگفتہ۔ اجی لیلیٰ نے ہزار نکیلیں کھینچی۔ چلائی مگر اونٹ روکے نہ رکا اور یہی تاریخی واقعہ ہے جس کی وجہ سے آج تک اونٹ شہر میں بدنام ہے۔

؎ محمل لیلیٰ کو لے بھاگا یہی الزام تھا
اونٹ بے چارہ اسی سے شہر میں بدنام تھا

رنگین۔ (ہنس کر) شگفتہ صاحب! لیلیٰ کو یہ فکر نہیں ہوئی کہ مجنوں اونٹ کی لات کھا کے زندہ رہے یا شہادت پا گئے۔

شگفتہ۔ اسی وجہ سے لیلیٰ پھر نجد آئی اب مجنوں بہت کمزور ہو چکے تھے مگر دیوانگی کا یہ عالم کہ لیلیٰ کا اونٹ دیکھتے ہی اس زور سے بھیانک آواز نکالی کہ

؏ اونٹ بھڑکا، نجد میں محمل سے لیلیٰ گر پڑی

شعلہ۔ ؏ اونٹ بھڑکا نجد میں محمل سے لیلیٰ گر پڑی

شگفتہ۔ ؏ قیس چلایا کچھ اس وحشت بھری آواز سے

رنگین۔ (قہقہا) یعنی لیلیٰ اونٹ سے گر پڑی؟

شگفتہ۔ جی ہاں، ادھر محمل سے لیلیٰ گٹھری کی طرح دھم سے ریت پر گری ادھر خود مجنوں زور سے چیخنے کی وجہ سے غش کھا کے دھڑام سے زمین پر آ رہے۔

شعلہ۔ (ہنسی) اس وقت اونٹ کس موڈ میں [illegible] صاحب؟

شگفتہ۔ شعر۔ قیس بزدل ہے تاقۂ لیلیٰ

شعلہ۔ شعر۔ قیس بزدل ہے تاقۂ لیلیٰ

شگفتہ۔ شعر۔ دانت پیسا کیا جنگل میں

رنگین (قہقہا) بہت خوب اچھا شگفتہ صاحب لیلیٰ اپنے بے ہوش مجنوں کے پاس تو ضرور گئی ہوگی۔

شگفتہ۔ شاید جاتی۔ مگر مجنوں کے پاگل پن اور اونٹ کے گرنے کی وجہ سے گھبرا گئی بے چاری اور اونٹ پر بیٹھ کے ایسی بھاگی کہ پلٹ کے مجنوں کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

شعلہ۔ اس کا مطلب یہ ہے شگفتہ صاحب کہ بے چارے اونٹ کو لیلیٰ مجنوں کی وجہ سے نہ جانے کتنی مصیبتیں اٹھانا پڑی ہوں گی؟

شگفتہ۔ حضور! یہی تو میں کہتا ہوں کہ لوگوں نے اونٹ بے چارے کو نیک سمجھ کے لیلیٰ مجنوں کی کہانی میں کہیں اس کا چرچا ہی نہیں کیا۔ حالاں کہ مجنوں کو ہیرو اور لیلیٰ کو ہیروئن بنانے والا صرف "اونٹ" تھا۔

رنگین۔ واقعی یہ تو ماننا پڑے گا شگفتہ صاحب!

شگفتہ۔ اجی ابھی نہیں ماننا چاہیے میں تو کہتا ہوں رنگین صاحب! جو لوگ کیوپڈ کو محبت کا دیوتا مانتے ہیں انھیں غور کرنا چاہیے کہ کیوپڈ محبت کا دیوتا ہے کہ اونٹ۔

شعلہ۔ کیا آپ کیوپڈ کو محبت کا دیوتا نہیں مانتے شگفتہ صاحب؟

شگفتہ۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سچی محبت کا دیوتا اونٹ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ سچی محبت اونٹ کی طرح بے وقوف ہوتی ہے۔

(قہقہے ۔ قہقہے ۔ قہقہے)

ایک خواہش

نفیس حمید بلوری

جب میں بس میں سوار ہوا اس وقت تقریباً سبھی مسافر اونگھ رہے تھے۔ لانگ روٹ کی بسوں میں مسافر بس کی تکان سے محفوظ رہنے کے لیے عموماً سوتے ہوئے ہی سفر کرتے ہیں۔ سرسری طور پر خالی سیٹوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈرائیور کے پیچھے سے تیسری سیٹ پر میں بھی بیٹھ گیا۔ اسی سیٹ پر کھڑکی کی طرف ایک ادھیڑ عمر کا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر دونوں ہاتھ گود میں ڈال رکھے تھے۔ اس کا قیمتی لباس اور پیروں کے پاس پڑا ہوا خوبصورت بریف کیس اس کی امارت کی گواہی دے رہا تھا۔ داہنے ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی بڑی سی انگوٹھی چمک رہی تھی جس پر سرخ رنگ کا کوئی نگینہ جڑا ہوا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چونک پڑا۔ سرسری طور پر اس نے میرا جائزہ لیا پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ شاید وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اتنے ہی میں بس چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گھوم کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ تھی؟"

"ہانسی!"

میرے جواب سے وہ مطمئن سا نظر آنے لگا۔ پھر اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"شوق فرمائیے۔"

"جی نہیں شکریہ! میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اوہ! تب تو شاید آپ مجھے بھی پینے کی اجازت نہ دیں" اس نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں آپ شوق سے پیجیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"شکریہ!"

یکایک کسی موڑ پر بس ایسی تیزی سے مڑی کہ سارے مسافر چونک پڑے۔ ایک آدھ تو نیند کی جھونک میں ایک دوسرے کے اوپر بھی گر پڑے۔

ڈرائیور کی بائیں طرف دو سیٹیں اس زاویے سے لگی ہوئی تھیں کہ اس پر بیٹھنے والے کا رخ ڈرائیور کی طرف ہوتا تھا۔ اسی پر ایک لڑکی سر سیٹ کی ریلنگ سے لگائے سو رہی تھی۔ بس کے مڑنے سے اسے ایسا دھکا لگا کہ وہ سیٹ سے اچھل کر بونٹ پر گرتے گرتے بچی۔ اگر ریلنگ کو اس نے مضبوطی سے نہ پکڑ لیا ہوتا تو یقیناً اس کا سر بونٹ کے اوپر گر کر پھٹ جاتا۔ بس میں ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔

تقریباً سارے ہی مسافر جاگ چکے تھے۔ اور بس ان سارے ہنگاموں سے قطع نظر اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

لڑکی نے بڑے بڑے پھولوں والا بیل باٹم پہن رکھا تھا۔ بکھرے ہوئے بھورے بال اس کے گول چاند سے چہرے پر نہایت خوبصورت لگ رہے تھے۔ اس نے کندھے پر ایک کیمرہ لٹکا رکھا تھا اور ہاتھ میں کوئی کتاب تھی یا بڑی سی نوٹ بک۔ پیروں کے پاس پڑے ہوئے بڑے سے چرمی بیگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی ٹورسٹ ہے۔

یوں تو ہانسی میں ہمیشہ قدیم تہذیب سے دلچسپی رکھنے والے ٹورسٹوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ مگر آج کل ہانسی کے قریب ہی گوتم بدھ کے زمانے کے کچھ مزید کھنڈرات کی دریافت ہوئی ہے جس کی کھدائی حکومت کی جانب سے بڑی احتیاط کے ساتھ ہو رہی ہے۔ انھیں دیکھنے کے لیے آج کل شائقین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ شاید یہ لڑکی بھی انھیں میں سے ایک ہو۔

اس کے متعلق میں مزید قیاس آرائی نہ کر سکا کیونکہ اچانک اس شخص نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اور سیل بجھنے سے اپنی نظروں میں ابھر رہا کر سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ ہو سکتا ہے اسے اندازہ ہو گیا ہو کہ

میں اسی کے متعلق سوچ رہا تھا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی اپنی
[illegible] انہیں آگاہ کر دیتی ہے کہ دوسرے لوگوں کے نزدیک ان کا کیا
مقام ہے۔ اس کی گردن اب بھی میری طرف مڑی ہوئی تھی میں نے
کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا وہ بغور میرے سراپا کا جائزہ لے رہی
تھی میں نے محسوس کیا کہ میری پیشانی بھیگتی چلی جا رہی ہے۔ اپنی گھبراہٹ
چھپانے کے لیے میں نے ہاتھ میں لیے اخبار کو کھول کر اپنے سامنے کر
لیا پسینے کا ایک قطرہ ٹپ سے اخبار پر گر پڑا اخبار نیچے کر کے میں
نے جیب سے رومال نکالا اور پسینہ خشک کرنے لگا۔ کنکھیوں
سے میں نے ایک بار پھر لڑکی کی طرف دیکھا وہ حیرت سے میری طرف
ایک ٹک دیکھ رہی تھی شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی یا میرا
اپنی طرف دیکھنا اسے ناگوار گزر رہا تھا۔ اس لیے آنکھوں کی زبانی
احتجاج کر رہی تھی میں کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اگر مجھے بھی
لڑکیوں کو گھور گھور کر دیکھنے کی عادت ہوتی تو میں بھی اس کی طرف...
آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا، مسکراتا مگر میں تو صرف اس کے گرتے گرتے
بچنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا ورنہ میں تو یہ بھی اندازہ نہیں
لگا پایا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی اس کے بالوں کی طرح بھوری ہیں یا
ان میں اور کسی رنگ نے قبضہ جما رکھا ہے۔

اس کی نظروں کی چبھن سے بچنے کے لیے میں نے کھڑکی کی طرف
مڑ کر سر پیچھے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی اداکاری کرنے لگا۔
میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ لڑکی اس ادھیڑ عمر کے رئیس شخص
کو گھور رہی ہو۔ اسی میں دلچسپی لے رہی ہو۔ یا میرے پیچھے بیٹھے ہوئے
اس نوجوان کو، جس کی مونچھیں پہلی ہی نظر میں مجھے اس کے منہ میں
داخل ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے سونے کی
اداکاری ترک کر کے پیچھے مڑ کر اس نوجوان کو دیکھا وہ سر جھکائے
اونگھ رہا تھا کم سے کم مجھے تو اس کا چہرہ ایسا جاذب نظر نہیں معلوم
ہو رہا تھا جس پر چاند سے چہرے والی لڑکی فریفتہ ہو سکتی۔ ادھیڑ
ہو گا کچھ۔ میں اس میں اتنا کیوں الجھ گیا میں نے اس کے خیال
کو دل سے نکال دینا چاہا اور بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اس
لڑکی کی طرف دیکھا وہ اب میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس
نے ریشمی رومال سے اپنے چہرے کو ڈھانک رکھا تھا شاید [illegible]
[illegible] کر رہی تھی یا [illegible] اچھا ہی ہے [illegible] اس کے خیال [illegible]

میں جھٹکا دینا چاہتا تھا کہ بس ایک اسٹاپ پر رک گئی۔ ڈرائیور
نے اعلان کیا کہ بس یہاں آدھا گھنٹہ ٹھہرے گی اگر کسی کو کوئی ضرورت
ہو تو وہ فارغ ہو لے۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس لڑکی کی طرف دیکھے بغیر
نیچے اتر گیا کوئی خاص ضرورت تو تھی نہیں صرف اس کی عقابی نظروں
سے بچنے کے لیے میں نے آدھا گھنٹہ نیچے گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک
ٹی اسٹال سے ایک کپ چائے لے کر جیسے ہی مڑا سامنے اسی لڑکی
کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"یہاں کافی نہیں ملے گی۔؟"

اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں!" میں بمشکل تمام کہہ پایا۔ "لیکن چائے مل سکتی ہے۔"

"آپ بھی بمبئی [?] ہی میں رہتے ہیں؟" اس نے بدستور میری طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں!"

"میں بھی بمبئی [?] جا رہی ہوں... بنارس سے آ رہی ہوں... میرا
نام موفیہ ہے۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں؟"

"مجھے عشرت کہتے ہیں الہ آباد یونیورسٹی میں اردو سے ایم اے
کر رہا ہوں۔"

"اوہ! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" کہتے کہتے وہ ذرا نڈھال
سی ہو گئی۔ اس کی سانس یوں پھولنے لگی جیسے کسی چڑھائی پر چڑھی
ہو۔ کہنے کو اس نے کہہ دیا تھا بڑی خوشی ہوئی مگر اس کے چہرے پر
خوشی کم استعجاب زیادہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے
کی طرف غور سے دیکھا غزالی آنکھوں میں کرب کا سایہ رقص کر رہا
تھا اس کے نتھنے نہ جانے کس جذبے کے تحت پھول اور پچک رہے تھے ہونٹ
کچھ کہنے کو تھرتھرا رہے تھے شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کنڈکٹر کی
سیٹی نے بس چلنے کا اشارہ کر دیا۔ ہم دونوں بس میں آ کر اپنی اپنی سیٹوں
پر بیٹھ گئے۔

تمام سفر میں یہی کیفیت رہی کہ وہ اداس مجھے دیکھتی رہی اور
میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

آخر جب بس [illegible] پہنچ گئی جیسے ہی میں نیچے اترا مجھے اس لڑکی کی
[illegible] آواز سنائی دی

بتاؤں کی میں اسے کبھی مایوس نہیں کروں گی۔

میں شبنم کے لیے کیا تحفہ لے کر جاؤں گی؟ جانے والے دن میری منتظر ہوگی۔ میں ہسپتال سے اٹھ کر شاپنگ سینٹر کی طرف گئی اور گفٹ سینٹر سے ایک خوبصورت شمع والا خرید لیا جس [illegible] سے مہک سکتی تھیں۔ میں نے فرانسیسی موم بتیوں کا ایک ڈبہ خریدا اور شبنم کے گھر پہنچی۔ شبنم میری ہی منتظر تھی لان میں اپنی تمام دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا وائٹ کلر کی چیئر پر گلابی ساڑھی باندھے بیٹھی تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ساڑھی اسے بے حد پسند ہے تھوڑا قد نکلا تو اس نے اپنی ہر سالگرہ پر ساڑھی باندھنا شروع کر دی تھی جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور میری گردن میں پیار سے بانہیں ڈال دیں میں نے اس کی پیشانی کو چوما اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

"آنٹی آ گئیں، تحفہ کہاں ہے؟" اس کی ایک دوست نے کہا۔ "تحفہ میں دوں گی پہلے اندر چلو آنٹی بہت دیر ہو رہی ہے۔"

شبنم کیک ٹیبل کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اس کی تمام دوست اس کے ارد گرد کھڑی تھیں میں نے بڑھ کر اچانک بتی بجھا دی اور سب کو خاموش رہنے کو کہا پھر میں نے دوبارہ خوبصورت تحفے کا شکریہ ادا کیا اور میں نے شبنم کا ہاتھ کیک پر رکھ دیا۔ شبنم نے کیک کاٹا اور ہیپی برتھ ڈے سے کمرہ گونج اٹھا تالیوں کا شور کچھ کم ہوا تو شبنم کی معصوم اور پیاری آواز سنائی دی اور اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی ابھری۔

میری پیاری آنٹی اور میری عزیز دوستو!

میری اس سالگرہ کے ساتھ ہی میری سالگرہ کی یہ سالانہ تقریب شاید ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہی ہے، میری یہ انیسویں شمع تو جل رہی ہے مگر شاید بیسویں شمع میں گل نہ کر سکوں۔ کیونکہ مجھے کینسر ہو گیا ہے اور میں عرصہ دو سال سے اس موذی مرض میں مبتلا ہوں، اب میں اپنے آپ کو زیادہ کمزور محسوس کرنے لگی ہوں میں آپ سب کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ سب نے مل کر مجھے انیس سال تک کبھی تنہائی محسوس نہ ہونے دی۔ میری پیاری آنٹی آپ کو یہ سن کر افسوس ہوا ہوگا کہ جو بیماری آپ مجھ سے چھپاتی رہی تھیں وہ مجھے کیسے معلوم ہوگئی۔ مگر آنٹی مجھے تو معلوم ہوئی اس کو تو کئی دو برس سے اپنے سینے میں پال رہی ہوں۔ آنٹی کہیں آپ مجھے بزدل تو نہیں سمجھیں۔ آپ کہیں یہ تو نہیں سمجھیں کہ میں موت کو اس قدر قریب رقص کرتے دیکھ کر ڈر جاؤں گی۔ نہیں آنٹی نہیں میں تو [illegible] ہوں، بہادر ماں کی بہادر بیٹی۔ مجھے اپنی ماں کی مجاہدانہ زندگی یاد ہے آنٹی آپ ہی تو مجھے امی کی مجاہدانہ اور بہادرانہ زندگی کے متعلق بتاتی ہیں کہ امی نے غموں، دکھوں، پریشانیوں سے کس طرح مقابلہ کیا تھا۔ آنٹی کیا آپ کو یاد نہیں اور میرا ذہن ماضی کی یادوں میں جا پہنچا۔

سائرہ کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ سائرہ میری بچپن کی دوست۔ سائرہ کو شبنم سے کتنی محبت تھی۔ سائرہ کتنی خوبصورت تھی لوگ اس کی خوبصورتی کی مثال دیا کرتے تھے۔ سائرہ کی شادی جلد ہی ہو گئی، پھر شادی کے پانچ سال بعد سائرہ بیوہ ہو گئی۔ سائرہ کا شوہر کیپٹن جمال تھا جو ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ شبنم ان کی زندگی کا سرمایہ تھی۔ شبنم کی پرورش اور تعلیم ان کا مقصد تھا۔ ایک تو بیوگی اور پھر عین عالم جوانی کی بیوگی جب شباب اپنے عروج پر ہو۔ کون تھا، جسے اس سے ہمدردی نہ ہوئی ہو، دوست دشمن ہر ایک کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اس وقت پھر وہ دن میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

جمعہ کا دن تھا میں میڈیکل کالج کی طالبہ تھی میں نے اور سائرہ نے پروگرام بنایا تھا کہ ایک ساتھ مل کر شاپنگ کرنے چلیں گے، لہٰذا میں کالج سے سیدھی سائرہ کے سسرال پہنچی۔ سائرہ اور شبنم کی تیاری کے بعد ہم لوگ شاپنگ سنٹر پہنچے۔ میں نے اپنے لیے کرتے شلوار کا کپڑا خریدا اور شبنم نے فراک پسند کیا اور سائرہ کے لیے ساڑھی کی ضد کی۔ سائرہ کو ساڑھی خریدنی پڑی [illegible] کی ساڑھی پر سنہرا کام بنا ہوا تھا۔ واقعی بڑی خوبصورت ساڑھی تھی پھر ہم نے ایک دکان پر زبردستی سائرہ کو دو درجن چوڑیاں پہنا دیں۔ اس کی گوری گوری کلائیوں میں کالی اور لال چوڑیاں غضب ڈھا رہی تھیں، مجھے سائرہ کی کلائیاں بچپن سے بڑی پیاری لگتی تھیں۔ جب ہم شاپنگ سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو شام کے چھ بجے کا عمل ہوگا جیسے ہی ہم تینوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے میرے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے سائرہ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا اور شبنم دوڑ کر باپ سے لپٹ گئی ڈیڈی آ گئے، ڈیڈی آ گئے۔ مگر جمال تو بالکل بے سدھ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا دنیا و مافیہا سے بے خبر [illegible] سب کچھ کھو گئی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

سائرہ کو ہوش میں لانے کے لیے جو کچھ ممکن تھا، کر ڈالا۔ مگر اس کے بعد تو [illegible] سکتہ طاری تھا کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کی ساس کو [illegible] بے ہوشی

کے دورے پڑ رہے تھے۔ سارے عزیز رشتہ دار جمع ہوئے اور جمال کو آخری غسل دینے کے لیے لے جایا گیا ادھر میری پیاری سائرہ کے سر سے رنگین دوپٹہ اور رنگین کپڑے اتار کر سفید کپڑے پہنا دیئے گئے۔ وہ چوڑیاں جو شبنم نے بڑی چاہت سے پہنائی تھیں اور سائرہ نے پہنی تھیں توڑ دی گئیں۔ جیسے جیسے سائرہ کے ہاتھوں سے چوڑیاں توڑی جاتی تھیں۔ ایسا لگتا میرے دل کے ٹکڑے کیے جا رہے ہیں۔ پھر شبنم اور سائرہ کو جمال کے آخری دیدار کے لیے لے جایا گیا۔ سائرہ کو جمال کے پلنگ کے پاس بٹھا دیا گیا۔ شبنم، سائرہ کو دیکھ کر رونے لگی۔ مگر سائرہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ٹک جمال کو دیکھے جا رہی تھی اور آنسو اس کے رخسار دل سے ڈھلک کر کفن میں جذب ہو رہے تھے۔ پھر شبنم کی اس بات پر سب ہی مد بھرے "ممی ڈیڈی ناراض ہو گئے بولتے ہی نہیں، اور سائرہ نے شبنم کو کلیجے سے لگا لیا۔ میں نے سائرہ کو کھایا اسے نیند لا کر دی۔ شبنم کو ایک بغل میں دبائے دوسرے ہاتھ میں تسبیح لیے سائرہ سفید کپڑوں میں ملبوس آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بوجھل بوجھل آنکھیں، سائرہ آسمان سے اتری پاکیزہ روح لگ رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں دونوں ماں بیٹیاں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ جس شخص نے بھی سائرہ کو اس دن دیکھا کلیجہ تھام کر رہ گیا کہ ... نے بھی زندگی میں اتنی حسین سوگوار بیوہ نہیں دیکھی تھی۔ بے چاری سائرہ نے شبنم کی خاطر اپنے غم کو سینے میں دبا لیا تھا ... سہمی سی بیٹھی تھی۔ جس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ جس کی خوشیاں منوں مٹی کے نیچے دفن کی جا چکی تھیں۔

سائرہ کی ساس ان پڑھ تھیں جوان بیٹے کی میت اٹھتے ہی وہ بہو کے گرد کنڈل ڈال کر بیٹھ گئیں۔ مگر پانچ سال بعد ان کی ساس کو بھی جوان بیٹے کا غم کھا گیا اور سائرہ اور شبنم پھر ایک ہستی کی شفقت سے محروم ہو گئیں سائرہ کو اپنی ساس سے بڑی محبت تھی اور کیوں نہ ہوتی اس کی ماں کے انتقال کے بعد وہ پہلی بزرگ اور شفیق ہستی تھیں جو اس کے اتنے قریب آ سکیں۔ ویسے تو وہ بھی سائرہ اور شبنم سے بہت محبت کرتی تھیں مگر ایک انجانا سا خوف انھیں پریشان رکھتا تھا کہ کہیں سائرہ، شبنم کو لے کر اپنے بھائی اور بہنوں کے پاس نہ چلی جائے اور ان کا گھر سنسان ہو جائے جب ساس کے انتقال کے بعد سائرہ کے والد اسے لینے گئے تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ وہ چاہتی ہے شبنم کا ڈولہ اسی گھر سے نکلے لہٰذا میں شبنم کو اسی گھر میں پال پوس کر جوان کروں گی۔ پھر اسی گھر سے اسے دلہن بنا کر رخصت کروں گی۔ سائرہ کے والد بھی واپس

آ گئے۔ زیادہ زور انھوں نے بھی نہیں دیا کیونکہ ابھی تو انھیں چار اور بیٹیوں کو بیاہنا تھا، کنواری اور جوان لڑکیوں کے رشتے تو ملنا مشکل تھے بیوہ بیٹی پھر وہ بھی ایک بیٹی کی ماں کا رشتہ کہاں ملتا۔ سائرہ نے صرف شبنم کو زندگی کا محور بنا کر اپنی بھری جوانی قربان کرنے کا تہیہ کر لیا۔

سائرہ نے اپنی تنہائیوں سے یوں سمجھوتہ کیا کہ قریب ہی ایک اسکول میں پڑھانے لگی۔ بڑی مشکلوں کے بعد اسے وہاں ملازمت ملی تھی۔ ایک سال کے بعد شبنم کو بھی اپنے اسکول میں داخل کر لیا اور دونوں ماں بیٹیاں ایک ساتھ اسکول جاتیں اور واپس آتیں۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن رہتیں انھوں نے دنیا سے الگ اپنی دنیا بسائی ہوئی تھی جس میں کسی تیسرے شخص کی دخل اندازی نہیں تھی۔

سائرہ نے بڑے بڑے غموں کو سینے سے لگا لیا تھا۔ قدرت کے عطا کردہ اور زمانے کے عطا کردہ ستم دونوں کو اس نے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ آخر وہ کب تک اتنی محنت کرتی۔ صبح سے شام تک کی محنت پھر اتنے بڑے بڑے غم سائرہ کو ایک دن اچانک دل کا دورہ پڑا۔ پھر ایک سال میں دو دو دورے پڑے اور سائرہ شبنم کو دنیا میں تنہا چھوڑ کر چل بسی۔ سائرہ کے والد شبنم کے ساتھ رہنے لگے۔ شبنم تو نیم دیوانی ہو گئی اس کی دنیا ہی اجڑ گئی۔ لیکن وقت غموں کا مرہم ہے آہستہ آہستہ شبنم نے اپنی خلاؤں میں ماں کی محبت اور ملنے کو تلاش کر لیا۔ اور کسی حد تک اپنا غم بھول گئی۔

شبنم نے میٹرک پاس کر کے کالج کی زندگی میں قدم رکھا۔ واقعی شبنم ایک عظیم ماں کی بیٹی تھی۔ جس کی زندگی جہاد کرتے گزری جس نے غموں سے جہاد کیا۔ جس نے بیوگی سے جہاد کیا۔ جس نے دنیا کے مسائل سے جہاد کیا۔ جس نے غموں سے ان جوان خواہشات سے جہاد کیا۔ سائرہ ایک عظیم مجاہد تھی اور شبنم اسی بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہے۔

میں یادوں کی نگری سے لوٹ آئی شبنم کی آواز میری سماعت سے اب بھی ٹکرا رہی تھی وہ بولے جا رہی تھی اس کی آواز میں لرزہ تھا۔ دکھ تھا۔ اس کی آواز میرے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہو رہی تھی۔ میں درد سے چیخ اٹھی "بس کرو شبنم میری بچی بس کرو" شبنم میرے سینے سے لگ کر رو پڑی صبر کا دامن دونوں کے ہاتھوں سے چھوٹ چکا تھا۔ ہر شخص اس انکشاف پر افسردہ تھا۔ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "آنٹی اس دنیا میں جو آیا ہے اسے واپس تو جانا ہے کوئی پہلے چلا جاتا ہے کوئی بعد میں۔

میں نے محسوس کیا شبنم (جیسے آپ کو...) نفسیاتی طور پر ہر صورت حال
کے لیے تیار کر رہی ہے۔ میرا صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا تھا۔ شبنم کا مرض اپنے
بچپن تک منتقل کر ڈالا۔ اپنی زندگی اس پر نچھاور کر دوں۔ خوش نصیبی سے اس
کا دامن بھر دوں۔ لیکن میں کتنی مجبور تھی۔ میں ڈاکٹر تھی۔ شفا کا ذریعہ تو میں
تھی۔ مگر شفا دینا تو خدا کے ہاتھ تھا اور میں خدا کے حضور عاجزی سے گڑگڑا
رہی تھی۔ میرے خدا میری شبنم کو زندگی دے دے۔ میری زندگی دے دے۔ مگر
میری دعا قبول نہیں ہو سکی۔ اس کی کچھ مہلت تھی۔ شبنم کی حالت روز بروز گرتی
جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے علاج میں
میں نے دن رات ایک کر دیئے اور جب میں شبنم کے سامنے جاتی تو شبنم
مجھے بڑے پر سکون انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتی "آنٹی آپ کو پتہ
ہے جسے دنیا میں جو چیز نہیں ملتی وہ اللہ میاں کے یہاں ضرور ملتی ہے
اب دیکھیے مجھے ممی ڈیڈی کا دنیا میں نہیں ملے ان کی محبت دنیا میں نہیں ملی
اب اللہ میاں کے یہاں ملے گی۔ جنت کے بغیچے میں پھر کتنا مزہ آئے گا میں
ہوں گی۔ ڈیڈی ہوں گے۔ ممی ہوں گی۔ سکون ہی سکون ہوگا۔ آرام ہی
آرام ہوگا۔ کیونکہ یہ سب چیزیں یہاں دنیا میں نہیں ملیں۔"

شبنم موت سے گلے ملنے کو بے قرار تھی اور موت کو پیچھے دھکیلنے کی
کوشش میں لگی ہوئی تھی اور بالآخر موت جیت گئی اور میں ہار گئی۔ میں ہار
گئی... ہاں میں... ہار گئی۔ شبنم میری جان میری زندگی۔ میری سائرہ کی آخری
نشانی مجھے چھوڑ کر سائرہ کے پاس چلی گئی۔

آج اس کی سالگرہ ہے ۲۰ویں سالگرہ اس کی تمام دوست آگئیں
محبت اور خلوص سے [illegible] تھی۔ شبنم تھی نہ اس کے قہقہے تھے نہ اس کی پیاری
پیاری باتیں۔ [illegible] اس کی دوست ہنس رہی تھیں اور نہ ہی کیک
کٹا اور نہ ہی شمعیں روشن کی گئیں بلکہ ہر چہرہ اداس تھا ہر آنکھ پرنم
تھی اور سب لوگ آئے اس کی تمام دوست خود ہی آئیں ایک ایک
[illegible] جلتی گئیں اور بیسویں سالگرہ کی
تقریب ختم ہو گئی......

اعضا بولتے ہیں

میں آپ کا دماغ ہوں

عبداللہ خاور

میں آپ کا جزو نہیں۔ کل ہوں۔ آپ کا وجود ہوں۔ میں آپ کے تمام افعال، احساسات، خیالات اور جذبات کا حکمراں ہوں۔ میرے مقابلے میں عجائب عالم ہیچ ہیں۔ میرا وزن تین پونڈ ہے جو خاکستری اور سفید ریشوں کا مجموعہ ہے اور اس میں جلاٹینی (GELATINOUS) لوچ اور امیدواری ہے۔ دنیا کا کوئی کمپیوٹر میرے لامحدود افعال انجام نہیں دے سکتا۔ میرے اجزائے ترکیبی بے شمار ہیں۔ یعنی تقریباً دس ارب عصبانیے (NEURONS) اور انہی سے پانچ تا دس گنا سریشی ریشے (GLIAL CELLS) اور یہ ساری کائنات آپ کے کاسہ سر میں سمائی ہوئی ہے!

میں آپ کا عضو نہیں، آپ کی 'انا' ہوں۔ آپ کی شخصیت ہوں آپ کا ذہن ہوں، آپ کی ذہنی استعداد ہوں! آپ کا خیال ہو کہ آپ کانوں سے سنتے ہیں، زبان سے چکھتے ہیں اور انگلیوں سے محسوس کرتے ہیں۔ جناب، یہ سارے عمل میرے اندر واقع ہوتے ہیں۔ کان، زبان اور ہاتھ، صرف معلومات جمع کرتے ہیں۔ میں آپ کو آپ کی عدالت کی اطلاع دیتا ہوں، پیاس اور بھوک کی خبر کرتا ہوں، آپ کی جنسی تحریک، موڈ اور ہر کیفیت کی کمان کرتا ہوں۔

جب آپ سوتے ہیں تو میں تواتر اس قدر بے شمار پیغامات کو بھیجتا ہوں جو تمام دنیا کے ٹیلی فون ایکسچینج بے کار کر دیے سکتے میں آپ پر خارجی اطلاعات کا جو سیلاب حملہ آور ہوتا ہے وہ کسی کے قابو میں نہیں آ سکتا۔ میں اس پر کس طرح قابو پاتا ہوں! میں انتخاب اور استرداد سے کام لیتا ہوں۔ اہم اطلاع پر کارروائی کرتا ہوں۔ باقی نظر انداز کر دیتا ہوں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کام کے دوران اگر آپ موسیقی کا ریکارڈ چلا دیں گا تو آپ کام پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں یا موسیقی پر، دونوں پر بیک وقت ارتکاز توجہ ممکن نہیں۔

جب اچانک کوئی خطرناک صورت حال رونما ہوتی ہے تو میں فوری طور پر اپنی رفتار کار بڑھاتا ہوں۔ فرض کیجئے چلتے چلتے آپ کا پیر پھسلا۔ میں پہلے تو آپ کو توازن برقرار رکھنے یا سنبھلنے کا حکم دوں گا۔ پھر ہاتھوں کو گرنے سے بچانے کے لیے تیز اور مناسب حال حرکات پر مجبور کر دوں گا۔ اگر آپ گر ہی گئے تو یہی ہاتھ اور دیگر اعضا کو بچانے اور کم سے کم چوٹ لگنے کے لیے فوری کارروائی کریں گے۔ پھر میں آپ کو چوٹ کی اطلاع دوں گا اور یادداشت کے خانے میں نوٹ کرا دوں گا کہ چلنے میں احتیاط برتیے۔

حادثات کے علاوہ مجھے ہزاروں اندرون خانہ کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً نظام تنفس کو لیجئے۔ حسی اعصاب مجھے اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کے خون میں کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھ رہی ہے، اور اضافی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ میں فوراً تنفس کی رفتار بڑھا دیتا ہوں۔ سینے کے عضلات کو تیزی سے پھیلنے اور سکڑنے کا حکم جاری کرتا ہوں اور آپ ہانپنے لگتے ہیں۔ اس طرح اضافی آکسیجن فوراً خون کو فراہم ہو جاتی ہے۔

میں آپ کی دایہ گیری ہزاروں طرح سے کرتا ہوں لیکن اس کا معاوضہ بھی سب سے زیادہ لیتا ہوں۔ آپ کے حاصل کردہ آکسیجن کا ۲۰ فیصد حصہ اپنے کام میں لاتا ہوں۔ خون اور آکسیجن کی مسلسل رسد میری ناگزیر ضرورت ہے۔ ان میں سے کسی چیز کی عارضی رکاوٹ سے آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ سپلائی چند منٹ منقطع ہو جائے تو میرے خلیات مردہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً فالج یا موت واقع ہو سکتی ہے۔ مجھے تغذیہ کی مسلسل ضرورت رہتی ہے۔ میرا تغذیہ گلوکوز ہے۔ شاید فاقہ کشی کی حالت میں بھی ذرا سی غذا ملتے ہی سب سے پہلے میں آلات ہضم سے گلوکوز کا مطالبہ کرتا ہوں [illegible] آپ کا [illegible] ور ہے۔

[illegible] اختیار سے [illegible]

یہ منظر ہوں، جیسے کسی ساحل کا کچھ اتا پتا لگایا گیا ہے۔ لیکن جو محققین میرے چند مبہم نقشے بنا سکے ہیں ان سے بڑی دل چسپ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر میں سارے بدن کا درد محسوس کرتا ہوں، لیکن جب خود مجھے کاٹا جاتا ہے تو تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے، لیکن اپنے درد کا احساس ہمیں نہیں۔!

لیکن اس عجیب صورت حال کا فائدہ یہ ہے جب دماغ کا آپریشن کیا جاتا ہے تو مریض پوری طرح بیدار ہو جاتا ہے، اور ہمارے سیاح (دماغی سرجن) نامعلوم علاقوں کو دریافت کرتے رہتے ہیں، میرے خاص خاص رقبوں کو برقی رو سے تحریک دیتے ہیں اور ردعمل کا معائنہ کرتے ہیں جس مریض کا دماغی آپریشن کیا جا رہا ہو وہ عجیب عجیب تجربات محسوس کرتا ہے۔ بجلی میرے ایک حصے سے مس کی گئی تو اچانک مریض کو ایک بھولا بسرا میرے درجہ کا استاد دکھائی دینے لگا۔ کسی اور حصے کو تحریک دی گئی تو ریل کی سیٹی یا کوئی گیت سنائی دینے لگا، جو مریض کو قطعی یاد نہ تھا۔ میں وہ قدیم محل سرا ہوں جس کے در و بام پر گزری ہوئی زندگی کے ہر لمحے کی داستان نقش ہے، خواہ اس داستان کے تمام اجزا آپ کو یاد ہوں یا نہ ہوں۔

واقف ماہرین میرے بنیادی کارکردگی والے رقبوں، کو کسی حد تک معلوم کر چکے ہیں۔ مثلاً حس بصارت میرے پچھلے حصے میں ہے، سماعت پہلوؤں کی جانب ہے۔ شاید سب سے دلچسپ دریافت میرا تفریحی رقبہ ہے۔ اگر اس حصے کو تحریک دینا کسی کو آجائے تو وہ کھانا پینا سب چھوڑ کر اسی تحریک میں لگا رہے اور فاقہ کشی کی حالت میں بھی خوشی خوشی مر جائے۔ اگر اضمحلال (DEPRESSION) کے مریض کے ذہن کے اس مخصوص حصے کو برقی تحریک دی جائے یا برقیہ (ELECTRODE) دماغ میں نصب کر دیا جائے تو پژمردہ مریض قہقہے لگانے لگے!۔

میں ایک محفوظ قلعہ میں رہتا ہوں۔ کاسہ سر کا اوپری حصہ کا ول تقریباً چوتھائی انچ اندر سروں پر اس سے زیادہ موٹا ہوتا ہے۔ تین ایک رقیق مادے میں ڈوبا رہتا ہوں، جو دھچکوں سے گدے کی طرح میری حفاظت کرتا ہے۔ میرے لیے خون کی رسد کا

... دروازہ اس طرح بنا ہوا ہے جو صرف مطلوبہ مادے اندر آنے دیتا ہے اور غیر مطلوبہ مادوں کو باہر ہی روک دیتا ہے۔ اس طرح میرے دروازے پر گلوکوز کو خوش آمدید کہا جاتا ہے، لیکن جراثیم اور نشہ آور مادوں کو دور رکھا جاتا ہے۔ بعض درد دور اور بے حس کرنے والی ادویہ (ANESTHETICS) اس راہ سے آسانی اندر آ جاتی ہیں اسی طرح الکحل اور تصور کاذب یا وہم روگ پیدا کرنے والی ادویہ (HALLUCINOGENIA DRUGS) میرے نہاں خانوں میں راہ پا جاتی ہیں اور میری عمومی کارکردگی کو مسخ کر دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں کبھی کبھی تصوراتی اشکال کی آوازیں، مجھے سنائی دینے لگتی ہیں۔

چند الفاظ میری ترکیب کے متعلق

اپنے لان پر سے گھاس لگی ہوئی مٹی کا ایک ٹکڑا تراش کر نکالیے۔ آپ کو اس میں جڑوں کا زبردست تانا بانا نظر آئے گا۔ میری ساخت بھی کچھ اسی طرح ہے۔ البتہ تعداد کو کروڑوں سے ضرب دینی پڑے گی میرے ۳۰ ارب عصبانیے، اور دوسری قسم کے ان سے ساٹھ ہزار گنا خلیے سب کے سب ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں! اب اندازہ کیجیے کہ ان سب کو ایک دوسرے سے ملانے والی ڈوریاں کتنی لمبی ہوں گی۔

عصبانیہ (NEURON) ڈوری میں بندھے ہوئے مکڑے کی طرح نظر آتا ہے۔ درمیان میں عصبانیہ ہوتا ہے، اس کے چاروں طرف محوریہ (AXON) اور شجرینہ (DENDRITES) کے جال ہوتے ہیں۔ شجرینے قریبی عصبانیوں سے اشارہ عصبانیے کو پہنچا دیتے ہیں یہاں سے یہ خبر ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوریوں (AXONS) پر سفر کرتی ہے اور دماغ کے مخصوص رقبوں کو پہنچائی جاتی ہے۔ اس ترسیل میں محوریہ کا جوہر (CHEMICAL) صرف ہو جاتا ہے اسے محوریہ ایک سیکنڈ کے دو ہزارویں حصے میں دوبارہ چارج کر لیتا ہے۔ میرے کوئی بھی دو عصبانیے ملے ہوئے نہیں ہیں، ان کے درمیان پیغام شرارے کو جلنے اور بجھانے (SPARK GAP FASHION) کے اصول پر سفر کرتے ہیں۔

اپنی تمام ہمہ گیر خصوصیات کے باوجود میں اپنے ضائع شدہ حصوں کی دوبارہ تخلیق (REPRODUCTION) پر قادر نہیں۔ مثلاً جگر کے ریشے (LIVER TISSUES) یا جلد یا خون کے خلیات، نقص یا ضیاع کی صورت میں دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اگر میں اپنا کوئی خلیہ ضائع کر دوں تو وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے ...

سال کی عمر تک ہر روز تقریباً ایک ہزار خلیات ضائع ہوتے ہیں اس طرح بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ میرا وزن گھٹتا جاتا ہے۔ اگر مجھ میں محفوظ ذخائر نہ ہوں تو یہ نقصان بڑا تباہ کن ثابت ہو۔ جب ہزار خلیے مر جاتے ہیں تو ان کا کام دوسرے ایک ہزار خلیے سنبھال لیتے ہیں اور نقصان محسوس نہیں ہونے پاتا۔ لیکن اگر یہ سلسلہ کافی وسیع ہو جائے تو نقصان ضرور محسوس ہوگا بلکہ دوسروں کو بھی نظر آئے گا مثال کے طور پر قوت شامہ کم یا زائل ہو سکتی ہے، قوت ذائقہ یا سماعت متاثر ہو سکتی ہے۔ ادراک کا زور بھی کم ہو سکتا ہے، جس کی وجہ سے نام، تاریخیں، ٹیلی فون نمبر وغیرہ یاد نہیں رہتے، لیکن حقیقی اہم افعال، میں آخری دم تک انجام دیتا رہتا ہوں۔

آپ کے بدن میں اکثر اعضا، گردے، پھیپھڑے، ہاتھ۔ دو دو ہیں۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں جوڑی دار عضو نہیں ہوں۔ لیکن ایک لحاظ سے میں بھی جوڑی دار ہوں، میرے دائیں اور بائیں نصف حصے نمایاں طور پر الگ الگ نظر آتے ہیں۔ میرا بایاں حصہ بدن کے دائیں حصے کی تمام حرکات کا نگراں ہے اور دایاں حصہ بدن کے بائیں حصے کی جنبشوں کا حاکم ہے۔ راست دست (RIGH HANDED) اشخاص کے دماغ کا بایاں حصہ زیادہ حاوی ہوتا ہے۔ جب کہ چپ دست اشخاص کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ میرا بایاں حصہ بولنے، لکھنے اور حسابی صلاحیتوں کو کنٹرول کرتا ہے اور دایاں حصہ قوت فیصلہ، تمیز تخیل وغیرہ کا خزانہ ہے۔

میری سب سے زیادہ حیرت انگیز صلاحیت میرا بازگشتی نظام (BACK-UPSYSTEM) ہے میں ہر یادداشت کو کئی کئی جگہ پر محفوظ کرتا ہوں۔ اس کے نتیجے میں ایک آم کے درخت کا منظر یا کسی دریائے رواں کی مترنم آواز، لکھنؤ کے دریائے گومتی یا ملیح آباد کے آموں کے باغات کی یاد دلا سکتی ہے۔ یادوں کے اس تسلسل کا ریکارڈ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔

ان محفوظ یادوں اور ان کے تحریکی عمل کی بنا پر ہی یہ بات ممکن ہو سکی ہے کہ خلیات کے ضائع ہونے کے باوجود میرے فرائض منصبی ادا ہوتے رہیں یا یوں کہیے کہ دماغ چل جانے کے باوجود دماغ چلتا رہے گا۔

پناہ (ADAPTABILITY) کی یہ صلاحیت میری خوش قسمتی ہے، کیونکہ باوجود سخت حفاظتی انتظامات کے میں بہت سے امراض کا شکار ہو سکتا ہوں۔ دماغی رسولیاں (TUMOURS) بہت سی تباہیاں لا سکتی ہیں۔ خوش قسمتی سے رسولیوں کا اخراج بذریعہ جراحت اب ممکن بلکہ آسان ہے۔ اس طریق علاج سے اکثر دوامی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

فالج ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔ میری خون کی ننھی ننھی نالیوں میں کہیں خون جم کر تھکا (علق) (CLOT) بن جاتا ہے۔ یا کوئی رگ کمزور ہو کر پھٹ جاتی ہے تو میرے متعلقہ حصہ میں خون کی رسد بند ہو جاتی ہے۔ اس کے سبب بے ہوشی کے مختصر دوروں سے لے کر مکمل فالج یا موت تک واقع ہو سکتی ہے۔ ایسے بعض حملوں کی صورت میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اکثر حالات میں مصنوعی عضو بندی (REHABILITATION) کا عمل کارگر ہوتا ہے اس عمل کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ دماغ کا کتنا حصہ ضائع ہوا ہے۔

دماغی زخم میرا ایک اور بڑا دشمن ہے۔ سخت کاسۂ سر اور آبی حصار کے باوجود سر پھوٹتے ہیں، چوٹیں لگتی ہیں اور حادثات واقع ہوتے ہیں۔ چوٹ لگنے سے کبھی میں سوج جاتا ہوں، لیکن میرے استخوانی قید خانے میں پھیلنے یا پھولنے کی جگہ نہیں ہے، اس لیے دماغی دباؤ پیدا ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ بلیک آؤٹ، سے لے کر موت تک ہو سکتا ہے۔

یہاں تک تو بات تھی میری ساخت اور افعال کی، رہا میرے ارتقا کا سوال، تو یہ کہیے کہ میری صلاحیتوں کا پورا مظاہرہ ابھی ہوا ہی نہیں۔ ہزار سال بعد کا آدمی ابتدائی عہد کے انسان ..... (NEANDERTHALMAN) کو دماغی اعتبار سے بالکل جانور سمجھتا ہے ...

یونیورسٹی سے اسپتال تک

از مسٹر شاہ آبادی

شامتِ اعمال دسواں پاس جب میں نے کیا
ایک یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا

دیکھ کر عالم وہاں کا دل میں آیا یہ خیال
حضرتِ آدم نہ کرتے خلد میں عصیاں کمال

وہ انوکھی تھی فضا اور وہ تھا اس کا بانکپن
لگ رہی تھی وہ جیسے جنت کی اک چھوٹی بہن

لڑکیاں لڑکوں کے سر پر ایک سے گیسو دراز
تھا وہاں دشوار تر مادہ میں کرنا امتیاز

حسن والے نشۂ شوخی سے اٹھلاتے ہوئے
سونے چاندی کی طرح ہر سمت تھے بکھرے ہوئے

بے تکلف اس طرح پھرتے تھے جوڑے بالعموم
واقعی جیسے کہ ان کا کیش ہو ترکِ رسوم

ان کے پہلو سے گزر جاتا جو کوئی نوجواں
پھبتیاں کس دیتی ان پر بے تکلف لڑکیاں

ہے انھیں کے دم سے یونیورسٹی رشکِ بہار
دعوتِ نظارہ دیتا ہے بدن کا ہر ابھار

پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں نوجواں دیوانہ وار
ہر حسیں لیکن سمندِ ناز پر جیسے سوار

دیکھ لو وا سا پگھل جاتا ہے بوڑھے خون میں
حسن جب چلتا ہے سینہ تان کر پتلون میں

اہلِ دل کے واسطے اک سیرگاہِ عام ہے
طائرِ دل جس میں پھنس جاتا ہے یہ وہ دام ہے

جنسِ الفت کے وہاں ایسے ہیں تاجر بے شمار
جو اثاث البیت پر کرتے ہیں دل کا کاروبار

اک حسینہ میں خدا کی دیکھ کر کاریگری
ہو گئی کچھ دیر کو مجھ پر بھی طاری کپکپی

دل الجھ کر خوں ہوا کیونکر نگاہِ ناز سے
ہو سکی واقف نہ سی بی آئی بھی اس راز سے

جب ملاقاتیں ہوئیں اس شوخ سے بار دگر
ہو گئے آپس میں بالکل دونوں ہم شیر و شکر

رات کٹتی تھی بڑی مشکل سے با حالِ خراب
اب تو ہر پل تھا فراقِ یار میں یوم الحساب

یہ نہیں کہ میں ہی ہجرِ یار میں رنجور تھا
سنگِ فرقت سے جگر اس کا بھی چکنا چور تھا

آخرش اک روز ہم دونوں نے کر کے کورٹ شپ
اپنے گھر والوں کو فوراً پوسٹ کی ایک اک سلپ

اپنے تو اس عشق سے وارے نیارے ہو گئے
سن کے ابو جی مگر اللہ کو پیارے ہو گئے

پائی ابو جان کی جب اطلاعِ انتقال
میرے اس دل کو ہوئی تھوڑی خوشی تھوڑا ملال

رہ گئے ارماں بھرے دنیا سے اس کا رنج تھا
ہو گیا آزاد اب میں اس لیے میں خوش ہوا

دل کو وصلِ یار سے جب آ گیا بالکل قرار
تب ہوا جا کر کہیں اس زندگی کا اعتبار

کیا ہوا چھ سال میں ڈگری نہ کوئی مل سکی
مفت میں بیوی تو مجھ کو حسبِ منشا مل گئی

اب جو گزرے خانہ آبادی کے اپنے آٹھ سال
قرض میں جکڑا ہوا تھا میرے سر کا بال بال

بھوک سے گھر میں مچی بچوں کی جب چیخ و پکار
ہو گیا کافور میرے عشق کا سارا خمار

زرعی پیداوار کا نیا ریکارڈ

- بھارت غذائی پیداوار کے لحاظ سے خودکفیل ہوگیا ہے۔ جولائی 1876ء سے اناج بالکل درآمد نہیں کیا گیا۔
- اناج کی 11 کروڑ 80 لاکھ ٹن پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔
- ملک میں اس وقت ایک کروڑ 50 لاکھ ٹن اناج اسٹاک میں ہے۔ پہلے اتنا اسٹاک کبھی نہیں ہوا۔
- 77 - 1976ء میں خام پٹ سن اور میستا کی پیداوار 66 لاکھ گانٹھوں کی پیداوار کے نشانے سے زیادہ ہونے کی توقع ہے۔ پچھلے سال اس کی پیداوار 58 لاکھ 30 ہزار گانٹھیں ہوئی تھیں۔
- بھرپور فصل، اناج کی اطمینان بخش وصولی اور کافی مقدار میں اناج کے اسٹاک کی بدولت ہماری معیشت میں مزید بھاری توسیع کے روشن امکانات پیدا ہوگئے ہیں

76/003

حریمی دسترخوان

اخروٹ کا مرغ مسلم

اشیاء: [illegible] وزن [illegible] والا ۰۰۰ گرام وزن کا۔ ادرک ایک بڑی گانٹھ [illegible] اخروٹ کی گری پندرہ بیس۔ گھی یا ڈالڈا حسب ضرورت۔ نمک مرچ سرخ یا سیاہ حسب خواہش دہی ۱۰۰ گرام۔

ترکیب۔ مرغ کی آلائش نکال کر اندر باہر سے خوب صاف کر کے کئی بار پانی سے دھوئیں۔ انار کے دانوں کا عرق نکال لیں اخروٹ اور ادرک دھو کر خوب باریک پیس لیں۔

گھی میں تھوڑے پیاز کے لچھے سرخ کریں اس کے بعد دہی اور اخروٹ، ادرک ڈالیں۔ مرغ کو انار کا عرق ڈال ڈال کر بھونیں۔ اگر نہ گلے تو تھوڑا پانی بھی ڈال دیں۔ اگر مرغ بیٹھا ہے تو بلا پانی کے بھی گل جائے گا۔ نمک۔ مرچ یا سیاہ جو پسند ہو حسب خواہش ملا کر نوش فرمائیں۔

مچھلی کے کباب

رہو یا چھا تیر کے بڑے بڑے قتلے ایک کلو۔ گھی یا ڈالڈا ضرورت کے مطابق۔ کالی مرچ ۱۰ گرام۔ تین انڈوں کی صرف سفیدی۔ سوکھے ڈبل روٹی کے توسٹ جو پیس کر دردرے کر لئے ہوں بقدر ضرورت۔ سفید زیرہ ۵ گرام۔

ترکیب۔ مچھلی کے ٹکڑوں کو پہلے لہسن کے پانی سے دھوئیں پھر صاف پانی سے دھو کر کسی باریک کپڑے میں پوٹلی سی بنا کر کھولتے پانی میں پانچ منٹ تک ڈالے رکھیں۔ اس کے بعد ٹکڑے گل جائیں گے۔ احتیاط سے کانٹے نکال کر پھینک دیں اور ٹکڑوں کو کسی چھلنی میں رکھ دیں تاکہ پانی سب نچڑ جائے۔ اس کے بعد نمک کالی مرچ اور زیرہ باریک پیس کر لیموں کے عرق میں حل کر کے مچھلی کے ٹکڑوں میں ملا کر اچھی طرح حل کریں۔

اب انڈوں کی سفیدی نکال کر کسی گہرے برتن میں رکھیں مچھلی کے کباب جیسی ٹکیاں بنا کر پہلے انڈوں کی سفیدی میں لت پت کریں پھر ڈبل روٹی کے دانوں پر دونوں طرف سے لگا کر گرم تیل کی تہہ میں برابر برابر جما لیں اور ہلکی آنچ میں تھوڑا تھوڑا گھی ڈال کر گلابی کر لیں۔ یہ کباب نہایت لذیذ ہوں گے اور انہیں کانٹے بھی نہ ہوں گے اس لئے بلا تکلف بچے بھی انھیں کھا سکتے ہیں جو بہنیں مرچ پسند کرتی ہوں وہ سرخ مرچ بھی حسب خواہش ملا سکتی ہیں۔ ([illegible] لکھنؤ)

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال پُر ملال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے۔ نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی جائے۔ خبر کی اشاعت میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے — ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

• بی بی فرزانہ پروین سانگلی۔ آپ نے نمبر خریداری نہیں لکھا اور آپ کی بہن کا نام صاف نہ پڑھا جا سکا۔ خبر پھر سے روانہ کریں۔

• رعنا خاتون (رجیت) میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید جنید اختر بی۔ ایس سی و بھابی احمد اختر کی زندگی کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۱۰ نومبر ۷۹ء بروز بدھ بوقت ۱۲ بجے شب پہلی بار ایک چاند سی گڑیا عطا فرمائی۔ پیار کا نام ہما قرار پایا۔

• مہ ناز امان و عرفانہ نسیم شمسی (آنولہ) ہمارے پیارے بھائی ضیاء الحق و بھابی فیروز بیگم کے گلشن حیات میں، اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۲۴ جنوری ۱۹۸۰ء بروز پیر بوقت ڈھائی بجے دن ایک ننھی منی پیاری کلی کھلائی۔ نام مہ رخ ضیا قرار پایا۔ اللہ صاحب نصیب کرے۔

• صبیحہ سلطانہ صبا (چھپرا) میرے پیارے بھیا جمال احمد و بھابی حشمت آرا کی زندگی کو پر بہار بنانے کے لئے ۲۱ فروری ۸۰ء بروز جمعرات بوقت ۹ بجے دن ایک کلی مسکرائی۔ اللہ پاک اس کلی کو باغ جہاں میں سر سبز و شاداب رکھے۔ (نام شگفتہ جمال رکھ دیجئے۔

نسیم انہونوی

• مسز نسیم رؤف خان (دیولالی) میری بھابی گوہر اور بھیا اشرف حسین کے گلشن حیات میں ۱۸ مارچ ۸۰ء بروز منگل بوقت ۶ بجے شام پہلی بار اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور بلند اقبال ہو۔

• نسیمہ شاہدہ بلیاوی میری پیاری چھوٹی بہن رخسانہ طلعت اور بہنوئی مامون الرشید کے گلشن حیات میں پہلی بار اللہ تعالیٰ نے ۲ فروری ۸۰ء کو ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ اس کے دادا مولانا محمد اسرائیل صاحب نے نام مامون اشرف رکھا۔ اللہ عمر دراز بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• ناز پروین شاہینہ تبسم (کلکتہ) میرے بھائی ناہر پرویز اور بھابی بادیہ پرویز کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے بمقام شکاگو یکم فروری ۸۰ء بروز منگل تیسری کلی کھلائی۔ نام ثروت پرویز قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر جاوداں اور حیات شادماں بخشے۔

پیغامات نشاط

• لکھنؤ کے مایہ ناز ڈاکٹر جناب حلیم صاحب کے برادر عزیز نعیم کی شادی سیما سلمہا کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر حلیم صاحب نے اپنے اعزہ، احباب اور معززین شہر کو ایک شاندار عصرانہ اپنی کوٹھی پر ۱۵ مارچ ۸۰ء کی شام کو دیا۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• لکھنوی تہذیب کے علمبردار، ممتاز اور شاہ خرچ رئیس جناب عبدالحئی لاری صاحب کی دختر نیک اختر رخسانہ نکہت لاری سلمہا کی شادی ڈاکٹر ریاض احمد سلمہ (فرزند جناب محمد خلیل احمد صاحب، رئیس کانپور) کے ساتھ ۲۰ مارچ ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۴ بجے سہ پہر اقبال منزل لکھنؤ میں بعد شان و شوکت انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ مقبول احمد لاری صاحب جو بھی تقریب کرتے ہیں، وہ خاص ہوتی ہے۔ اس کا اہتمام۔ اس کی شان و شوکت موصوف کی فراخدلی اور حوصلہ مندی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس تقریب میں بھی سارے ہی معززین شہر یکجا ہو گئے تھے۔ جنھیں نکاح کے بعد نہایت شاندار عصرانہ دیا گیا۔ (نسیم انہونوی)

محترمہ بیگم احمد عظیم صاحبہ (ماڈل ہاؤس کا پور دہ۔ لکھنؤ) نے اپنے فرزند دلبند اشتیاق سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو تنویر سلمہا کے ساتھ عمل میں آئی تھی، ۱۰ مارچ ۸۰ء کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ جس میں معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

• حکیم شرف الدین بقائی صاحب (دہلی) کے فرزند دلبند حکیم عزیز الرحمٰن بقائی سلمہ کا عقد مسنون ہمراہ دختر جناب حاجی محمد حسین صاحب بتاریخ ۱۶ مارچ ۸۰ء بوقت ۱۱ بجے دن بمقام فراش خانہ دہلی بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

• الحاج مطیع اللہ صاحب (نارمل عنبری کانپور) کے فرزند جاوید سلمہ

کی شادی بشارت سلمہا (دختر نیک اختر الحاج ظہیر حسن صاحب کلکتہ) کے ساتھ اور دختر نیک اختر فہیدہ سلمہا کی شادی منصور سلمہ (فرزند جناب محمد جلیل صاحب آسام) کے ساتھ ۹ اور ۱۲ مارچ ۸۲ء کو بالترتیب بمقام کلکتہ و حاجی نگر کا پور عمل میں آئیں۔ اللہ مبارک کرے۔

نسیم انہونوی

• نسیم بکڈپو کے رکن قدیم عزیز الرحمٰن صاحب انچارج شعبہ اشاعت کے فرزند اکبر عزیزی حفظ الرحمٰن سلمہ کا عقد مسنون ریحانہ بیگم سلمہا دختر نیک اختر جناب ڈپٹی شہاب الدین صاحب محکمہ فارسٹ (تکمیل گنج لکھنؤ) کے ساتھ ۲۸ فروری ۸۲ء کو ۱۱ بجے دن میں عمل میں آیا۔ اللہ مبارک کرے۔ اس سلسلہ میں عزیز الرحمٰن صاحب نے ۲ مارچ ۸۲ء کو اپنے اعزہ و اقربا اور احباب کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔

• محترم محمد شفیع صاحب (گھڑی والے) دہلی کی دختر نیک اختر شاہدہ بیگم افشاں سلمہا کا عقد مسنون عزیزی اقبال احمد سلمہ (پسر جناب شیخ احسان العارفین صاحب، دوالی والے) کے ساتھ اتوار [illegible] مارچ ۸۲ء بمقام خیل کلب گراؤنڈ باغ دیوار میں ساڑھے چھ بجے شام بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ افسوس کہ میں اس شادی میں بھی شرکت نہ کر سکا حالانکہ افشاں سلمہا سے وہ یادیں وابستہ ہیں جو نینی تال میں شفیع صاحب سے ملاقات کا ذریعہ بنی تھیں۔ افشاں سلمہا اور نجم السحر سلمہا دونوں چھوٹی چھوٹی تھیں رضا کلب ہی میں شفیع صاحب کا بھی قیام تھا۔ میری صحت اتنی خراب ہے کہ آجکل تو اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بڑا ہی دکھ ہے مجھے کہ افشاں بیٹی کی شادی میں نہ جا سکا۔

فہیم انہونوی

انتقال پر ملال کی خبریں

• واسلا احمدی ناز (   ) افسوس صد افسوس میری پھوپھی صاحبہ ۸ مارچ ۸۲ء کو صبح دس بجے دن اس دار فانی سے رحلت فرما کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو غریق رحمت فرمائیے اور سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

• عابدہ بیگم (چھندواڑہ) افسوس صد افسوس میری خوشدامن صاحبہ ۲ فروری ۸۲ء بروز سنیچر بوقت صبح ۸ بجے اس جہان فانی سے رحلت فرما کر اپنے لاڈلے بیٹے سے جا ملیں۔ اللہ مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اس سے قبل ۱۲ جنوری ۸۲ء کو مرحومہ کے فرزند سید اشفاق علی صاحب شوہر [illegible] عابدہ بیگم کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ یہ خبر مارچ کے حریم میں چھپ چکی ہے اس خبر کو مرحومہ سے پوشیدہ رکھا گیا، لیکن جب وہ عالم نزع میں تھیں تو انھیں باخبر کیا گیا۔ اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

• فریدہ سید علی سادات (شری وردھن) "افسوس میری ماموں زاد بہن کے سسرے ڈاکٹر داؤد علی شیخ علی عرف درزی کا ۲ فروری ۸۲ء کو اچانک اخبار پڑھتے پڑھتے انتقال ہو گیا۔ مرحوم بڑے غریب نواز اور ملنسار تھے۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

دلچسپ لطیفے

ایک صاحب نے بیوی سے بات نہ کرنے کی ہڑتال کر دی۔ اور گھریلو امور بذریعہ خط و کتابت طے پانے لگے۔ ایک دن انھوں نے بیوی کو لکھ کر ہدایت کی۔

مجھے صبح پانچ بجے بیدار کر دیا جائے ایر پورٹ پہنچنا ہے۔
لیکن جب اگلے روز سو کر اٹھے تو اس وقت آٹھ بج چکے تھے۔
ناراض ہو کر بیوی کو دوسرا پرچہ لکھا۔
میں نے ہدایت کی تھی کہ صبح مجھے پانچ بجے اٹھا دیا جائے لیکن آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔

بیوی نے جوابی پرچہ لکھا۔ "ذرا اپنا تکیہ اٹھا کر دیکھیے" موصوف نے تکیہ اٹھایا تو نیچے سے ایک پرچہ برآمد ہوا لکھا تھا۔ پانچ بج چکے ہیں۔ اب اٹھ جایئے۔

اسکول میں استاد نے بچوں کو "مفلسی" پر مضمون لکھ کر لانے کے لیے کہا۔

اگلے روز ایک لکھ پتی لڑکا جو مضمون لکھ کر لایا تھا اس کا آغاز یوں ہوتا تھا "ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی جگہ ایک بہت غریب خاندان آباد تھا باپ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ماں کو بھی کہیں ملازمت نہ ملتی تھی، یہاں تک کہ اس خاندان کے ڈرائیور، نوکر اور نوکرانیاں بھی بہت غریب تھے...!"

ایک پرانی نرس نئی آنے والی نرس کو ہسپتال دکھا رہی تھی۔
اس نے کہا:۔
"اس وارڈ میں وہ مریض ہیں جو خطرے کی حد کو پہنچ چکے ہیں"
نئی نرس بولی۔ "آپ کا مطلب ہے وہ مریض جو شدید بیمار ہیں"
پرانی نرس نے جواب دیا۔
"نہیں، وہ مریض جو صحت یاب ہو رہے ہیں اور بھاگ سکتے ہیں۔"

ایک قیدی جسے چودہ برس قید کی سزا ملی تھی اپنے ایک ساتھی قیدی کو بیتے ہوئے سنہرے دنوں کی باتیں سنا رہا تھا۔
جب وہ اور اس کی خوبصورت بیوی سمندر کے کنارے ایک دوسرے کو ریت سے ڈھکنے کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔
بات پوری کرتے ہوئے دوسرے قیدی نے کہا:۔
"میرا خیال ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد میرے لیے مناسب یہ ہوگا کہ فوراً اپنے شہر پہونچوں اور بیوی کو کھود نکالوں۔"

لیڈر کا چمچہ۔ جب آپ نے تقریر میں یہ اعلان کیا کہ آپ ووٹ خرید کر لوگوں کے ایمان خراب نہیں کرنا چاہتے تو حاضرین کا ردعمل کیا تھا۔
لیڈر:۔ چند لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ لیکن اکثریت مایوس نظر آتی تھی۔

ایک دوست جو کافی عرصہ کے بعد ملاقات کے لیے گیا: اور سے بھائی وہ تمہارا طوطا کدھر گیا۔
دوسرا دوست:۔ کیا بتاؤں میں نے شادی کرلی۔ اور وہ دل شکستہ ہو کر اڑ گیا۔
پہلا دوست:۔ وہ کیسے؟
دوسرا دوست:۔ بے چارہ باتیں کرنے میں بیگم کا مقابلہ نہ کرسکا۔

باورچی خانے سے برتن ٹوٹنے کی آواز آئی تو خاتونِ خانہ نے چلا کر کہا: "کیا ہوا نفیس! تو نے پھر کچھ توڑ دیا؟"
"ہاں بیگم صاحب، مگر آج تو قسمت بڑی مہربان تھی"
"کیا مطلب؟"
"وہ پلیٹیں دھونے کے بعد ٹوٹتیں تو میری محنت ضائع ہو جاتی۔"

کسی ملک کے وزیر اعظم اپنے وزرا کے ساتھ ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ وزیر اعظم کہنے لگے: "اگر میں سو روپے کا ایک نوٹ جہاز سے نیچے پھینکو تو جس آدمی کو ملے گا اسے بہت فائدہ ہوگا" ایک وزیر جھٹ بول اٹھا "بجائے ایک نوٹ کے آپ دس کے دس نوٹ پھینکیں تو دس کو فائدہ ہوگا" دوسرے وزیر نے کہا "نہیں پانچ پانچ کے بیس نوٹ پھینکیں بیس کو فائدہ ہوگا۔ ایک صاحب یہ تمام گفتگو سن رہے تھے۔ انھوں نے کہا: "اگر وزیر اعظم خود چھلانگ لگا دیں تو سبھی عوام کو فائدہ ہوگا"

محلے کے چند بزرگ بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ ہر شخص گھریلو زندگی میں اپنی اپنی کامیابیوں کی داستانیں سنا رہا تھا۔
ایک بڑے میاں نے دعویٰ کیا "بیوی کے ساتھ جب بھی میرا جھگڑا ہوا تو ہمیشہ میری ہی بات حرف آخر ثابت ہوئی اور جھگڑا ختم ہوگیا"
بڑے میاں کے اس دعوے پر دوسرے بزرگ کہنے لگے: "اگر یہ سچ ہے تو انتہائی حیران کن بات ہے آخر آپ بیوی سے اپنی بات کیسے منوا لیتے تھے؟"
"میں ہمیشہ آخر میں معافی مانگ لیا کرتا تھا، بڑے میاں نے برجستہ جواب دیا۔

دکاندار (گاہک سے) "دیکھیے یہ کوٹ ریچھ کی کھال کا ہے قیمت صرف پانچ ہزار روپے ہے۔
گاہک:۔ اف اتنی قیمت! تو آپ کا خیال ہے کہ میں اپنی کھال اتروا کر ریچھ کی کھال پہن لوں۔

ایک صاحب اپنے دوست کو ملنے گئے تو راستے میں پانی برسنے لگا

ان کے جوتے اُدھا نیچے بھیگ گئے۔ دوست کے گھر پہونچے تو اس نے پوچھا: یار تمہارے جوتے ادھا نیچے کیسے بھیگ گئے۔ وہ بولے: کیا بتاؤں دوست اشنم پاؤں پر پڑی تھی:

دوست بولا: بڑے خوش قسمت ہو ہمیں تو خواب میں کبھی چن چن بھی نظر نہیں آتی۔

فیشن ایبل باپ: کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج کل ترقی کے دور میں۔ میچنگ کتنی ضروری ہے۔ مثلاً کسی کے بال بھورے ہیں تو اسے براؤن سوٹ پہننا چاہیئے۔ اگر سفید بالوں والا بوڑھا ہے۔ تو اسے سفید سوٹ نیلا سوٹ، سیاہ بال ہیں تو سیاہ سوٹ وغیرہ، وغیرہ۔

بیٹا:۔ اور اباجان اگر کسی کے بال ہی نہ ہوں تو۔؟

ایک نئی شادی شدہ خاتون کسی کتب فروش کے ہاں گئی اور کتابیں شادی کے موضوع پر ایک کتاب خریدی دکاندار نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دسترخوان کے موضوع پر ایک کتاب خاتون کو دی۔ بل دینے کے لیے خاتون نے بٹوہ نکالا تو دکاندار نے بچوں کی پرورش کے متعلق ایک نئی کتاب خاتون کے سامنے رکھ دی۔ تینوں کتابوں کے خریدنے کو کہا تو چالاک دکاندار نے ایک بیش قیمت اٹلس آگے بڑھایا۔

خاتون نے اٹلس خریدنے میں تامل کیا تو دکاندار کہنے لگا: اٹلس خرید کر آپ بین الاقوامی معلومات میں اپنے خاوند سے سبقت لے سکتی ہیں:

خاتون نے تینوں کتابیں واپس کرتے ہوئے کہا۔ صرف اٹلس دے دیجئے گا:

ایک راہگیر کا ریلوے لائن کی طرف سے گذر ہوا۔ وہ کیا دیکھتا ہے ایک آدمی پٹری پر لیٹا ہوا ہے۔ اور پاس ہی روٹیوں کا ڈبہ رکھا ہے، راہگیر نے پوچھا، بھائی آپ یہاں اس طرح کیوں لیٹے ہیں؟ اگر خودکشی کرنی ہے تو روٹیوں کا ڈبہ کیوں رکھا ہے۔ اس راہگیر نے جواب دیا خودکشی تو کرنی ہے لیکن بھلے وقت آدمی اگر گاڑی لیٹ ہوگئی تو۔

آدمی

تو کیا ہوا؟

تو کیا تیرا باپ مجھے کھانا کھلائے گا۔؟

ایک دوست نے دوسرے دوست کو مدتوں بعد ملا تو اس نے شکایت کی:

کیا بات ہے بہت عرصے بعد ملے ہو۔؟

دوسرے نے جواب دیا: کیا بتاؤں دوست۔ کاروبار میں اس قدر مصروف رہتا ہوں کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی:

وہ صاحب بولے: میں آج کل روزگار کی تلاش میں ہوں کیوں نہ تمہارا سر کھجا دیا کروں۔ فرصت تو مل جائے گی:

آقا:۔ آئندہ اگر تم نے سستی سے کام کیا تو مجبوراً مجھے دوسرا آدمی رکھنا پڑیگا۔

ملازم:۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔ کام بھی تو دو آدمیوں کا ہے۔

تجریدی آرٹ کے ایک دلدادہ نقاد نے بڑی خوشی سے کہا: واہ صاحب کیا تصویر بنائی ہے: رنگوں کا امتزاج سبحان اللہ! ایسے خط کھینچنا آپ ہی کا کام ہے یقین کیجئے۔ حضور ایسے شاہکار کے سوا اور کوئی چیز نظروں میں جچتی ہی نہیں۔

فنکار نے سر اٹھا کر نقاد صاحب کو دیکھا اور اپنا برش دھوتے ہوئے بولا: میں اپنا برش استعمال کرنے کے بعد روزانہ اسی جگہ دھوتا ہوں:

ایک طالب علم نے والد کو خط لکھا: جناب والد صاحب! عرصہ ڈیڑھ ماہ سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہو سکی۔ براہ مہربانی میرا خرچ روانہ کر دیں تاکہ معلوم ہو آپ خیریت سے ہیں:

مالک نے ملازم کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

تجارت کی کامیابی اور ترقی کے لیے دیانتداری اور عقل مندی بہت ضروری ہے۔ دیانتداری کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی سے کوئی وعدہ کرلو تو پھر اسے ہر قیمت پر پورا کرو۔ چاہے اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اور عقلمندی کا مطلب؟ نوکر نے سوال کیا۔

یہ کہ کسی سے ایسا وعدہ ہی نہ کرو۔ مالک نے جواب دیا۔

ایک ملازم نے مالک سے کہا "میں آپ کے پاس پندرہ برس سے کام کر رہا ہوں میں نے اس دوران میں کبھی آپ سے تنخواہ بڑھانے کے لیے نہیں کہا۔ لیکن...

مالک جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ یہی وجہ ہے کہ تم پندرہ سال سے میرے پاس ہو۔ ورنہ.....!

ترنم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے: میری قسمت۔ مجھے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا آپ بھی نہیں۔ اسے بیراکتنا دل چاہتا ہے۔ میں آپ کے غم سمیٹ لوں۔ دکھ بانٹ لوں۔ آنسو پونچھوں۔ کچھ تو کروں آپ کے لیے۔ مگر میرے سارے جذبات میں آپ کا لہجہ آگ لگا دیتا ہے۔ آپ مجھے ہی میں جھوٹ سمجھتی ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی:

مجھے غلط نہ سمجھو۔ ترنم۔ بےچارہ بے بسی سے بولا۔

حالانکہ میں نے اپنی جان کی قسم دی تھی: وہ اب سسکیوں پر اتر آئی۔ تابش گھبرا گیا! اگر کسی نے مجھے پھر کے ادھر دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟

اچھی بات ہے۔ میں اب کچھ نہ کہوں گا؟۔

وعدہ کرتے ہیں؟:

بالکل!۔

مجھے غیر تو نہیں سمجھے!۔

آج یہ سوال کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی ہے؟!۔

ترنم آنسو پونچھ کر اس کے قریب کھسک آئی اور کوئی چیز اس کی آغوش میں رکھ دی۔

آپ کو میری قسم۔ اسے واپس نہ کیجئے گا۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا! جس دوست سے جو کچھ بھی لیا ہے اسے واپس کر دیجئے۔ کیوں خواہ مخواہ فکر کر کے خود کو ہلکان کرتے ہیں ...:

ساجد صاحب نے اسے دو ہزار روپے دیے تھے۔ وہ ابھی اس کے پاس محفوظ تھے۔ سلطان صاحب کی تجہیز و تکفین کا سارا خرچ ساجد صاحب نے اٹھایا تھا۔ اور تابش سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے اس کا نام لیا تو وہ اسے غیر سمجھنے لگے۔ وہ پورا احسان گھڑوں پانی کی طرح تابش کے سر پر پڑا تھا۔ اس پر سے

نے کہا۔ اجرہ تابش کی پوری بات سنے بغیر اندر پہنچ چکی تھیں۔ ساجد صاحب بھی جھپٹتے ہوئے چلے گئے۔ ترنم پیچھے کھڑی رہ گئی۔ اس نے بے حد غور سے تابش کو دیکھا۔

کیا آپ رو رہے ہیں؟ اس نے اتنا کہا اور جلدی سے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

کیوں روتا؟" تابش نے کہا اور پیٹھ پھیر کر تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ ترنم کے دل پر گھونسہ پڑا۔ جب تک وہ سڑک کے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ وہ کھڑی دیکھا کی۔ پھر مرے مرے قدموں سے اندر آئی!۔

چھوٹے دالان میں چند ھا سا بلب روشن تھا۔ اس کی زرد اداس روشنی میں ماحول بہت افسردہ اور پریشان کن ہو رہا تھا۔ ساجد صاحب بڑے سلطان صاحب کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھے تھے۔ اجرہ اندر بیگم نانی کی چھوٹی چوکی پر بیٹھی مدھم آواز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ترنم باپ کی کرسی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی اسے بڑے... ان کی حالت ابتر تھی مایوسی کی حد تک آگئی!۔

سلطان صاحب کو ادھر چند برسوں سے یکا یک ضیق النفس کا عارضہ ہو گیا تھا!۔ اب تو وہ بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ بہت بہت رک رک کر سانس آ رہی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ منہ کھلا ہوا۔ ترنم اپنی جگہ سے ہٹ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ اس وقت زاہدہ بیگم نے کوئی شکایت کی تو شوہر کو ہوش تھا کہ وہ ان کی معروضات پر کان دھریں!۔

تابش ڈاکٹر کو لے آیا۔ عورتیں پردے میں ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے سلطان صاحب کو دیکھا بھالا اور کوئی دوا دی۔ انجکشن لگایا پھر مشورہ دیا کہ انھیں کسی ہسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا جائے!۔

کیا اسی وقت لے جائیں!۔ ساجد صاحب نے دریافت کیا۔

صبح کو سہی۔ گھر پر مستقل علاج کا بندوبست اور باقاعدہ نرسنگ نہیں ہو سکتی!۔

تابش اندر آیا۔ لفافہ باسکٹ میں رکھ دیا۔ اور چپ چاپ واپسی کے لیے مڑا۔

"بیٹے!" ترنم نے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

"اگر آپ کو فرصت ہو تو میری ایک بات سن لیجئے۔"

"کہو۔"

"مجھ کو جو دکھ [illegible] میں نے کی ہے وا سے میرے منہ پر دہرا دیجئے۔ لیکن آپ کی اس خاموشی سے اور یوں گم صم رہنے سے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"تم دیکھ رہی ہو۔ نانا میاں کی طبیعت اچھی نہیں۔"

"مگر مجھے بیمار ڈالنے پر آپ کیوں تلے ہوئے ہیں۔"

"خدا نہ کرے۔"

"اور پھر کیا۔ وہ پچھلا طرز عمل آپ کا رہا نہیں۔ امی کہتی ہیں کہ میں نے کچھ ایسی بدتمیزی آپ کی شان میں کی ہے کہ بات آپ نے دل میں رکھ لی ہے۔"

"تم کیا اور میری شان کیا۔ ترنم۔"

"وہی خفگی کی بات ہوئی نا۔"

"کتنی بار کہوں کہ میں ہرگز تم سے خفا نہیں ہوں۔ اچھا تم یہ دلیاں پکاؤ۔ میں نانا میاں کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔"

"کچھ بھی نہیں پکاؤں گی۔ چولھے میں آگ رکھ دوں گی جب تک آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم نہ کھائیں گے۔"

"پڑھی لکھی ہو کر ایسی جہالت کی بات کرتی ہو۔" پھیکا تبسم تابش کے چہرے پر

رکھ لو۔ اپنی امی سے نہ کہنا۔ کچھ رقم ہے۔ غیریت یا تکلف کی ضرورت نہیں تم لاکھ مجھے محض ایک پڑوسی کہو لیکن میں تمہیں اپنا بیٹا کہہ چکا ہوں۔ جیسی ترنم ویسے تم ہو۔ بیمار کا معاملہ ہے۔ پتہ نہیں۔ کب کیا ضرورت پیش آ جائے!"

"ڈیڈی آپ کب تک ......"

"ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔" ساجد صاحب نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "تم مرد ہو۔ تمہیں اپنا دل مضبوط رکھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے الگ لے جا کر کہا تھا کہ اب سلطان صاحب صحت یاب نہیں ہو سکتے۔ انہیں ہسپتال میں شرکت کی تکلیف نہ دی جائے۔ اگر بہت عرصے تک چلے تب بھی بس کل شام یا دوپہر تک۔ بس...

تم کل یونیورسٹی مت جاؤ۔ میں بھی چھٹی لے لوں گا۔ مگر عورتوں سے یہ بات نہ کہنا۔"

تابش کے رگ و پے میں ٹھنڈی سنسنی پھیل گئی۔ اس کے چہرے پر پہلی موت تھی۔ وہ سہم کر بولا۔ "تو پھر۔ ڈیڈی۔ آپ کیوں جا رہے ہیں۔ خدا جانے۔ ماموں رات۔ نانا میاں کی کیا کیفیت ہو جائے۔ میں کسی کو سنبھال نہ سکوں گا۔"

"میں تو اس لیے جا رہا ہوں۔ بیٹا کہ کچھ رقم کا بندوبست کر رکھوں۔" ساجد صاحب نے بڑے خلوص سے کہا۔ "تم گھبراؤ مت۔ اولاد کا دم پر جو پڑتی ہے۔ وہ بہر صورت گزر ہی جاتی ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

"تو پھر صبح کو نانا میاں کو اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں میاں۔ وہ تو صرف عورتوں کی تسلی کا خیال تھا۔"

"لیکن آپ کو تو ڈاکٹر صاحب نے سفارشی خط لکھ دیا تھا۔"

جیب سے بٹوہ نکال کر ساجد صاحب نے اسے پکڑا دیا "یہ ڈاکٹر کو [illegible] دینا۔ اچھا خدا حافظ۔" وہ چلے گئے۔ سڑک کی روشنی میں تابش نے پیسے [illegible] دوڑا میں

ٹیلیفون نمبر آفس :-
۲۲۵۵۹

لکھنؤ
حریم
ماہنامہ

ٹیلیفون نمبر رہائش :-
۲۵۳۳۴

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

گذشتہ ۴۹ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں
ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ فہرست مضامین ماہ مئی سنہ [illegible] نمبر ۵

معاونین - شوکت جہاں بیگم غزالہ - جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	[illegible] روپیہ
مخصوص خریداری		[illegible] روپیہ
معمولی خریداری		پندرہ روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر [illegible] روپیہ [illegible] پیسے زائد
غیر ممالک سے [illegible] براہ راست [illegible] ارسال سے [illegible]

- حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
- حریم [illegible] پرچہ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں [illegible] تاریخ سے پہلے کی کسی شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں۔
آفس اور ترسیل زر کا پتہ - نسیم بک ڈپو - [illegible] روڈ - لکھنؤ
نسیم انہونوی - [illegible]

کو شش رکھنا ضروری ہے۔ یہی نہیں نوکری عزیز ہے تو باس کی خوشی بھی ضروری
ہے۔ ترقی کا انحصار و مدار اسی پر ہوتا ہے کہ باس خوش رہے۔ لیکن یہ باس
مرد ہی ہوتا ہے۔ وہی مرد جو ابتدائے آفرینش سے عورت کو [illegible]
آیا ہے جو ہمیشہ اسے ایک کھلونا سمجھتا رہا ہے۔ اس کی فطرت تو نہیں
بدل سکتی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے ایک مرد کی غلامی سے زیادہ
مردوں کی غلامی کرنا پڑتی ہے۔ کام بھی بے حد کرنا پڑتے ہیں۔ گھر میں
نہ سہی دفتر میں تو کام ہوتا ہی ہے۔ امور خانہ داری سے
متعلق ہو یا آفس سے۔ لیکن جب پرندہ پنجرے سے نکل بھاگتا ہے
تو پھر دوبارہ پنجرے میں چین نہیں لیتا۔ خواہ ہر وقت شکاری کا پرندوں
[illegible] قدم قدم پر خطرہ محسوس کرتا رہے۔ عورت نے جب گھر چھوڑ کر نکلی
اور شوہر کی [illegible] آزاد ہو گئی [illegible] لیکن شوہر
[illegible] باتیں سنیں ذلیل اور مکروہ باتیں۔ دامن بچانے کی کوشش کی لیکن
قدم قدم پر مجبوریاں پیش آتی رہیں اور پھر رفتہ رفتہ وہ ان باتوں کی پابند ہو گئی
بری نگاہیں۔ جھوٹے اشارے اور نامناسب باتیں دیکھنے اور سننے
کی عادی ہو گئی اور یہ مکروہ اور پہلے سے زیادہ پابند زندگی فطرت
بن کر رہ گئی۔ زندگی کا معیار بدل گیا۔ پاکیزگی نفس جو پہلے تھی وہ باقی
نہیں رہی۔ جس طرح وہ شوہر کی فرمانبرداری، خدمت اور گھر
بچوں کی دیکھ بھال کی عادی بن کر زندگی گزارتی رہی تھی۔ اسی طرح
اب اس زندگی کی عادی ہو گئی جس نے ایک مرد کے بجائے بہت سے
مردوں سے دوچار ہونا سکھا دیا تھا، جس نے ایک شوہر کی باتیں
سننا چھڑا کر متعدد مردوں کی باتیں سننے کا خوگر بنا دیا تھا۔ گھر میں
رہ کر صبح سے شام تک کام کرنے یا آرام لینے کے باوجود وہ آزاد تھی
اس طرح کی پابندیاں اس پر نہیں [illegible] اور وہ دفتر کو بھاگی
پر غلامی سردی ہو یا شدید گرمی۔ آندھی ہو یا پانی آفس کے وقت پر
جانا ضروری۔ گھروں میں سکون سے رہنے کے بجائے بس کے اڈوں پر
[illegible] بسوں کے پیچھے دوڑنا بسوں میں گھستے وقت اس بدن کو
جسے شوہر کے سوا کوئی ہاتھ نہ لگا سکتا تھا۔ اجنبی مردوں کے جسموں سے رگڑ
پر مجبور ہونا۔ پھر آفس پہنچنا۔ کام کرنا اور جواب دہ ہونا۔ اس طرح
ہر وقت مردوں کی بد نگاہی کا شکار بننا، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

دفتروں میں صرف ایک ہی ایسی ملازمت ہے جو عورت کے
لئے کسی حد تک بہتر ہے یعنی صیغہ تعلیم کی ملازمت، لیکن اس میں
بھی یہ ممکن نہیں کہ اسے مردوں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور پھر وہ مرد بھی
مرد ہی ہوتے ہیں۔ ان سے کام رہتے ہیں انھیں پر ترقی و تنزلی کا انحصار
ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے کام بنانا اور خود کو بچانا بھی آسان بات نہیں
جس پختہ کردار یا نفع نقصان کی پروا نہ کرنے والیاں ہی سرخرو رہتی ہیں۔

دراصل عورت اور مرد کی مساوات قائم کرنے کا صاف صاف
مطلب یہ ہے کہ قانون قدرت سے بغاوت کی گئی ہے۔ جس طرح شمال جنوب
اور مغرب مشرق نہیں بن سکتا، اسی طرح عورت مرد کے مساوی اس اعتبار
سے نہیں ہو سکتی کہ وہ وہی سب کچھ اسی حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے جس
طرح مرد یا مرد وہ تمام کام اسی طرح انجام دے سکتا ہے جس طرح عورت
ان فرائض کو ادا کرتی ہے جن کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کیا قدرت منصف
نہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اللہ منصف حقیقی ہے۔ پھر اس نے
مرد و عورت کو اس طرح کیوں نہیں خلق کیا کہ ان کی جنس میں یہ فرق
نہ ہوتا جو ہے۔ ذرا بھی غور سے کام لیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں
آسکتی ہے کہ قدرت نے عورت اور مرد کو اس کے فرائض کے پیش نظر
خلق کیا ہے۔ اسی لئے ان کے قوائے جسمانی بھی مختلف قوتوں و احساسات کے حامل
ہیں۔ ایک صاف اور صریح بات یہ ہے کہ عورت کتنی تعلیم کیوں نہ حاصل
کرلے۔ کتنی آزاد کیوں نہ ہو، لیکن مرد سے خائف نہ رہے یہ ناممکن ہے۔ اور
اس جنس سے اسے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے سامنے
اس کی ساری تعلیم، ساری آزادی اور مساوات کے سارے دعوے بیکار
محض ثابت ہو جاتے ہیں۔ مرد اس کے لیے ایک ایسا خطرہ ہے جس سے اسے
کوئی شے کبھی بھی بے خطر نہیں بنا سکتی۔ الا یہ احساس کہ عزت و آبرو،
عصمت و عفت سب لغو یا فضول چیزیں ہیں۔ خیالی ڈھکوسلے ہیں، ان کے لٹنے
اور برباد ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔

کیا قدرت عورت کو ایسا نہیں بنا سکتی تھی کہ مرد کا وجود اس کے لیے کسی طرح
کا خطرہ نہ بن سکتا۔ ضرور بنا سکتی تھی۔ لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ مردوں
کی دنیا سے دور رہ کر اپنے گھروں ہی میں دنیا کا عیش کرے۔ ایسا نہ ہوتا تو آپ خود
سوچئے کہ نماز جیسی عبادت کے لیے یہ کیوں فرمایا جاتا کہ جس طرح مرد کو مسجد میں
نماز ادا کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ اسی طرح عورت اگر گھر میں اور گوشہ تنہائی
میں نماز پڑھے تو زیادہ ثواب کمائے گی۔ ذرا سوچئے کہ عبادت کے سلسلے میں
بھی کوشش یہی کی گئی ہے کہ عورت گھر میں رہے تو بہتر ہے۔ تو پھر دوسرے معاملات
میں اس کا گھر بدر ہونا اسلام کی نظر میں کیسے روا ہو سکتا ہے۔ [illegible]

مشورے

حریمی بہنیں مشورے دیتی رہتی ہیں۔ بہن بشیر عثمانی صاحبہ نے لکھا ہے کہ بزم حریم سے قارئین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ مشورہ دینا بہن موصوفہ نے اپنا حق سمجھا ہے۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ بزم حریم کے لئے بہت سی بہنوں کی رائے ہے کہ اسے ہونا چاہیئے۔ اور میں خود بھی اسے ایک ضروری کالم سمجھتی ہوں۔ ہر رسالہ میں تعارفی طور پر خبریں دینا ضروری ہے۔ اس لئے کیوں نہ انھیں خبروں کو شائع کیا جائے جن سے حریمی بہنوں کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ ہو جاتا ہے۔ (نسیم انہونوی)

بہن شگفتہ سلیم صاحبہ نے مشورہ دیا ہے کہ حریم میں ایک کالم ایسا قائم کیا جائے جس میں حریمی بہنیں اپنے مشورے روانا کریں۔

ایسا پہلے کیا جا چکا ہے۔ مشورے اتنے آنے لگے کہ اگر ان سب کو چھاپتا تو ہر ماہ بس مشورے ہی مشورے حریم میں نظر آتے۔ بیشتر بہنیں اپنا نام چھپوانے کے لئے ایسا کرنے لگی تھیں۔ اس لئے اس کالم کو بند کر دیا گیا۔ مشورہ اڈیٹر کو دینا چاہیئے وہ غور کرے گا۔ اشاعت سے کوئی فائدہ نہیں ہاں کوئی ایسا مشورہ ہو جو حریمی بہنوں سے کیا جانا ضروری ہو تو بیشک اس کی وضاحت کردی جائے گی اور کی بھی جاتی رہتی ہے۔

حریمی دسترخوان

ماہی پلاؤ

سامان۔ آدھا کلو پرانا باسمتی یا دہرہ دون چاول۔ بڑی رہو یا مہاشیر مچھلی کے قتلے ایک کلو۔ گھی ۲۰۰ گرام۔ لہسن دو گٹھی بڑی۔ پیاز دو گٹھی بڑی۔ زیرہ سیاہ، زیرہ سفید اور خشک دھنیا ایک ایک چمچہ چائے کا۔ گرم مسالہ حسب ضرورت۔ عرق کیوڑہ کا چمچہ بھر لونگ چند۔ کالی مرچ چند۔ بڑی الائچی ایک۔

ترکیب

مچھلی کے قتلوں کو صاف کرکے کئی بار پانی سے دھوئیں۔ ٹکڑوں کو درمیان سے کاٹ کر سلائس کی طرح کرلیں۔ لہسن کی ایک گٹھی چھیل کر اس میں نمک۔ سرخ مرچ حسب خواہش۔ تین چار لونگ زیرہ سفید، زیرہ سیاہ، سوکھا دھنیا ایک چمچہ۔ سیاہ مرچ پانچ عدد۔ بڑی الائچی ایک۔ سب کو باریک باریک ذرا سا پانی ملا کر پیس لیں اور اس مرکب کو مچھلی کے ٹکڑوں پر لگا دیں۔ ٹھنڈی جگہ میں کم سے کم ایک گھنٹہ تک رکھیں۔ اس کے بعد پیاز سرخ کرکے نکال لیں اور قتلوں کو تل لیں۔ جب سرخ ہو جائیں تو نکال لیں۔ نکالی ہوئی پیاز کو پیس کر قتلوں پر لگا دیں۔ اس کے بعد چاول کو ایک گھنٹہ پہلے سے بھگو دیں۔ پھر کھولتے پانی میں چند لونگ و الائچی ڈال کر چاول ڈال دیں۔ چاول کے کنی کڑے ہوتے نظر آئیں تو کسی کپڑے میں چھان لیں اور نصف چاول کسی قلعی دار پتیلی میں بچھا کر مچھلی کے ٹکڑے رکھ دیں اور باقی چاول اس پر ڈال دیں۔ اور ڈھکن کو آٹے کے ذریعہ پتیلی پر چپکا دیں پتیلی کو تیز انگاروں کی آنچ پر رکھیں اور ڈھکن پر بھی انگارے رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھکن کھول کر دیکھیں۔ اگر چاول اچھی طرح گل گیا ہو تو دودھ کا چھینٹا دے کر دم کریں۔ بعد میں رنگ کیوڑے میں گھول کر نصف پتیلی میں چھڑک دیں۔ نصف چاول سفید رہیں۔ نکالتے وقت دونوں کو ملا کر نکالیں۔

نجمہ اسرار بیگی

ہونیوالی ماؤں کے لئے چند مشورے

بچوں کی آمد کے تو ہر گھر میں پہلے سے سب ہی منتظر رہتے ہیں لیکن سب سے زیادہ انتظار ماں کو ہوتا ہے وہ شروع ہی سے اپنے بچے کے بارے میں کیا کچھ نہیں سوچتی ہے اسے دن رات یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ اس کا بچہ آرام سے پھلے پھولے اسے کوئی تکلیف نہ ہو پاکستانی معاشرے میں نومولود کی آمد کی تیاریوں کے لئے دادی نانی اور دیگر رشتہ داروں کی ایک خاص فوج اور مستعد جماعت ہر وقت تیار رہتی ہے لیکن ترقی کے اس دور میں جب کہ مشترکہ خاندان کا شیرازہ بڑی تیزی سے بکھرتا جا رہا ہے بچے کی آمد سے قبل کی تمام تیاریاں بالعموم خود بیوی اور میاں ہی کو کرنی پڑتی ہیں اور جو مائیں بروقت ضروری تیاری نہیں کرتیں انھیں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے زچگی کے ابتدائی ایام میں خود انھیں نومولود اور روزی کمانے میں مصروف شوہر کو بھی تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس لیئے مناسب یہ ہو۔ ہے کہ ایک بننے والی ذمہ دار ماں کی طرح ہر شادی شدہ خاتون حمل کے ایک دو ماہ بعد ہی سے ضروری تیاریوں کا آغاز کر دے تاکہ وقت پر کسی قسم کی مشکل پیش نہ آسکے۔

ہونیوالی ماں کا سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ اپنے اور نومولود کے آرام سے سونے کا انتظام کر لیا جائے۔ دولت مند گھرانوں میں خدا کے فضل سے جگہ، اشیاء اور سامان کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے کوٹھیوں کے مالک بچے اور زچہ کے لئے علیحدہ کمروں کا اہتمام بھی کر لیتے ہیں مہینوں پہلے ان میں رنگ و روغن ہو جاتا ہے دروازوں اور کھڑکیوں میں اپنی پسند کے پردے بھی لٹکا دیے جاتے ہیں قیمتی اور پر تکلف پلنگ، پنگوڑے، کپڑے رکھنے کے لئے الماریاں وغیرہ بھی خرید لی جاتی ہیں لیکن کم استطاعت والوں کو بھی اپنے وسائل کے مطابق ضروری تیاریاں کر لینی چاہئیں ضروری نہیں کہ آپ بھی امیرانہ چونچلوں کی تکمیل کریں اگر آپ کا بنیادی مقصد بچے اور خود کو آرام پہنچانا ہے تو پھر گھر ہی میں موجود فرنیچر سے یہ کام لیا جا سکتا ہے مثلاً اگر آپ قیمتی پلنگ یا پنگوڑے نہیں خرید سکتی ہیں تو اس مقصد کے لئے میز کی بڑی دراز بھی کام دے سکتی ہے۔ ضرورت صرف ذرا سی محنت کی ہے کسی اچھی سی دراز کو اپنی پسند کے رنگ سے پینٹ کر لیں یا اس پر خوبصورت کاغذ چڑھالیں دو تین ماہ تک یہ آپ کے بچے کے لئے آرام دہ پنگوڑے کا کام دے سکتا ہے اس کام سے فارغ ہو کر بچے کے کپڑوں، پوتڑوں اور بہا لچوں کی فکر کیجئے جس کے ابتدائی مہینوں میں آپ باسانی بازار میں گھوم پھر کر اپنی پسند کے کپڑے خرید سکتی ہیں اور ان کے ذریعے سے گھر ہی پر خود کپڑے سی سکتی ہیں۔ بازار جائیے تو سب سے پہلے پوتڑوں کی فکر کیجئے اچھے اور نرم قسم کے کپڑے کے بہت سے پوتڑے تیار کر لیجئے ان کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی آپ کو اتنا ہی آرام ملے گا آج کل دوکانوں پر جاذب قسم کا نرم و ملائم کاغذ (TISSUE PAPERS) بھی بہ آسانی دستیاب ہے آپ اس سے بھی جھٹ سے آرام دہ پوتڑے تیار کر سکتی ہیں۔ پلاسٹک کی چڈی میں انھیں رکھ کر باندھنے سے بچے کا پیشاب کاغذ ہی میں جذب ہو جائے گا اور یوں آپ کئی روز تک پوتڑوں کی دھلائی اور انھیں خشک کرنے کی زحمت سے بچ جائیں گی بعض شہروں میں اس قسم کے بنے ہوئے پوتڑے بھی مل جاتے ہیں لیکن یہ بہر نوع مہنگے ہوتے ہیں خریداری کی فہرست میں سیفٹی پن ضرور شامل رکھیے ان کی مدد سے آپ پوتڑوں کو ٹھیک طور پر باندھ سکیں گی۔ بچے کو انھیں لگاتے وقت اس وقت اس بات کا ضرور خیال رہے کہ ان کی نوک بچے کے نرم و نازک جسم میں نہ چبھنے پائے۔ ہمارے ہاں بالعموم بچے کے بول و براز (پیشاب پاخانہ) کو پونچھنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ صفائی کا یہ طریقہ ناقص اور نامناسب ہے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اپنے کمرے میں ایک آدھ میز اس مقصد کے لئے مخصوص کر لیجئے اس پر پلاسٹک کی چادر ڈال دیجئے بچے کو اس پر لٹا کر نیم گرم پانی سے دھو کر تولیے سے خشک کیجئے

چھوٹے ڈبے میں ڈال دیجئے اس مقصد کے لئے کسی بھی خالی ٹن کو استعمال کیا جا سکتا ہے پوتڑے ڈالنے کے بعد ڈھکن لگانا مت بھولیے اس طرح بدبو اور مکھیوں سے بچیں اور آپ بھی محفوظ رہیں گے اور آنے والوں کو بھی ناگواری کا احساس نہیں ہوگا۔ اسی میز کے قریب کسی الماری یا بکس میں بچے کے کپڑے بھی رکھیے آپ اسی میز پر پلاسٹک کا بڑا ٹب رکھ کر اپنے بچے کو آرام سے نہلا بھی سکتی ہیں اس میز کی موجودگی میں آپ کو بلا ضرورت اور بار بار جھکنے کی زحمت سے نجات مل جائے گی اور آپ پیٹھ میں درد کی شکایت سے محفوظ رہیں گی۔

بچے کا بستر اور کپڑے

اپنے بچوں کو جی بھر کر نت نئے کپڑے پہنانا کون نہیں چاہتا اپنی سکت اور ضرورت کے مطابق زیادہ سے زیادہ کپڑے بنالیجئے لیکن بعض کپڑوں مثلاً نیم آستین یا بنیان خریدنا یا بنانا نہ بھولیے۔ بچے کے سینے کو محفوظ رکھنے کے لئے ۸،۷ بنیان ضرور ہونے چاہیئں۔ ان کے علاوہ اگر موسم سرد ہو تو تین چار پلاسٹک کے پاجامے یا پتلونیں بھی ہونی چاہیئں۔ اسی طرح بستر کو گیلا ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے پلاسٹک کی اچھی قسم کی دو تین چھوٹی چادریں بھی ضروری چیز ہیں اس سے نہ صرف یہ کہ بچے کا بستر گندا ہونے سے بچ جائے گا بلکہ خود آپ کے کپڑے بھی محفوظ رہیں گے اور یوں آپ بہت سی زحمتوں سے بچ جائیں گی سرد موسم کی صورت میں تین چار ڈھیلے ڈھالے قسم کے فلالین یا نرم اون کے جھبلے بھی ہونے چاہیئں تاکہ سوتے وقت انھیں پہنایا جا سکے۔ اکثر بچے رات کے وقت لحاف کمبل یا چادر کو اتار پھینکتے ہیں اور یوں ان کے بیمار ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس قسم کے ایک دو گرم سوٹ سی لئے جائیں جن میں پاجامہ اور کوٹ ساتھ سلا ہوا ہو اور اس میں بٹن کے بجائے زپ لگا ہوا ہو یا پھر زپ لگا ہوا تب خوابی کا ایک تھیلا بھی سیا جا سکتا ہے تاکہ بچہ اس کو اتار نہ سکے اور آرام کے ساتھ گرم بستر کا لطف اٹھا سکے بچے کا کمبل بھی ایسا خریدیے جسے با آسانی دھو کر خشک کیا جا سکے۔ رات کے وقت باندھے جانے والے پوتڑوں کے لئے تولیہ کا علیحدہ کپڑا خریدنے کے بجائے مناسب یہی ہے کہ پرانے استعمال شدہ تولیوں کو مناسب سائز میں کاٹ کر پوتڑے بنالیے جائیں ایسے پوتڑے نرم تو ہوں گے ہی لیکن ان میں جذب کرنے کی صلاحیت بھی زیادہ ہوگی۔ بعض مائیں ڈھیروں گرم سوٹ اور سوئٹر بھی خرید لیتی ہیں حالانکہ اکثر رشتہ دار اور دوست احباب بچوں کے لئے گرم کپڑے بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ایک آدھ گرم سوئٹر کا خریدنا ہی کافی ہے یہی حال دوسرے کپڑوں کا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کے لئے "کرتہ ٹوپی" کی اصطلاح مروج ہے نو مولودوں کو ڈھیروں کپڑے پہننے کو مل جاتے ہیں۔

مناسب معالج کا انتخاب

بچے کے لئے مناسب معالج کا انتخاب بھی قبل از وقت مناسب ہے تاکہ وہ بچے کی پیدائش کے روز ہی سے اس کی صحت کے سلسلے میں مناسب مشورہ اور تدبیر فراہم کر سکے بروقت معائنہ کے ذریعہ سے اکثر بچوں کو مختلف عوارض اور بیماریوں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اکثر والدین بچوں کو مختلف بیماریوں کے حفاظتی ٹیکے بروقت نہیں لگواتے جس سے بچے کی صحت پر بڑے بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ بچے کی پھول جیسی صحت کو کمھلانے سے محفوظ رکھنے کے لئے بروقت ٹیکے لگوا دیے جائیں بڑے شہروں کے اسپتالوں میں ایسی تمام سہولتیں با آسانی دستیاب ہیں۔

اپنا دودھ ہی پلایئے

مناسب یہی ہے کہ آپ کا بچہ آپ ہی کا دودھ پی کر پلے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی دودھ نہیں ہوتا۔ لیکن اوپر کا دودھ پلانے کی صورت میں مناسب قسم کا دودھ کے پاؤڈر کا انتخاب کیجئے اس سلسلے میں معالج کا مشورہ ضروری ہے دودھ پلانے کی صحیح بوتلوں کا انتخاب بھی ضروری ہے ایک آدھ زیادہ بوتل اور نپل کا خریدنا بھی ضروری ہے تاکہ بوتل ٹوٹنے کی صورت میں عین وقت پر پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

لکھنؤ کے بٹیر باز

جلال ملیح آبادی

کردار

نواب منجھلے آغا . . . . نواب سیف جنگ کے نواسے مگر خود بٹیر جنگ مشہور

نواب پیارے جانی . . . . بائیس برس تک پالنے میں جھولے ہوئے لاڈلے نوابزادے

مرزا جی . . . . منجھلے آغا کے خاندانی مصاحب

میر صاحب . . . . پیشہ ور مصاحب

تماشائی . . . . اور جواری

⁂(نواب منجھلے آغا کی حویلی)⁂

نواب منجھلے آغا۔ اماں تم نے بھی سنا مرزا ؟ (واللہ حد ہوگئی) وہ کل کے بٹیر باز، نواب پیارے جانی، مجھ سے بٹیر لڑانا چاہتے ہیں۔

مرزا جی۔ ہائیں ؟ واللہ نواب صاحب ! آپ کو میرے سر عزیز کی قسم! کیا آپ سچ فرما رہے ہیں !؟

منجھلے آغا۔ اجی حرف بہ حرف سچ کہہ رہا ہوں مرزا !۔ کل اُن کا ایک مصاحب ان کا یہ پیغام لے کر آیا تھا میں نے کہا جس دن حوصلہ ہو پالی بدلیں مگر شرط یہ ہے کہ پانچ سو سے کم پر بٹیر نہیں لڑے گا۔

مرزا۔ اے حضور ! یہ دنیا بھی عجب عبرت کی جا ہے ، اللہ اس سے بڑا عبرت کا اور کون سا مقام ہوگا کہ ہندوستان میں آپ سے کوئی بٹیر لڑانے کی ہمت کرے۔ ؟ ہاں کوئی امریکہ یا فرانس کا بٹیر باز یہ بات کرتا تو سمجھتے چلو بھئی پردیسی ہے نواب صاحب کے بٹیروں سے ناواقفیت کی بنا پر ایسی غلط بات کہہ گیا مگر . . . .

منجھلے آغا۔ اور ابھی کچھ سنا مرزا جی ؟ اماں وہ میرے بٹیر "فولاد خاں" سے اپنا بٹیر لڑانا چاہتے ہیں۔

مرزا۔ اے سرکار ! پریشانی کو اس قدر شدت نہ دیجئے۔ اور حضت ! آج یقین آگیا وہ جو لوگ آج کل کہتے ہیں نا کہ قیامت قریب ہے تو واللہ قیامت کے یہی سب آثار ہیں نواب صاحب !۔

منجھلے آغا۔ بھلا اس میں قیامت کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں کہ اس لکھنؤ کے لوگ "فولاد خاں" سے اپنے بٹیر کی ہمسری کرنے لگیں۔ جس بٹیر کی چاروانگ عالم میں دھاک بندھی ہوئی ہے ؟

منجھلے آغا۔ اور یہ پیارے نواب ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کے بٹیر باز۔ اپنے مصاحبوں کی کھڑی میں آکر لگے مجھ سے مقابلے کی سوچنے۔

مرزا۔ سنو ! اجی حضور ! آپ کے خاندان میں کچھ نہیں تو تین سو سال سے بٹیر بازی چلی آرہی ہے سیکڑوں بٹیروں کے شجرے آپ کے گھر موجود۔ اور یہ ابھی چار چھ سال سے لگے چھتّے پالنے اور بن گئے بٹیر باز ؟

منجھلے آغا۔ اجی مرزا صاحب ! میرے خاندان والوں نے بٹیر بازی میں لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے۔

مرزا۔ اے سرکار ! اس بات سے دنیا واقف ہے کہ آپ کے خاندان والوں نے بٹیر بازی کو فن کی حیثیت دے دی۔ اور حضور نے تو بٹیر بازی کو فلسفے کا درجہ بخشا ہے۔ جس فلسفے کو یونان کے حکیم لقمان اور افلاطون کبھی ہاتھ نہ لگا سکے۔

منجھلے آغا۔ مرزا ؟ یاد ہے تمہیں میرا وہ بٹیر ؟ "زور آور" مرحوم ؟ ؟

مرزا۔ اے حضور ! بھلا مجھے زور آور بہادر مرحوم ، نہیں یاد ہوں گے میں تو ہر جمعرات کو ان کی قبر پر جاتا ہوں ان کے مزار پر جا کر کچھ اپنا ہوا لی چادر کے طور پر چڑھاتا ہوں۔ فاتحہ پڑھ کر حوالے پھیلا

ہوں اور اسی رومال سے آنسو پونچھتا ہوا گھر تک برابر روتا ہوا آتا ہوں۔

منجھلے آغا۔ ہاں مرزا۔ تھا تو وہ ایسا ہی بٹیر کہ جس پر صدیوں رویا جائے میں نے ایسا جیوٹ کا بٹیر آج تک نہیں دیکھا۔

مرزا۔ اے حضور! جی وٹ؟ میں نے تو اسے پالی میں کبھی دشمن بٹیر کے دوسری لات مارتے نہیں دیکھا۔ بس جہاں ایک "او جھڑ" اور فقط ایک لات جھاڑی، سامنے کا بٹیر "فرتیج" بول کر کسی تماشائی کے پائینچے میں دبک گیا واللہ۔

منجھلے آغا۔ اور "پالی" میں وہ کیسا قد نکالتا تھا "مرزا صاحب"!؟

مرزا۔ اجی قد؟ حضور! میری نظر سے تو آج تک ایسا قد آور کوئی شتر مرغ نہیں گزرا۔

منجھلے آغا۔ اور مرزا! کیا تمہیں اس کا سینہ تان کے چلنے کا انداز یاد ہے؟

مرزا۔ حضور! میں تو اس کا ہر انداز غور سے دیکھا کرتا تھا۔ سرکار! جب وہ پالی مارتا تھا تو آپ کی طرف داد لینے کے لئے مسکرا کر دیکھا کرتا تھا اور آپ کو باتوں میں مشغول پاتا تو مجھے ہنس کر دیکھتا تھا (رندھی آواز) ــــ حضور! ــــ مرحوم مجھے پہچانتے تھے کہ آپ کا مصاحب ہوں اس وقت اُن کو یاد کر کے دل بھر آیا۔

(رونے لگتے ہیں)

منجھلے آغا۔ اماں رو نہیں مرزا صاحب! دنیا فانی ہے۔ آخر میرا فولاد خاں تو زندہ ہے۔

مرزا۔ خدا اس بٹیر کو قیامت تک سلامت رکھے حضور ــــ اس میں (اس کی جان سے دور) ــــ مرحوم کے انداز پائے جاتے ہیں۔

منجھلے آغا۔ اسی ٹھاٹ سے یہ بھی پالی میں اُترتا ہے۔

مرزا۔ اجی، سرکار! یہ جس وقت پالی میں اُترتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندادین مہاراج، نواب واجد علی شاہ کے دربار میں کتھک کا ٹھاٹ باندھے کھڑے ہیں۔

منجھلے آغا۔ اور کس "شان" سے "ٹرتا ہے فولاد خاں"؟

مرزا۔ اجی جب چونچ بڑھاتا ہے تو گردن کا ڈورا ایسا چلتا ہے کہ بھاؤ بتلاتے وقت گوہر جان گلگتے والی کی گردن کا ڈورا کیا چلتا ہوگا حضور۔

منجھلے آغا۔ اور مرزا صاحب! جیسا اس کا نام ہے فولاد خاں ویسا ہی یہ بہادر بھی ہے۔

مرزا۔ اجی حضرت! میں تو روز تین بار اس کا نام لے کر سوتا ہوں۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے حضور! اس وظیفے کا یہ اثر ہے کہ آج تک خادم کے گھر کبھی چوری نہیں ہوئی۔ اتنی دہشت ہے اس کے نام میں کہ چور میرے محلے سے گذر نہیں سکتا سرکار!

(کسی کی آواز)

میر صاحب۔ اجی جناب قبلہ نواب صاحب! ــ

مرزا۔ کون؟

میر صاحب۔ اجی میں ہوں، میر صاحب

منجھلے آغا۔ اماں بے تکلف تشریف لائیے میر صاحب۔ غریب خانے کو اپنا ہی گھر سمجھئے۔ آپ تو مغائرت برتنے لگے۔

میر صاحب۔ آداب بجا لاتا ہوں جناب نواب صاحب

منجھلے آغا۔ آداب عرض ہے میر صاحب

میر صاحب۔ قبلہ نواب صاحب! میں ہمیشہ آداب محفل کا خیال رکھتا ہوں اس لئے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت مانگ رہا تھا کہ میرا آنا کہیں خاطر مبارک پر گراں نہ گزرے۔

منجھلے آغا۔ اماں۔ آپ کا آنا اور ہمیں گراں گزرے گا میر صاحب تشریف رکھئے۔

مرزا۔ اور بندہ کورنش بجا لاتا ہے میر صاحب

میر صاحب۔ اوہ ہو آداب عرض ہے۔ جناب مرزا صاحب۔ بھئی معاف فرمائیے گا میں نے آپ کو قطعی نہیں دیکھا۔

مرزا۔ زہے نصیب کہ آپ تشریف لائے میر صاحب۔ کہئے کیسے زحمت فرمائی؟

میر صاحب۔ اجی ذرا نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

منجھلے آغا۔ فرمائیے۔ فرمائیے میر صاحب! میرے لائق کوئی خدمت؟

میر صاحب۔ جناب میں اسلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ ہمارے نواب صاحب نے فرمایا ہے کہ مجھے پانچ سو پر بٹیر لڑانا منظور ہے اگر مزاج مبارک میں آئے تو کل ہی گومتی کے میدان میں پالی ہو جائے۔

منجھلے آغا۔ اپنے نواب صاحب سے میری طرف سے عرض کیجئے گا میر صاحب

کہ میں بھی تیار ہوں کل سویرے آٹھ بجے اپنا بٹیر لے کر گومتی کے میدان میں تشریف لے آئیں۔

مرزا۔ اماں میر صاحب! کہیں تمہارے پیارے نواب کو غلط فہمی تو نہیں ہوگئی ہے ایک مرتبہ ان سے "چبا" دینا کہ صاحب! آپ نواب منجھلے آغا کے بٹیر "فولاد خاں" سے اپنا بٹیر لڑانے جا رہے ہیں۔ ایک بار پھر غور فرما لیجئے ورنہ بھری پالی میں "بھد" ہو جائے گی۔

میر صاحب۔ اجی بٹیر لڑانے میں کیا ہے؟ دو میں سے ایک ہارے گا مرزا جی!! اور یاد رکھیئے میرے نواب کے بٹیر کا نام جنگ بہادر ہے مرزا صاحب۔

مرزا۔ "دو میں سے ایک ہارے گا" یہ کیا کہا آپ نے؟ اماں ہمارے نواب کا فولاد خاں آج تک کسی بٹیر سے ہارا ہے کہ تمہارے نواب کے "بھگے" جنگ بہادر سے ہار جائے گا؟

میر صاحب۔ مرزا صاحب! ہم ٹھہرے نوابوں کے مصاحب! اُن کے بٹیروں کو بھگا کہنا ہمارا آپ کا فرض نہیں۔

مرزا۔ اجی جانے بھی دیجئے کل سے دو چار گھاگر پال لئے آج اُترائے پالی میں۔ تمہارے۔ پیارے نواب کے "کرمزوں" کو تو ہمارے منجھلے آغا کے "پھندیت" دو لاتوں میں "چین" بلوا دیں۔

میر صاحب! میں آپ کے نواب صاحب کے بٹیروں کی شان کے خلاف تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں جو آپ میرے نواب صاحب کے بٹیروں کی شان میں گستاخی کرنے لگے۔

مرزا۔ سچ بات ہے، بٹیروں کی شان میں گستاخی وستاخی نہیں۔ دو دن سے چار اُنگل کا گھاگر کیا لڑانے لگے کہ اب پتنگ لڑانے کا بھی شوق ہو گیا تمہارے پیارے نواب کو۔

میر صاحب۔ (بگڑ کے) بہت "دون" کی لے رہے ہیں آپ مرزا جی! اجی نوابوں کی بات چھوڑیئے آپ میں حوصلہ ہو تو کل کوئی اپنا تیموری بٹیر پالی میں لیتے آیئے گا میں اس پر اپنا ایک جنگ چھوڑوں گا۔ دیکھوں آپ کتنے پانی میں ہیں مرزا صاحب!!

مرزا۔ اجی جانے بھی دیجئے میر صاحب! میں نے تو اپنا شوق اپنے نواب کے شوق پر قربان کر دیا اب تو میں نواب کے بٹیروں کا علاج کرنے پر مقرر ہوں۔ بٹیر ہوتا تو دیکھ لیتا آپ کو!۔

میر صاحب۔ اجی مرزا جی۔ آپ کل سے نواب صاحب کے مصاحب کیا ہو گئے کہ گلے منھ کو آنے۔ اجی ابھی بارہ برس بٹیر کی موٹھ کرنا سیکھیئے تب بٹیر بازی پر گفتگو فرمایئے گا

مرزا۔ اجی آپ کو کب تمیز ہے بٹیر کو موٹھ کرنے کی؟ آپ کو جب دیکھا پان کھائے ہوئے بٹیر کی پیٹھ پر زبان سے مالش کر رہے ہیں اسی کو کہتے ہیں بٹیر کی موٹھ؟

میر صاحب۔ اور میں نے جب بھی آپ کو بٹیر کی موٹھ کرتے دیکھا تو یہی دیکھا کہ بٹیر کی ٹانگیں آپ کی مٹھی میں جکڑی ہوئی ہیں اور بٹیر ایسا پھڑک رہا ہے جیسے چڑی مار کے ہات میں صدقے کا کوّا۔

نواب۔ اماں آپ حضرات کی ہمیشہ کی یہ عادت ہے کہ جب ملے تلوز لین کی طرح گتھ گئے۔ چھوڑیئے بھی یہ بحثا بحثی، کل دیکھا جائے گا۔

میر صاحب۔ اجی حضرت!۔ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں؟ کہ میری طرف سے کوئی آو بھی نہیں ہوئی یہی لگے پھبتیاں کسنے "تو پیرو مرشد! میں بھی انسان ہوں جواب دینا ہی پڑا۔

منجھلے آغا۔ بجا ارشاد میر صاحب! جانے بھی دیجئے۔ مرزا جی آخر آپ کے پرانے دوست ہی تو ہیں۔

مرزا۔ (ہنس کر) سنیئے میر صاحب! کل دو چار "نین سکھ" کے تھان ساتھ لیتے آیئے گا۔ تاکہ جب آپ کے پیارے نواب کا بٹیر ہارے تو نین سکھ کے تھان آپ کے آنسو پونچھنے کے کام آسکیں۔

میر صاحب۔ سنیئے مرزا صاحب! اگر آج جھگڑے ہی پڑا "تارہ د" ہیں اور آپ کو یہ گھمنڈ ہے کہ آپ نے برسوں "بانا" ہلایا ہے تو ذرا باہر تشریف لے چلئے میں ابھی دکھاتا ہوں "بنوٹ" کے دو ہاتھ۔ پلک جھپکنے میں لوٹن کبوتر بنا دوں گا مرزا صاحب! آپ ہیں کس ہوا میں۔

منجھلے آغا۔ (ہراساں کے) اماں مرزا صاحب! مجھے ایسی چھیڑ دھلی پسند نہیں جس سے آدمی طیش میں آجائے اٹھئے میر صاحب سے گلے ملیے۔

مرزا۔ اماں یار میر صاحب! تم تو ذرا سی پھریری کھاتے ہی پھاتر آتے ہو۔ بھلا مذاق کر رہا تھا۔

میر صاحب۔ بھئی مذاق کے بھی آداب ہوتے ہیں مرزا۔ یہ کیا کہ دوسرے کا دل دکھ جائے اور آپ مذاق ہی سمجھتے رہیں۔ چلو معاف کیا۔

منجھلے آغا۔ اماں میر صاحب! تمہیں میری جان کی قسم۔ اس گھر سے دل میں کوئی شکایت لے کر نہ جانا۔

میر صاحب۔ اجی قبلہ، بات آئی گئی ہوئی فکر نہ فرمائیں، مگر قبلۂ عالم اتنا ضرور کہوں گا کہ آج کل مرزا پر مرزا غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے

چوائے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

منجھلے آغا۔ ہاں سنا مرزا جی؟ کہہ گئے میر صاحب اس وقت بڑی چبھتی ہوئی۔

مرزا۔ (ہنس کر) کیوں میر صاحب! جاتے جاتے چوٹ۔ چلتے چلتے داؤں؟

میر صاحب۔ اجی سپاہی کے چھتیس فن ہوتے ہیں مرزا جی! اچھا آداب بجا لاتا ہوں قبلہ نواب صاحب

منجھلے آغا۔ آداب میر صاحب۔

میر صاحب۔ آداب بھائی مرزا

مرزا۔ خدا حافظ میر صاحب!!

(وقفہ)

(نواب پیارے جانی کی حویلی)

پیارے نواب۔ کہو! کیا خبر لائے میر صاحب؟

میر صاحب۔ اجی حضور۔ میں کہتا ہوں نواب کے مصاحب، اس مرزا نے، جنگ بہادر کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ سرکار! اگر جنگ بہادر کی دو لاتوں میں، پالی میں' فولاد خاں کی دھول مل جائے تو کپڑا دھونے والے صابن سے بھگو کر، یہ مونچھیں منڈا ڈالوں

پیارے نواب۔ خیر تو ہے میر صاحب؟ آخر ہوا کیا؟

میر صاحب۔ اجی اس کم بخت مرزا کو منجھلے آغا نے بہت منہ چڑھا لیا ہے۔ لگا اڑانے بے پر کی۔ کہ تمہارے پیارے نواب ابھی دو دن سے چار انگل کا گھاس کیا لڑانے لگے کہ اب "جنگ" لڑانے کا بھی شوق ہو گیا؟

پیارے نواب۔ ہاں تم نے اس پر کیا کیا میر صاحب؟

میر صاحب۔ اجی حضور! وہ منہ توڑ جواب دیا کہ یاد کرتا ہوگا۔ میں نے کہا مرزا صاحب! تم میں حوصلہ ہو تو کل پالی میں اپنا کوئی تیموری بٹیر لیتے آنا میں اس پر اپنا ایک "جنگ" چھوڑ دوں گا دیکھوں کہ کتنے پالی میں رہیں۔

پیارے نواب۔ اس پر مرزا نے کیا جواب دیا؟

میر صاحب۔ اجی حضور! جواب کیا دیتا بس بغلیں جھانکنے لگا اور لگا اول فول بکنے۔ بات بڑھ گئی تھی! ۔۔۔ آج سر پھٹول کی نوبت آ گئی تھی وہ تو کہیے منجھلے آغا نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

پیارے نواب۔ ہاں آئیں؟ واللہ میر صاحب! کیا واقعی اس نے ایسی بات کہی تھی کہ جھگڑے کی صورت پیدا ہو گئی تھی؟

میر صاحب۔ اجی ہاں حضور! کہنے لگا اچھا میر صاحب! کل دو چار خیل مکھڈ کے تھان ساتھ لیتے آئیے گا تاکہ جب تمہارے پیارے نواب کا بٹیر ہارے تو تمہارے آنسو پونچھنے کے کام آ سکیں۔

پیارے نواب۔ ہاں واللہ تم نے اٹھ کر ایک گلہ پیکر کا ہاتھ کیوں نہ رسید کیا کہ "بھنڈارا" کھل جاتا

میر صاحب۔ اجی حضور کا خادم ہوں۔ حضور کی صحبت میں رہتا ہوں میں کہیں دبنے والا ہوں شیر سامنے آئے تو کلّے پھاڑ کے رکھ دوں سرکار

پیارے نواب۔ آخر تم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ نہیں۔

میر صاحب۔ اجی حضور! میں نے کہا سنیئے مرزا جی! اگر آج آپ جھگڑے پر آمادہ ہیں اور آپ کو یہ گھمنڈ ہے کہ آپ نے برسوں "بٹیر" پالا ہے تو باہر تشریف لے چلیئے۔ میں ابھی دکھاتا ہوں آپ کو "جھٹ" کے دو ہاتھ پلک جھپکتے میں لوٹن کبوتر بنا دوں گا مرزا صاحب! آپ ہیں کس چھا میں؟

پیارے نواب۔ ہاں یہ بات ہے۔ کیوں نہ ہو آخر میرے مصاحب ہو خیر تو پھر کیا بولا وہ مغل بچہ؟

میر صاحب۔ اجی کھسیں نکالنے لگا۔ اور منجھلے آغا نے اسے ڈپٹا کہ میر صاحب سے گلے ملو۔

پیارے نواب۔ تو یہ کہو نواب منجھلے آغا نے میل کرا دیا۔ چلو بلا ٹلی۔

میر صاحب۔ اجی حضور! وہ خود اٹھ کے آیا اور معافی مانگنے لگا ورنہ میں اسے تگنی کا ناچ نچا دیتا۔

پیارے نواب۔ بھئی میر صاحب! جو شخص معافی مانگ لے اس سے کیا لڑنا۔

میر صاحب۔ یہی تو مجبوری ہو گئی سرکار! ورنہ میں تو اپنی جگہ سے بھک چکا تھا کہ۔ آج نپٹ لوں اس مغلیے سے۔

پیارے نواب۔ چلو اچھا ہوا لڑائی جھگڑے سے کوئی فائدہ نہیں کل دیکھا جائے گا۔

میر صاحب۔ حضور! کل، جس وقت پالی میں جنگ بہادر فولاد خاں کو مارے گا اس وقت میں اس مرزا کی گھٹی ہوئی چاند پر دھول جما کر اپنی ہتھیلی پر اس کے دستخط کرا کے، ہری کی رسید لکھ لوں گا۔

پیارے نواب۔ اجی سب کہنے کی باتیں ہیں، فولاد خاں بھی بٹیر [illegible]

"میرا جنگ بہادر" بلا کا مضبوط قیامت کا غصے ور اور غضب کا بہادر شیر ہے میر صاحب۔

میر صاحب۔ اے سرکار! پارسال کا قصہ تو حضور کو یاد ہوگا جب سرکار آپ شیر کے شکار پر تشریف لے گئے تھے۔ اور جنگ بہادر کو میری نیپر دگی میں دے گئے تھے۔ ہوا یہ حضور! کہ ایک آفت کا مارا بلا۔ کہیں جنگ بہادر کی کابک کے پاس آ نکلا اور ذلگا کابک سونگھنے بس پھر کیا تھا آگیا غصہ میرے شیر کو۔ جنگ بہادر نے بلے کی موچھ چونچ میں داب۔ جو دی ہیں دو جھنجھوڑیاں تو لگا بلا چیخیں مارنے۔ میری آنکھ کھلی تو پھر بڑا کے بھاگا کابک کی طرف۔ حضور! کیا دیکھتا ہوں کہ بلا چیخیں مار مار کر تڑپ رہا ہے اور زمین پر پٹخنے کھا رہا ہے۔

پیارے نواب۔ ہاں مجھے یاد آگیا بڑی مشکل سے تم نے اس بلے کو میرے بٹیر کے منہ سے چھڑایا تھا میر صاحب!

میر صاحب۔ اجی حضور! آپ کا بٹیر بلے کو چھوڑ تھوڑی رہا تھا میں نے خوشامدیں کیں، ہاتھ جوڑے اور بلے کی طرف سے خود میں نے بٹیر سے معافیاں مانگیں۔ اپنی ٹوپی اتار کے شیر کے قدموں میں رکھی تب بھی وہ نہیں مانا۔ اس وقت مارے غصے کے جنگ بہادر کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں سرکار!

پیارے نواب۔ پھر کیا ہوا تھا میر صاحب! میں بعد کا قصہ کچھ بھول سا گیا ہوں۔

میر صاحب۔ اے سرکار! ہوا یہ کہ آخر مجبور ہو کر میں دوڑ کر قینچی لایا اور بلے کی مونچھ کاٹی تب کہیں بلے کی جان بٹیر سے بچی۔ ۔۔۔ اور بلا سر پر پیر رکھ کر بھاگا ہے سرکار! تو بس نہ پوچھئے اس دن سے گومتی پار دیکھا حضور! آپ کے شیر کے خوف سے بلا گومتی پیر کر کھسیٹ سے نکل بھاگا۔

پیارے نواب۔ ہنہ۔ اور یہ منجھلے آغا چلے ہیں اسی جنگ بہادر سے اپنے بٹیر فولاد خاں کو لڑانے۔ اور اس فولاد خاں پر انہیں بڑا غرور ہے۔

میر صاحب۔ اجی وہ مثل ہے نا سرکار! کہ غرور کا سر نیچا۔ ملاحظہ فرمائیے گا اس غرور کا انجام۔

پیارے نواب۔ اچھا بھئی میر صاحب ابھی ذرا سویرے ہی چلے آنا۔

میر صاحب۔ اجی حضور! منہ اندھیرے پیلا کو ٹہلنے بہلانے لے کر سرکار کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو جاؤں گا اچھا حضور! اجازت؟

پیارے نواب۔ اچھا بھئی میر صاحب فی امان اللہ

میر صاحب۔ اچھا بندہ پرور تسلیم۔ خدا حافظ و ناصر۔

(وقفہ)

گومتی کا میدان

مرزا۔ اے حضور! خیر آ تو گئے پیارے نواب۔ میں تو سمجھا تھا ہمارے فولاد خاں کی ہیبت سے بچکیا گئے۔

منجھلے آغا۔ ہاں سنا ہے انہیں اپنے جنگ بہادر پر بڑا ناز ہے دیکھتا ہوں آج وہ میرے فولاد خاں کے سامنے کتنی دیر ٹکتا ہے۔

مرزا۔ اجی حضور نواب کی بات تو چھوڑیئے مگر ان کا یہ مصاحب میر صاحب (جو ان کے ساتھ آ رہا ہے) بڑا منہ زور ہے کل آپ کے سامنے مجھ سے کہہ رہا تھا۔ یاد رکھئے میرے نواب کے بٹیر کا نام جنگ بہادر ہے مرزا صاحب! ۔۔۔ یہ میر صاحب جنگ بہادر کو نہ جانے سرکار کیا سانڈ سمجھتا ہے یار! ہا ہا ہا

منجھلے آغا۔ اجی میر صاحب ع

جو ہر کھینچے یہ کھلتے ہیں تیغ اصیل کے

میر صاحب۔ اجی سرکار! یہ ٹھیک ہے کہ پیارے نواب کا جنگ بہادر "چونچ پنجے" کا اچھا ہے مگر فولاد خاں کی نشی "نوک پلک" کا پھیر دیا کے پردے میں کیا کوہ قاف میں بھی نہ ہوا ہوگا۔ جہاں حضور پریاں پیدا ہوتی ہیں۔

پیارے نواب (اونچی آواز) آداب عرض کرتا ہوں جناب نواب منجھلے آغا صاحب۔

منجھلے آغا۔ آداب۔ بجا لاتا ہوں جناب پیارے نواب! کہئے حضرت! مزاج گرامی۔

پیارے نواب۔ اے حضرت! آپ کی نوازش ہے، فرمائیے! آپ کا مزاج مبارک؟

منجھلے آغا۔ آپ کی دعا سے اچھا ہوں۔ اے حضرت! بڑی دیر سے خلقت پالی کا انتظار کر رہی ہے۔

پیارے نواب۔ بسم اللہ جناب! مضائقہ کیا ہے اب بٹیر پالی میں چھوڑ دیئے جائیں ۔۔ لانا ذرا جنگ بہادر کی کابک میر صاحب!

منجھلے آغا۔ مگر جناب ان تماشائیوں کو سمجھا دیا جائے کہ ذرا احتیاط سے پالی دیکھیں ۔۔۔ بھئی مرزا اچھا ذرا آپ ہی فرما دیجئے۔

مرزا۔ (تماشائیوں سے) حضرات! آپ خاموشی سے تشریف رکھیں جب بٹیر چھوٹیں تو بٹیروں کے قریب گھیرا نہ ڈالیں۔ لال کپڑا پاس ہو تو چھپالیں لال کپڑے سے بٹیر بھڑکتا ہے۔ اور مہربانی فرماکر شور بالکل نہ فرمائیں۔

پیارے نواب۔ ہاں تو چھوڑیئے اپنا بٹیر، جناب منجھلے آغا صاحب!

منجھلے آغا۔ اپنے بٹیر کی کابک سامنے رکھیے۔ میں فولاد خاں کی کابک کی کھڑکی کھولتا ہوں پیارے نواب

پیارے نواب۔ ذرا چار دانے کا کن تو ڈالنا میر صاحب!۔ میں جنگ بہادر کو چھوڑتا ہوں۔

(چند سکنڈ وقفہ)

مرزا۔ اے سبحان اللہ! اے سبحان اللہ، خدا نظر بد سے بچائے۔ اللہ عمر خضر عطا فرمائے۔ کس شان سے فولاد خاں نے زمین پر پنجہ ٹیکا ہے حضور منجھلے آغا!؟

میر صاحب۔ اے حضور پیارے نواب! جنگ بہادر کے پیروں میں کالا دھاگا باندھیئے خدا نہ خواستہ (دشمنوں کے کان بہرے) کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ آہا کس چھب سے کابک سے باہر قدم رنجہ فرمایا ہے جنگ بہادر نے

مرزا۔ اور سرکار منجھلے آغا! فولاد خاں کی چال ملاحظہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کوئلی سبزے پر ٹہل رہا ہے۔

میر صاحب۔ اے حضرت پیارے نواب! جنگ بہادر کے کان اٹھانے کے انداز پر غور فرمائیں جیسے "ہنس" سیپے موتی چگ رہا ہے۔

مرزا۔ حضور منجھلے آغا! ذرا ابھی بٹیر کا لے رہیئے گا میں فولاد خاں کے سر کی بلائیں لے لوں

میر صاحب۔ اے سرکار پیارے نواب! ذرا ٹھہریئے میں جنگ بہادر کے سر سے تیل ماش اتار دوں!

مرزا۔ اے سبحان تیری قدرت کیا تیور کیا ٹھاٹ ہیں فولاد خاں کے

شعر
ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

میر صاحب۔ جنگ بہادر کا کیا رعب و دبدبہ ہے کیا جاہ و جلال ہے۔

شعر
کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

پیارے نواب۔ (ہنس کر) اماں چھوڑو بھی میر صاحب! یہ بٹیروں کی پالی ہے کہ شاعروں کا اکھاڑا — ہاں منجھلے آغا صاحب! اگر بٹیروں پر یونہیں قصیدے بازی ہوتی رہی تو ہو چکی بٹیروں کی پالی۔

منجھلے آغا۔ (ہنس کر) آپ ذرا اپنے میر صاحب کو روکئے ورنہ ڈر ہے پیارے نواب کہ بٹیروں کی بجائے کہیں میر صاحب اور مرزا کی پالی نہ ہو جائے۔

پیارے نواب۔ (ہنس کر) بھئی میر صاحب! ذرا خاموش رہیے۔ بٹیر لڑنے جا رہے ہیں

منجھلے آغا۔ ذرا آپ بھی صبر فرمائیے پالی شروع ہو رہی ہے مرزا صاحب!

مرزا۔ بسم اللہ حضور — بسم اللہ فرمائیے۔

پیارے نواب۔ منجھلے آغا صاحب! آپ بٹیر کے سامنے سے ہاتھ ہٹائیے۔ میں جنگ بہادر کو سامنے لاتا ہوں۔

منجھلے آغا۔ یہ لیجئے! میرا فولاد خاں سامنے آگیا۔ ہاں لایئے اپنا بٹیر۔

(ذرا وقفہ)

مرزا۔ اے سبحان اللہ سبحان اللہ۔ ہاں۔ ہاں فولاد خاں۔ دے لکھوں بچا کے۔

میر صاحب۔ ہاں یہ بات ہے جنگ بہادر، دے پوٹے پر لات اور اور اور ——

مرزا۔ اجی قلف ڈال دیا فولاد خاں نے، دے جھنجھوڑی ہاں ایک اور بیٹا شاباش شاباش بیٹا

میر صاحب۔ جنگ بہادر نے زبان پکڑلی فولاد خاں کی۔ ہاں بیٹے ارے واہ میرے شیر

ایک جواری۔ اجی دونی دیتا ہوں فولاد خاں پر ہے کوئی کھلاڑی؟

دوسرا جواری۔ اجی چوپڑ! جنگ بہادر مارے

مرزا۔ اجی فولاد خاں پر ایک پر سو دیتا ہوں ہے کوئی لگانے والا؟

میر صاحب۔ اجی مرزا جی، پانچ پر پانچ سو رہی لایئے ہاتھ ملایئے۔

مرزا۔ رہی۔

ایک جواری۔ اماں بچیا گیا ہے فولاد خاں۔ وہ۔ وہ پالی مارے گا جنگ بہادر

دوسرا جواری۔ اجی جنگ بہادر چھوٹا پڑ گیا دو چار لاتوں کا اور ہے ہاں۔ ہاں بیٹا بڑھ کے فولاد خاں، میرے مٹی کے شیر!

میر صاحب۔ (اونچی آواز) اجی ہٹک رہا ہے جنگ بہادر پیارے نواب اپنا بٹیر کاٹ لیجئے۔

مرزا۔ فولاد خاں بھڑک رہا ہے حضور منجھلے آغا! ذرا روکئے بٹیر کو۔

پیارے نواب۔ اماں منع کرو ان جواریوں کو میر صاحب!

منجھلے آغا۔ تماشائیوں کو ذرا ہٹائیے مرزا جی!

مرزا۔ جناب! جناب!! ذرا پیچھے ذب کے پالی دیکھئے بٹیر شور سے دہشت کھا رہے ہیں۔

میر صاحب۔ اجی حضت! دس گز، بٹیروں سے دور ہٹ کر پالی ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔ شکریہ ۔ شکریہ

مرزا۔ ہاں حضور آغا! چھوڑیئے فولاد کو اور آپ پالی سے ہٹ آئیے سرکار۔

میر صاحب۔ ہاں سرکار پیارے نواب! آپ بھی بیچ پالی میں جنگ بہادر کو چھوڑ کر، وہاں سے یہاں تشریف لے آئیں حضور۔

(ذرا وقفہ)

ایک تماشائی۔ ہاں فولاد! واہ میرے شیر!! ہاں ایک اور۔ ڈبک ہا ہے جنگ بہادر

دوسرا تماشائی۔ بڑھ کے جنگ بہادر! ہاں دے بچا کے پینترا۔ ایک لات اماں لات لات

مرزا۔ اجی شل کر دیا فولاد خاں نے جنگ بہادر کے چھکے چھوٹ گئے

میر صاحب۔ اماں جنگ بہادر نے فولاد خاں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔

ایک تماشائی۔ ہاں اچھل کے ۔ دے کنپٹی پر ۔ اے واہ۔ اے قربان۔

دوسرا تماشائی۔ گتھ گئے دونوں گتھ گئے۔ اب کی معاملہ آر پار۔ اے صدقے۔

(مرزا اور میر صاحب کے چلانے کی آواز)

مرزا۔ اے اے اے چیل

میر صاحب۔ چیل چیل چیل

(لوگوں کا شور)

ایک تماشائی۔ لے گئی۔ لے گئی چیل لے گئی

دوسرا تماشائی۔ دونوں بٹیروں کو چیل

میر صاحب۔ غضب ہو گیا حضور! جنگ بہادر کو چیل لے گئی۔

پیارے نواب۔ چیل ؟ ۔

میر صاحب۔ سرکار چیل

پیارے نواب۔ میرے جنگ بہادر کو چیل؟ ۔۔۔ میر صاحب؟ چیل؟؟

منجھلے آغا۔ میرا فولاد خاں مرزا جی؟؟؟

مرزا۔ چیل لے گئی حضور

پیارے نواب۔ (رو کر) میرا جنگ بہادر میر صاحب!!!

میر صاحب۔ حضور! وہ تو چیل کو پیارے ہو گئے!

پیارے نواب۔ ہائے میں مر گیا میر صاحب

منجھلے آغا۔ میں بے ہوش ہونے جا رہا ہوں مرزا۔ مجھے تھامنا۔

میر صاحب۔ اماں جلدی کرو ذرا کیوڑا گلاب چھڑکو منجھلے آغا کے منہ پر

پیارے نواب۔ میرا دل ڈوب رہا ہے میر صاحب

مرزا۔ اماں لخلخہ ۔ لخلخہ سنگھاؤ میر صاحب ورنہ (خدانخواستہ) چلے پیارے نواب

میر صاحب۔ حضور! دل سنبھالئے پیارے نواب! جنگ بہادر نے شہادت کا رتبہ پایا ہے۔

منجھلے آغا۔ ہائے میرا فولاد خاں مرزا؟ میں نے اُسے اپنے بزرگوں کی طرح پالا تھا!

مرزا۔ حضور صبر فرمائیں۔ سرکار کے سر عزیز کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک ہندوستان بھر کی ساری چیلوں کو بندوق سے نہ اڑا دوں گا دم نہ لوں گا۔

(قہقہے قہقہے قہقہے)

بیوی ایک سائنس داں کی

مناظر عاشق ہرگانوی

حقیقت یہ ہے کہ سائنس داں کی بیوی بننا بھی قسمت کی بات ہے۔

میرے شوہر ایک بہت بڑے سائنس داں ہیں ان کی شہرت سے میں شادی سے قبل ہی واقف تھی۔ وہ بڑے بڑے شہروں کے خاص خاص مجمعوں میں اپنا لکچر دینے کے لئے مدعو کئے جاتے تھے۔ بڑی بڑی لیبارٹریوں میں ریسرچ کے سلسلے میں بلائے جاتے تھے جہاں وہ دن رات کھانے پینے سے بے نیاز ناقابل بیان محنت کرتے۔ ان کے کار منصبی اور عمل دلچسپی پر سرکار نے ان کی تجربہ گاہ کو ایک لاکھ روپیہ بھی دیا تھا۔

ان ہی سب باتوں سے متاثر ہو کر میرے والد نے میرا ہاتھ ان کو سونپ دیا۔ میں بھی کم خوش نہ تھی۔ ان کے ساتھ میٹنگ اٹنیڈ کرنا، ایسوسی ایشن میں جانا ان کے ساتھ ساتھ عزت حاصل کرنا بھی مجھے بہت بھاتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے یہاں تک کہ تجربہ گاہ میں بھی ان کے ساتھ رہتی۔ وہ تو اپنے کام میں مصروف ہو جاتے اور میں کبھی ایک کھڑکی سے ادھر اور کبھی دوسری سے ادھر دیکھا کرتی۔ ٹھیک ایک بجے نوکر کھانا لے کر آتا اور میرے کہنے پر وہ کہہ دیتے "تم کھاؤ منا! میرا ایکسپیریمنٹ چل رہا ہے پھر کھا لوں گا —" اور نہ ہی ان کے کھانے کا وقت آتا اور نہ میں ہی اکیلے کھاتی اور یہ روز کا معمول ہو گیا۔

لیکن اس روزانہ کے معمول سے میں اکتا گئی اور ایک دن آخر پھٹ پڑی۔

"مجھے اس طرح کی بے کیف زندگی بالکل پسند نہیں۔"

"کیا یہاں لیبارٹری میں تمہارا جی نہیں لگتا؟ کیسے کیسے ایکسپیریمنٹ میں تمہارے سامنے کرتا ہوں، تمہیں خوشی نہیں ہوتی؟"

"خوشی کیا خاک ہوگی۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا البتہ مجھے ایک نجومی کی پیشین گوئی یاد آ رہی ہے۔"

"کیسی پیشین گوئی؟ کس کے بارے میں؟"

"میرا ہاتھ دیکھ کر میرے متعلق اس نے پیشین گوئی کی تھی —"

"کیا —؟"

"یہی کہ چالیس برس کی عمر تک تم اپنے شوہر کے تجربات دیکھتی رہوگی —"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" میرے شوہر نے اچھل کر مجھ سے پوچھا۔

"بس میں نے بھی نجومی سے یہی پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بعد میں اس کی عادی ہو جاؤں گی۔"

"لاحول ولا قوۃ! یہ کیا بات ہوئی؟ یاد رکھو! تم ایک سائنس داں کی بیوی ہو۔ تمہیں ان میں دلچسپی یعنی معلومات بڑھانی چاہیئے۔"

"اگر میں یوں ہی جانکاری بڑھاتی رہی تو نجومی کی بات سچ ثابت ہو جائے گی۔ میری جوانی ضائع ہو جائے گی پھر میں آپ کے ایکسپیریمنٹ کی عادی ہو جاؤں گی۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ سائنس کے علاوہ دوسرے ایکسپیریمنٹ میں بھی ہم دونوں حصہ لیں آپ کو میوزک سے دلچسپی لینی چاہیئے۔ سینما چلنا چاہیئے اور ......"

"بس بس۔ یہ وقت برباد کرنے کی باتیں ہیں۔ سینما! کیا رکھا ہے ان جھوٹی کہانیوں میں؟"

میں جھنجھلا کر کہہ بیٹھی — "کل سے میں گھر پر رہ کر اپنے گھر کا کام خود کروں گی۔ نوکر کا کھانا مجھے پسند نہیں۔"

"بالکل ٹھیک، میں تمہارے لئے بالکل نیا [illegible]

بنوا دوں گا جہاں پر تم کھانا پکاؤ گی اور وہیں کھانا کھاؤں گا"

"جی ہاں! آپ تو لنچ لینے گھر آنے ہی لگے، یہاں پر ہی کون سا کھاتے ہیں۔"

"نہیں نہیں — جب تم اپنے ہاتھ سے بناؤ گی تو ضرور آؤں گا —"

اور پھر میرا باورچی خانہ تیار ہوگیا جہاں پر دو چولہے بجلی کے تھے جن میں تھرمامیٹر لگے تھے۔ مسالہ کوٹنے، دہی بلونے اور مکھن نکالنے وغیرہ کی سبھی جدید مشینیں موجود تھیں۔ ٹھیک سوا آٹھ بجے ناشتے کا اور ایک بجے لنچ کا وقت مقرر ہوا ان کا کہنا تھا کہ "وقت کے ایک ایک منٹ کا پابند رہنا ہوگا اگر تم نے دیر کی تو میں کھانا نہ کھا سکوں گا اور اگر میں نے پہنچنے میں دیر کی تو تم کو میرے انتظار کی ضرورت نہیں —"

فیصلہ ہوگیا اور میں نے اپنا باورچی خانہ سنبھال لیا۔

پہلے دن ٹھیک سوا آٹھ بجے شوہر نامدار میز پر آ گئے میں نے دودھ کپ میں ڈال کر دیا وہ ایک گھونٹ لے کر ہی برس پڑے۔ ہر طرح کی آسانیاں تمہیں دے ڈالیں پھر بھی اتنا گرم دودھ، منھ جلا ڈالا۔ لیکن — خیر، آج پہلا دن ہے۔ آئندہ کے لئے غور سے سن لو۔ ۶۰ ڈگری کی حرارت کا دودھ، ۷۰ ڈگری کی حرارت کی کافی اور ۹۰ ڈگری کی چائے پہلے تھرمامیٹر سے ناپ کر میز پر لگایا کرو —"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے —"

اسی طرح دوپہر اور رات کے کھانے میں بھی غلطیاں ہوئیں اور مجھے ہدایت لینی پڑی۔

دوسرے دن ناشتے کے وقت دودھ ادبٹا کر رہنے دیا پھر پیالے میں ڈال کر کچھ وقت بجلی کے فین کے نیچے رکھا تب جا کر اس کی حرارت ۶۰ ڈگری آئی پھر کڑھائی میں گھی ڈال کر تھرمو اسٹینڈ پر رکھی اور کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی سوا آٹھ بجنے میں پورے پانچ منٹ باقی تھے۔ وقت کی کمی کا احساس ہوتے ہی میں نے جلدی سے کڑھائی میں پکوڑی ڈال دی۔

ناشتے کی میز پر وہ بولے — "تم تو رسوئی میں بھی تجربہ کار نہیں ہو۔ ٹھنڈے گھی میں پکوڑی ڈال کر ستیاناس کر دیں۔ جیرا

آج یہ بھی سن لو۔ گھی کا ٹمپریچر جب ۲۰۰ ڈگری ہو تب پکوڑی یا پوری ڈالنا چاہیئے"

مجھے برا تو لگا مگر اسی وقت اٹھی اور رسوئی میں جا کر تھرمامیٹر کڑھائی میں ڈال دیا جو فوراً ہی چٹ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ وہ میرے پیچھے ہی پیچھے آگئے تھے آواز سن کر بولے — "اوہ تم تو بڑی بے وقوف ہو۔ تھرمامیٹر تو تمہارے چولہے پر ہی لگا ہے جو چیزوں کا درجہ حرارت اپنے آپ ہی بتا رہا ہے اگر تھرمامیٹر سے ہی دیکھنا تھا تو برائنگ ہاٹ دیکھنے والا تھا —

میں نے کہا — "ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ سب اندازے ہی سے ہوتا ہے آپ کی اس طرح کی پابندی مجھ سے نہیں ہی جاتی"

وہ بولے — "بس ہندوستانی عورتوں کو کوئی اچھی بات نہیں سکھائی جا سکتی۔ ہٹ دھرمیاں ان کی پہلی پہچان ہے"

میں کیا کہتی۔ چپ ہو رہی —"

ایک دن کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی باہر کا تو کہنا ہی کیا کمرہ بھی بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا اور کمرے کا روم تھرمامیٹر ۱۵ ڈگری ٹمپریچر دے رہا تھا۔ ایسے میں میں اکیلی بیٹھی سوئٹر بن رہی تھی انگلیاں ٹھٹھر جاتیں تو رک جاتی اور پھر بننے لگتی — ابھی گیارہ ہی بجے تھے کہ وہ آ گئے بولے "کیا ہو رہا ہے؟"

میں بولی — "ابھی سے آ گئے؟ گیارہ ہی بجے ہیں۔ کیسے چلے آئے؟"

میں چونک اٹھی — "یہ سوکھی ندی میں باڑھ کیسی؟"

کہنے لگے — "اچھا جی، تو ہم سوکھی ندی ہیں پیار نہیں کرتے آپ کو۔ ہے نا؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا — ؟ آج ہماری شادی کا دن ہے۔ سوچا آج کچھ دیر چین سے بیٹھیں گے۔ بس اسی لئے آ گئے مگر اوہ ارے روم ٹمپریچر ۱۵ ڈگری ہے۔ تبھی تو اتنی ٹھنڈک ہے۔ لیکن تم نے ہیٹر بھی آن نہیں کیا حقیقت میں تم کسی دیہاتی ہی کو بیاہنے کے قابل تھیں۔"

میرے عزت نفس یا احساس خودی پر سخت چوٹ لگی آئے تھے شادی کی سالگرہ منانے اور دینے لگے دیہاتی ساتھی کی۔ میری آنکھیں چمک اٹھیں "تو کسی ساتھی دیہاتی عورت سے دوسری شادی کر لیجئے۔ جب یہیں کہیں کونے کھدرے میں پڑی رہوں گی"

دوسرے دن وہ روز کی طرح کام پر چلے گئے اور میاں کی تو

سا بدلنے کی فکر میں رہی ۔ ان کے جاتے ہی میں نے پڑوسن سے انگیٹھی
مانگ کر اپنے گیرج میں مزے دار قورمہ، آلو، سبزی، مکئی اور مسالہ
لگا کر دیہاتی ڈھنگ کی روٹیاں بنوائیں۔

ایک بجے وہ آتے تھے پھر کھانا وقت پر آج کیونکر آتے
جب [illegible] کو کرنے گیرج کی طرف آئے تو مجھے سامنے انگیٹھی
پر روٹی سینکتا دیکھ کر بھونچکا سے رہ گئے۔

" یہ کیا ــــ؟"

میں کیا کہتی ۔ حالانکہ کہنے کے لئے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن
میں غصہ سے بھری ہوئی تھی۔ دیہاتی کی طرح کھانا پکاؤں گی آپ
اپنی دوسری شادی کر لیں جو درجۂ حرارت جانچ جانچ کر جائے
وودھ دیا کرے اور منٹ منٹ کی پابند ہو اور بدنظمی اور
بے ضابطگی اس میں نام کو بھی نہ ہو۔

مگر یہ سب کچھ نہ کہہ سکی۔ کبھی بھی کیسے وہ اپنے ڈاکٹر کرد ڈاکٹر
شہاب کو بھی اپنے ساتھ جدید سامان سے لیس رسوئی دکھانے
لائے تھے۔

شرم سے میرا منہ لال ہو گیا ۔ میں کچھ بھی تو کہہ نہ پائی ــــ
اتنے میں ڈاکٹر شہاب بولے۔

" تم ابھی نہیں جانتے قمر کہ آج مسز قمر اپنے مائکے کے
ڈھنگ کا مزہ لے رہی ہیں عورتوں کو اپنے مائکے کا چلن بہت
بھاتا ہے ۔ چاہے وہ کتنا ہی واہیات کیوں نہ ہو! اور دونوں
زور سے ہنس پڑے ــــ ان کی ہنسی سے میں کٹ کر رہ گئی اور
مجھے وہ میاں بیوی یاد آگئے جنہیں ایک بار ایسی ہی شرمندگی کا
سامنا کرنا پڑا تھا عورت کو اپنے شوہر کی، ریس پر روپیہ
لگانے کی عادت پر اعتراض تھا ۔ اس لئے شوہر نے چوری چھپے
گھوڑوں پر روپیہ لگانا شروع کر دیا ۔ ایک دن اس کا ایک
دوست آیا اور باتوں باتوں میں پوچھنے لگا ۔ "کہو بھئی کل شام
ریس کے معاملے میں کچھ کامیابی ہوئی ــــ؟"

یہ سنتے ہی بیوی نے غضبناک نظروں سے شوہر کو دیکھا
اور کمرے سے باہر چلی گئی ۔ شوہر نے دوست سے فریاد کی، "تم نے
تو سارا معاملہ چوپٹ کر دیا ۔ میں نے بڑی مشکل سے بیوی کو یقین
دلایا تھا کہ میں اب ریس میں روپیہ نہیں لگاتا ۔ اسے تم ہی کوئی
ترکیب بتاؤ ــــ ۔

ذرا دیر کے بعد جب عورت واپس آئی تو دوست نے کہا۔
" دیکھئے بھابی ۔ میری بات سے آپ کوئی غلط مطلب نہ
نکالیے گا ۔ آپ کے شوہر گھوڑوں پر رقم نہیں لگاتے راج
کسی گھوڑی کا نہیں دفتر کی ٹائپسٹ کا نام ہے "

[illegible] یہ معاملہ اتنا ہی سیریس ہے میرا معاملہ بھی
ہے فرق صرف اتنا ہے کہ زندگی کی ریس میں خود کو اس
مشینی رفتار سے بدلتے بدلتے رہ گئی پھر وہی سب کچھ پہنا
اور کرنا پڑ رہا ہے۔

تشریح کلام غالب

مزاحیہ
قسط نمبر ۲
برق آشیانوی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجمل ہماری فرصت کے دشمن ہو گئے ہیں تعطیل کا دن تھا - ارادہ تھا کہ فرصت کو کسی مفید کام میں استعمال کریں گے لیکن ناشتہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اجمل آ پہنچے بغل میں دیوان غالب تھا اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ - ہم سمجھ گئے کہ آج پھر ہمارا دماغ چاٹیں گے - چنانچہ ایسا ہی ہوا - بیٹھتے ہی دیوان کھولا اور اس شعر پر انگلی رکھدی -

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور کہا کہ سمجھایئے اس شعر کا مطلب -

ہم نے پھر ایک بار ان سے ملتجیانہ انداز میں کہا ——— بابا کیوں ہم سے اتنا بڑا گناہ کرواتے ہو - ہم صحیح کہتے ہیں بلکہ کہو تو قسم کھانے کو تیار ہیں کہ ہم غالب کو خود نہیں سمجھ سکے تو تم کو کیا خاک سمجھائیں گے سوائے اس کے کہ اوٹ پٹانگ باتیں کریں ہم سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے -"

لیکن جب اجمل طفلانہ ہٹ پر اتر آئے تو ہم نے پھر ایک بار بے معنی بکواس کرنے کی ٹھان لی ہم نے جب شعر کو غور سے پڑھا تو ذہن میں الیکشن کا خاکہ کھنچ گیا ——— چنانچہ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اسی انداز میں بڑ ہانک دی جائے لہذا کہنا شروع کیا ———

"الیکشن کی دھوم دھام تھی .... " ابھی ہم آگے بھی نہیں بڑھے تھے کہ اجمل نے ٹوک دیا ——— " اس زمانے میں الیکشن بھی ہوا کرتے تھے ——— ؟

ہم نے کہا ——— " سنو میاں اجمل اگر تم اسی صبر و استقلال بلکہ شرافت کے ساتھ سنتے جاؤ جیسا کہ سابق میں سن چکے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ بھرے جاؤ اپنے غالب صاحب کو اور ان کے دیوان صاحب کو بھی ———

وہ بیچارے سنبھل گئے اور منت سماجت پر اتر آئے اور وعدہ کیا کہ اب کبھی بیچ میں نہ بولیں گے - چنانچہ بکواس جاری رکھتے ہوئے ہم نے کہا ——— " ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ .... الیکشن کا ہنگامہ تھا بالکل ہنگامۂ حشر کی طرح - ہر طرف کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا نمائندہ اپنا سفرِ اعمال کھولے لوگوں کو بہکا رہا تھا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دیے جائیں - یہ جو تمہارے ماموں جان صاحب ہیں یا برق آشیانوی ——— ان کو ایک حماقت سوجھی - چنانچہ سیدھے پہنچے مرزا غالب کی خدمت میں - پہلے تو بڑے ادب سے کورنش بجا لا کر کھڑے ہو گئے اور جب مرزا صاحب نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو جھک کر ایک اور فراشی سلام جھاڑ دیا ——— اور پھر دست بستہ کھڑے ہو گئے - مرزا صاحب ان کے مسخرے پن سے واقف تھے لہذا مسکرا کر دریافت کیا " کہو بھئی کیسے آئے ——— ؟ " اور ہاتھ سے اشارہ بیٹھنے کا کیا ——— برق آشیانوی مرزا صاحب کے حکم کی تعمیل میں چار زانو بیٹھ گئے ——— اور عرض کیا ———

" حضور ایک پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں ——— " مرزا صاحب چونکے اور پوچھا -

" کس کا پیغام ؟ کیسا پیغام ؟ "

" جی حضور اپنا ہی پیغام لے کر حاضر خدمت ہوا ہوں ——— بالکل اسی طرح جیسے آپ اپنا خط لے کر خود ہی محبوب کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں " ——— مرزا صاحب ہنس پڑے اور کہا ———

" اچھا تو بتاؤ کیا بات ہے ——— ؟ "

عرض کیا ——— " قبلہ اس بندۂ حقیر کی فقیرانہ گزارش صرف اتنی ہے کہ آپ الیکشن لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں ——— "

اس پر مرزا صاحب نے ایک قہقہہ بلند کر دیا اور کہا ———

" میاں صاحبزادے چھوڑو مذاق کو کام کی بات کرو "

عرض کیا ——— " بندہ پرور بھلا آپ سے مذاق کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے ——— فی الحقیقت عرض یہ ہے کہ آپ اس

اکھاڑے میں بھی دھڑک اتر جائیں۔ خاکسار کو سو فیصدی اس بات کا یقین ہے کہ میونسپل کونسلری کے لئے آپ کے سوائے اس حلقے سے کوئی اور منتخب ہو ہی نہیں سکتا۔ غالباً آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ آپ نے جو بھوک ہڑتال کی تھی تو اس کے بعد لوگ آپ کو کتنا بڑا لیڈر سمجھنے لگے ہیں۔"

مرزا غالب نے کچھ پس و پیش کیا تو انھیں بتایا گیا کہ کس طرح پچھلے انتخابات میں ایک حجام نے الیکشن جیتا اور پھر کس طرح جیت جانے کے بعد تمام لوگوں کے سر مونڈ ڈالے جو اس کے پرانے گاہک ہونے کے باوجود اس کو چھوڑ کر سامنے والے اپ ٹو ڈیٹ سیلون میں جا کر دلیپ کمار فیشن کے بال کٹوانے لگے تھے۔ پھر گزشتہ الیکشن میں اس بھنگی نے جو برسوں سے ان کے گھر آیا کرتا تھا کونسلر ہونے کے بعد بلدیہ کے ہر اجلاس میں فلش سسٹم کے بیت الخلاؤں کی تعمیر کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی اور معقول دلائل سے فلش سسٹم کو صحت عامہ کے مضر قرار دے کر ممنوع ٹھہرایا — اب اگر مرزا صاحب کھڑے ہو جائیں تو ایسے تمام لوگ ہوا میں اڑ جائیں گے اور جب مرزا صاحب منتخب ہو جائیں تو نہ صرف شعرا اور عشاق کے دیرینہ مسائل حل ہو جائیں گے بلکہ قاسم جان کی گلی میں سیمنٹ کی سڑک بن جائے گی اور برقی روشنی آ جائے گی اور مرزا صاحب کے تنگ و تاریک اور خستہ مکان کی جگہ ایک آر، سی، سی کی بلڈنگ کھڑی ہو جائے گی۔ غرض بڑی رد و قدح کے بعد مرزا صاحب الیکشن کے میدان میں اتر پڑے۔

مرزا صاحب کو سخت حیرت اور شدید ملال اس وقت ہوا جب کہ انھیں معلوم ہوا کہ ان کا یہ دیرینہ وفادار ملازم کلیان بھی الیکشن کا امیدوار ہے اور محلہ کا وہ پینٹر (Painter) بھی جس کو انھوں نے شاعری کا درس دیا تھا ان کے خلاف کھڑا ہو گیا ہے۔ کلیان کو تو جیسے ہی اس بات کا علم ہوا کہ مرزا صاحب الیکشن لڑ رہے ہیں وہ میدان سے ہٹ گیا اور اس نے اپنا ٹکٹ واپس لے لیا لیکن پینٹر مرزا صاحب کے مقابل ڈٹ گیا۔ انھیں اپنے ... ناخلف شاگرد پر سخت غصہ آیا۔ تب برق آشیانوی نے سمجھایا کہ زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے۔ مرزا صاحب تو شاگرد کی بات کرتے ہیں الیکشن میں تو باپ بیٹے کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے

چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ شوہر کے مقابلے میں بیوی کھڑی ہو جاتی ہے۔ مرزا صاحب کو اس بات سے کچھ تسلی ہوئی کہ مصوری کے معاملے میں وہ خود بھی اس کے شاگرد رہ چکے تھے۔ بہرحال اب انتخابی تقریروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو امیدواروں نے محلہ محلہ پھر پھر کر تقریریں شروع کر دیں چنانچہ مرزا صاحب کے اس غیر سعادت مند شاگرد یعنی پینٹر نے جو ان کے خلاف تقریر کی اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

بہنو اور بھائیو! آپ مرزا غالب کے جھانسے میں نہ آئیے وہ کوئی قابل اعتبار انسان نہیں ہیں۔ خود میرا تجربہ ہے کہ فن مصوری تو انھوں نے مجھ سے سیکھ لیا لیکن شاعری مجھے نہیں سکھائی۔ برسوں ان کی غلامی کرنے کے بعد بھی مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ایک مصرع چھوٹا اور دوسرا مصرعہ بڑا کس طرح ہو جاتا ہے حالانکہ میں نوشاد کی دھن پر گا کر پڑھتا ہوں تو دونوں مصرعے برابر نظر آتے ہیں۔ جس غرض کے لئے فن مصوری انھوں نے مجھ سے سیکھا ہے وہ سن کر آپ عش عش کرنے لگیں گے بلکہ غش کھا کر گر پڑیں گے انھوں نے اس عظیم آرٹ کو اس لئے نہیں سیکھا کہ وہ آرٹ کی خدمت کریں گے جس طرح مغربی ممالک میں لوگ برہنہ تصاویر بنا کر آرٹ کی خدمت بجا لاتے ہیں بلکہ اس لئے سیکھا کہ وہ حسینان عالم کی تصویریں بنا کر ان کی خدمت میں تحفتہً پیش کرنے کے لئے حاضر ہو جائیں گے اور بہانے سے مہ رخوں سے ملاقات کریں گے ان کی اس نیت کا یہ شعر گواہ ہے ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے مرزا صاحب نے بھوک ہڑتال کی تھی لیکن آپ غور فرمایئے کہ اس کا مقصد کس قدر عامیانہ تھا۔ انھوں نے قانون کی دفعہ ... سی کے جواز کو چیلنج کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا تھا کہ مہ جبینوں کو چھیڑنے پر سے قانونی پابندی ختم کر دی جائے — ذرا سوچیے کہ یہ کاز (Cause) کس قدر عامیانہ بلکہ میں تو کہوں گا کہ پست ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ آئے دن عائد کئے جانے والے نئے نئے ٹیکسوں کے خلاف بھوک ہڑتال کرتے یا پھر شعرا کے لئے ایک علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتے ہوئے بھوک ہڑتال کرتے کیونکہ ملک میں شعرا کی اتنی بڑی اکثریت ہے کہ ان کی ایک علیحدہ

ریاست کا قیام ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ ان مسائل کو چھوڑ کر انہوں نے مردوں سے چھیڑ چھاڑ پر سے قانونی پابندی ختم کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کی ——— حالانکہ خود ان کا محبوب انھیں اس درجہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس نے اپنی ڈیوڑھی کے دربان کو حکم دے رکھا ہے کہ مرزا غالب کبھی ڈیوڑھی کے سامنے بھی نظر آجائیں تو انھیں کوتوال فیض الحسن خاں کے حوالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مرزا صاحب گداگر کا لباس پہن کر اور اس طرح قانون کے تحت تلبیس شخصی کا جرم کرکے اپنے محبوب کی ڈیوڑھی کے سامنے جا بیٹھے پھر خود ان کی ہی نازیبا حرکت سے جب دربان نے پہچان لیا تو ان کی وہ درگت بنائی کہ مرزا صاحب کا حلیہ بگڑ گیا چنانچہ اس واقعہ کا خود انھوں نے اس شعر میں اعتراف کیا ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

سب سے بڑھ کر آپ کو اس بات پر سخت حیرت ہوگی کہ مرزا صاحب کو ایک جرم کی پاداش میں جیل جانا پڑا تھا۔"

غرض ہر حریف میدان اپنے مخالف پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اسی دوران کسی نے مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ ایک خاتون امیدوار بھی میدان انتخاب میں اتر آئی ہیں۔ مرزا صاحب نے سنتے ہی کہہ دیا کہ کسی خاتون کا انتخابات میں حصہ لینا خلاف شرع ہے۔ چنانچہ مفتی صدر الدین صاحب کے پاس پہنچے اور فتویٰ حاصل کر کے پمفلٹ کی شکل میں چھپوایا اور تقسیم کرا دیا۔ ادھر خاتون امیدوار کی تائید میں بھی پمفلٹ شائع ہوئے جن میں رضیہ سلطانہ ——— چاند بی بی ——— رانی کرناوتی ——— بہادر رانی جھانسی اور ملکہ وکٹوریہ کی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ "خواتین" کو "حضرات" کے دوش بدوش کام کرنے کا حق حاصل ہے مرزا صاحب کو اپنے دیگر حریفوں سے زیادہ اندیشہ نہ تھا کیونکہ تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلا تھا کہ پیر ڈیچھی سنگھ کی دوکان کا مالک نیشنل ریشوڈنٹ کا پروپرائٹر اور ایک وظیفہ یاب کیپٹن اور ایک چھٹا ہوا ڈاکٹر وغیرہ تو مرزا صاحب کے مقابل نہ ٹھہر سکیں گے لیکن خاتون امیدوار سے روز بروز خدشہ بڑھتا جا رہا تھا چنانچہ اپنی کانسٹی ٹیوئنسی میں مرزا صاحب نے ایک انتخابی جلسہ منعقد کیا جس میں انھوں نے ایک دھواں دھار تقریر فرمائی جس کا اقتباس درج ذیل ہے:—

"حضرات وخواتین ——— " اس انداز تخاطب پر خواتین کی جانب سے شور بلند ہوا کہ "لیڈیز فرسٹ" یعنی "خواتین و حضرات" کہا جائے ——— لیکن مرزا صاحب نے توضیح فرمائی چونکہ "حضرت" یعنی آدم کی تخلیق "خاتون" یعنی حوا سے پہلے ہوئی اس لئے یہ ترتیب تاریخی و دستوری لحاظ سے بالکل درست ہے پھر تقریر جاری رکھتے ہوئے مرزا غالب نے فرمایا ——— "میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ پایا باپ میرا عبد اللہ بیگ نواب آصف الدولہ کا نوکر ہوا بعد میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں بہادر میرا چچا حقیقی، مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اسی لحاظ سے میرا دعویٰ مبنی بر صداقت ہے کہ ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

علاوہ ازیں میرا قد درازی میں انگشت نما۔ میرا رنگ چمپئی تھا۔ جب کبھی مجھ کو میرا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ میری زندگی میں نہ سزا نہ جزا نہ نفرین نہ آفریں، نہ عدل نہ ظلم۔ نہ لطف نہ قہر۔ بے رنق جینے کا مجھ کو ڈھب آگیا ہے اور اسی ڈھب کو میں اپنے عہد رکنیت میں عام کرنے حزائی قلت کے مسئلے کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کر دوں گا جیسا ننگا بھوکا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ اور تمام لوگوں کو ننگے اور بھوکے جینے کا گر سکھا دوں گا پھر آپ دیکھیں گے کہ آنے والے سال کے بجٹ میں کروڑوں روپئے خسارے کے بجائے کروڑوں روپئے کی بچت ہوگی۔ لہٰذا میں ایک بے لوث خدمت کے قابل ہوں۔ آج کل کے مکانات کا یہ عالم ہے کہ برسات کا حال کچھ نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے مکان کا جو حجک رہا ہے چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔

بیشتر گھرانہ میرے اچھوت مان بھر بیٹھے کہیں لگن لگا ہوا ہو کہیں [illegible] دھری ہوئی۔ ان تمام باتوں نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ اب میرے سینے میں صرف عوام کا درد ہے۔ اب میں ..... اور صرف میں ہی اس قابل ہوں کہ خلق کی صحیح خدمت کرسکوں یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایک خاتون امیدوار بھی انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں جو ہمارے ملک کی روایات کے عین خلاف ہے پھر خود اس خاتون کے مسلک کے اعتبار سے کسی قسم کا اقتدار حاصل کرنا خلاف شرع ہے علاوہ ازیں اس بات کو بھی آپ اچھی طرح یاد رکھئے کہ جس روز کوئی خاتون برسر اقتدار آجائیگی وہ اس کے خیال کے مطابق صدیوں سے اس پر کئے گئے مظالم کا گن گن کر بدلہ لے گی۔ اور ہم مردوں کا جینا تو درکنار سانس لینا بھی دوبھر ہو جائے گا۔

ایک امیدوار صاحب کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں نے انھیں شاعری نہیں سکھائی غالباً انھیں یہ بات معلوم نہیں کہ شاعر بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے جب میں نے یہ دیکھا کہ "لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ طوطا ہی رہا" تو میں نے اپنی کئی غیر مطبوعہ غزلیں انھیں مفت دے دیں جو انھوں نے آل انڈیا مشاعروں میں اپنے نام سے جھوم جھوم کر پڑھیں اور خوب داد تحسین حاصل کی۔ بعض لوگ میری قید کا ذکر کرتے ہیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار کے لئے تو یہ ایک "صداقت نامہ قابلیت" کا درجہ رکھتا ہے جو کسی حریف امیدوار کو نصیب نہیں ہے۔"

دوسرے روز اسی مقام پر خاتون امیدوار نے انتخابی جلسہ کیا اور ایک انتہائی گرم و تانک تقریر کی جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"بہنو اور بھائیو! مرزا غالب نام کے نواب اور لوگوں کے سامنے ہیں اگر وہ نواب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ہیں تو پھر ان کے گھر میں بوریا تک کیوں نہیں ہے اور جب میں ان کے گھر جانے کا ارادہ کرتی ہوں تو کیوں یہ کہتے ہیں

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اور اگر سپاہی ہیں تو کیوں ہاتھ میں تلوار لے کر نکلنے کے بجائے "کان پر قلم رکھ کر" گھر سے نکلتے ہیں اور کیوں اس بات کی تشہیر کرتے ہیں کہ۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مرزا صاحب ایک نکمے آدمی ہیں وہ صرف عشق و عاشقی کر سکتے ہیں۔ قوم کی خدمت بیچارے کیا کر سکیں گے اس بات کا اظہار خود انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انھوں نے عورت کے مقام کو بہت گرا دیا ہے بلکہ عورت کے وقار کو سخت ٹھیس پہنچائی ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خود مرزا صاحب تو عورت کے مقام سے بھی گر چکے ہیں اگرچہ یہ بات کہنے کی نہیں ہے کیونکہ اس میں میری خودنمائی اور خودستائی ہوگی لیکن اس حقیقت کو خود مرزا صاحب نے فراموش نہیں کیا کہ ایک موقعہ پر انھوں نے میرے پاؤں دابے ہیں اس واقعہ کے ثبوت میں ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اس خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا مرے پاؤں داب تو دے

سمجھیو اور سمجھیو! پاؤں دابنا پھر بھی غنیمت ہے ایک مرتبہ تو انھوں نے میرے پاؤں دھوکر پیئے ہیں اس واقعہ کا شاہد خود ان کا یہ شعر ہے۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

مرزا صاحب کو اپنی درازقامتی پر ناز ہے لیکن بہنو اور دوستو! آپ سب جانتے ہیں کہ طویل قامتی کم عقلی کی دلیل ہے۔ مرزا صاحب کا رنگ کسی زمانہ میں چمپئی ہوگا لیکن اب تو سرمئی ہے۔ ننگے بھوکے ہونے کا تو وہ خود اعتراف کرتے ہیں اور اپنی عمری کے زمانہ میں لوگوں کو بھی بھوکے مارنے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں۔

بہرحال میں کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنا نہیں چاہتی میں نے

اپنا مقام مرزا صاحب کے مقابلے میں واضح کر دیا ہے اب آپ کا یہ اخلاقی فریضہ ہی نہیں بلکہ خود اپنی بہبود دی کی خاطر یہ کام ہے کہ مرزا صاحب کے مقابلے میں مجھے زیادہ ووٹ دیں اور اپنے حلقۂ رکنیت سے میرا انتخاب فرمائیں۔

مرزا غالب خاتون امیدوار سے بہت خائف تھے چنانچہ ان سے نہ رہا گیا اور جلسے کا رنگ ڈھنگ دیکھنے اور امیدوار کی تقریر سننے کے لئے خود بھی آن پہنچے لیکن گھر سے نکلتے نکلتے اتنی دیر ہو گئی تھی کہ جب انھوں نے جلسہ گاہ میں قدم رکھا تو خاتون امیدوار کی تقریر ختم ہو رہی تھی جونہی مرزا صاحب کی نظر اسٹیج پر پڑی انھوں نے دیکھا کہ امیدوار کوئی غیر نہیں خود ان کی محبوب وہ ڈومنی ہے جس پر وہ سو جان و دل سے فدا تھے۔ جیسے ہی امیدوار نے تقریر ختم کی مرزا صاحب مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج پر پہنچے اور ترنم کے ساتھ برجستہ یہ شعر فرمایا۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اس کے بعد مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ وہ خاتون امیدوار کے حق میں انتخابی مقابلے سے دست بردار ہوتے ہیں اور اپنا ٹکٹ واپس لیتے ہیں۔

آخر میں ہم نے اجمل سے کہا —— "تو یہ ہے میاں اجمل مرزا صاحب کے شعر کی تشریح —— اب یہ صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ تم خود کر لو اور ہمارا پیچھا چھوڑو ——"

ختم

پیار کی منزل

مس نسیمہ بیگم بھوکی بی اے

رات کسی بیوہ کے مقدر کی طرح ویران تھی ـــ دور کہیں بوڑھا گھڑیال دو بار کھانس کر خاموش ہو گیا ـــ!! سلمیٰ نے اپنی ریسٹ واچ دیکھی تو رات کے دو بج رہے تھے۔

وہ اپنے وارڈ میں گشت کے لئے اٹھی۔ اسپتال کا سارا ماحول اونگھ رہا تھا۔ زرد چاندنی سوئے ہوئے مریضوں کے چہروں پر اپنا ازلی نور بکھیر رہی تھی۔ فضا آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی کہ اچانک اسے کوئی گھبرایا ہوا ڈاکٹر کے کمرے میں جاتے نظر آیا۔ چلتے چلتے سلمیٰ ایک دم رک گئی اور دھندلی روشنی میں ڈاکٹر کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی ـــ خلافِ معمول یہ قصہ کیا؟ پھر غیر ارادی طور پر اس کے قدم ڈاکٹر کے کمرے کی جانب اٹھنے لگے وہ کمرے کی دیوار کے سائے میں کھڑی ہو کر سننے لگی۔ ڈاکٹر کا دوست شمیم کہہ رہا تھا۔

"وہ میرے چاقو کے پہلے وار سے ہی ڈھیر ہو گیا اب آپ مجھے کسی سابقہ تاریخ میں اسپتال میں داخل کر لیں تاکہ پھانسی کے پھندے سے بچ سکوں۔"

قتل اور پھانسی کا ذکر سن کر سلمیٰ کا دل یوں اس پتے کی طرح کانپنے لگا جو اپنی شاخ سے ٹوٹ کر کسی ٹہنی میں اٹک گیا ہو۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگی جیسے خود اس نے قتل کیا ہو ـــ جیسے وہ خود قاتل ہو۔ سلمیٰ کو وہیں کھڑے کھڑے پسینہ آ گیا۔ قتل .... پھانسی .....

اور سلمیٰ تقریباً بھاگ کر اپنے ڈیوٹی روم میں لوٹ آئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتے کرتے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔

دس منٹ بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو ڈاکٹر جمشید سلمیٰ کے قریب کھڑا غضب آلود نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ سلمیٰ گھبرا کر تعظیماً اٹھ کھڑی ہوئی اور کرسی چھوڑ دی ڈاکٹر جمشید نے شعلہ بار نگاہوں سے سلمیٰ کو گھورا اور کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگا۔

"تم سو رہی تھیں؟"

"جی نہیں جناب"، سلمیٰ کے لہجے میں لرزش تھی۔

"تو اور کیا ہو رہا تھا؟" ڈاکٹر جمشید نے معمول کے بالکل خلاف سلمیٰ کو دوسری کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

وہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی اور ایک لمحہ بھر کے لئے سوچ میں کھو گئی ـــ نہ جانے ڈاکٹر اسی بنا پر اسے معطل کر دے؟ آج رات کے دو بجے مریضوں کا معائنہ کیسے ہو رہا ہے؟ آخر ماجرا کیا ہے؟ "دیکھو سلمیٰ!" سلمیٰ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی ـــ "مجھے اس وقت ایک خالی بیڈ چاہیئے۔"

"جی بیڈ تو اس وقت کوئی بھی خالی نہیں۔"

"میں کہتا ہوں کہ اس وقت مجھے بیڈ چاہیئے ـــ" ڈاکٹر جمشید کی آواز نے اسپتال کے سارے ماحول کو جگا دیا اور مریضوں نے ڈر کے مارے سرخ کمبل اپنے اوپر اوڑھ لیئے۔

"لیکن جناب اس وقت ....."

"زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں نے کہہ دیا بیڈ خالی چاہیئے۔ اگر دس منٹ کے اندر اندر بیڈ خالی نہ ہوا تو میں تمہیں ملازمت سے برطرف کر دوں گا۔"

"لیکن جناب میں ...." سلمیٰ نے مجبوری بیان کرنا چاہی۔ "لیکن ویکن کچھ نہیں ......" یہ لو ایک ڈوز بیڈ نمبر ۱۳ کے مریض کو دے دو تاکہ بیڈ خالی ہو سکے۔"

"یہ کس طرح جناب ....."

"میں جو حکم دے رہا ہوں جاؤ ..... کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟ اس مریض نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے نہ دن کو آرام نہ رات کو چین۔" دوسرے ہی لمحے سلمیٰ بیڈ نمبر ۱۳ کے قریب

کھڑی تھی۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ سلمیٰ نے فنجان کو ڈول پر رکھا۔ مریض پورے پندرہ دن بعد صرف پل بھر پہلے سویا تھا۔ مدھم روشنی میں وہ ڈوز کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی کیا وہ ایسا کر سکے گی ——؟

—— کیا وہ اپنے دل کو زہر پلا سکے گی؟؟

کیا اس کے ہاتھ دل کو زہر پلاتے وقت لرز نہ اٹھیں گے ——؟

اس دل کو جس کو اس نے صرف ایک بار چاہا ہے، محبت کی ہے۔ کیا وہ اس شخص کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے، جس نے محبت کے افسردہ مرغزاروں میں زندگی کے پرکیف نغمے بکھیرے ہیں اور جس کے ساتھ اس نے ایک ایسی وادی میں قدم رکھا ہے جہاں زندگی خزاں کا گیت نہیں ہوتی بلکہ بہاروں کی مسکراہٹ ہوتی ہے، لہجے کی شیرینی ہوتی ہے۔ سلمیٰ نے اپنی زندگی ہار اور جیت سوچے بغیر ایک داؤ پر لگا دی تھی اب وہ پہلی منزل پر مات کھا رہی تھی اپنا سب کچھ اپنے ہاتھوں لٹا رہی تھی..... کل تک وہ مریض موت کا منتظر تھا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے موت کو بلانا چاہا تھا کہ ڈاکٹر یا نرس سے وہ ایسی دوا لے کر کھا لے جس سے وہ انگارے کی طرح پانی کے چند قطروں سے بھسم ہو جائے مگر وہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔

سلمیٰ کو اس مریض سے ہمدردی تھی وہ رات کے کئی کئی پہر اس کے بیڈ کے قریب بیٹھی رہتی۔ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود وہ اس مریض کو دیکھنے چلی آتی..... مگر جب اس مریض نے سلمیٰ سے زہر مانگا تو سلمیٰ نے پوچھ ہی لیا کہ تم موت کی آرزو کیوں کرتے ہو؟ جواب میں مریض نے اپنی ناکام زندگی کی ایک لمبی داستان کہہ سنائی جو سلمیٰ کی اپنی زندگی کی کہانی سے مطابقت رکھتی تھی۔

سلمیٰ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ محبت کے رشتے میں منتقل ہو گیا۔ سلمیٰ کے دل میں چاندنی رینگ آئی۔ آنکھوں میں سپنے جاگ اٹھے دل میں پیوست چاند کی کہانی دھڑکنے لگی خشک ہونٹوں پر کسی معطر شگوفے کو چومنے کا ارمان تڑپنے لگا سلمیٰ نے کوندے بکھرے لہجے میں کہہ دیا تھا۔

"دل صاحب! میری زندگی کا عکس تمہاری زندگی کے اندھیرے سے ملتا جلتا ہے ہم ایک ہی کہانی کے دو کردار ہیں۔ ہم دونوں مل کر زندگی کی روٹھی ہوئی بہاروں کو آواز دیں گے ہم ناساز حالات کا مقابلہ کریں گے میں تمہارے عزم میں وہ استحکام پیدا کر دوں گی کہ پیار کی منزل تمہارے سامنے سرنگوں ہو جائے تم مرنے کی آرزو نہ کرو۔ موت کی تمنا تو بزدل کیا کرتے ہیں میری محبت تمہارے ارادوں میں شعلے کی لپک پیدا کر دے گی میرا مرہم کیجل تمہارے زخموں پر پٹیوں کا کام دے گا میں تمہیں ہمیشہ مسکراہٹوں کے پھول دیا کروں گی گھبراؤ نہیں"

مگر اب وہ اپنی منزل سے دور ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی وہ ایک امتحان سے دوچار تھی کیا وہ دل کو زہر پلا سکتی ہے؟ کیا وہ اپنی محبت کا گلا خود دبا سکتی ہے؟ اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اپنے ارمانوں کے چمن کو اپنے ہاتھوں سے پھونک دے؟ نہیں وہ ایسا نہیں کرے گی ہرگز ایسا نہیں کرے گی!! وہ ڈاکٹر سے کہہ دے گی کہ بیڈ خالی نہیں ہو سکتا..... مگر فوراً چاند کی دھندلی روشنی میں اسے اس طرح محسوس ہوا جیسے ڈاکٹر اس کے قریب آ رہا ہو اور کہہ رہا ہو —— اگر دس منٹ کے اندر اندر بیڈ خالی نہ ہوا تو میں تمہیں ملازمت سے برطرف کر دوں گا"

وہ پھر سوچ کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

اگر ملازمت جاتی رہی تو اس کی بوڑھی اندھی ماں کا کیا بنے گا اس کی دو چھوٹی بہنوں بے بیا اور مشرت کا مستقبل تاریک ہو جائے گا جو پانچویں اور میٹرک میں پڑھ رہی ہیں اس کے علاوہ گھر میں کمانے والا کوئی نہیں نہ بھائی نہ باپ وہ خود ہی اپنی زندگی کے سفینے کو ساحل کے قریب لیے پھر رہی تھی یہ سب کچھ کیا ہوگا؟..... یہ سوچتے سوچتے اسے اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے اس کی چھوٹی بہنیں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بغلوں میں جھولیاں ڈالے سڑک پر ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگ رہی ہوں کوئی چاہنے والے انہیں ہوسناک نگاہوں سے گھور رہے ہوں اور پھر پھر انہیں دھتکار رہے ہوں..... اس کا لاشعور پکار اٹھا "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا——"

وہ اپنی بہنوں کو کبھی اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی —
مگر ایک بیٹی بھی تو فداکار ہوتی ہے ...... کیا وہ دل کڑا کر کے اپنے
ہاتھوں سے زہر پلا سکے گی؟ کیا وہ اپنے جیون ساتھی کو مار سکے گی
جس سے اس نے محبت کی ہے؟ زندگی دینے کا وعدہ کیا ہے...
وہ اپنے محبوب سے ہرگز ایسا نہ کر سکے گی ...... تو پھر ......
پھر اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس کا سر چکرا گیا وہ مرتے مرتے بچی۔ بہنوں کے
مستقبل کی تاریکی ...... اپنی زندگی کے ساتھی کا خاتمہ ....
والدین بوڑھی ماں کے خونیں آنسو ...... اس کی اپنی محبت
کا ڈوبتا چاند ...... زندگی یا موت ...... اس کے دماغ
میں ہزاروں طوفان سنسنانے لگے وہ اپنا سر پکڑ کر وہیں
ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

اچانک روشنی کا ایک تھرتھراتا ہوا دائرہ سلمیٰ کے
چہرے پر پڑا۔

ڈاکٹر جمشید ٹارچ کی روشنی میں دیکھ رہا تھا کہ سلمیٰ نے
وہ کام کر دیا ہے جو اس کے ذمے لگایا گیا تھا سلمیٰ ڈاکٹر
جمشید کو آتے دیکھ کر ایک دم اٹھی اور دوڑ کے کر ولی کی طرف
لپکی ڈاکٹر بالکل قریب آ چکا تھا۔

سلمیٰ نے ہاتھ دوا کی طرف بڑھایا ...... مگر فوراً رک
گئی اور اس نے کہا۔

"ڈاکٹر ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کام کسی قیمت
پر نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری دولت کی ضرورت نہیں۔ میں تن
پیٹ کے لئے کسی کا خون نہیں کر سکتی آپ خود ہی اپنے
دوست کی خاطر ایک بے گناہ کی جان لیں۔"

ڈاکٹر سلمیٰ کی باتیں سن کر تڑپ اٹھا اس نے دوا کا
چھوٹا گلاس اس کے ہاتھوں سے لے کر ولی کے چہرے سے کمبل
ہٹایا تاکہ اسے زہر پلا دے لیکن اسے ایسا کرنا نہیں پڑا ولی
پہلے ہی مر چکا تھا۔

سلمیٰ ڈاکٹر نے چیخ کر کہا — "یہ تو مر چکا ہے"
سلمیٰ کے دل پر ایک گھونسا سا لگا ایسے لگا کہ وہ
ولی پر گر پڑی۔

صبح اس بیڈ پر ڈاکٹر کا قاتل دوست لیٹا ہوا تھا۔

تبصرا

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مثنوی مولانا روم (دفتر سوم)

شائع کردہ سب رنگ کتاب گھر دہلی ۶ سائز ۱۸x۲۲/۸ صفحات ۴۵۶ کتابت و طباعت اعلیٰ اور معیاری دیگر دبیز کی مضبوط اور رنگین جلد کے ساتھ۔ قیمت بائیس روپیہ۔

مثنوی مولانا روم ان کتب میں شامل ہے جنھوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ یہ مثنوی فارسی میں ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی نے قابلیت کے ساتھ کیا ہے کہ اصل کا لطف دیتا ہے

مثنوی ہذا کے دفتر اول و دوم اسی شان سے پہلے شائع ہو چکے ہیں اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پند و نصائح و معلومات سے پر یہ مثنوی اس قابل ہے کہ ہر گھر میں رہے۔ فارسی تعلیم عام نہ ہونے سے اس مثنوی کو لوگ بھولتے جا رہے تھے لیکن اردو ترجمہ کے ساتھ اس کی اشاعت نے اسے حیات نو بخش دی ہے جس کے لئے قاضی صاحب موصوف اور سب رنگ کتاب گھر کا ہمیں شکرگذار ہونا چاہیئے۔

دشت تمنا

نہید تحسین صاحبہ کی منظومات اور غزلیات کا مجموعہ ناشر۔ محفل خواتین۔ صفحات ۱۳۰ سائز ۲۰x۳۰/۱۶ قیمت مجلد صرف تین روپیہ

حمد کے بعد "زندگی جہد مسلسل ہی تو ہے" نظر آئی جو ترقی پسند شاعری کا نمونہ ہے۔ ردیف و قافیہ اور موزونیت وغیرہ سے آزاد طبیعت مکدر ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد دیکھا تو تمام منظومات اور غزلیات اردو شاعری کے قواعد و ضوابط کے تحت کہی گئی ہیں۔ پورے مجموعہ کلام میں اور کوئی نظم یا غزل ترقی پسندی کی حامل نہیں نہ جانے کیوں ابتدا ہی میں تحسین صاحبہ نے اس کلام کو کیوں شائع کر دیا جسے میں شاعری سمجھتا ہی نہیں اس کے علاوہ تمام نظمیں اور غزلیں پڑھنے والوں کو متاثر کرنے والی ہیں۔

چشم خوں بستہ (مجموعہ کلام ثریا رحمٰن)

سائز ۱۸x۲۲/۸ صفحات ۲۲۴ کتابت طباعت اور جلد اعلیٰ قیمت تیس روپیہ۔ کتاب کو جمی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی متعدد رنگین اور سادہ تصاویر سے اور زیادہ حسین و دلکش بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ نئے ستارے ۲۷ ریوٹ روڈ لکھنؤ۔

اردو میں کمتر ہی کتابیں آج کل اچھی کتابت کے ساتھ شائع ہوتی ہیں لیکن یہ کتاب لکھنؤ کے ایک مایہ ناز کاتب عشرت نے لکھی ہے اس لئے وہ اچھی چھپی بھی ہے کاغذ بھی عمدہ اور دبیز استعمال کیا گیا ہے۔

ثریا صاحبہ کا نام عرصہ سے سنتا رہا ہوں لیکن ان کا کلام پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اب اس مجموعہ کلام سے یہ کمی بھی دور ہو گئی۔

کتاب کی اشاعت کے لئے حکومت نے بقول صاحب کلام ایک گرانقدر عطیہ بھی دیا ہے اس کے باوجود تیس روپیہ قیمت رکھتے وقت بہن ثریا صاحبہ نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ ہندوستانی صرف مشاعروں ہی میں واہ واہ کرتے ہیں کسی کا کلام خرید کر رکھنے کی ہمت شاذ ہی کر پاتے ہیں اسلئے اگر قیمت کم ہوتی تو بہتر ہوتا۔

بقول فراق صاحب ثریا صاحبہ کے کلام میں جذبات کی پاکیزگی، سچائی اور شرافت ہے ان کا کلام سستے پن کے عیب سے اپنے کو بچا لیگیا ہے۔

ایسا کلام جو ان محاسن کا حامل ہو اگر فنی اعتبار سے کسی طرح کی کمی رکھتا ہو تو میں اسے قابل تحسین سمجھتا ہوں۔

مریض۔ تو پھر دوا کی رقم بھی اسی کو دے دوں گا۔

• شوہر بڑے زور شور سے اپنے اعلیٰ نسب ہونے کا دعویٰ کر رہے تھے اور اپنے آبا و اجداد کا سلسلۂ نسب دور تک ملا رہے تھے۔ بیوی نے تنگ آکر کہا۔ بس رہنے بھی دو اب تم کہو گے کہ تمہارے دادا حضرت نوح کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار تھے۔

شوہر نے کہا۔ واہ۔ واہ۔ حضرت نوح کی کشتی میں کیوں سوار ہوتے، ان کے پاس خود کی کشتیاں تھیں۔

مرسلہ۔ شاہنواز (ہوڑہ)

• بیگم گلے کی خرابی سے مسلسل کھانسے جا رہی تھیں تو شوہر نے از راہ ہمدردی کہا۔ آج میں تمہارے گلے کے لیے ضرور کچھ لاؤں گا۔ بیوی نے کھانستے ہوئے کہا: مگر وہی جڑاؤ نکلس لایئے گا جسے کئی بار آپ کے ساتھ جا کر سہاگ چند رکھب داس کے یہاں دیکھ چکی ہوں۔

• ایک آدمی نے ایک خالی کاغذ کو ایک لفافے میں بند کیا اور اس پر پتہ لکھ دیا۔ اس کا دوست یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟ خالی کاغذ کو لفافے میں ڈالنے سے فائدہ؟

جواب ملا: "آج کل بیوی سے میری بول چال بند ہے"۔

• ساس (داماد سے) جہیز تو ایک فالتو چیز ہے میں سب سے قیمتی چیز تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔

داماد۔ اچھا تو قیمتی چیز اپنے پاس رکھیں اور فالتو چیز ہمیں دے دیجئے۔

• مریض (ڈاکٹر سے) میں آپ کا کس منہ بلند سے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے میری جان بچائی۔

ڈاکٹر۔ ہم جان بچانے والا کون ہوتے۔ جان تو خدا نے بچائی ہے۔

• شوہر تمام رات باہر رہا صبح گھر آیا تو بیوی کو بڑا تاؤ آیا۔ آپ اس وقت بھی کیوں آئے؟ بیوی نے بپھر کر پوچھا۔

میاں بولے، بیگم ناشتہ کرنے۔

• ایک دوست دوسرے دوست سے، بھئی مجھے تنگ نہ کرو میرا موڈ آن ہے۔

دوست:۔ یار کبھی آن ہوتے ہو کبھی آن۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمہارا فیوز ہی نہ اڑ جائے۔

• ایک یہودی تاجر (دوسرے تاجر دوست سے) جب ایک دکاندار ایک ایسی چیز کو جس کی گاہک کو ضرورت ہو فروخت کر دینے میں کامیاب ہو جائے تو یہ کارکردگی تجارت کی قابلیت کہی جائے گی۔ لیکن جب کوئی دکاندار کوئی ایسی چیز جس کی گاہک کو ضرورت نہ ہو اس کے ہاتھ فروخت کر دے تو اسے تجارتی کمال کہا جائے گا۔

ساتھی تاجر نے تذبذب کے لہجے میں کہا، میں تمہاری آخری بات نہیں سمجھا مثلاً؟

یہودی تاجر نے جواب دیا، مثلاً یہ کہ قطب شمالی قطب جنوبی جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ اگر کوئی تاجر وہاں کے باشندوں کے ذہنوں میں ریفریجریٹر کی اہمیت اور ضرورت بٹھا کر فروخت کر دے تو یہ اس کا تجارتی کمال ہوگا۔

ایک ریاضی داں سڑک کو پار کر رہا تھا کہ ایک تیز رفتار کار سے ٹکرا گیا اور فٹ پاتھ پر گر گیا۔ لنگڑاتے ہوئے پولیس کے پاس گیا اور شکایت کی۔ پولیس نے پوچھا کیا آپ کار کا نمبر نوٹ کر سکے؟

نہیں جناب کار اس قدر تیز تھی کہ میں نمبر نوٹ نہ کر سکا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ اگر اسے دو حصوں میں تقسیم کریں اور حاصل کو اصل سے ضرب دیں تو حاصل ضرب ۴۸ ہوگا۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع ہو سکتی ہے جو ولادت و شادی اور انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر الفاظ میں روانہ کی جائے۔ خبر پر نمبر خریداری ضرور لکھا جائے۔ اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی روانہ کرنا ضروری ہے۔ خبر دفتر تک نہ پہونچے تو دفتر ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ خبر کی اشاعت میں نام و مقام کی کوئی غلطی ہو جائے تو فوراً اطلاع دیں اس کی تردید شائع کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

ولادتِ اطفال

● نیر سلطانہ نیطر (لندن) "میری پیاری باجی گل رعنا خان کے گلشن حیات میں پہلی بار ۲۵ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۷۷ء یوم جمعرات، بوقت آٹھ بجے شب اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سی بچی عطا فرمائی۔ نام ظفرین قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

● رفعت صفی (مظفر پور) "میری خالہ زاد بہن عفت زماں اور ڈاکٹر فصیح الزماں (ایم۔بی۔ایس) کو اللہ پاک نے ۴ اپریل ۱۹۷۷ء بروز سوموار بوقت پونے بارہ بجے دن ایک فرزند عطا کیا۔ نام شرجیل رکھا گیا۔ خدا اسے عمر نوح عطا کرے اور خاندان کا نام روشن کرنے والا بنائے۔

● نعیم اشرف رسیل بلی۔ارے بلی) "میرے تایا میرے بھائی منظو بھیا اور بھابی ساجدہ کے گلشن حیات میں پہلی بار اللہ تعالیٰ نے ۳ اپریل ۱۹۷۷ء بروز اتوار بوقت صبح ۷ بجے ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ نام مبشر حسن قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور بلند اقبال ہو۔

● شبنم نسیم رضوان اللہ (بھوروا) میری بڑی نند حسن آرا اور نندوئی صدر عالم صاحب کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۱۴ مارچ ۱۹۷۷ء بروز سوموار بوقت ۵ بجے شام بمقام پورنیہ ایک کلی کھلائی۔ دعا ہے کہ اس کلی سے آپا جان کا چمن مہکتا رہے اور وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● صالحہ خاتون (بہار شریف) "ہمارے بڑے نوشے بھائی ڈاکٹر قمر الزماں اور بڑی آپا عشرت فاطمہ کے گلشن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو ایک اور پیاری کلی کھلائی۔ نام نزہت فاطمہ عرف لالی رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

● فریدہ رحمٰن نیازی "میری پیاری باجی حسن بانو اور بھائی تہذیب الرحمٰن صاحب کے گلزار حیات میں سات سال کی طویل مدت کے بعد [illegible] مارچ ۱۹۷۷ء بروز جمعہ بوقت صبح سات بجے اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ایک ننھا سا پھول کھلایا۔ اللہ پاک ہمارے ننھے بھانجے کو عمر دراز عطا فرمائے اور وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● ۹۰۲۷ خبر بلا ٹکٹ ملی شائع نہ ہو سکی۔ دوبارہ خبر مع ٹکٹ روانہ کریں۔

پیغاماتِ نشاط

● گل رعنا خان (لندن) "میری چھوٹی بہن نیر سلطانہ نیطر کی شادی محمد اکبر میاں کے ساتھ ۳ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء یوم جمعرات بخیر و خوبی انجام پائی۔ خداوند عالم سے دعا ہے کہ دونوں کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

● عزیزی شہناز فاطمہ سلمہا (دختر سجاد حسین صاحب) گیسٹ ملک گیتی لکھنؤ کی شادی عزیزی ریاض احمد سلمہ (فرزند جناب علی حسن ساکن منور پور اعظم گڑھ) کے ساتھ یکم مئی ۱۹۷۷ء کی شب میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور شہناز ریاض ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ (نسیم انہولوی)

● فردوس نواب (آگرہ) "میری پیاری بہن کوثر نواب کی شادی میرے پھوپھی زاد بھائی جمیل اختر (فرزند جناب عبد الحق شاہدرہ والے) کے ساتھ ۲۰ مارچ ۱۹۷۷ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام

پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری بہن اور بہنوئی کی ازدواجی زندگی ہمیشہ پُربہار رہے۔

● اسما فاروقی مائم فاروقی (جھجھانہ) ہماری پیاری باجی (دختر الیاس احمد فاروقی) سیما فاروقی کی شادی اختر عزیز کاظمی (فرزند تقیین احمد کاظمی۔ کراچی) کے ساتھ ۲۲ فروری ۱۹۸۸ء بروز بدھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک ہماری باجی اور بھائی صاحب کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

● مس انجم فرید (آگرہ) میری پیاری بجیا فردوس شاہین (بی ۔اے) کی شادی نسبت علی صاحب (ایم۔اے) ڈپٹی ڈائرکٹر نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ساتھ ۱۳ مارچ ۱۹۸۸ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ رب العزت دونوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

انتقالِ پُر ملال کی خبریں

● عزیزی تسیم اشرفی سلمٰی کی خوشدامن اور عزیزی سلمٰی کی والدہ (زوجہ شمس الحسن زیدی عزت جان صاحب) ۷ مارچ ۱۹۸۸ء کو ایک مختصر علالت کے بعد بمقام لکھیم پور کھیری انتقال فرمائیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو غریق رحمت کرے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(نسیم انہونوی)

● اظہر نگرامی صاحب (مالک کتابی دنیا لکھنؤ) کی نہایت چہیتی بیٹی شاہین ۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء کی صبح ایک معمولی علالت کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ شاہین کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ ایسی پیاری بچی کے انتقال پر اپنے تو اپنے تڑپ رہے تھے، غیروں کی آنکھیں بھی پُر آب تھیں۔ اللہ پاک اظہر صاحب اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

● بہن نسیمہ فرحت صاحبہ کے والد جناب ڈاکٹر خلیل الرحمن صاحب ریٹائرڈ افسر بلدیہ بنگلہ بعارضہ کینسر گذشتہ ماہ لکھنؤ میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم ایک بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ وضعداری میں ان کا مثل مشکل ہی سے ملے گا۔ اللہ پاک انہیں بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

● محترمہ سلمٰی کے چھوٹے بھائی نسیم جعفری (لکھنؤ) کے بڑے بھائی ابراہیم علی جعفری ۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء بمقام کانپور بعارضہ کینسر انتقال فرما گئے۔ اللہ پاک انہیں بخشے اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(نسیم انہونوی)

● محمد کمال احمد صاحب کے والد جناب عزیز احمد صاحب رئیس محمد آباد، اعظم گڑھ بندگی میاں ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ء بوقت ۷ بجے شب انتقال فرما گئے۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

● فریدہ واجد (ہلسور) میری عزیز اور اکلوتی خالہ جان صرف چند ماہ کی جان لیوا علالت سے ۱۹ جنوری ۱۹۸۸ء اس دارفانی سے رحلت فرما گئیں۔ اللہ پاک انہیں جنت میں جگہ دے اور خصوصیت سے امی جان اور خالو صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم بڑے ملنسار، مہمان نواز اور خلیق انسان تھے۔

● مس فضیلت بہار (دربھنگہ) بڑے رنج و کرب کے ساتھ لکھتی ہوں کہ میری بڑی باجی عارفہ خاتون عرف گلنارہ بی صرف ۳۲ سال کی عمر میں اچانک ہم سب بہنوں اور ماں باپ کو تڑپتا چھوڑ کر ۷ فروری ۱۹۸۸ء بروز جمعرات اپنے معبود حقیقی سے جا ملیں۔ مرحومہ نیک سیرت ملنسار، غربا پرور اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل دے۔

● مہ ناز اختر (مرادآباد) افسوس صد افسوس میری شفیق ٹیچر نجمہ سلطانہ صاحبہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۸ء کو اس دارفانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ نے اپنی نشانی دو سال کا لڑکا اور چار ماہ کی ایک بچی چھوڑی ہے۔ اللہ پاک انہیں پروان چڑھائے۔ مرحومہ کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے اور خود مرحومہ کو غریق رحمت کرے۔

● نشاط حیدری دیادی (دیاؤ) افسوس صد افسوس دسمبر ۱۹۸۷ء کی ایک منحوس شب، میرے والد محترم پر دل کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ ہم سب کو روتا تڑپتا چھوڑ کر راہیٔ عدم ہو گئے۔ مرحوم کی عمر ابھی ایسی نہ تھی کہ ہم سے جدا ہو جاتے۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● افشاں تبسم (پٹنہ) افسوس صد افسوس کہ میرے محترم دادا سید مرتضیٰ حسین ۲۲ مارچ ۱۹۸۸ء بروز منگل بوقت ۹ بجے شب ۸۰ سال کی عمر میں دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور

(بقیہ حریم حرم صفحہ ۴۲ پر)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں اور پاکیزہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری بھی لکھا گیا ہو۔ جون کے لئے عنوان "درد" ہے اور جولائی کے لئے "انجام" ——— (ادارہ)

تن زیر خاک چھپ گیا، جان خلد کو گئی
بحر فنا میں ڈوب کے ہم پار ہو گئے

مرسلہ۔ قمر فاطمہ نیازی (آگرہ)

خاک ہو گا ان طبیبوں سے علاج درد دل
بستر غم پر مجھے بیمار رہنے دیجئے

مرسلہ۔ فردوس بنت بی۔اے (آگرہ)

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مرسلہ۔ انیس قادر (مدراس)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مرسلہ۔ رفیعہ یاسمین (بیلا سیتا بڑھی)

اپنے دم کو آدمی ہر دم غنیمت جان
خاک کا پھر ڈھیر ہے، بعد فنا کچھ بھی نہیں

مرسلہ۔ مکرم النساء [illegible] (جرول)

یہ آدمی کی ہوس، اس کا منہ خدا کی پناہ
سوائے خاک لحد، اس کو کوئی بھر نہ سکا

مرسلہ۔ سعیدہ احمد و نجیب اللہ خاں (ہنسور)

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

مرسلہ۔ فاطمہ زہرہ (بہار شریف)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مرسلہ۔ زینب [illegible]

خاک میں ملتے ہوئے برگ خزاں سے پوچھئے
کون اسکو شاخ سے اونچی فضا تک لے گیا

مرسلہ۔ ایس۔ ایس بیگم (امروہہ)

کیا خاک اڑانے کو چلیں آہ چمن میں
نے یار، نہ ساقی، نہ صراحی، نہ پیالہ

مرسلہ۔ لاڈلی شمع (پٹنہ)

پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لئے
اے چشم اشکبار، یہ کیا مجھکو ہو گیا

مرسلہ:۔ فریدہ واحد (ہنسور)

خون سے اس کے آج بھی گلرنگ ہے خاک وطن
فخر عالم، نازش ہندوستاں پیدا ہوا

مرسلہ:۔ مہر افروز (تلکنیاں)

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

مرسلہ:۔ قمر نگار جلیلی (آمبور)

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مرسلہ:۔ شہناز پروین (کانپور) طلعت ناہید۔ بدر النساء۔ امراوتی

وہ خاک دیں گے زمانے کو درس عشق جلیس
جو اپنے دل سے کدورت کو بھی مٹا نہ سکے

مرسلہ:۔ جلیس شمسی (آگرہ)

بچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ
خاک و خون میں مل رہا ہو گرچہ سلطان عرب کا

مرسلہ:۔ کے نیلو فر خوشتر (آمبور)

کیا کیا کدورتیں ہیں، اس داغ درد دل کی
آتی ہے خاک لینے آندھی اسی چمن میں

مرسلہ:۔ مس عظمت ترنم (آمبور)

یہ تو سمجھا کہ مجھے خاک میں ملا دے گا
مگر بتا کہ وہ کس جرم کی سزا دے گا

مرسلہ:۔ نسیم آرا بیگم (مبارکپور)

پھول سا جسم نہ تھا خاک میں ملنے کے لئے
جانے کس دل سے اذیت یہ گوارا کی ہو گی

مرسلہ۔ [illegible] (آمبور)

تجھ سے بیں ہوں سراپا گناہ وخطا
کاش مجھکو بھی حاصل ہو خاک شفا

مرسلہ :- فردوس اطہر (کسرول - مرادآباد)

خاک اس کے لیے گرچہ بنایا تھا ہمیں
کاش خاکِ درِ جاناں نہ بنایا ہوتا

مرسلہ :- پروین صدیقی وریحانہ (ورلڈ سین)

پیکر کی صورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

مرسلہ : مس ملکہ بانو (ہاسن)

جس بے وفا نے ہم کو تہہ خاک کل کیا
روتا وہی ہے آج لپٹ کر مزار سے

مرسلہ :- مس بدر شاہین شمسی (آگرہ)

میری خطا فریب تھی میری وفا پہ خاک ڈال
تجھ سا ہی بے وفا کوئی تجھکو خدا کرے ملے

مرسلہ :- مس نوری (میسور)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مرسلہ :- صوفیہ مظفر - جمشید پور

خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

مرسلہ :- آفتاب سفیر (چن پٹن)

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

مرسلہ :- مس فرزانہ انوری (باندہ کسی پور)

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

مرسلہ :- زاہدہ انور (الہ آباد)

خاک غمناک کہتی ہے اس کی
عشق نے رو کے جان گنوائی ہے

مرسلہ : فاطمہ زیدی (بہار شریف)

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

مرسلہ :- حنا سلطانہ (چھپرہ)

منزل بھی مل ہی جائے گی اے گردِ کارواں
بیٹھا ہوں رہ گذر پہ بنا خاکِ پا سے

مرسلہ :- مس نسیمہ بیگم بھولی (بھاگلپور)

آشیاں جل کے خاک ہو چکا کب کا
آج تک یہ عالم ہے روشنی سے ڈرتے ہیں

مرسلہ :- بی بی صفورہ حسن (بھٹکل)

اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش
جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھکو

مرسلہ :- تبسم سلطانہ چھپرا

میں خاک ہو بھی گیا گر تری خوشی کے لیے
یہ کم نہیں ہے محبت کی زندگی کے لیے

مرسلہ :- عابدہ نسرین ساری (کانپور)

مٹی نہ اپنے ہاتھ سے میت کو دو مری
سب یہ کہیں گے خاک میں تم نے ملا دیا

مرسلہ :- عقیلہ ہارون بالوجی (مرودڈ - بیجرہ)

چند اشعار بلا نمبر خریداری آئے تھے ۔ چند ناموزوں اور غلط تھے ۔ اس لئے شائع نہ ہو سکے ۔ ۲۰ تاریخ تک وصول ہونے والے اشعار ہی شامل ہو پائے ہیں ۔

بقیہ بزم حریم صفحہ ۳۰ کا

ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے ۔

● مہرالنساء (کولار) بے حد رنج و افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے شوہر ایس عبدالرزاق (پی - ڈبلو - ڈی کانٹریکٹ) ۲۷ اپریل ۱۹۸۰ء بروز اتوار رحلت فرما کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے ۔ مرحوم بلند اخلاق اور باہمت شخصیت کے مالک تھے ۔ اللہ پاک انہیں غریقِ رحمت کرے اور مجھے و میرے بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔ (بہن اس خبر سے دلی صدمہ پہونچا ۔ میں آپ کا شریکِ غم ہوں ۔ نسیم انہونوی ۔)

جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا لفافہ ضرور روانہ کریں ۔

پلنگ پر لٹا کر کمبل اڑھا دیا۔

گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے خالہ اماں۔" اس نے شمسہ بیگم کو ہراساں دیکھ کر تسلی دی" بس دو دوا انجکشن لے لیں۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔!

وہ مطمئن ہو کر اپنا سینا پرونے بیٹھیں۔ ترنم تابش کے پاس جم گئیں۔

میں ایک الجھن لے کر آپ کے پاس آئی تھی" اس نے کشمکش کے عالم میں کہا۔

آپ یہ طوطا پال کے بیٹھ گئے۔

طوطا دو ایک روز میں اڑ جائے گا۔ تم اپنی الجھن بیان کرو۔ زہے قسمت۔ میں بھی تمہاری الجھن کو دور کرنے کی سکت رکھتا ہوں!" تابش نے تو اسے بیوقوف بنانے کے لیے کہا تھا مگر ترنم کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر کہیں... کھنکتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔

کیا بات ہے۔ تم رو کیوں رہی ہو؟" اس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اوپر اٹھایا اور معاً دو آبی شفاف لکیریں ترنم کے رخساروں پر بہہ نکلیں۔

کچھ کہہ دیا ہے خالہ امی نے۔ بولو۔ ترنم۔ کیا ہوا۔"

اس نے اس کی کلائی پر پیشانی جھکا دی اور سسکیاں لینے لگی!

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے۔ خدا کا واسطہ تمہیں۔ کہہ دو۔ مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو کیا تم میری وجہ سے رونے لگیں۔ ترنم میں اچھا... ہو جاؤں گا۔ مجھے ہوا کیا ہے؟"

اس نے سر اٹھایا اور آنچل سے آنسو پونچھ کر الگ کرسی پر جا بیٹھی۔

"تابش؟" اس نے ہچکیوں میں کہا۔

ہوں" وہ بے چین نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ (باقی آئندہ)

اس میں دیر کتنی ہے۔" ترنم نے بدستور شرماتے ہوئے لہجے میں کہا" کچھ دن اور سہی!۔

ترشح جب باقاعدہ بارش میں تبدیل ہو گیا تب دونوں اٹھ گئے۔

گیٹ پر رخصتی مصافحہ کے لیے تابش نے ہاتھ بڑھایا۔ اور مسکرا کر بولا۔

کاش چلی جاؤ۔ میں گھر واپس جاؤں گا کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم ساتھ ساتھ آ رہے ہیں"

اچھا" ترنم سادگی سے بولی پھر چونک پڑی" کیا بات ہے۔ آپ کی ہتھیلی کیوں گرم ہو رہی ہے"

کچھ بھی تو نہیں... فکر نہ کرو۔ شاید جاگنے یا تکان کا اثر ہے۔ سر میں بھی درد ہے" پھر وہ اس سے رخصت ہو کر چلی گئی۔ اور تاکید کرتی گئی کہ وہ اپنا خیال رکھے۔

جب تابش گھر پہونچا تو باوجود کئی من کی فکروں کے بوجھ کے خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے گھر میں پتہ نہیں کون کون عزیز موجود تھے۔ ڈرائنگ روم میں خلاف توقع منظم صاحب اور خرم بھی ملے۔

واہ برخوردار۔ محلہ میں موت ہوئی اور تم باہر پھر رہے تھے" منظم صاحب کا لہجہ بڑا ترش تھا۔ اچھا ہی ہوا۔ بڑے میاں گزر گئے۔ ان کی بھلا کیا خدمت ہو رہی تھی۔!" خرم نے لقمہ دیا۔

تم تو نہیں کر رہے تھے ان کی خدمت۔" تابش نے جھنا کر کہا اور قدم بڑھا کر باہر کے برآمدے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی طبیعت پھر بے کیف ہو گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے ترنم کا لفافہ جیب سے نکالا۔ سو سو کے آٹھ عدد نوٹ تکیہ پر گر پڑے۔

آخر وہ کس طرح اپنے قلبی جذبات کا اظہار کرتی؟۔ تابش کے ذہن میں رنگین لہرے جال بننے لگے۔ کیا وہ واقعی اس کی ہو سکے گی!! کوئی شاید کوئی خرم اس

کی راہ نہیں کاٹے گا؟!۔

اس نے لفافہ الماری میں محفوظ کر دیا اور بستر پر آلیٹا۔ جسم کا بند بند دکھ رہا تھا۔ بھیگے لباس پر اس نے کمبل اوڑھ لیا اور سوچتے ہی سوچتے بے خبر سو گیا!

دوسرے دن ہاجرہ تھکی ہاری اپنے گھر واپس آئیں۔ غسل کر کے کپڑے بدلے اور دھوپ کے رخ پر بیٹھ کر ملازمہ سے چائے منگوائی۔ ترنم پھول کی طرح کھلی ہوئی ان کے سامنے تھی۔ چوڑی دار پاجامہ اور ڈھیلا ڈھالا کھلا دار کرتہ پہنے۔ گلے میں سبز رنگ کی خوشنما سبک اوڑھنی لپٹی تھی۔ بال کندھوں پر بکھرے تھے۔ سیاہ بالوں کے پس منظر میں اس کا سفید رو گلابی چہرہ بڑا بھولا بھالا اور دلفریب لگ رہا تھا۔

اللہ جانے۔ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ نجانے کیوں ہاجرہ بیگم کے دل میں خیال آ گیا پھر وہ بری طرح کانپ اٹھیں۔ خدا میری اکلوتی بچی کی تقدیر چمکا دے۔ کیا مہمل باتیں سوچنے لگی ہوں۔ انھوں نے اسے پاس بلایا اور خواہ مخواہ سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔

میں تو کسی تندرے کے ساتھ اپنی نازوں کی پالی کی قسمت نہیں پھوڑوں گی۔ جہاں تک پڑھنا چاہو بیٹی۔ پڑھو کسی کے کہنے سننے سے اپنے دل پر بوجھ نہ لینا۔"

ترنم چونکی "کیا بات ہے ممی۔ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

کسے پتہ، کب کوئی کچھ کہہ دے۔" ہاجرہ بیگم بڑی بددل ہو رہی تھیں۔ مختلف خیالات ان کے ذہن میں آ رہے تھے۔ تین شبانہ روز مسلسل انھوں نے شمسہ بیگم کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ تو باپ کے غم میں الگ بیٹھی رو رہی تھیں انھوں نے اپنے گھر کی طرح ان کے عزیزوں کو سنبھالا تھا۔ کھانا پکا کر بھجوایا تھا۔ ان کے شوہر نے میت کی آخری رسوم اپنے صرفہ سے انجام دی تھیں۔ مگر۔

کیا بات ہے۔ بیٹی" شمسہ بیگم چائے کی کشتی لیے کھڑی تھیں "تابش گھبرا گیا۔ ترنم محجوب ہوگئی۔ جلدی سے کھڑے ہو کر اس نے ٹرے لی اور اپنی خالی کرسی پر رکھ دی۔

خالہ اماں۔ آپ سے انھوں نے کہا نہیں ہے" وہ تابش کی گرم نگاہوں کی پروا کیے بغیر بولی "انھیں کئی روز سے بخار ہے۔ دوا علاج انھوں نے کیا نہیں اور مسلسل کھانس رہے ہیں!"

ارے امی کچھ بھی نہیں" تابش نے ہاتھ ہلا کر اس کی بات کاٹ دی"... بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں خوامخواہ مسلسل میں دھوپ میں بیٹھا رہا ہوں جسم گرم ہو گیا ہے۔ بس!"

مگر اتنے میں شمسہ بیگم نے اسے اوپر سے نیچے تک ٹٹول کر رکھ دیا تھا۔ تشویش سے بولیں "بات کا بتنگڑ نہیں بیٹا تمھیں اچھا خاصہ بخار ہے۔ ابھی جاؤ کسی ڈاکٹر کے پاس۔ دوا لاؤ"

چلیے میں بھی چلوں!" ترنم مستعدی سے بولی۔

جی ہاں۔ ڈاکٹر کو بھی بھڑکانا ہے شاید" تابش برا سا منہ بنا کر بولا۔

ہاں ڈاکٹر تو کھسیا رہا ہوگا۔ اسے کچھ آتا جاتا نہیں۔ میرے بھڑکانے سے بھڑک جائے گا" ترنم جھگڑنے میں کیوں پیچھے رہتی!۔

امی آج تک ایسی لڑاکا لڑکی میں نے نہیں دیکھی" تابش نے کہا۔

میرے علاوہ اور کتنی لڑکیاں آپ دیکھ چکے ہیں!" اس نے ترکی بہ ترکی پوچھا۔ شمسہ بیگم ہنس دیں۔ تابش گڑبڑا گیا۔

بہرحال ترنم نہ ماننا تھی نہ مانی۔ زبردستی اسے اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے کے چلی گئی۔ اسے انجکشن دلوایا۔ دوا لائی اور گھر واپس آنے کے بعد اسے

اچھا بیٹی "

وہ تابش کی طرف مڑکر مسکرائی " آپ سے زیادہ خالہ اماں میرا کہا مانتی ہیں۔
سعادت مندی ہے ان کی ! " تابش نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ ترنم ہنس
پڑی ۔ اس دن بخار آرہا تھا ۔ اب کیسے ہیں ! " اس نے پوچھا ۔
کون ؟ " جان بوجھ کر تابش نے سوال کیا ۔
ابھی آپ خود ۔ اور کون ؟ " حسب توقع وہ جھنجھلا گئی ۔
دیکھ لو ۔ کیسا ہوں " تابش نے کہا اور اپنی ہتھیلی اس کے ہاتھ پر رکھ دی
ترنم سراسیمہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی ۔
آگ کی طرح جل رہا ہے ۔ آپ کسی کا علاج نہیں کرا رہے ہیں ۔ ؟ "
آہستہ بولو ۔ امی سن لیں گی تو پھر گھبرا جائیں گی ۔ میں نے انھیں مطمئن کر
دیا ہے "
کب سے آرہا ہے بخار ۔
گھبراؤ نہیں ۔ چلا جائے گا ! "
چلیے میرے ساتھ ۔ ڈاکٹر سے کہہ کر دوا انجکشن لے آئیں ۔
تم بیٹھو ۔ باتیں کرتی رہو ۔ بخار خود بخود چلا جائے گا ! ۔
اور ایسے میں آپ گوشت کھائیں گے !؟ ۔
کیا حرج ہے "
خالہ اماں چاہے گھبرائیں چاہے کچھ ہو ۔ میں تو ان سے کہوں گی ۔ اگر بڑھ
گیا تو کیا ہوگا "
مرجاؤں گا ! "
یا اللہ " بے ساختہ اس نے تابش کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔

اور یہاں سے آگے سوچتے ہوئے ان کا قلب الٹتا تھا ۔ وہ ہمیشہ شمسہ بیگم کی
صورت و سیرت کی مداح رہی تھیں ۔ سامنے پیچھے ان کے گُن گایا کی تھیں لیکن
اتنا سب کرنے کے باوجود شمسہ نے ان کے حسن سلوک کی اس قدر پذیرائی نہیں
کی تھی ۔ جتنی انھیں امید تھی ۔ حتیٰ کہ جب ہاجرہ واپس آنے لگیں تب وہ انھیں
رخصت کرنے دروازے تک بھی نہیں آئیں ! جس کا انھیں گہرا ملال تھا ! ۔
ملازمہ چائے لائی ۔ حسن اتفاق کہ اسی وقت فرحت اور خرم بھی آگئے ۔
تم بھی کہو گی ۔ یہیں چائے کھانے کے وقت ٹپکتی ہوں " فرحت ہنستی ہوئی بولیں
ہاجرہ بیگم چپ چپ سی تھیں " کیا کہوں ۔ دنیا کے رنگ " وہ پھر خاموش
ہو گئیں ۔
فرحت نے چائے بنائی ۔ خرم کو پیالی تھمائی ۔ ہاجرہ کو پیش کی اور خود کپ
سنبھال کر ہمہ تن گوش متوجہ ہو گئیں ۔ ہاجرہ بیگم کا دل صحیح معنوں میں شق ہوا جا
رہا تھا ۔ انھوں نے زندگی میں پہلی حماقت کی کہ دل کا سارا غبار فرحت کے سامنے
نکال پھینکا ! ۔
فرحت جہاں کو ایسا موقع خدا دے ۔ جھٹ سے شروع ہو گئیں " میں تو پہلے
ہی کہہ رہی تھیں کہ شمسہ بیگم اوپر کچھ اور ہیں اندر کچھ اور ۔ پیشانی دیکھ کر میں صورت
سیرت بھانپ لیتی ہوں ۔ خدا کا قہر ہے کہ انھوں نے تمھاری محنت اور محبت کی
کچھ بھی قدر نہیں کی ۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ کیسی احسان فراموش عورت ہیں ۔ تم کیوں
ان کے پیچھے جان دیے دیتی تھیں ۔ بلا سے وہ اپنے حالوں مریں کہ جیتیں ۔ ! "
ساجد صاحب نے اپنے ضروری کام پیچھے ڈال کر ان کے باپ کی ساری رسمیں
کیں " ہاجرہ بیگم آنسو پونچھتی ہوئی بولیں ۔ آخر انھیں فرحت سے زیادہ کوئی اپنا
نظر نہیں آرہا تھا ! ۔ ترنم البتہ متوحش اور مبہوت تھی ۔ آخر کیا بات ہے کہ آج ممی

اپنی جان دجگر کہلی کی یوں برائیاں کر رہی ہیں۔ خرم کے سامنے اسے یہ ہرگز گوارہ نہیں تھا! مگر وہ کیا بولتی۔ ہاجرہ بیگم جب فل اسپیڈ بول کر کیں تو فرحت نے اسٹارٹ لے لیا۔

"کیوں اپنی جان کو روگ لگا لیا ہے۔ دفع کرو۔ ان سے تمھیں کیا فائدہ ہے ایک دوستی کا دم بھرتی ہو اور پر سے ان کے برے سلوک کا داغ دل پر لیتی پھرنا اس جائے ان کا۔ اب آنسو پونچھ لو۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔" واہ: انھوں نے اپنے آنچل سے ہاجرہ بیگم کے آنسو پونچھے۔ کچھ اس قسم کی باتیں کیں کہ ان کا غم بٹ لیا۔ ہاجرہ بیگم کے خیالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ وہ شمسہ کو واقعی اپنا دشمن سمجھ سے قطع تعلق کرنے کی تدبیریں سوچنے لگیں!۔

شمسہ بیگم کے دل و دماغ پر جیتے دکھ پہاڑ کی طرح کھڑے تھے۔ ان کا اندازہ ان دونوں بے فکری عورتوں کو مطلقاً نہیں تھا! غم روزگار نے شمسہ بیگم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تابش کا مستقبل ابھی غیر یقینی تھا۔ اس کے امتحان میں بھی کئی ماہ باقی تھے۔ پھر ملازمت کا سوال تھا۔ شمسہ بیگم مسلسل دکھ اٹھاتے اٹھاتے کچھ اس قدر مایوس اور نا روا ہو چکی تھیں کہ اب کسی قسم کی کوئی اچھی توقع انھیں کسی طرف بھی نہیں تھی۔ نہ بندوں سے آس۔ نہ خدا سے امید۔ بے تقدیر جی رہی تھیں۔ جو بھی بری بات ہوتی وہ انھیں پہلے سے معلوم ہوتی انسانوں سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ خدا سے دعا مانگ مانگ کر وہ تھک چکی تھیں بالآخر انھوں نے دل کو تسلی دے لی کہ ہرگز ہرگز ان کی دعاؤں میں اثر نہیں۔ بلکہ ہر دعا الٹ جاتی ہے۔ اگر وہ ایسی بدبخت بے نصیب نہ ہوتیں تو ان کے شوہر کیوں مرتے۔ وہ بھی ہزاروں خوش نصیب عورتوں کی طرح زندگی بسر کرتیں۔ شوہر کما کما کر ڈھیر کرتے۔ انھیں فکر معاش میں کیوں ہلکان ہونا پڑتا۔ بوڑھے باپ کا سارا

نیم دراز تھا۔ ترنم کو آتے دیکھ کر دونوں چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"تسلیم خالہ اماں!" اس نے اپنا موڈ درست کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جیتی رہو۔ بیٹی۔ خدا تمھاری عمر میں برکت دے۔ نصیبہ بلند کرے۔ آؤ بیٹھو۔ کیا آج کالج نہیں گئیں۔"

"جی نہیں.... طبیعت نہیں چاہ رہی تھی!"

"مجھے آپ نے سلام نہیں کیا!" تابش نے کہا۔

"ہاں آپ بڑے آئے کہیں سے۔" ترنم ٹھٹھک کر بولی۔

شمسہ بیگم مسکرائیں۔ تابش ہنسنے لگا "اچھی بات ہے۔ میں خود کرتا ہوں۔ محترمہ۔ آداب عرض ہے"

"میں آپ سے بات ہی کہاں کر رہی ہوں" وہ منہ بنا کر بولی۔

"یہ بات دوسری ہے" تابش نے کہا۔

"آج آپ کیوں نہیں گئے یونیورسٹی"

"ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ بات نہیں کروں گی" وہ ہنسنے لگا۔

"خالہ اماں۔ یہ مجھے اس قدر کیوں ستانے لگے ہیں" ترنم نے انھیں جھنجھوڑ کر کہا۔

"بیٹی میں جا رہی ہوں۔ گوشت بھوننے کو، ابھی کھانا مانگنے لگیں گے۔ تم بیٹھ کر اطمینان سے لڑو جھگڑو" شمسہ بیگم یہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

"چائے بنا دیجئے گا امی" تابش نے کہا۔

"کیا اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ امی کو حکم دیتے ہوئے" ترنم نے کہا۔

"جس کسی کو حکم دیتا ہوں۔ وہ الٹا مجھ ہی کو کھانے دوڑتا ہے۔ بتاؤ کیا کروں؟"

"خالہ اماں آپ نہ بنائیے گا۔ میں آ کے بتاؤں گی" اس نے صحن سے ہانک لگائی۔

عشق میں پاگل ہو کے مرے جتے ہیں آپ تماشہ دیکھا کیے تھے۔ مذاق چھوڑیئے۔
مذاق میں یہ بات ہمیشہ کی طرح نہیں ٹلے گی۔ مجھے ترنم کی بہت فکر ہے۔ بوا اماں کی
نواسی بجو اللہ رکھے اپنی ترنم کے برابر ہے۔ اس کی پچھلے برس شادی ہوئی تھی۔
اب گود میں پہلوٹھی کا لڑکا ہے۔ اے ہے۔ ایسا گورا گورا گول مٹول پیارا پیارا
کہ بس نظر لگتی ہے۔"

"مرت نواسہ کھلانے کا ارمان ہے تمھیں۔ میں اب کہا!"
"میں فرحت کو جواب دے دوں گی۔ آپ کو منظور ہے؟"
"مجھے ہرگز منظور نہیں ہے۔" یک لخت ساجد صاحب کو غصہ آگیا: "مجھ سے
پوچھے بغیر خبردار اس قسم کے جواب کسی کو مت دینا۔ اپنے فعل کی تم ذمہ دار ہوگی
یہ خوب سمجھ لو۔"

یہ کہہ کر وہ تو پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ ہاجرہ بیگم کوئی کوفت میں مبتلا کر
گئے۔ ترنم چلتے پھرتے سب سُن رہی تھی۔ چہرہ سرخ تھا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ۔
اسے اپنی ماں سے ایسی توقع نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو باپ ہی کو خیر جذباتی۔ لاپرواہ
سمجھتی تھی۔!

دالان کا وقت تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے آئی۔ اور غصہ ضبط کر کے ماں سے بولی۔
"میں اپنی ایک سہیلی کے یہاں کتابیں لینے جا رہی ہوں۔ دو ایک گھنٹے بعد
واپس آجاؤں گی۔" جواب لیے بغیر گھر سے نکل گئی۔
ہاجرہ بیگم منہ کھولے بیٹھی رہ گئیں۔
ترنم گھر کے پچھواڑے سے ہو کر سب کی نظریں بچاتی ہوئی تابش کے گھر
میں داخل ہوئی۔
شمسہ بیگم صحن ہی میں بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس آرام کرسی پر تابش بھی

اثاثہ تابش کی پرورش پر ختم ہو گیا تھا۔ ہر روز نیا غم لے کر ان کا آفتاب طلوع
ہوتا ہر شام نئی فکر دے کر غروب ہوتا!
انھیں پکا یقین تھا کہ تابش کبھی کبھی ملازمت حاصل نہ کر سکے گا! پتہ نہیں
اس کے نصیب میں کیا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ بہت بدبخت ہو گئیں۔ گونا گوں
فکروں نے ان سے یہ شعور بھی چھین لیا کہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ انھیں
تو یہ اندازہ تھا کہ ان کے چاہنے والے خود بخود ان کی فکروں کی تہہ تک پہونچ کر
انھیں قابل درگزر سمجھیں گے! اور یہ سوچیں گے کہ وہ واقعی رحم کی مستحق ہیں۔
ساجد صاحب کی عنایتوں نے انھیں شرمسار کر رکھا تھا! لوگ ان کی
ندامت، غم اور صادق محسوسات سمجھ نہ سکے۔
ان سے بدظن ہو گئے۔
خفا ہو گئے۔
اور انھیں ایک منافق، بے حس، اور خود غرض عورت سمجھنے لگے۔
یہ نیا غم کہ لوگ انھیں سمجھتے نہیں انھیں لے بیٹھا۔
اب بے چاری اکیلی تھیں۔ کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک، ایک کر کے
خاندان والے رخصت ہوئے۔ گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا!
وہ اٹھ کر کچن میں آئیں۔ بچے کھچے کھانے کا جائزہ لیا۔ پھر برتن کپ بورڈ
میں لٹکا کر تابش کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ کمبل تک کمبل اوڑھے
دیوار کی طرف منہ کیے سو رہا تھا۔ چپکے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
چہرہ گرم ہو رہا تھا۔
الٰہی خیر! انھوں نے دل تھام لیا: "اسے بخار کیوں آ رہا ہے؟"
تابش بھاری بھاری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ازری چیر پر

لیٹ گئیں اور اپنی تنہائی، اپنے حالات پر کڑھ کڑھ کر زار و قطار رونے لگیں!

فرحت اور خرم نے ایک نیک کام انجام دے لیا۔ بہت خوش تھے اچھی طرح ماجرہ بیگم کا دل شمسہ کی طرف سے پھیر دیا ہے!۔ مگر ترنم اتنی ہی برہم تھی ابھی تک اس کے دل میں تابش کا محبت پاش لہجہ گونج رہا تھا۔ اس کا چہرہ جو گونا۔ گوں جذبات کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی شرافت۔ اس کا گریز۔ وہ گفتگو اور اپنی بے چارگی کا اظہار۔ اس نے کبھی اس پر اپنی رو انگی یا برتری نہیں جتائی تھی۔ ہمیشہ اس سے دب کر ملا کرتا تھا۔ ترنم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ یا اس کی امی خود غرض، مطلبی ہو سکتے ہیں۔ خرم کا ناگوار انداز سرد چہرہ بے باک قہقہے اور… احساس تفاخر ترنم کو برافروختہ کر رہا تھا!۔

"تمھیں بہت دکھ ہو رہا ہے۔ سلطان صاحب کی موت کا؟" خرم نے کہا۔

سلطان صاحب کا نام کیوں لیتے ہو۔ وہ میرے کون تھے؟۔

"تو پھر اتنی خاموشی کس لیے ہے؟" خرم کچھ کھسیا گیا۔

"ہے کچھ میرا اپنا معاملہ۔ کیا ضروری ہے کہ میں تمھیں بتا دوں" وہ بے رخی سے بولی "ٹھیک ہے بھئی۔ ہم بھلا کون ہیں تمھارے۔ دکھ درد وہی سنتا ہے جو اپنا ہوتا ہے"۔

"اس میں تمھیں کچھ شک ہے؟"

خرم بہت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ پھر ہنس کر بولا "کیا بات ہے۔ ترنم۔ تم مجھ سے بہت خفا معلوم ہوتی ہو۔ کیا کیا ہے میں نے؟۔ خدا کی قسم میں تو تمھارے چشم و ابرو کے اشارے میں اپنی خوشی پوشیدہ دیکھتا ہوں۔ تم یقین کرو کہ نہ کرو!"

"اچھا" استہزائیہ انداز میں مسکرا کر ترنم بولی "بھلا کس رومانی ناول سے

ابھی بھی ایسا ہی کچھ ہو جائے گا" ساجد صاحب نے پھر بیزار ہو کر بات کاٹ دی "مجھے اس لڑکے کی عادتیں پسند ہیں نہ شکل!"

"شکل کو کیا ہوا ہے۔

ترچھا دیکھتا ہے!۔

اب کیڑے نہ نکالیے۔ فرحت مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ بھیک لیے بغیر نہیں جاؤں گی لاحول ولا قوۃ۔ گویا ہماری نازوں کی پالی بچی ان کے حق میں صرف بھیک کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ کو تو گھما پھرا کر مطلب سمجھنے کی عادت ہو گئی ہے" ماجرہ بیگم نے برا مان کر کہا "ان کا یہ منشا تھا کہ وہ اپنی آرزو کی بھیک ہم سے چاہتی ہیں"

"تم نے لڑکی کا عندیہ معلوم کیا؟"

"اے لو اور تماشہ سنو۔ ارے میں کیا لڑکی سے پوچھوں کہ ہم نے تمھارے لیے لڑکوں کی فہرست تیار کی ہے۔ اس میں سے ایک پسند کر لو"

"یہ بہت ضروری ہے۔ تمھارا زمانہ گیا کہ میں نے سنا تھا تم اپنے خالہ زاد بھائی پر لٹو تھیں وہ بھی تمھارے لیے خودکشی کر کے جہنم داخل ہونے پر آمادہ تھے لیکن تم گلے پڑیں میرے۔ اور نہ تم اُف کر سکیں نہ میں آہ کر سکا!"

"کون تھا وہ نگوڑا موا جرگٹا۔ میرا خالہ زاد بھائی۔ جھاڑ دیکھے اس کی صورت پر۔ اماں کی اپنی تو کوئی بہن ہی نہیں تھیں۔ بے چاری پھوپھی زاد میری ایک خالہ تھیں۔ ان کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ پیدائشی پاگل تھا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ کپڑے کا۔ بھی جوانی میں بے چارہ گزر گیا"

"سنا ہے کہ وہ آپ کے عشق میں پاگل ہوا!"

بات کاٹ کر ماجرہ بیگم بھڑک اٹھیں "ان ہاں زمانے بھر کے نامرادو میرے

بے شک بے شک: طنزیہ لہجہ میں وہ بولے: اور جنھیں تم بچپن سے کھیلتے
کودتے دیکھ چکی ہوگی۔ ان کے عادات و اطوار کا تم کو بخوبی اندازہ ہوگا۔ وہ تمھارے
سعادت مند داماد بننے کی سو فی صد صلاحیت بھی رکھتے ہوں گے!:
مجھے تو غصہ سے چڑھ ہو گئی ہے: ہاجرہ بیگم نے بالآخر اپنا مافی الضمیر واضح
کر ہی دیا: ہم نے ان کے ساتھ اتنا کچھ کیا ہے۔ زبان سے بھی ہاتھ سے بھی۔ مگر انھوں
نے شکریہ ادا کرنا تو درکنار محسوس تک نہیں کیا۔ ایسی بے رخی برتی:
"تم اپنے خیالات درست کرو۔ اگر ان پر کوئی غم ایسا پڑا ہے جس نے انھیں۔۔
بدحواس کر رکھا ہے تو تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ وہ صرف تم سے خفا ہیں؟:
ان کے برعکس فرحت ہیں۔ ہاجرہ بیگم بولیں: پہلے میں سمجھتی تھی کہ ذہنی مفسد اور
اور سطحی عورت ہیں لیکن اب مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ انھیں ہم سے
بے پایاں محبت بھی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اب تک لڑکی کے لیے کیا کچھ لا چکی ہیں
کیا آپ خرم کے لیے نہیں سوچ سکتے؟:
خرم کے لیے: ساجد صاحب نفرت سے بولے: تمھیں کیا معلوم کہ باہر ان کی کیا
مشغولیات ہیں۔ صاحبزادے کو فلم بینی کا حد سے زیادہ چسکا لگا ہے۔ کوئی نیا پرانا
فلم پہلے شو میں زیادہ قیمت کے ٹکٹ لے کر دیکھنا نہیں بھولتے۔ ان کے احباب میں بھی
کوئی ایسا نہیں جسے معقول کہا جا سکے۔ سر راہ بیٹھے وہ کیرم یا تاش کھیلتے نظر آتے ہیں
مزید براں ان کی تعلیمی حالت سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ بی۔ اے میں شاید
تیسرا سال ہے!:
تو اس کا کیا قصور ہے: ہاجرہ بیگم نے تڑپ کر اس کی وکالت کی: پہلی
بار اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے امتحان دینے کو منع کر دیا تھا۔ دوسری
مرتبہ اس کے دادا کا انتقال:

یہ مکالمہ رٹ لیا تھا مجھے سنانے کے لیے!۔
میرا مذاق مت اڑاؤ!۔
مجھے کچھ بھی اڑانا نہیں آتا۔ آج تک میں نے پتنگ بھی نہیں اڑایا۔
اچھا اچھا۔
آخر تم یہ اپنے ڈائلاگ، پر لطف فقرے اور رنگین جملے مجھے کیوں سنایا کرتے ہو
کہہ نہیں سکتا!۔
کہنا پڑے گا۔ ورنہ تم مجھے نہیں جانتے۔ خرم۔ مجھے تمھاری کسی بات پر غصہ
آئے گا تو میں ڈیڈی سے تمھاری شکایت کر دوں گی!:
خدا کی پناہ۔ یہ سنجیدگی۔ میرے جذبات تمھارے نزدیک کچھ حقیقت
نہیں رکھتے؟۔ کیا بکواس ہے تمہاری سنجیدگی؟۔ خدا کی شان ہے؟۔
تمھیں یقین آیا ہو کہ نہ آیا ہو۔ مگر ترنم میں اپنے جذبے میں سچا ہوں!:
سچ مچ؟۔
دیکھ ہی لو گی۔ زبان سے کہنا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ لیکن میں نے سنا ہے
کہ جذبہ دل کی سلامتی آخر کار محبوب کو چاہنے والے کے پاس لے ہی آتی ہے۔
ہاں۔ وہ کچھ اس قسم کا ایک گھسا پٹا سا شعر بھی تو ہے۔" ترنم نے بے حد
سنجیدگی سے کہا۔
"تم نے اسے نثر کر کے مجھے سنا دیا ہے:
کیا تمھیں اب بھی پتہ نہیں۔ ترنم میں تمھارے بارے میں کیا کچھ سوچتا رہتا
ہوں۔
"بالکل نہیں:
بہت سنگدل ہو۔

شکریہ!۔

"مذاق مت کرو۔ ترنم۔ امی نے تو سوچ ہی رکھا ہے۔ وہ تمھیں کہیں اور ہرگز نہ جانے دیں گی۔ اور میں یہ تہیہ کیے بیٹھا ہوں کہ اگر تم میری زندگی میں نہ آسکیں تو بخدا خودکشی کرلوں گا۔"

"خودکشی کرنے کی تدبیر سمجھ میں نہ آئے تو میرے پاس چلے آنا۔ میں چوہے مارنے کا زہر تمھیں بہت سا دے دوں گی!" غصے سے کانپ کر وہ بولی اور اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ خرم کا چہرہ سرخ منھ فق اور آنکھیں آگ کی طرح جل رہی تھیں!۔

ایک ماں کی حیثیت سے ماجرہ بیگم ترنم کے مستقبل سے بے پرواہ نہیں تھیں انھیں کئی رشتے دار عورتوں نے لڑکی کے سلسلے میں پیغام دیے بھی تھے۔ لیکن انھیں وہ کچھ پسند نہیں تھے۔ سب کو یکسر جواب دے دیے اور آس لگا رکھی تھی۔ تابش کی۔ انھیں وہ نہایت پسند تھا اونچا قد شاندار۔ خوبرو شریف نیک اور تعلیم یافتہ۔ سات سال کے عرصے میں انھوں نے اس کی کوئی حرکت ایسی نہیں دیکھی جو قابل اعتراض ہو۔ سوچے تھیں کہ بس وہ پڑھائی ختم کرلے تو شوہر سے کہہ کر ملازمت دلوادیں اور پھر خود ہی شمسہ بیگم سے کہہ کر اس کا پیغام شوہر کے نام سے بھجوادیں۔ لیکن اچانک ہی کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ انھیں شمسہ بیگم سے اختلاف ہوگیا۔ دل میں کدورت جم گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تابش بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دیا۔ مایوس و متفکر ہو کر رہ گئیں۔

یکبارگی انھیں ترنم سوالیہ نشان بن کر سامنے کھڑی ہوتی محسوس ہوئی راتوں کو نیندیں تک اڑ گئیں۔ پھر خیالوں نے قلابازی کھائی تو انھوں نے ساجد صاحب سے تذکرہ کیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ اپنی ترنم کے لیے تابش بہت اچھا رہے گا۔ مگر۔۔"

"مگر کیا۔" ساجد صاحب کو ایسے تذکروں سے دقت ہوتی تھی۔ بات کاٹ دی "اب بھی اچھا ہی رہے گا۔ تم ترنم کے متعلق اتنا کیوں سوچنے لگی ہو۔"

"سوچنے کی بات تو ہے ہی اس کا ماشاءاللہ اٹھارھواں برس چل رہا ہے۔"

"تو پھر" کچھ غرا کر ساجد صاحب بولے۔

"اب میرا دل تابش کی طرف نہیں جھکتا!" دھیمی آواز میں ماجرہ بیگم نے کہا۔

"کیا؟" سگریٹ سلگاتے سلگاتے وہ رک کر انھیں گھورنے لگے۔

"پہلے میں سمجھتی تھی کہ شمسہ اچھی ساس ثابت ہوں گی۔ انھوں نے میرے ساتھ سلوک بھی سگی بہنوں کا سا کیا تھا مگر اب وہ ایسی بدل گئی ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جب مجھ سے دیدے پھیر لیے تو بھلا میری بچی کے حق میں کیا اچھی ثابت ہوں گی۔ ایک تو مجھے بچی بیاہنی ہے۔ اس کی جان کو روگ لگے۔ میں عمر بھر پچھتایا کروں۔ سو کیا فائدہ؟"

"میں تمھارا مافی الضمیر کہنے سے قاصر ہوں۔" ساجد صاحب لاپروائی سے سگریٹ پینے لگے "کیا تو صبح و شام تابش اور شمسہ کے قصیدے تھے۔ ناک میں دم آجاتا تھا یا اب یہ بیزاری ہے۔ یہی تو تم عورتوں میں خرابی ہے کہ تھالی کی بینگن ہوتی ہو۔ کبھی ادھر ڈھلک گئیں کبھی ادھر۔ آج تابش کو نظروں سے گرادیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ اس سے اچھا لڑکا ملنا ممکن نہیں ہے!"

"سینکڑوں لڑکے صورت شکل کے اچھے اعلیٰ تعلیم یافتہ مل جائیں گے۔"

ٹیلیفون نمبر رہائش:- ۲۵۳۳۴

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

حریم لکھنؤ

ماہنامہ

ٹیلیفون نمبر آفس:- ۲۴۵۵۹

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

گزشتہ ۴۶ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اُردو میں
ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ فہرست مضامین ماہ جون [illegible] نمبر ۶

معاونین۔ شوکت جہاں سلیم غزالہ — جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	بیس روپیہ
مخصوص خریداری	”	اٹھارہ روپیہ
معمولی خریداری	”	پندرہ روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر [illegible] روپیہ [illegible] پیسے زائد

غیر ممالک سے [illegible] روپیہ [illegible] ایرمیل سے
[illegible]

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• تمام [illegible] روانہ کریں [illegible] ہندوستان میں [illegible] سے پہلے کی شائع [illegible] پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع [illegible] سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا [illegible]

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ [illegible] اور تمام ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو ۔ ۲۵ [illegible] روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی، مالک و ناشر، سرفراز پریس لکھنؤ ...... پرنٹر

لمعات کے ان کالموں میں میرا مخاطب بہنوں سے نہیں بھائیوں سے ہے۔

کیا آپ مسلمان ہیں۔؟ جواب میں آپ یقیناً یہی نہ کہیں گے کہ بلاشبہ مسلمان ہوں بلکہ شاید کلمہ بھی پڑھنے لگیں گے تاکہ کسی طرح کا شک نہ رہ جائے کہ آپ خدائے واحد اور اس کے امی رسول حضرت محمد صلعم کے ماننے والے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو کیا آپ نے کبھی ایسا منظر دیکھا ہے کہ

- ایک دولت مند انسان کسی بھکاری سے کچھ کھانے کو مانگ رہا ہو۔
- ایک نوجوان صحت مند مرد کسی ایڑیاں رگڑتے ہوئے ضعیف انسان سے کہہ رہا ہو کہ بھائی مجھے بچاؤ۔
- ایک ماں اپنے شیر خوار بچے سے کہہ رہی ہو۔ بیٹا مجھ سے چلا نہیں جاتا، میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سہارا دے کر لے چلو۔
- ایک مرد کسی عورت سے کہہ رہا ہو۔ مجھے بچاؤ، لوگ مجھے بے آبرو کرنے پر آمادہ ہیں۔
- ایک چوہا بلی کا پیچھا کر رہا ہو اور بلی بھاگ رہی ہو

مجھے یقین ہے کہ شاید کوئی بھی یہ اقرار نہ کر سکے گا کہ ایسا کوئی سین اس کی نظر سے کبھی گذرا ہو، اس لئے کہ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کا امکان ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کوئی دولت مند فقیر کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ ضعیف انسان خود لاچار و مجبور ہوتا ہے، وہ کسی جوان کو کیا مدد پہنچا سکتا ہے۔ ماں خود بچے کا سہارا ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے ماں کا سہارا بن ہی نہیں سکتے۔ آبرو عورت کی لوٹی جا سکتی ہے۔ مرد کی نہیں۔ اس طرح کی فریاد عورت کر سکتی ہے۔ مرد نہیں کر سکتا۔ بلی کبھی چوہے کے سامنے راہ فرار نہیں اختیار کر سکتی۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

ان سوالات کے بعد میں ہر مسلمان مرد سے یہ پوچھوں گا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ اللہ پاک نے مرد کو عورت پر افضلیت بخشی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے عورت کا محافظ بھی بنایا ہے اس لئے کہ وہ جنس لطیف ہے۔ وہ کتنی ہی آزاد اور بیباک کیوں نہ ہو جائے لیکن فطرت نہیں بدل سکتی۔ اس کے جنس کی لطافت میں ان چیزوں سے فرق نہیں پیدا ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ ہی مرد کے سامنے کمزور ہی رہے گی اور اپنی حفاظت کے لئے کسی مرد کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی۔ جو عورتیں ایسا نہیں کرتیں یا نہیں کر پاتیں۔ وہ اس کمی کو بہرحال محسوس کرتی ہیں کہ ان کا کوئی محافظ نہیں ہے۔ چاہے وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کریں۔

عہد آفرینش سے آج تک ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ جب کبھی جنگ ہوتی ہے تو مرد اپنی عورتوں کو گھروں میں رکھکر خود لڑنے جاتا ہے اور یہی کوشش کرتا ہے کہ کوئی حملہ آور اس کی عورتوں تک نہ پہنچ جائے۔ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس مقصد کے لئے بہا دیتا ہے۔ کوئی ایسی مثال ہمیں تاریخ میں نظر نہیں آتی کہ مردوں کو گھروں کی چار دیواری میں رکھکر خواتین دشمن کا مقابلہ کرنے اور اپنے مردوں کو محفوظ رکھنے کے لئے گھروں سے نکل کر میدان جنگ میں گئی ہوں۔

ان حقائق کے بعد ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ بات ہے عورت کا مہر جس کا مقرر ہونا اور ادا کرنا سنت نبوی ہے۔ چنانچہ حسب حیثیت مہر مقرر کیا جاتا ہے۔ یعنی یہاں بھی اسلام نے مرد کی افضلیت کو قائم رکھا ہے ــــ لیکن اس کے باوجود جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آج کے مرد شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بیوی کے گھر والوں سے بھیک مانگتے ہیں، دست طلب دراز کرتے ہیں۔ ان گنت فرمائشیں کرتے ہیں اور

نام و نمود

کے لئے کچھ کرنا اپنی اقتصادی حالت کو کمزور کرنا ہے نام و نمود والی باتوں پر بس تھوڑی دیر ہی کے لئے واہ واہ ہوتی ہے۔

ــــ نسیم الہنوری

ان کی تکمیل نہ ہونے کی صورت میں اکثر مرد اپنی بیویوں کو طعنے دیتے ہیں۔ پریشان کرتے ہیں اور کبھی کبھی انہیں گھر سے بھی نکال دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آج مغربی تعلیم کے اثر سے ہماری خواتین میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ مردوں سے مساوات کا دم بھرنے لگی ہیں۔ اور ہر طرح اپنے کو مرد کے برابر ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پھر بھی ابھی اتنا نہیں ہوا ہے کہ وہ مردوں پر اپنی بالادستی قائم کریں۔ لیکن مرد آج بھی اپنے کو عورتوں کے مقابلے میں افضل سمجھتا ہے۔ میں نے کسی مرد کو کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ عورتوں کو ان پر فضیلت حاصل ہے۔

—— پھر یہ کیسا تماشہ ہے کہ اپنے کو ہر حیثیت سے افضل سمجھتے ہوئے بھی مرد عورت سے بھیک مانگتا ہے۔ اسے دینے کے بجائے اس سے لینا چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ پست اور گری ہوئی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک بالادست، زیردست کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ شرم و غیرت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے ہی مہر کی رقم دے کر لڑکی والوں کو اس سے جہیز مہیا کرنے کا موقع دیا جائے۔ چہ جائیکہ جہیز اور فرمائشیں حاصل کرنے کے بعد بھی مہر کی رقم معاف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور مجبور عورت شوہر کی خوشنودی کے لئے ایسا کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتی۔

والدین اپنی بیٹی کو جتنا چاہتے ہیں اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو فراخدلی کے ساتھ وہ سب کچھ دے ڈالتے ہیں جو ان کے امکان میں ہوتا ہے۔ کیسا ظلم ہے یہ کہ اس کے باوجود انہیں وہ کچھ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے، جو ان کی حیثیت سے بالاتر ہوتا ہے۔

کیا مرد کے یہ مطالبات وہی حیثیت نہیں رکھتے، جن کا تذکرہ میں نے ابتدا میں کیا ہے۔ یہ افضلیت ہے یا اسفلیت؟

اقوالِ زرّیں

۱۔ لینا چاہتے ہو تو بزرگوں کی دعائیں لو۔
۲۔ بیٹھنا چاہتے ہو تو اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھو۔
۳۔ آزمانا چاہتے ہو تو خود کو آزماؤ۔
۴۔ سیکھنا چاہتے ہو تو نیک کام سیکھو۔
۵۔ کرنا چاہتے ہو تو بزرگوں کی باتوں پر عمل کرو۔
۶۔ کہنا چاہتے ہو تو اپنی حیثیت کو یاد رکھو۔
۷۔ بتانا چاہتے ہو تو اندھوں کو راستہ بتاؤ۔
۸۔ سمجھانا چاہتے ہو تو سادہ الفاظ میں سمجھاؤ۔
۹۔ کھلانا چاہتے ہو تو بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔
۱۰۔ رہنا چاہتے ہو تو سادگی سے رہو۔
۱۱۔ پینا چاہتے ہو تو غصہ کو پیو۔
۱۲۔ شرمانا چاہتے ہو تو اپنے برے اعمال کو یاد کر کے شرماؤ۔

کام کی باتیں

۱۔ زبان کی شیرینی، معافی اور عاجزی دشمن کو بھی دوست بنا لیتی ہے۔
۲۔ تکیہ، نرم بستر اور ٹھنڈی ہوا نیند میں غفلت پیدا کرتی ہے۔
۳۔ دودھ، عطر اور پھول کو لینے سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔
۴۔ بخالت غیبت اور خیانت انسان کو دوزخ کے قریب لے جاتی ہے۔
۵۔ زیادہ کھانا، چیخ کر بولنا اور تیز چلنا بدتمیزوں کا کام ہے۔
۶۔ ہلکی غذا کھانا، پرسکون نیند سونا اور ورزش کرنا تندرستی کی نشانی ہے۔
۷۔ سخاوت، صدقہ اور خیرات سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔
۸۔ کوشش، محنت اور علم رائیگاں نہیں جاتا۔

مرسلہ: نعمت پروین (ملک چک)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان پر ہو۔ پاکیزہ معیاری اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری بھی لکھا گیا ہو۔ جولائی کے لئے عنوان ہے انجام اور اگست کے لئے آنسو۔

نہ سمجھا درد ہم نے بھید باں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں، روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

مرسلہ:۔ غزالہ اظہر (کانپور)

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزہ ہوتا

مرسلہ:۔ مس فرحانہ شریف (آگرہ)

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے

مرسلہ:۔ عائشہ صدیقہ احمدی ناز (ورسلا آمیور)

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مرسلہ:۔ ناظمہ زہرہ (بہار شریف)

چپ ہوں تمہارا درد محبت لئے ہوئے
سب پوچھتے ہیں تم نے زمانے سے کیا لیا

مرسلہ:۔ شہناز پروین عراقی (کانپور)

تھک گیا درد بھی اٹھتے اٹھتے
اب کلیجے میں رہا جاتا ہے

مرسلہ:۔ فیروزہ یوسف (گھاٹا نگ)

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

مرسلہ:۔ بیگم آفتاب سیفر (چن پٹن)

ہم گئے تھے اس سے کرنے شکوۂ درد فراق
مسکرا کر اس نے دیکھا سب گلا جاتا رہا

مرسلہ:۔ مس قمر فاطمہ نیازی (دانگی)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رلائے کیوں

مرسلہ:۔ فی عظمت ترنم (آبپور)
آم سلمیٰ بانو (آبپور)

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرسلہ:۔ مس زینت کوثر (بدیسرہ)

یوں ہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم، کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

مرسلہ:۔ مہر افروز (گلستیاں)

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

مرسلہ:۔ شبنم کوثر (بریٹھ)
مرسلہ:۔ مس انجم فرخ شمسی (آگرہ)

بتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

مرسلہ:۔ مکرم النسا لاری (جرول)

درد دل اور بڑھا دیکھ کے صورت تیری
ہم تو سمجھے تھے کہ تسکین کی صورت ہوگی

مرسلہ:۔ رقیہ یاسمین (بیلا بیتا مڑھی)

دولت درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

مرسلہ:۔ مس مشاہین شمسی (آگرہ)

درد اپنا بھی ہر اک سمت جہاں ہوتا ہے
ہم تڑپتے ہیں تو بے چین جہاں ہوتا ہے

مرسلہ:۔ فردوس اطہر (کسرول)

درد [illegible] کے واسطے کچھ ہیں منزل ہے [illegible] — مرسلہ:۔ نجیب
[illegible] (مدراس)

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

مرسلہ:- فریدہ واحد (اہنوٹر)

مرسلہ:- سیدہ تسنیم لکھنوی

نہیں دنیا میں کوئی درد سے اچھی دولت
بانٹ لو درد کو بے درد زمانے والو

مرسلہ:- مس حلیمہ فاروقی (کروڑ۔ جھابوا)

یوں دل کے تڑپنے کا ہے کچھ تو سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی یا تم نے ادھر دیکھا

مرسلہ:- صوفیہ مظفر (جمشید پور)

۶۹۵۹ شعر غلط ہے۔

کسی کی جدائی سے گھبرا کے شیون، یہ خود کہہ رہی ہے مرے دل کی دھڑکن
اگر بخش دینا تھا دردِ محبت، چراغِ تمنا جلایا نہ ہوتا

مرسلہ:- ساجدہ رحمت (آمبور)

جب کہا اس سے شب غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا

مرسلہ:- نازش ہدیٰ (گیا)

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزہ ہوتا

مرسلہ:- مس زبیدہ فضلی (رامپور)

اب کس کو سنائیں گے اس درد کا افسانہ
سمجھے تھے جسے اپنا وہ ہوگیا بے گانہ

مرسلہ:- ایم ایس جہاں (محی الدین پور)

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

مرسلہ:- مسز عذرا کلام روحی (دعا باد بیگوسرائے)

مرسلہ:- نسیم سلطانہ (چھپرا)

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

مرسلہ:- قمر نگار جلیلی
(آمبور)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

مرسلہ:- مس نسیمہ بیگم بھولی (بھاگلپور)

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

مرسلہ:- محمد غوث الاعظم پھلجوی (بہار شریف)

دردِ دل کس سے کہوں کوئی بھی غمخوار نہیں
اے خدا تیرے سوا کوئی مددگار نہیں

مرسلہ:- مس ملکہ بانو (رہاسن)

درد اس درجہ بڑھے گا ہمیں معلوم نہ تھا
پھر چھپانا بھی پڑے گا ہمیں معلوم نہ تھا

مرسلہ:- رشیدہ پروین تشکیل (دہلی)

اے چارہ ساز حالت دردِ نہاں نہ پوچھ
اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

مرسلہ:- فرزانہ انوری (باندہ کستی پور)

زندگی کسی مفلس کی قبا ہو جیسے
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

مرسلہ:- کلیم نور دیناری (تیلو شام)

انساں کسی سے دنیا میں اک بار محبت کرتا ہے
اس درد کو لے کر جیتا ہے اس درد کو لے کر مرتا ہے

مرسلہ:- ریحانہ بیگم (سانتا کروز بمبئی)

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں
عرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

مرسلہ:- نرگس آرا اسمٰعیل (وارے پلی)

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

مرسلہ:- شاہدہ بیگم (اٹاوہ)

پاندان والی خالہ اور اُن کی سہیلی!

مخلص بھوپالی

خالہ اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی دھوپ لے رہی تھیں کہ دروازے کے کھٹکھٹانے کی آواز سنی۔

کون ہے کیا زنجیر توڑے گا۔ اتنی زور زور سے مار رہا ہے! دروازے پر۔ توبہ ہے میں کہوں ذرا منھ سے تو بول کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ ارے اللہ۔ دیکھو کیسا باجا بجا رہا ہے ہنک ہنک کے۔ خدا سمجھے صبح سے شام تک جھاڑو پھروں کی آ رک جا رک رہتی ہے ایک گیا تو تھوڑی دیر بعد دوسرا آ دھمکا یہ ہمارے لڑکے ننھے میاں کے آٹھ یار دوست ہیں دن بھر تانتا بندھا رہتا ہے نگوڑ مارے بکروں کا — اچھا آج بجائے جا موے۔ میں بھی نہیں اٹھنے کی پہلے اپنا نام پتہ بتا — بات تیرے سنڈے کی خالہ نے غضبناک ہو کر للکارا —

لے کمبخت تو کھول غضب پڑا کھیلا۔ گھنٹہ بھر سے منھ چلا رہی ہے۔ بیٹھی ہوئی کہ خدا کی یوں میں زبان نہیں ڈالتی سلو ہیں۔

توبہ ہے میری۔ اے تو ہے زیتون مردار۔ خدا سمجھے پھوٹے منھ سے بولتی کیوں نہیں میں سمجھی کوئی موا مرد آگیا — خالہ نے ہنستے ہوئے دروازہ کھولا۔

ہاں تیری بھلی چلائی۔ تو بھلا اس رانڈ کے پاس آئے گا کوئی مردوا۔ اس سے پھر نکاح کرے۔ جب بات کرے گی تو ایسی لگی لپٹی بات کرتی ہے وہ تو سنجات (خالہ کا نام) بڑے بوڑھوں کی کہاوت ہے کہ جوانی میں رانڈ ہو جائے اور اس کے سر پہ کوئی اس کے چلانے دیکھنے والا نہیں رہے تو پھر وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے کیا مجال جو کسی کے قبضے میں آجائے پھر دیکھو کیا کنی کا ناچ نچواتی ہے پورے گھر کو۔ زیتون نے برقعہ اتار کر پلنگ پر پھینکا اور چارپائی میں دھنس گئیں۔

خیر خیر — خالہ نے جھینپ کر کہا کبھی مری آکے صبح سے کیا کوئی نیا راگ لالائی ہے آج — خالہ نے زیتون کے قریب کھسک کر کہا۔

"تیری بہو کہاں ہے؟"

"وہ تو آٹھ روز سے اپنے میکے گئی ہے۔ آج کل میں شاید آجائے۔ کیوں اس سے کیا کام ہے —؟"

"اے مجھے اپنے لڑکے کے لئے ایک لڑکی پسند آگئی ہے تیری بہو اس لڑکی کو جانتی پہچانتی ہے ذرا اس سے مل کے پوچھوں کہ لڑکی کے چال چلن اور رنگ ڈھنگ کیا ہیں کیسی بری چال میں تو نہیں —"

پہلے مجھے بتا نام و پتہ۔ کون سی لڑکی ایسی ہے اس شہر کی جسے میں نہیں جانتی۔

اے لو میں وہ بھلا سا نام ہے اس کے باپ کا نام بھی تو آگ لگے ایسے مشکل رکھتے ہیں کہ زبان ٹوٹتی نہیں ان پہ۔ زیتون بی نے آنکھیں بند کر کے سوچا ارے وہ — اوئی بھول ابھی مجھ غضب پڑا کیا یاد تھا رستہ بھر نام رٹتی ہوئی آئی ہوں اور عین وقت پہ جھاڑو پھرا دماغ سے نکل گیا۔

اچھا محلہ کا نام — لڑکی کے باپ کا رنگ روغن بتا تو میں پہچان لوں گی — وہ حیدر خاں تو نہیں جا خاں کا داماد شبراتی کا بھائی یا اور سبحان خاں کا بھانجہ۔ آخر کون ہے۔

نہیں نہیں ان میں سے کوئی نہیں وہ پٹھان لوگ ہیں نام فارسی کا ہے مشکل۔ میری عقل پر پتھر پڑیں۔ زیتون نے ماتھے پہ ہاتھ مار کر کہا — ہاں اب یاد آیا وہ چن چن جنو خاں۔

ہے کمبخت ماری زیتون — یہ فارسی کا لفظ کہاں ہے۔ جاہل جھاڑو پھرو میں جانوں تیرے جن جن تو نہیں ہو گئے جو یاد آئے ہیں۔ خالہ نے ہنس کر زیتون کو دھکا دیا۔

اے ہٹ ادھر خدا کی میرے گھر کو ہو وہ چھنگاں

بہروپیے حکیم

جلال ملیح آبادی

کردار

بہروپیے حکیم ——— فلمی دیوانے اور جلبلے حکیم
بیوی ——— حکیم کی ترد ماربیوی
پولیس انسپکٹر ——— تماشائی اور گاہک

خرّانٹے

حکیم کی بیوی۔ (اونچی آواز سے) ارے کیا گھوڑے بیچ کے سوئے ہو؟ ارے بیتے ہو؟ گھوڑے والے کے سوداگر؟ ...... ارے الٹونا ایکسٹرا ایکٹروں کے ہیرو! ......

بہروپیے حکیم۔ اُف ہو غضب ... جب دیکھو ... ہزار مرتبہ کہا ..... تمھاری وجہ سے تو میری نیند کا بھی ناک میں دم ہے۔

بیوی۔ اور تمھاری وجہ سے میرا دم میری ناک میں رہنے لگا ہے جب سے نگوڑا وہ ٹھکرا آئینہ ٹوٹا، نیا آئینہ لانے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ کیا کروں۔ جب تم سوتے ہوتے ہو تو تمھاری چندیا میں اپنا منھ دیکھ کے مانگ نکال لیتی ہوں۔

حکیم۔ میری چندیا میں اپنا منھ دیکھ کر؟ کیا بکتی ہو!؟

بیوی۔ ہاں۔ مگر یہ کم بخت چیڑا۔ مجھے مانگ کبھی نہیں نکالنے دیتا۔

حکیم۔ چیڑا۔ اری چیڑا کیا؟

بیوی۔ وہی چڑیا جیسا جو ہوتا ہے وہ "چیڑا" جہاں سویرا ہوا یہ آگیا تمھارے گنجے سر سے لڑنے اور تمھاری چاند بھی تو کمبخت ایک تانبے سی چمکتی ہے۔ چیڑا تمھاری چاند کو آئینہ سمجھ کر بیچ چیا دکر تمھاری کھوپڑی کے پیچھے پڑگیا ہے۔

حکیم۔ کیا بکتی ہے؟!

بیوی۔ سچ کہتی ہوں ...... وہ آئینے ہوتے تو تمھیں تمھاری چندیا دکھلاتی۔ دیکھا چیڑے نے اس میں سی کھوپڑی پر کتنے ٹھونگے مارے ہیں ...... دو کوڑی کی ہوگئی ہے تمھاری گنجی کھوپڑی ......

حکیم۔ میری گنجی کھوپڑی؟ اور تو دیکھ کسی نالی میں اپنا منھ معلوم ہوتا ہے کسی نے کالے تربوز میں کوڑیاں چبھو کر آنکھیں اور ایک نیلی گاجر رکھ کر تیری ناک بنائی ہے ... یہ ہے تیرا ناک نقشہ۔

بیوی۔ اور تو دیکھ اپنا منھ جیسے گھوڑے پر پھٹا ہوا جوتا ... ہنستے ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے اکڑا ہوا جوتا کھیسیں نکال رہا ہے۔

حکیم۔ اے زبان سنبھال نہیں تو زبان کھینچ لوں گا۔

بیوی۔ زبان کھینچنے والے مرگئے۔ اور تم سے ایکسٹرا ہیرو چھوڑ گئے۔ اسٹوڈیو اسٹوڈیو جوتیاں چٹخانے کو

حکیم۔ دیکھ بس یہ ختم کر دے نہیں تو معلوم ہے تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے؟

بیوی۔ خوب جانتی ہوں اس گھر میں ہوتا کیا ہے، روز جوتیوں پر دال بٹتی ہے۔

حکیم۔ ہاں اور آج پھر اسی وقت جوتیوں پر دال بٹنے والی ہے، اب بھی سنبھل جا۔

بیوی۔ کام کے نہ کاج کے ...... [illegible]

بھر تیل ہیں۔ دس بوند اس شیشی سے نکالیے۔ اشنان سے پہلے غسل سے قبل سر پر مالش کیجئے۔ بعد اشنان گنجا ہو۔ دو مہینے میں اس طرح بال اگیں گے کہ آپ کو ایسا لگے گا کہ آپ ریچھ کی کھال کی ٹوپی پہنے پھر رہے ہیں ــــ

تو حضور! اس حقیر کے ناچیز تیل کا بھلا امتحان کیجئے اور خوبی اس تیل کی یہ بھی ہے کہ چاہے کہ آپ کی عمر سو برس کی کیوں نہ ہو، بال جو سے کالا اگے گا ــــ کالا ایک دم کالا۔ جٹ کبرا نہیں، کوئی پیلا نہیں سوائے کالا ــ بال، اور اس بال کے بعد نسلاً بعد نسلاً کالے کالے بال اگتے رہیں گے۔ آپ لگائیے آپ کی سات پشت کے بال حشر تک کالے رہیں گے آج لگائیے قیامت کے دن کالے بال سر پر لیے ہوئے اٹھیے۔

ہاں تو بھائی جان! جس بھائی کو اس دوا ــــ دوا نہیں اس اکسیر کی ضرورت ہو آگے بڑھے آگے آ جائے آپ کے شہر کے لیے صرف دو سو کیا سو شیشیاں بچ گئی ہیں اور یہاں گاہک ہیں پانچ (۵۰۰) سات سو۔ جس کی قسمت جاگ رہی ہے وہی خریدے گا وہی پائے گا جو سوچے گا عمر بھر پچھتائے گا اور قیمت! کچھ نہیں ہے معمولی بالکل معمولی، اس شہر کے لوگوں کے لیے رعایتی قیمت ہے صرف پانچ صرف پانچ روپئے۔ مال کے مول سوا ہے، پانچ روپئے تو آپ مہینے میں پان کھا کے تھوک دیتے ہیں سگرٹ پی کر ہوا میں اڑا دیتے ہیں سودا سستا ہے بازار اٹھتا ہے۔ لائیے ــ یہ لیجئے شیشی ــ

نوٹ کم ہوتا تو نہیں ــ بابو جی! ــــ مذاق میں بات کہی بابو جی برا مان جائیے گا۔ بات یہ ہے آج کل۔

نگر نگر جب جائیے ڈگر ڈگر کیے مار

لعنت ہے دھوکہ دینے والوں پر ــــ مگر ان سے ہوشیار رہنے کے لیے جو دو پیوں پہ داؤں کرتے ہیں۔ شہر کے صاحب جلدی کا کام شیطان کا۔ باری باری دو دو دن کا۔ ان کا پیسہ کوئی مٹی کا نہیں میرے لیے پھر بھائی ایک تاسف کا کہ اشرفی کے برابر ہے۔ ــ لیجئے لیجئے ــ دوا ہے ہاتھ سے بابو جی ــــ رقم ہمیشہ داہنے ہاتھ سے دیتے ہیں ـ ـ ـ یہ لیجئے دوا کی شیشی۔

(بیوی کا قہقہا)

بیوی۔ شاباش! بھئی میں بڑی دیر سے یہاں کھڑی تمھاری تقریر سن رہی تھی، باتیں تم بڑی بھلے داؤ کرتے ہو ــــ ماننا پڑتا ہے۔ سچ سچ تم فلموں میں ہوتے تو ہیرو کیا، ہیرو کے باپ کا کام بھی خوب ادا کرتے ــــ

حکیم۔ تو یہاں کیوں آئی؟

بیوی۔ اے لو ـ خوب۔ کتنی جلدی بات بھول جاتے ہو تم نے تو کہا تھا کہ تو بدلہ نہ لے تو تجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ میں بھلا تمھارا حکم کیسے ٹال سکتی تھی۔!

حکیم۔ تو بدلہ لینے آئی ہے مجھ سے۔

بیوی (قہقہا) بدلہ تو بعد کی بات ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم پیپرمنٹ میں نوسکی کا لک ملا کر گھر سے لاتے ہو تو اسے کیسے (ہر مرض میں المناس) کہہ کر بیچ لیتے ہو بھئی خوب ہو استاد۔

(قہقہا)

پبلک میں سے ایک۔ اجی کون عورت ہے یہ؟

حکیم۔ اجی صاحب۔ ! میرے محلے کی ایک پگلی ہے پیچھے پڑ گئی ہے جہاں جاتا ہوں یہ آ کر ہی بکتی ہے۔

بیوی: بڑے حیا دار ہو! سچ ہے سب کے سامنے بیوی کہتے شرم آ رہی ہوگی۔

دوسرا آدمی۔ یہ ضرور تمھاری بیوی لگتی ہے۔

حکیم۔ اجی لعنت بھیجئے اس بڑھیا میں نے ابھی کہا تھا کہ محلے کی پگلی ہے

بیوی۔ (قہقہا) جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے ــــ سنتے ہو لوگو! ابھی دوا بیچتے وقت، یہ بہالیہ سے جڑی بوٹیاں لانے والا بندر کہہ رہا تھا کہ میں آپ کے شہر میں ہر تیسرے سال آتا ہوں اور یہ رہتا ہے یہیں بھنڈی بازار میں ــــ اور اب اپنی بیوی کو محلے کی پگلی کہہ رہا ہے۔

تیسرا آدمی۔ بتاؤ تم یہاں کہاں رہتے ہو۔؟

چوتھا آدمی۔ سالا محلے کے بتاؤ۔

پانچواں آدمی۔ چار سو بیس معلوم ہوتا ہے۔

چھٹا آدمی۔ صورت سے نظر آتا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے۔

حکیم۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں! اور یہ پاگل عورت سچ بول رہی ہے

انسپکٹر۔ کیوں ؟ حکیم بنتا ہے ؟
حکیم۔ خاندانی حکیم ہوں حضور سچ بولتا ہوں۔
انسپکٹر۔ جب خاموش، میں کوتوالی میں کے سچ بولنا۔ کہاں ہو وہ دو آدمی ؟
پہلا آدمی۔ اجی۔ مجھ سے لیجئے، یہ شیشی ہے۔ اس نے پانچ روپے مجھ سے لیے تھے۔
انسپکٹر۔ تم کوتوالی میں کے گواہی دے سکتے ہو ؟
تیسرا آدمی۔ مزدور۔ ایک نہیں دس آدمی گواہی کے لیے چل سکتے ہیں۔
انسپکٹر۔ اس تھیلے میں کیا ؟۔
حکیم۔ یہ دوائیں ہیں سرکار۔ قہ ہے لیجئے سچی دوائیں ۔
انسپکٹر۔ (اٹھا تھیلا اس کی جانچ ہوگی ۔ چل ۔ چل نہیں تو.
حکیم۔ چل تو رہا ہوں حضور مگر . . . .
بیوی۔ مگر، بیوی کے چھوٹنے کا غم ہے ۔ مجھ بیوی کو کس پر چھوڑے جا رہے ہو پران ناتھ ؟
حکیم۔ دیکھ گھر آکر، اگر تیری ناک نہ کاٹ لی ہو فقیر کی بچی ۔
بیوی۔ (قہقہہ) پہلے حوالات کی ہوا کھاؤ اور جیل کی روٹیاں توڑو، تگڑے ہو جاؤ تب آنا، ناک کاٹنے ۔
حکیم۔ تجھ کو طلاق ـــ تجھ پر سات طلاق
بیوی۔ (قہقہہ) تجھ کو طلاق، تیری سات پیڑھی کو طلاق، تیری چھوٹی چھوٹی کو طلاق ۔
حکیم۔ کچا چبا جاؤں گا تجھے، جوگی کی بچی فقیرنی.
انسپکٹر۔ چل بے فقیرنی کے بچے حوالات
بیوی۔ (قہقہہ) میں نے کہا تھا ناکہ تمھاری آج کی رات حوالات میں کٹے گی۔ (قہقہہ) مبارک ہو ۔
(قہقہے ۔ قہقہے ۔ قہقہے)

چچی چھمن

عطیہ پروین

خالہ جان کے بٹوے میں ڈوری ڈالتے ہوئے چچی نے جیسے کچھ یاد کر کے سر اٹھایا اور بولیں۔

"پروین بی بی!"

"ہاں چچی!" میں نے اپنی بے حد دلچسپ ناول کو بادل ناخواستہ بند کر کے کہا اور چچی کی طرف دیکھنے لگی۔ چچی نے پوچھا

"بی بی یہ سری نگر بھی کوئی شہر ہے؟"

"سری نگر! میں نے حیرت سے کہا۔

اے ہاں! ابھی میاں آج پڑھ کے سنا رہے تھے...... وہاں کئی ایک لوگ بیٹھے تھے پوچھنے کا میرا ہیاؤ نہیں پڑا نہیں تو پوچھ لیتی...

اوئی کیا کیا نام ہیں سری نگر سودائی پھر....."

میں اب سمجھ گئی تھی ہنس کر بولی۔

ارے وہ سری نگر ہے چچی کشمیر کا ایک خوبصورت شہر!"

"اے ہے میں بھی سری نگر!" چچی نے بڑی معصومیت سے کہا۔

بیٹی کشمیر کی عورتیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں میرے ایک بھائی کی بی بی کشمیر کی تھیں ارے جیسے چینی کی مورت اور گالوں پر ٹماٹر .... کتنا ارمان تھا مجھے کشمیر سے جمال کے لئے لڑکی لاؤں گی مگر .... ٹھنڈی سانس بھر کر۔ مگر اس پرکٹی ڈائن نے ایسا میرے بچے کو بس میں کیا کہ ساری گئی۔ نگوڑے کی!"

چچی کی بہو ایک خوبصورت، اینگلو انڈین لڑکی ہے اور ان کے صاحبزادے یعنی جمال احمد نے یہ شادی چچی کی مرضی کے خلاف کی ہے۔ دوسرے معنوں میں لو میرج کی ہے اور چچی اپنے بیٹے بہو سے اس حد تک خفا ہیں کہ منہ دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔

میں نے کہا۔

"سارا قصور ان بے چاری کا نہیں ہے چچی جمال بھائی بھی برابر کے شریک ہیں۔"

چچی خفا ہو کر بولیں۔

"اے تم کو بڑی ہمدردی ہے بی بی کیا اس سے مل ملا لی ہو؟"

"ملی ولی نہیں چچی ایک سیدھی سی بات کہی ہے میں نے.... انھوں نے جمال بھائی کے گلے پر چھری تھوڑے رکھی ہوگی کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ دونوں کی مرضی سے شادی ہوئی ہوگی!"

"بھاڑ میں گئی ایسی شادی" چچی نے غصے کے مارے بٹوہ تخت پر پٹک دیا اور ہاتھ نچا کر بولیں۔ یہ شادی مردی کوئی شادی ہوئی نہ نکاح پڑھایا گیا نہ ایجاب و قبول ہوا نہ...."

"ایجاب و قبول!" میں نے دھیرے سے کہا۔ ہاں یہ خبر ہے چچی۔ ان دونوں نے کورٹ میں جا کے شادی کر لی!"

"یہ کوئی شادی ہوئی!" چچی چلائیں "رجسٹر پر نام لکھ دیا اور بن گئے میاں بیوی۔ اللہ کی سنوار ایسی بی بی پر اور خدا کی پھٹکار ایسے میاں پر۔ اے اپنا خون ہے تو کیا ہوا کھری بات ڈنکے کی چوٹ پر کہوں گی یہ سیدھے سیدھے حرام کاری ہوئی!"

"ہائے اللہ چچی!" میں نے دانتوں تلے زبان دابی۔

"ہاں بیٹی اور کیا کہوں! پوچھو نکاح نہیں ہوا دو گواہ بنائے نہیں گئے پھر کیسی شادی، یہ کہو بے شرمی کی زندگی گزار رہے ہیں دونوں اے مجھے کیا آپ بھگتیں گے، اللہ کے سامنے جواب دینا پڑے گا بس اتنا ہے بی کلیجہ بازو قت ملتا ہے۔ اس موئی کا بیٹے کی صورت آنکھوں کے نیچے آجاتی ہے تو اللہ قسم آج بھی سینے میں [illegible] لگتا ہے!"

چچی کی اس مامتا پر جہاں مجھے ہمدردی اور افسوس ہوا وہاں ہنسی بھی آ گئی بہ مشکل اپنے لبوں کو قابو میں کیا اور بولی۔

"تو چچی آپ نے سوچا تھا کشمیر سے دلہن لائیں گی!"

"ہاں بیٹی۔ مجھے بڑا ارمان تھا۔ کوئی دو [illegible]

تھیں نہیں۔ ایک لاتا تھی سوچتی تھی لاکھوں میں ایک لاؤں گی۔ پوری بستی میں چرچا ہوگا مگر بی یہ ارمان پورا نہ ہوا؛ چچی نے سپیکا ہوا اچوہ اٹھالیا اور سپہر ڈوری ڈالنے لگیں۔ میں نے ان کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

"چچی کچھ اندر سنا آج کل ڈالڈا نہیں مل رہا ہے۔"

"ہاں بی بی کل اچھن میاں بتا رہے تھے وہ کیا کہتے ہیں شان ٹیج ہوگیا ہے ڈالڈا کی...... ارے بی کیسی شان ٹیج یہ بڑے دوکاندار جو ہیں انھوں نے تہ خانوں کے اندر بھر لیا ہوگا دیکھنا سو کے دو سو پر دیں گے......... اللہ ان غاصبوں کو روز قیامت یزیدکے ساتھ اٹھائے۔ بخشش نہ ہو مردوں کی......... لو اور سنو ڈالڈے کی شان ٹیج ہے کل کو سارے تیل تہ خانوں میں گھس جائیں گے پرسوں اور کچھ ہوگا۔ اور جنتا دہائیاں دیتی پھرے گی۔"

"واہ چچی واہ آپ تو ہندی بھی اب خوب بولنے لگی ہیں جنتا ...."

"واہ بھئی واہ!" میں نے مصلحتاً چچی کو مکھن کا ڈبہ رسید کیا اور چچی کا موڈ چمک اٹھا تیزی سے بولیں:

"ارے پھر کیا کروں بیٹی جیسا دیس ویسا بھیس بس اتنا ہے کہ جناتی ہندی نہیں بولوں گی ہلکی پھلکی بولوں گی اور نہ اپنی زبان کو چھوڑوں گی۔"

"کاش کہ آپ کی طرح سب سوچیں اور ایسا ہی بولیں چچی۔"

"ہائے ہائے! کیا شربت کی ڈلی ہماری بڑی بوڑھیاں زبان بولتی تھیں۔ چچی بولیں۔ ہندی بھی اردو بھی وہی ہم لوگوں نے سیکھی وہی تم سب بولتے ہیں مگر اب یہ نئی پود جو اُگ رہی ہے بی یہ تو ایسی لکڑ توڑ زبان بولتی ہے کہ کیا کہوں۔ الاتی سم کان کے پردے میں سوراخ ہو جاتے ہیں...... اچھن کی چھوٹی لڑکی ہے نا اسے کیا کہوں کیا بولتی ہے......... کل میں بیٹھی تھی ان کے گھر اسکول سے آتی منہ دھوپ سے لال چقندر یہ بچاری بورا کتابوں کاپیوں سے بھر بکس پر لادے آتے ہی بولی اماں ہمارے دھیان دھیک نے آدیش دیا ہے کہ........."

اے جانے کیا کیا زنانز بول گئی......... میں جناب امیر قسم حق وقت اس کا منہ دیکھوں جو میں بی بی میری میں نے خوب اچھن کی دلہن کے لتے لیے کہنے لگیں کیا کروں باجی اسکول میں یہی سکھایا جاتا ہے" میں نے کہا لعنت ہو ایسے ماں باپ پر جو بچوں کی زبان نہ سنبھالیں۔ پوچھو اسکول میں سکھایا جاتا ہے۔ تو تم بھی کچھ سکھاؤ کہو اپنی یہ لکڑ توڑ بولی اسکول تک رکھو گھر میں نہ لاؤ وہ کیا کہتے ہیں، شین قاف ٹھیک کر دیں جتنی دیر رہتی ہوں اس لونڈیا کو ٹوکے جاتی ہوں......"

"برا مان جاتی ہوگی۔" میں نے کہا تو چچی گردن مٹکا کر ناک چڑھا کر بولیں۔

"مان جائے میری جوتی سے۔ میں اپنی ایسی کہوں گی ضرور اللہ کی شان پڑھے لکھے شریف اشراف ماں باپ کے بچے بولیں خوف کی جگہ کھوف، خوبصورت کی جگہ کھوبصورت اور سندر قابل کو کہیں کابل جب یہ بچے بڑے ہوں گے تو اپنے بال بچوں کو کیا سکھائیں گے کون سی بولی میراث میں دیں گے"؟

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ چچی"!

چچی کو اور جوش آگیا۔

"ہے نا دل کو لگتی بات! خدا کی شان ہے بی یہ موٹی موٹی کتابیں اسکول کی نکلی جا رہی ہیں وہ کیا کہتے ہیں کبتائیں یاد کی جا رہی ہیں....."

"کبتائیں...... میں ہنس پڑی۔

"نہیں چچی کویتائیں۔"

اے ہوگا یہی سہی۔ چچی منہ سکوڑ کر بولیں۔ میرے منہ سے جو ہی نکلتا ہے...... ہاں تو کبتائیں یاد کی جا رہی ہیں کیا مجال جو دو حرفیں نعت کی یاد ہوں، مرثیہ یا نوحہ یاد ہو اور تو اور کلمہ تک یاد نہیں ہے یا اللہ کب آئے گی قیامت کب ظہور ہوگا بارہویں امام کا......... مسلمان کہاں سے کہاں پہونچ گیے نہ دین کے رہے نہ دنیا کے اور سب اقوام میں ترقی کر رہی ہیں.... آسمانوں پر چڑھ رہی ہیں۔ مسلمان لوگ ہیں کہ آنکھ کان بند کیے بیٹھے ہیں یا تو بی میری بچے پیدا کر رہے ہیں یا کتابیں یاد کر رہے ہیں........"

میں ہنس رہی تھی اور چچی دھواں دھار ان کے الفاظ میں تقریر کر رہی تھیں۔

"وہ تو اللہ بھلا کرے اندر والی بی کا پچھوکیوہ کرنس جدیاں کر دی ہیں نہیں تو اب بھی انھیں ہوش نہ آتا دوسرے لوگ دو دو بچے لیے سونے کے زینے چڑھتے جاتے اور یہ بچوں کا لشکر لیے اپنے آپ کو کچھ اچھے

سوائے روتے بسورتے خاک چاٹتے رہتے۔ اللہ کی شان صبح آنکھ کھلتے ہی ریڈیو پر دودھ بھارتی ڈھونڈا جاتا ہے اور گانے سنے جاتے ہیں……؟

"دودھ بھارتی!" میں نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے تصحیح کی مگر بجیا اس وقت صرف بول رہی تھیں سن نہیں رہی تھیں۔

"جھوٹ بولے کوا کاٹے اور بگلا دیوانہ سن من نے کلیجہ ٹھنڈا اور ایمان روشن کیا جاتا ہے…… قرآن شریف کے جزدانوں پر الا ق سم ایک ایک انگل کی گرد جمی ہے بوجھ برکت کہاں سے آئے گھر میں فرشتے کس در دانے سے قدم رکھیں قرآن کی آیتوں کے بجائے تیری گلیوں میں نہ جائیں گے صنم کی آوازیں آ رہی ہیں باجے بج رہے ہیں……؟

"اسے یہاں تو تقریر ہو رہی ہے" خالہ جان یہ کہتی ہوئی جیسے ہی اندر آئیں بجیا منہ بنا کر چپ ہو گئیں اور میں اپنی کتاب لے کر بجیا کو خالہ جان کے حوالے کر کے بجیا کے کمرے میں جا گھسی۔ ۰۰

انوکھا پیار

صفیہ تاج

میز پر ماں کا تار پڑا ہوا ہے۔

ہیجانی و اضطرابی کیفیت میں مسٹر فیصل ڈرائنگ روم میں ٹہل رہے تھے۔ وہ ایک مشہور و معروف سول سرجن تھے اور ذہنی سکون کے لیے دارجلنگ میں قیام پذیر تھے۔ رات کی سیاہی کا دھندلکا تمام فضا میں چھایا ہوا تھا

بیگم نورانی نے بہو کو رخصت کرانے کی خوشی میں ایک شاندار جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے لخت جگر کو فوراً آجانے کو لکھا تھا جس سے مسٹر فیصل کا ذہن پریشان تھا۔ ایک طرف محبت تھی جس نے انھیں نئی امنگ عطا کی تھی، دوسری طرف گھنگھور اندھیرا تھا جو ان کی زندگی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جوڑا جا رہا تھا۔ جو انھیں ناقابل برداشت لگ رہا تھا۔ نسیم جسے اس نے دل و جان سے چاہا تھا۔ اسے نصیحت کر کے چلی گئی تھی اس کی خاطر اس نے محبت کی قربانی دی تھی۔ فیصل نے بہت کچھ سمجھایا کہ وہ اسے نہیں چھوڑ سکتا، اس کے سوا کسی کو اپنا شریک حیات نہیں بنا سکتا لیکن اس نے ماں کے حکم کی تعمیل کی اہمیت سمجھا کر اسے فرض سے آگاہ کیا۔ اور اتنا مجبور کیا کہ اسے اس کی بات ماننا ہی پڑی اور اس نے ماں کی مرضی کے سامنے سر جھکا دینا ضروری سمجھا۔

پھر اس کا ذہن ماضی کے اوراق پلٹنے لگا تھا۔ کتنا پرکیف سماں تھا ہر طرف سرسبز اور دلکش پہاڑی سلسلے تھے۔ جھرنوں کا سحر آفریں سماں۔ نئی زندگی بخشنے والی خنک اور پھولوں کی مہک سے بسی ہوئی ہوائیں جن پر ورڈس ورتھ کی شاعری کا گمان ہوتا تھا۔

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے۔ گنگناتا اور ان مدہوش کن مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا کار کچھ بے خیالی کے انداز میں چلا رہا تھا کہ ایک چیتا جانکی پھلکا اس کی کار سے ٹکرایا۔

”اوہ! معاف کیجئے گا“ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

لڑکی پہلے تو چونک کر پھر کچھ شرما کر حجاب آلود لہجے میں بولی۔

”جی۔ کوئی بات نہیں“

اس کی آنکھوں میں مئے احمریں کے پیمانوں کی سی مستی تھی۔ نگاہوں میں شوخی۔ اداؤں میں دلبری۔ اور۔ اور ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی شریر مسکراہٹ سے وہ سحر زدہ سا ہو گیا، لیکن جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا: ”آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“

”نہیں۔۔۔“

لڑکی نے جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ٹوکا: ”سنیے کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“

لڑکی پہلے تو گھبرائی پھر اس نے آہستہ سے کہا: ”مجھے۔ نسیم کہتے ہیں“ اور یہ الفاظ اس نے کچھ اس طرح سے کہے کہ جیسے کئی ساز ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔ نسیم۔ نسیم اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔

فیصل نے تعریفی انداز میں کہا۔ بہت خوبصورت نام ہے۔

یہ فقرہ سن کر نسیم کا چہرہ اوس میں بھیگے ہوئے گلاب کی طرح عرق آلود ہو گیا۔

”آئیے۔ میں آپ کو چھوڑ دوں“ فیصل نے کہا۔

”نہیں۔ آپ زحمت نہ کریں۔ میں چلی جاؤں گی“

لیکن فیصل کی بہت استدعا کے بعد وہ کار میں بیٹھ گئی۔ فیصل کی نظریں اس کی بلائیں لیے جا رہی تھیں؟ اس کا دل اس بھولی بھالی معصوم لڑکی سے گفتگو کرنے کی تمنا کر رہا تھا؟ نہ جانے اس پری پیکر کی نرگسی آنکھوں میں کون سا سحر تھا جس میں وہ ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کے نورانی تقدس پر فدا ہوا جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ ایک چھوٹے سے کوارٹر کے پاس نسیم نے کار روکنے کے لیے اشارہ کیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ فیصل نے ٹوکا: ”کیا میں دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل کر سکتا ہوں۔؟“

”انشاء اللہ تعالیٰ! زندگی رہی تو پھر ملوں گی“ اور وہ چلی گئی۔

نفیس کی نگاہیں دیر تک اس کے سائے کا تعاقب کرتی رہیں۔

پھر وہ ہر روز نسیم سے ملنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں کی بے تکلفی میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ جیسے ان کا جنم جنم کا ساتھ رہا ہو۔ گھنٹوں پیڑوں کے سایے میں جھاڑیوں کی پشت پر چھپ چھپ کر وہ ایک دوسرے کو کھوجتے رہتے اسی بیچ نسیم کی چوڑی اس کے ہاتھوں میں آجاتی اس کی گھنگھریالی زلفیں ریشم کے مانند اس کے ہاتھوں سے لپٹ جاتیں اور پھر۔ وقت کا ایک بیشتر حصہ اسی شغل میں گذر جاتا اور وہ ایک، دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھوئے رہتے مستقبل کے پیمان وفا باندھتے رہتے اور خوبصورت دلکش سپنوں کا تاج محل بناتے رہتے۔

حالانکہ نسیم نہایت ڈرپوک لڑکی تھی لیکن... محبت ایک ایسا جذبہ بے اختیار ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں۔ نفیس کی کسی مرضی میں نسیم کے لیے خون کا کوئی دخل نہیں تھا۔ دور دور تک تنہا وہ دونوں ایک دوسرے کے پیار سے سرشار باہوں میں باہیں ڈالے سیر سپاٹے کرتے رہتے۔ نسیم کے پیارے پیارے وجود کے ساتھ نفیس کی زندگی بڑی شاداں و فرحاں گذر رہی تھی کہ اچانک ماں کے تار کی خبر نفیس نے نسیم کو سنائی تو وہ اداس ہوگئی۔

"نسیم"

"جی"

"کیا تم اب مجھ سے نفرت کرنے لگو گی؟"

"نہیں تو۔"

تمہیں تو میری ہنسیں رہ گئی ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ میری عقل تو جواب دے گئی ہے۔

ماں کی نازک طبیعت اپنے خلاف مزاج ایک لفظ نہیں سن سکی۔ "میں اپنی ضد میں ہوں کہ میں کسی ایسی لڑکی سے نباہ نہیں کر سکتا، جسے نہ میں نے دیکھا ہو اور نہ جانتا ہوں کہ وہ کیسی ہے۔ اور اب جب کہ تم میری زندگی کا جزو بن گئی ہو۔ میں کیسے اس کے ساتھ انصاف کر سکوں گا؟ کیسے اسے اپنا پیار دے سکوں گا؟ بولو۔ کچھ تو جواب دو۔ میرے سینے میں طوفان امڈ رہا ہے۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ نہ جانے تم میرے متعلق کیا سوچ رہی ہوگی۔ شاید یہی کہ میں بھی ایک سطحی اور گرا ہوا مرد ہوں۔ جس کا کوئی کردار نہیں ہوتا"

"نہیں نہیں۔ آپ ایسا نہ سوچیں۔"

"تو پھر۔ اتنی سنگین خاموشی کیوں ہے؟"

"دراصل آپ کی صاف گوئی سے میں بہت متاثر ہوں اور پھر اس کے ان جملوں نے اسے لوٹ لیا۔ "نفیس! آپ نہیں سمجھ سکتے عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ کبھی اس کی قربت میں نہیں رہے۔ پتھر بھی دو چار ضربوں میں ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہ تو صنف نازک کہلاتی ہی ہے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اپنی منسوبہ کو اپنا لیجئے وہ جیسی بھی ہے آپ کی ہے۔ سوچئے تو ذرا آپ نے اسے ٹھکرا دیا تو کون اسے اپنائے گا؟ رہی میرے پیار کی بات۔ تو کچھ لیجئے گا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" کیونکہ میری زندگی تو ہمیشہ ہی تنہا گذری بچپن میں ماں۔ انتقال کر گئی سن بلوغ کو پہونچی تو ڈیڈی اتنی بڑی جائداد کا مالک بنا کر داغ فراق دے گئے۔ اور اب۔ آپ ملے تھے۔ میں سمجھتی تھی کہ اب میری زندگی میں قوس قزح کے رنگ بکھر گئے مگر۔ کیا خبر تھی۔ کہ آپ بھی۔ چار دن کی چاندنی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے آج کے تازہ پھول نفیس کو پیش کیے۔ پل گھنٹہ سکتہ کا سا عالم چھایا رہا۔ کتنا جانگسل لمحہ تھا جیسے تلوار کی نوک پر ٹھہرا ہوا لمحہ ہو۔ اس کی محبت اس کی چاہت اس سے جدا ہو گئی تھی۔ کتنی اٹل اور ارفع تھی وہ۔ کتنے مقدس اور بلند خیال تھے اس کے۔

جب دوسرے دن صبح کی گاڑی سے نفیس ماں کے پاس پہونچا تو ہر طرف شہنائیاں بج رہی تھیں۔ سارا اہتمام بڑے زور شور کا تھا۔ کوٹھی کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ لان کی آرائش کا کیا کہنا۔ لیکن اس کے دل میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک معصوم بچے کے مانند اس کا دل بلک بلک کر رونے کو مچل رہا تھا۔ کاش۔ اس کا دکھ کوئی سمجھ سکتا۔

رات کے ۹ بجے جب شادی کے ہنگامے رکے۔ دوست احباب اور رشتہ داروں سے نفیس کو نجات ملی تو وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا حجلہ عروسی میں داخل ہوا جہاں۔ اس کی دلہن نوشابہ سرخ جوڑے میں لپٹی۔ شرمائی سمٹی بیٹھی تھی۔ نفیس کی نظروں میں اس وقت بھی نسیم کا پیکر تھرک رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا وہ سچ مچ ... یاد نسیم تھی جو اپنے لطیف جھونکوں سے اسے معطر کر کے چلی گئی۔

وہ تھوڑی دیر تک بت کی طرح اپنی دلہن کو دیکھتا رہا۔ پھر آکر پلنگ پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے بے دلی کے ساتھ اس کا گھونگھٹ... الٹ دیا۔ گھونگھٹ الٹتے ہی جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی اور ۔ وہ چیخ اٹھا "تم ۔ تم ۔ نیسم ۔ تم ۔ ؟" نیسم نے شرما کر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ پھر حیران اور پھٹی پھٹی نظروں سے دلہن کو دیکھ کر کہنے لگا "نیسم ۔ فرزانہ ۔ آخر یہ سب کیا ہے ؟ میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں ۔

"نیسم نے کہا "جی نہیں"

کیا مطلب ؟ یہ سب کیا ہے ... ؟ میں کچھ سمجھا نہیں ۔

وہ نگاہیں نیچی کیے مسکراتی ہوئی کہنے لگی ۔

دراصل مجھے ۔ پیار میں ۔ نیسم کہتے ہیں اور کالج میں داخلہ فرزانہ کے نام پر ہوا تھا ۔ امی نے دارجیلنگ مجھے تفریح کے لیے بھیجا تھا ۔ تاکہ ایک انجان لڑکی بن کر میں آپ کی قدم بوسی کر سکوں ۔ یہ کہتے ہوئے اس کے احمریں رخسار اور گلگوں ہو گئے ۔

"اداکاری میں بڑی ماہر ہو"

شکریہ ..."

اور تب ۔ فیصل نے فرط محبت سے اس کی پلکوں کو چوم لیا ۔ نیسم کا صبیح چہرہ ۔ شفق گوں ہو گیا ۔

سہرا

بتقریب شادی خانہ آبادی برادر عزیز سید محمد صغیر اشرفی ۔ موضع تیری ضلع سلطان پور ۔

رخ صغیر پہ کیا نغمہ بار ہے سہرا
نزول رحمت پروردگار ہے سہرا

بہار کہتی ہے روح بہار ہے سہرا
عروس زندگی نو کا ہار ہے سہرا

ہر ایک گل میں ہے نسرین کا عکس جلوہ فگن
جلو میں اپنے لئے حسن یار ہے سہرا

سمو گئی ہے کچھ ایسی شریعت اسلام
نہیں یہ رسم کہیں پر شعار ہے سہرا

نعیم شاد ہیں سہرا بسر کا دیکھ کے آج
تجلیات نسیم بہار ہے سہرا

شمیم اور قسیم و نسیم اور ندیم
ہر اک کے دل کا سکون و قرار ہے سہرا

ہیں شاد نجم سحر اور کہکشاں اصغرا
یہ ماں کی ممتا بہنوں کا پیار ہے سہرا

خوشی میں کہتے ہیں ہنس کر غضنفر و صابر
ہر اک نظر کو جمال نگار ہے سہرا

حیات نو کی تجلی پہ شاد ہیں منصور
اک عزم و آگہی و اعتبار ہے سہرا

عجب خوشی ہے ہنسے دیتے ہیں مجیب الدین
کچھ ایسا بیٹی کا باغ و بہار ہے سہرا

کھل اٹھا پھول کی صورت دل صغیر الدین
کہ ان کے دل کی دعاؤں کا ہار ہے سہرا

ہر ایک گل میں مسرت کے ولولے ہیں نہاں
رسن وفا کی محبت کی دار ہے سہرا

کہا جو خندآں نے سہرا تو اہل فن نے کہا
زبان و شعر و ادب کا وقار ہے سہرا

نتیجۂ فکر خنداں لکھنوی

پیش کردہ ۔ سید محمد قسیم اشرفی

بچے کو بولنا سکھائیے

مناظر عاشق ہرگانوی
ہرگانواں، بر بگہہ، مونگیر بہار

پانچ سال کا ہو جانے پر بھی ظہیر نے بولنا نہیں سیکھا تھا۔ ہر بات کے لیے روتا رہتا تھا اور اشارے سے کچھ مانگتا رہتا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو عجیب سے احساس سے دوچار ہونا پڑا۔ عفت مجھے اس پانچ سالہ لڑکے کے بارے میں بتا رہی تھیں جسے میں ان کے یہاں دیکھ رہا تھا۔ "شروع میں اس کے ماں باپ نے یہ سوچا اور سوچ کر اطمینان کر لیا کہ ابھی چھوٹا ہے لیکن پچھلے ڈھائی سال سے وہ بھی پریشان تھے۔ جھاڑ پھونک کرایا گیا۔ گلے کے ماہروں کو دکھلایا گیا۔ ڈاکٹروں نے ہر طرح دیکھا بھالا۔ مگر انھیں گلے میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔" عفت سانس لینے کے لیے رکیں۔ پھر کہنے لگیں "ظہیر اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس لیے سبھوں کا لاڈلا ہے۔ اسے اس لاڈ پیار سے رکھا گیا کہ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کی گئی ہے۔ اشارے سے اس نے کچھ بتایا اور پورا کر دیا گیا۔ سب اس کی طرف متوجہ رہتے تھے کہ اسے کیا خواہش ہوتی ہے، وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ بولنا سیکھ نہیں پایا۔ ٹھیک سے اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے کیا چاہیئے۔ میں نے اسے دیکھا تو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ بچوں کا اسکول چلاتی ہوں اس لیے ان کی نفسیات کی شُدبُد رکھتی ہوں۔ میں نے ظہیر کے والدین کو مشورہ دیا کہ اس کے رونے اور اشارے سے بات کہنے پر اس کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ زبان سے یعنی آواز سے مانگنے دیجئے۔ کچھ کہنے دیجئے اور اسے بولنا سکھایئے۔ بغیر سکھائے ہوئے وہ بولنا نہیں سیکھے گا۔ ان لوگوں نے میری بات پر عمل شروع کیا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ دو ڈھائی مہینے میں وہ سکھائے گئے الفاظ اور جملے کو صحیح تلفظ سے بولنے لگا۔ ابھی رفتار کم تھی۔ لیکن ایک سال گزرنے کے بعد وہ اپنی ضروریات کی چیزیں بول کر مانگنے لگا تھا۔ اپنے خیالات کا اظہار الفاظ سے کرنے لگا تھا۔ اور آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ لڑکا میرے اسکول میں ہے۔ میں اسے روزانہ سبق دیتی ہوں اور دوسرے روز زبانی سنتی ہوں۔"

عفت کا یہ کہنا حقیقت سے قریب ہے کہ کسی بھی بچے سے بولنا شروع کرنے کی امید تب تک نہیں کی جا سکتی جب تک کہ بولنا اس کے لیے ضروری نہ معلوم ہونے لگے۔ ضرورتوں کو ظاہر کرنے کے طریقے جسمانی اور دماغی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ بچے بھی نئے طریقہ سیکھنا چاہتے ہیں۔ نئی باتوں کو جاننے کا تجسس ان میں بڑوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کوئی اسے سکھانے والا ہو۔ صحیح طریقے سے بتانے والا ہو، اس کے تجسس کو ابھارنے والا ہو اور اسے صحیح سمت دکھانے والا ہو۔ ماں باپ کو اتنی سمجھ اور جانکاری ہونی ہی چاہیئے کہ بچے کی نشوونما کب اور کیسے ہوتی ہے۔ الفاظ سیکھنے کی رفتار چھوٹے بچے میں ایک سی نہیں ہوتی۔ تھوڑے سے الفاظ سیکھ لینے کے بعد وہ ہر بار کچھ عرصہ کے لیے رک سا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر ماں باپ سیکھتے رہنے کے لیے دباؤ ڈالیں گے تو بچے کا ذہن پختہ ہونے کی بجائے کمزور ہو جائے گا۔ یاد رکھنے کی صلاحیت کم ہو جائے گی۔

بولنا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بڑے ہو جانے پر بھی نئی زبان سیکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے کو اپنی توتلی بولی پسند ہوتی ہے۔ لیکن صحیح تلفظ جاننا ہی اس کے لیے ضروری ہے۔ کئی بچوں کا برسوں تک توتلا کر بولتے رہنا اسی بات کی علامت ہے کہ گھر کے افراد ہمیشہ اس سے توتلی بولی میں بات کرتے ہیں اور اس کا توتلا کر بولنا گھر کے افراد کو پسند ہوتا ہے۔ بچہ نئے نئے الفاظ صرف اپنے ماں باپ سے ہی نہیں بلکہ اپنے پڑوس سے۔ اپنے چاروں طرف سے سیکھتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بولنا سیکھنے کے ابتدائی مرحلے

ے بعد بچے کا بولنا رک جاتا ہے یا الفاظ کو قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے ماں باپ میں طلاق ہو جاتی ہے یا ان میں سے کسی ایک کی خاص کر ماں کی موت ہو جاتی ہے۔ یا ماں باپ کی ازدواجی زندگی کی ناہمواری یا حد سے زیادہ بچوں پر ڈانٹ ڈپٹ سے بھی ان کا بولنا سیکھنے پر اثر پڑتا ہے۔ بولنا اگر غصہ ظاہر کرنے اور لڑنے جھگڑنے کا ذریعہ بن جائے تو بچے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اسی میں وہ اپنی بھلائی دیکھتے ہیں۔ اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو کیا سیکھ سکیں گے کیسے سیکھ سکیں گے۔؟

یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھوٹے بچے کی موجودگی میں اگر کوئی اور بچہ تولد ہو جاتا ہے تو فطری طور پر سب کی نگاہ کا مرکز وہی نومولود ہی ہوتا ہے۔ پہلا بچہ اپنا پیار نہ پاکر سوچتا ہے کیا بات ہے جس سے لوگ اس کی طرف توجہ نہ دے کر نئے بچے کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اور وہ نئے بچے کی حرکات کی نقل شروع کر دیتا ہے، جب اسے ٹوکا جاتا ہے، روکا جاتا ہے تو ماں باپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ چڑچڑا ہو گیا ہے۔۔ اب پھر وہ ماں کی گود میں بیٹھے رہنا چاہتا ہے۔ کھیلنے کے لیے کھلونا مانگتا ہے۔ ماں کے ہاتھ سے کھانے کے لیے مچل اٹھتا ہے۔ ماں کے ہی ساتھ سونے کے لیے ضد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بولنے کے معاملے میں بھی وہ ماں باپ کا پیار چھن جانے کے ڈر سے آگے بڑھنا، آگے سیکھنا بند کر دیتا ہے۔

اس لیے ماں باپ کو اپنے رویے، اپنے پیار اور اپنی محبت کے بارے میں سوچنا چاہیئے۔ دھیان میں رکھنا چاہیئے اور بچے کو بولنا اور بولتے رہنا ضرور سکھانا چاہیئے۔ بچے کی نشوونما پر پوری توجہ دینی چاہیئے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا چاہیئے۔

نئے ناول

آپ کی قسم	عالیہ ناز	15/-
تشنج	اے آر خاتون	18/-
آواز شدہ	مسرور جہاں	11/-
راہوں میں	"	12/-
پاگل بیتا	مینا ناز	13/-

لیموں کے فوائد

سلہ ذیشانہ (بی ایڈ)

(۱) ریشمی رومال وغیرہ دھوتے وقت آخری بار پانی میں لیموں کے چند قطرے اور ایک چٹکی نمک ڈال لینے سے کپڑے کی چمک بدستور قائم رہتی ہے۔

(۲) کپڑے پر سیاہی کے دھبے پر کافی مقدار میں رکھ چھوڑیں کچھ دیر بعد صابن سے دھولیں دھبہ دور ہو جائے گا۔

(۳) لوہے کی زنگ دار چیز کو نمک اور لیموں سے رگڑیے زنگ دور ہو جائے گا

(۴) گلیسرین اور عرق گلاب میں لیموں کا عرق ملا کر رکھ دیں اور روزانہ سوتے وقت ہاتھ منہ وغیرہ پر ملیں جلد دلکش نظر آئے گی۔

(۵) دانت کے لیے لیموں سے بڑھ کر مفید کوئی چیز نہیں۔

لیموں نمک یا لیموں شہد یا لیموں اور سرسوں کا تیل میں ملا کر دانتوں پر ملنے سے دانتوں میں چمک آتی ہے منہ کی بدبو دور ہو جاتی ہے مسوڑے مضبوط ہو جاتے ہیں۔

(۶) سبزی کاٹنے کے بعد اکثر کسیلے عرق کی وجہ سے ہاتھ کی جلد بدرنگ ہو جاتی ہے ان پر لیموں ملنے سے صاف و شفاف نکل آئے گی

(۷) سیب کاٹنے کے فوراً بعد ان میں چند قطرے لیموں لگا لینے سے کاٹنے کے بعد جو ان میں سیاہی رنگت آ جاتی ہے وہ نہیں ہوگی اور سیب دیر تک اپنی اصل رنگت پر رہے گا۔

(۸) مچھلی کی بساندھ دور کرنے کے لیے اس پر لیموں کا عرق ملیں۔

(۹) پیتل کا سامان بھی لیموں کے عرق سے صاف کیا جا سکتا ہے

(۱۰) ناخن کترنے کے بعد ٹھنڈے پانی سے ہاتھ پیر دھولیں پھر ان خشک کر کے عرق لیموں ناخنوں پر ملیں اس سے ان میں چمک آئے گی۔

(۱۱) چائے کی پیالیوں میں اکثر چائے کا داغ پڑ جاتا ہے جو بڑی مشکل سے صاف ہوتا ہے۔ ان دھبوں کو دور کرنے کا بھی آسان ترین علاج نمک اور لیموں ہے۔

حریمی دسترخوان

——— سلمہ ذیشانہ (بی ایڈ)

مسوری کوفتے

اشیاء: - قیمہ ۲۵۰ گرام بلا چربی کا باریک کٹا ہوا۔ گھی ۱۰۰ گرام یا حسب ضرورت۔

کھوپرا ۱۲ گرام۔ لال مرچ پسی ہوئی چائے کا ایک چمچہ یا ... حسب خواہش کم و بیش۔ پسا ہوا دھنیا چائے کا ایک چمچہ۔ ہلدی پسی ہوئی ½ چائے کا چمچہ۔ بھنے چنے کا بیسن چائے کے چار چمچے۔ لانگ دو عدد۔ الائچی سفید ایک، ادرک ۱۰ گرام۔ لہسن ایک گھٹی۔ ہرا دھنیا ۱۲ گرام۔ سیاہ زیرہ ایک چٹکی۔ نمک حسب ضرورت۔

تمام مسالوں کو باریک پیس لیں۔ پھر قیمہ کو سل پر ایک پیس کر تمام مسالہ اس میں ملا کر ایک بار سب کو سل پر پیس کر ایک جان کرکے چھوٹے چھوٹے کوفتے بنا لیں اور انھیں بھاپ دے کر گھی ڈالڈا یا تیل میں اچھی طرح متوسط آگ پر تل لیں۔ اس طرح کہ جگر تک پک جائے

نوٹ: - قیمہ میں چکنائی قطعی نہ ہو ورنہ کوفتے پھٹ جائیں گے۔

ڈبل روٹی کے پکوڑے

سامان: - ڈبل روٹی ایک عدد۔ بیسن آدھا کیلو۔ زیرہ چائے کا ایک چمچہ۔ سرخ مرچ حسب خواہش۔ نمک اندازے سے۔ ہرا مرچیں کتری ہوئی حسب خواہش۔ کھٹائی حسب خواہش۔ کھٹائی کے بجائے لیمو کا عرق ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ گھی ڈالڈا یا تیل جتنا صرف ہو۔

ترکیب: - ڈبل روٹی کے موٹے موٹے سلائس کاٹ کر ان کے چوکور ٹکڑے ایک اپنچ کے کاٹ لیں۔ روٹی کا کنارہ چھیل کر علیحدہ کردیں۔

لہسن مرچ زیرہ اور نمک کو پیس کر بیسن میں ملا دیں اور بیسن کو خوب پھینٹیں بعد میں ہرا دھنیا اور ہری مرچ کے ٹکڑے بھی شامل کردیں۔ بیسن میں نہ اتنا زیادہ پانی ہو کہ بالکل پتلا ہوجائے نہ اتنا کم زیادہ گاڑھا رہے۔

گھی، ڈالڈا یا تیل کو کڑھائی میں کڑکڑا کر ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو بیسن میں لت پت کرکے ہلکی آنچ پر تلیں۔ سرخی مائل ہوجائیں تو نکال کر املی اور پودینہ کی چٹنی کے ساتھ ناشتہ میں استعمال فرمائیں۔

عہد حاضر کی لڑکیاں

محمد مقصود عالم کچھن پوری

برق رفتار زمانہ کی لڑکیاں عشقیہ خیالات کے رنگوں سے شرابور ہیں۔ ان کے اندر حسن کی نمائش کا جذبہ حد سے سوا ہو گیا ہے۔ ہر لڑکی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، ہمہ وقت بنی سنوری رہتی ہے۔ ایسی لڑکیاں شادی سے قبل والدین کے لیے اور شادی کے بعد شوہروں کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بن جاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے والدین اور شوہروں کی عزت و ناموس ہر گھڑی معرض خطر میں رہتی ہے۔ بننے سنورنے کے لیے طرح طرح کے مصنوعی اسباب و ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں۔ پاؤڈر، لپ اسٹک اور زعفران وغیرہ کی بات ہی کیا، ان کی تو عام چیزیں ہیں۔ اب تو شکل و صورت کو پرکشش اور پر رونق بنانے کے لیے پلاسٹک سرجری بھی شروع ہوئی ہے یعنی آپریشن کے ذریعہ اعضاء جسمانی کو حسین و جمیل اور صحیح و شکیل بنایا جا رہا ہے۔ خوبصورتی اپنی جگہ اچھی شے ہے لیکن لڑکیوں کا یہ سمجھ لینا کہ یہی سب کچھ ہے۔ بہت بڑی بھول ہے۔ صورت سے زیادہ گراں قدر گوہر سیرت ہے۔ دونوں کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔ خواتین کو ہر دلعزیز بنانے، اس کی خوبیوں اور بزرگی کو دو بالا کرنے اور پیوند خاک کے بعد روز روشن کی طرح درخشندہ و تابندہ رکھنے میں اس جوہر بے بہا کا بہت قوی ہاتھ ہے۔

> جو دلربا نہیں ہے تو ثروت کا فائدہ
> سیرت اگر نہیں ہے تو صورت کا فائدہ

> سیرت نہیں ہے جس میں وہ صورت فضول ہے
> خوشبو نہیں ہے جس میں وہ کاغذ کا پھول ہے

دنیا میں قدر و قیمت محض اچھی شکل و صورت اور زرق برق لباس سے نہیں ہوتی۔ انسان کی قدر اس کے جوہروں سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ "تاریخ میں جن تابناک عظمت خواتین کا ذکر ہے وہ محض ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جمیلہ کی وجہ سے ہے۔ دنیا میں انھیں لوگوں کا نام مہر درخشاں سے بھی زیادہ روشن و تابناک ہے۔ جن لوگوں نے اعمال صالحہ کو اپنا زیور بنایا اور حسن صورت سے نہیں بلکہ حسن سیرت سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

> اے حسن کے مائل یہ نصیحت مری سن لے
> سیرت پہ نظر چاہیے صورت سے زیادہ

> حسن صورت کے لیے خوبی سیرت ہے ضرور
> گل وہی گل ہے کہ خوشبو بھی ہو رنگت کے سوا

نئی نسل کی لڑکیوں پر جدید فیشن مکمل طور پر حاوی نظر آ رہا ہے۔ آج کی لڑکیاں لباس محض نمود و نمائش کے لیے زیب تن کرتی ہیں ستر پوشی کے لیے نہیں۔ مگر مذہب اسلام میں سب سے زیادہ ستر کی اہمیت ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

"اے آدم کی اولاد! ہم نے تم پر لباس اتارا کہ وہ تمھارے شرم کے حصوں کو ڈھانکے اور تمھارے جسموں کو موسموں کے اثر سے بچائے اور تم کو سنوارے۔" (اعراف: ۲۶)

مذکورہ بالا آیت میں یہ بتایا گیا کہ خدائے بزرگ و برتر نے لباس کو کیوں عطا فرمایا؟ لباس اس لیے عطا فرمایا کہ فرزندان آدم ان حصوں کو ڈھانک لیں جن کے کھلے رہنے سے ان کو شرم آتی ہو۔ مگر موجودہ سماج میں حیوانیت کا سیلاب زور و شور سے امڈا نظر آ رہا ہے۔ ملبوسات میں کافی تبدیلی آ گئی ہے۔ یوں لگتا ہے اس میں نئی نئی ایجادات کی جا رہی ہیں۔ دور قدیم میں ایسا لباس زیب تن کیا جاتا تھا جس سے جسم پوشی ہو سکے لیکن دور جدید میں ایسا لباس پسند کیا جاتا ہے جس

یعنی بے حیائی کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ ہو۔ کتب احادیث کے
مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے گھر کوئی لڑکی
باریک دوپٹہ اوڑھ کر آتی تو آپ تلقین و نصیحت کرتیں اور اکثر چادر
دینا ڈھاوا دیتیں تاکہ تربیت پر اچھا اثر پڑے۔ ارشاد باری
تعالیٰ ہے!

"اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ
دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب
طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں خدا تعالیٰ
معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (احزاب ۔ ۵۹)

پلو لٹکانے سے مراد ہے گھونگھٹ ڈالنا۔ خواتین کو چاہیے کہ
جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنی زینت کو چھپا کر نکلیں۔ پاؤں زور سے
زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں، ستر پوشی کریں، اپنی نگاہیں نیچی رکھیں
سینوں پر آنچل ڈالے رہیں، بیچ و بیچ کر اپنے کو دکھاتی نہ پھریں اور
اپنے اوپر گھونگھٹ ڈال لیا کریں تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ یہ نیک
نفس اور معزز خواتین ہیں۔ جو خواتین خوبصورت اور جاذب نظر نقش و
نگار اور بیل بوٹے والی ساڑیوں میں بس، برہنہ سر کھلے چہرے اور
اپنے بدن کے زیب و زینت کے حصوں کو عریاں کیے ہوئے باہر ادھر ادھر
گھومتی ہیں وہی غنڈوں اور برے لوگوں کی نظر کا نشانہ بنتی ہیں۔ ایسی
ہی خوش پوش خواتین کو دیکھ کر عشقیہ اشعار پڑھے جاتے ہیں اور ایسے
ہی خواتین پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔

شرم و حیا جو عورت کے لیے انمول زیور ہے روز بروز ختم ہوتی
جا رہی ہے اور بے حیائی و بے شرمی کے تباہ کن جراثیم بڑی سرعت
کے ساتھ پھیلتے جا رہے ہیں۔ بے حیائی اور بے شرمی کی وجہ سے لڑکوں
اور لڑکیوں میں انواع و اقسام کی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بے پردگی
و بے حجابی کا رواج عام ہے۔ بعض گھرانوں میں تو پردہ ہے ہی نہیں
اور جن گھرانوں میں پردہ کا رواج قائم و باقی ہے ان گھرانوں کی بہو
بیٹیاں بھی اس قسم کے برقعے پہننے لگی ہیں جن میں سے ان کا چہرہ اور
جسم حسین اور دلکش دکھائی دیتا ہے۔

برقعہ گھونگھٹ اور چادر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن ترقی کرتے
کرتے ایسا کچھ ہوتا جا رہا ہے کہ اس سے عورت کے مزاج کی کیفیت
اور اس کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں
سامنے آتے بھی نہیں والی شکل ہو جاتی ہے۔ برقعہ ایسا ہونا
چاہیے جو چست نہ ہو بلکہ ڈھیلا ڈھالا ہو جس سے جسم کے
نشیب و فراز کا اندازہ نہ لگایا جا سکے۔

عظیم المرتبت صحابی وحیہ کلبی کی روایت ہے کہ سرکار دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصر کا بنا ہوا باریک ململ آیا۔ حضور
اکرم نے اس میں سے ایک ٹکڑا مجھے عنایت کیا اور فرمایا کہ اپنی
قمیص بنا لینا اور جو بچے اہلیہ کو دے دینا۔ مگر ان کو تنبیہ و ہدایت
کر دینا کہ اس ململ کے نیچے ایک کپڑا پہن لیا کریں۔ تاکہ جسم و جسد
کے پوشیدہ حصے نہ جھلکیں۔

کتب احادیث میں مرقوم ہے کہ ایک دفعہ ام المومنین ۔
حضرت عائشہؓ کی بڑی ہمشیرہ صحابیہ حضرت اسماءؓ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے روبرو آئیں اس وقت وہ باریک لباس میں ملبوس
تھیں رسالت پناہ نے فوراً روئے مبارک کو پھیر لیا اور پر جلال
لہجہ میں فرمایا اے اسماءؓ! عورت جب بچپن کی معصوم سرحد
پھلانگ کر شباب کی گل ریز وادی میں پہونچ جائے تو اس کے
لیے جائز و مباح نہیں ہے کہ اس کے منہ اور ہاتھوں کے علاوہ
اس کے جسم کا کوئی عضو دکھائی دے۔ باریک لباس سے ۔
ستر کی حفاظت نہیں ہوتی۔

اللہ جل شانہ سورہ نور میں فرماتا ہے۔

"مومن عورتیں اپنی زینت، بناؤ سنگار، آرائش اور بیچ
دبیج نہ دکھائیں (بجز کسی مجبوری کے) جو آپ سے آپ کھل جائے
(وہ معاف ہے) اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل
ڈالے رہیں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں
کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اسے لوگ جان سکیں۔"
(نور ۔ ۳۱)

مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنی زینت کے حصوں کو چھپانے
کی از بس کوشش کریں۔ ہر گھڑی سینوں پر دوپٹوں کی آنچل
ڈالے رہیں۔ اور نامحرم مردوں کو دکھانے کے لیے بناؤ سنگار
کر کے بے نقاب ادھر ادھر نہ پھریں۔ کیونکہ احکام حجاب نازل
ہونے کے بعد ام المومنین حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابیات
ایام حج میں بھی حالت احرام کے علاوہ اپنے چہرہ اور پر نقاب

ڈال لیتی تھی۔ اگر حالت احرام میں کوئی غیر محرم مرد سامنے سے نکلتا تھا تو اس وقت وہ رخ پر نور کو پنکھے یا کپڑے کی اوٹ میں کر لیتی تھیں۔ پردہ کے متعلق اللہ جل جلالہٗ کا ارشاد ہے۔

"جب ان سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر طریقہ ہے"۔

(احزاب : ۵۳)

متذکرہ بالا آیت میں اللہ تعالٰی پردے سے ظاہری کے علاوہ باطنی حجاب کی تعلیم دیتا ہے۔ فرماتا ہے اے میرے بندو! تمہارے دلوں کی تسکین و صفائی کے لیے یہ نہایت مناسب اور بہتر طریقہ ہے۔ جب خدا تعالٰی مردوں اور عورتوں کو رو برو گفتگو کرنے سے روکتا ہے تو اسے یہ کیونکر پسند آ سکتا ہے کہ عورتیں مردوں کے ساتھ شریک بزم ہوں یا درسگاہوں میں ایک ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں۔

نظریں بچانے کے بارے میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے۔

"اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو، اپنی نظریں بچا کر رکھیں۔"

(نور - ۳۱)

عورتوں کو چاہیئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ غیر محرم مردوں کو ٹکٹکی لگا کر ہرگز نہ دیکھیں۔ بری باتوں کو نہ سنیں اور کسی برے کام کرنے کے لیے گھر سے باہر قدم نہ نکالیں۔ کیونکہ بری باتوں کو سن کر مزہ لینا کانوں کی بدکاری ہے۔ دیدہ بازی آنکھوں کی بدکاری ہے اور ناجائز کام کے لیے گھر سے قدم نکالنا پاؤں کی بدکاری ہے۔ جب برائی کی طرف لے جانے والے ان تمام اعضا پر شیخ نجدی قبضہ جما لیتا ہے تو جسم کا سب سے زیادہ شرم و حیا والا عضو بھی اس کی گرفت میں خود بخود آ جاتا ہے۔ اس وقت عورت بے نکیل اونٹ ہو جاتی ہے۔ مذہب کی بات اسے بے معنی لگنے لگتی ہے۔ بالآخر وہ بدکاری جیسے گناہ عظیم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور یہ گناہ آلود عورت اپنی اس حالت میں شاد و خرم اور مست و مگن رہنے لگتی ہے اور پھر اس وقت اسے اپنی بھیانک غلطی اور ہولناک لغزش کا احساس ہوتا ہے۔ جب اعضا جسمانی جواب دینے لگتے ہیں اور جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔

آقائے نامدار بے کسوں کے غمگسار سرور عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نظریں بچانے کے بارے میں شدید تنبیہ و تاکید کی ہے۔ چنانچہ ایک روز ام المومنین حضرت سلمہ اور حضرت میمونہ حضور رسول اللہ کے پاس بیٹھی تھیں۔ اتنے میں نابینا صحابی ابن ام مکتوم تشریف لائے۔ حضور نے فرمایا! ان سے پردہ کرو۔ دونوں نے دبے الفاظ میں بصد ادب و احترام عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو نابینا ہیں نہ ہمیں دیکھ سکیں گے اور نہ پہچان سکیں گے۔ جواب میں فرمایا! تم تو نابینا نہیں۔ تم تو ان کو دیکھ سکتی ہو۔

پردہ کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے اعلٰی تعلیم و تربیت کا بھی خیال کرنا از حد ضروری ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ زمانہ قدیم میں لڑکیاں پردہ میں رہ کر بھی ایسی اعلٰی و ارفع تعلیم حاصل کرتی تھیں جس کی نظیر عصر حاضر میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ حالانکہ پیشتر کے مقابلے میں تعلیم کا رواج کافی بڑھ گیا ہے۔ تقریباً ہمہ جہت لڑکیوں کی تعلیم و تدریس پر زور دیا جا رہا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر دیکھا جا رہا ہے کہ دور جدید کی لڑکیاں حصول تعلیم کے بعد قابو سے باہر ہو جاتی ہیں۔ اور معاشرے کی بنی سنوری رنگ برنگی شیطان فطرت لڑکیوں سے ہم آہنگ ہو کر غیر محدود خلا میں پرواز کرنے لگتی ہیں۔ اور بعض لڑکیاں تو کسی نوخیز پیکر حسن و جمال کے عشق مجازی کا نشانہ بھی بن جاتی ہیں۔ غرضیکہ تعلیم کے بعد بھی ان کی عادات و خصائل، طور طریق اور تہذیب و ثقافت میں کوئی خاص تبدیلی و ترقی نہیں ہوتی۔ جوہر اخلاق و شائستگی سے کوسوں گریزاں ہونے کی وجہ سے راہ ناصواب پر گامزن ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی غلط روی کے نتائج رسواکن اور نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ حصول تعلیم کے بعد نہ لڑکیاں اچھی بچیاں بن رہی ہیں اور نہ اچھی بیبیاں ہی ثابت ہو رہی ہیں۔ آج کی اکثر حسن خوبی حسن و اخلاق سے عاری لڑکیاں کاغذ کے خوشنما پھولوں کی طرح بن گئی ہیں جس میں خوشنمائی تو ضرور ہے مگر خوشبو نام کو نہیں۔

بہرکیف دانشوران لڑکیوں کی اس بدلی ہوئی روش پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس بات پر بہت کم غور و فکر

کیا جاتا ہے کہ آخر لڑکیوں کی روش میں یہ تبدیلی کیونکر واقع ہوئی میرے نزدیک تبدیلی کی وجہ آج کی تعلیم و تربیت کی خامی ہے۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جو ان کے بغیر متحرک اور پژمردہ قویٰ کو متحرک اور شگفتہ کر دے۔ نہ ایسی تعلیم جو متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔ ایسے علم سے لاعلمی لاکھ گنا بہتر ہے۔ فی الحقیقت تعلیم وہی ہے جو ہماری روزانہ کی زندگی میں کام آئے لیکن موجودہ مروجہ تعلیم ہماری روزمرہ کی زندگی سے کوسوں دور ہے، اس لیے اس میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔

لڑکیوں کے اخلاق کو بگاڑنے میں بدچلن اور فاحشہ استانیوں کا بھی ہاتھ ہے ان کی تربیت کو بگاڑنے میں گندے ناولوں اور رسالوں کا بھی دخل ہے۔ اس کے برعکس اعلیٰ درجے کے ناولوں سے اچھے نصائح اور مختلف مقامات کے اچھے رسوم و اطوار کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ساتھ قوت متخیلہ کی ترقی اور زبان دانی کی بھی واقفیت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں لڑکیوں کی فلاح و ترقی، وعظ و پند اور دینی متین کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و تلقین کے معیاری دلچسپ اور درج پر درکتابیں اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کیا کریں تاکہ قلب و ذہن اور اخلاق و کردار پر اچھا اثر پڑے۔ ہمارے خیال میں وہی انسان تعلیم یافتہ ہے جس نے اپنے قویٰ دماغی اور جسمانی کی تکمیل کی ہو۔ کیونکہ تعلیم کی اصلی غرض تربیت و اخلاق اور عادات کی درستی کے علاوہ انسانیت کی تکمیل ہے۔ اگر یہ نہیں تو علم بے معنی اور لاحاصل ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

ساتھ ہی ساتھ والدین سے ہماری مخلصانہ و مودبانہ گذارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دیں۔ کالج اور اسکولوں میں تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ گھر پر بھی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا انتظام کریں۔ کیونکہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم ہی ایک

ایسی تعلیم ہے جو لڑکیوں کے دلوں میں خوف و خشیت کی تمیز پیدا کر سکتی ہے۔ مذہبی تعلیم ہی زندگی کا سنگ بنیاد ہے اگر یہ ابتدائی اینٹ ٹیڑھی رکھ دی گئی تو اس پر چاہے کتنی ہی دیواریں اٹھائی جائیں وہ کج ہی اٹھیں گی۔ اس سلسلے میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اس کے علاوہ اولاد کے اخلاق و کردار پر ماں باپ کے خیالات و جذبات کا بھی غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔

لڑکیاں ایک لیمپ کی مانند ہیں اگر لیمپ کو احتیاط سے رکھا جائے تو گھر روشن رہے گا اور اگر حفاظت نہ کی جائے تو یہ لیمپ گر جائے گا اور آگ لگا دے گا۔ آج والدین کی بے التفاتی اور عدم توجہی سے ہی لڑکیاں بے راہ روی اختیار کر لیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شباب کی حسین و دلفریب وادی میں قدم رکھنے سے قبل ہی کتاب محبت کا سبق دہرانے لگتی ہیں اور جب مکمل طور پر جوانی کی رنگین گل پوش وادی میں پہونچ جاتی ہیں تو خود بخود شباب کی دلفریبیاں خود نمائی کرنے لگتی ہیں۔ والدین کو چاہیئے کہ روز اول ہی سے ان کے چال چلن پر گہری نظر رکھیں تاکہ ان کا دامن گناہوں کے بدنما دھبہ سے پاک و صاف رہے۔

بالآخر میں اپنی بہنوں سے یہی گذارش کروں گا کہ وہ اپنی کجروی کو خیرباد کہہ کر جادۂ مستقیم پر لگ جائیں۔ عزت اور شرافت کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑیں۔ کیونکہ اللہ عزوجل نے زنان بہشتی کے بارے میں ان کے حسن و جمال سے پہلے ان کی عزت و حمیت کی توصیف کی ہے یہ دنیا چند روزہ ہے۔ ہر ذی روح جس نے آغوش مادر دیکھا ہے یقیناً اسے کسی نہ کسی دن فنا کی چادر اوڑھنا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ قفس عنصری ٹوٹ جائے گا اور طائر روح عرش کی جانب پرواز کر جائے گا اور جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا جائے گا۔

المختصر یہ دنیائے دنی دار العمل ہے۔ آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فلاح و بہبودی اعمال صالحہ پر منحصر ہے۔ دنیائے شاعری کے درخشندہ ستارے میر ببر علی انیس نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا کیا نہ دنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

حاصل کلام یہ ہے کہ لڑکیوں کو شریفانہ و مخلصانہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔ لڑکیاں حسن کی نمائش نہ کریں بلکہ اپنے اندر پاکیزگی صداقت، عاجزی و خاکساری، خوش دلی، خوش اخلاقی، نیک خوئی، نرم مزاجی اور منکسر المزاجی جیسے اوصاف گراں مایہ پیدا کریں۔ جس سے اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمانے کے بعد بھی دنیا میں نیک نام خورشید و قمر کی طرح روشن و تابناک رہیں۔

اقوال زرّیں

فرمایا حضرت علی مشکل کشا نے

۱۔ عقل جیسی کوئی تونگری نہیں، ادب جیسی کوئی میراث نہیں، اور مشورہ جیسا کوئی مددگار نہیں۔

۲۔ اس انسان کو کبھی موت نہیں آتی جو علم کو زندگی بخشتا ہے وہ انسان کبھی فقیر نہیں کہلاتا جسے علم و عقل کی دولت حاصل ہے۔

۳۔ جو چھوٹے ہاتھ سے دیتا ہے وہ لمبے ہاتھ سے پاتا ہے۔

۴۔ جو زیادہ بولتا ہے وہ زیادہ غلطی کرتا ہے۔

۵۔ سخاوت انسان کی زینت ہے۔

۶۔ قناعت وہ دولت ہے جو کبھی کم نہیں ہو سکتی قناعت ایک سلطنت کی مانند ہے۔

۷۔ جھگڑے سے عزیز داری ٹوٹ جاتی ہے۔ لہذا جھگڑوں سے بچو۔

۸۔ جہالت سے بڑھ کر کوئی فقیری نہیں ہے۔ اکثر عیبوں کا سرچشمہ ہے۔

۹۔ اپنی آرزوؤں کو کم کرو ورنہ مصیبتوں میں پھنس جاؤ گے۔

۱۰۔ غصہ کو ضبط کرو ورنہ کبھی خوش نہ رہ سکو گے غصہ بہت سے نامناسب کام کرا دیتا ہے۔

۱۱۔ جھوٹے سے الگ رہو کیونکہ وہ سراب کے مانند ہے جو دور کی چیزوں کو قریب اور قریب کی چیزوں کو دور کر کے دکھاتا ہے

مرسلہ۔ ایم ایس جہاں محی الدین پور

تبصرا

چاندی کے تار

ضیا حسنی کے ۱۵ افسانوں کا مجموعہ۔ سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ صفحات ۱۵۰ طباعت اور جلد معمولی۔ قیمت چھ روپیہ۔

ضیا صاحب کہنہ مشق لکھنے والے ہیں۔ کبھی وہ حریم میں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کی نئی کتابیں اردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہو چکی ہیں۔ چاندی کے تار کو بھی نہ صرف اردو اکیڈمی کا مالی اشتراک حاصل رہا بلکہ اسے گزشتہ تقسیم انعام کے موقع پر پانچسو روپیہ سے بھی نوازا گیا۔ ان باتوں سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ضیا صاحب اچھا لکھتے ہیں۔

ضیا صاحب کے افسانوں کو زندگی کی قربت حاصل ہوتی ہے وہ جو کچھ دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں اسے افسانوی ادب بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے افسانوں میں اصلاحی پہلو کم پائیں یا انھیں سبق آموز نہ سمجھ سکیں، لیکن ان میں عریانی یا فحاشی نہیں ہوتی۔ یہی کیا کم ہے آج کل زیادہ تر افسانوں کو کامیاب بنانے کے لئے ان کے لکھنے والے انھیں رنگین بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضیا صاحب کے جو افسانے بھی میں نے پڑھے انھیں اس گندگی سے پاک و صاف پایا۔

آہ مولانا عتیق میاں صاحب قبلہ فرنگی محلی

یہ خبر نہایت رنج و غم سے سنی جائے گی کہ مرکز علم و ادب فرنگی محل کے عالم و فاضل بزرگ جناب مولانا عتیق میاں صاحب کا ۲۷ مئی ۱۹۶۸ء کی سہ پہر میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ ۲۸ مئی کو ۹ بجے صبح کیننگ باغ لکھنؤ میں مولانا نا مولانا صاحب قبلہ نے پڑھائی جس میں ایک لاکھ سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد جسد خاکی آبائی قبرستان باغ مولوی انوار صاحب میں سپرد خاک کیا گیا۔ لکھنؤ میں اتنے زیادہ سوگوار اس سے پہلے کسی بھی جنازے کے ساتھ نہیں دیکھے گئے۔ مولانا مرحوم کی ذات گرامی سے جو فیض عامۃ المسلمین کو پہنچ رہا تھا۔ وہ ختم ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بزم حریم

اس عنوانات کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے بشرطیکہ خبر ولادت، شادی اور غمی سے متعلق ہوں، مختصر ہے مختصر اور صاف صاف لکھی گئی ہوں، ساتھ ہی نمبر خریداری لکھیں اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی روانہ فرمائیں خبر کی اشاعت میں طباعت کی غلطی کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔ ہاں اطلاع ملنے پر غلطی کی صحت کر دی جائے گی۔ ۲۰ تاریخ تک وصول ہونے والی خبریں ہی سر دست اشاعت ہونگی۔

ولادت اطفال کی خبریں

● مسز نسیم رؤف خاں (دیولالی کیمپ) "میری بھابی گوہر اور بھیا بشیر حسین کے گلشن حیات میں پہلی بار یکم مارچ ۸۳ء بروز منگل بوقت ۶ بجے شام اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور بلند اقبال بنائے۔

● انجم افشاں (کٹک) "میری بھابی عارفہ خاتون کے گلشن حیات میں پہلا پیارا ایک چاند سا گڈیا عطا کر کے ہمکو نانی بنا دیا نام افروز بیگم رکھا گیا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔

● نسیم اختر (زند لاری) (کانپور) "ہمارے منجھلے بھائی بدر عالم لاری اور بھابی بشریٰ بدر کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ۳۰ جنوری ۸۳ء بروز اتوار بوقت ۴½ بجے صبح ایک حسین کلی کھلائی۔ نام فاذینہ بدر عرف پنکی قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

● شبنم نسیم (بانس پار بہوروا) "میری نند باجی طلعت جہاں شاہ اور بھائی جان کی زندگی کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۱۳ مارچ ۸۳ء بروز جمعرات بوقت ۱۲ بجے شب ایک پھول کھلایا۔ اللہ تعالیٰ اسے شاداب رکھے اور فخر خاندان بنائے

● مسز منہ خاتون زیدی (دہلی) میرے پھوپھی زاد بھائی سید کاظم رضا کاظمی ردولوی کے گلزار حیات میں ۲۶ اپریل ۸۳ء بروز منگل بوقت ۹ بجے صبح ایک ننھا سا پھول اللہ تعالیٰ نے کھلایا۔ نام احسن رضا کاظمی رکھا گیا۔ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● کلثوم پروین لاری (دیوریا) میری چھوٹی بہن قیصر جہاں لاری اور بہنوئی پروفیسر شمشاد عالم کے گلشن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۱۳ مارچ ۸۳ء بروز اتوار ½۱۱ بجے دن کو ایک چاند سا فرزند عطا فرمایا۔ نام غفران عالم قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائے۔

● راشدہ بانو (چتوارپور) میری نند عابدہ خانم اور ثنا اللہ بابو کے گلشن حیات میں ۲ مئی ۸۳ء بروز دوشنبہ بوقت ۹ بجے شب ایک پھول کھلا پیار کا نام "نجمی" رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر نوح عطا فرمائے اور فخر خاندان بنے۔

پیغامات نشاط

● میرے مرحوم کرم فرما ڈاکٹر ایم اکرام صاحب کی بیگم عظیمہ اکرام صاحب نے اپنے فرزند ضیاء الدین احمد سلمہٗ کی شادی کی دعوت مجھے دی جو شاہین سلمہا (دختر نیک اختر ایم۔ اے کریم صاحب مرحوم) کے ساتھ ۵ مئی ۸۳ء کو بمقام مدراس عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے اور ضیا سلمہا کی یہ نئی زندگی خوشگوار گذرے۔ (نسیم انہونوی)

● حاجی ابوالحسن اللہ والا صاحب کے فرزند دلبند مظہر الحسن سلمہٗ کی شادی خانہ آبادی قمر جہاں سلمہا (دختر نیک اختر جناب حاجی محمد طاہر صاحب) کے ساتھ ۸ مئی ۸۳ء بروز اتوار بمقام ذکریا اسٹریٹ کلکتہ بحسن و خوبی عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

● عزیزی سید محمد صغیر اشرفی سلمہٗ فرزند دلبند جناب نعیم اشرفی صاحب (بیولی ضلع سلطان پور) کی شادی خانہ آبادی عزیزہ شیریں سلمہا (دختر نیک اختر جناب مجیب الدین صاحب) کے ساتھ بتاریخ ۲۳ مئی ۸۳ء بمقام عروس بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ صغیر سلمہٗ کی ازدواجی زندگی مسرتوں اور شادمانیوں میں گذرے افسوس کہ میں اپنی خرابی صحت کی بنا پر شرکت نہ کر سکا۔ بہرحال دل سے دعا ہے کہ یہ شادی مبارک ہو۔ (نسیم انہونوی)

سامنے اٹھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا [illegible] آنکھوں کے سامنے تھا
نماز جنازہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی مسجد میں بعد نماز ظہر ان نے
پڑھی اور جسد خاکی نشاط گنج کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔
مرحوم کے دو لڑکے اور ایک لڑکی فارن میں ہیں۔ وہ دیدار سے
بھی محروم رہے۔ سب سے بڑی بیٹی خورشید جو شادی کے بعد بھی انھیں
کے پاس رہتی۔ اس کی والدہ اور سب سے چھوٹی بیٹی۔ نجم السحر سلمہا
کی ہیلی بٹ بی ان کے پاس تھیں۔ اللہ پاک ان سب کو صبر جمیل عطا
فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(نسیم انہونوی)

• ڈاکٹر (خوش ہوکر) آج تو آپ بڑی آسانی سے کھانس رہے ہیں۔
مریض۔ (چڑ کر) جی ہاں، میں رات بھر اسی کی مشق کرتا رہا ہوں۔"

• بس میں ایک صاحب بڑی دیر سے اپنی چھینک روک رہے
تھے چھینک آتی تو وہ عجیب مضحکہ خیز شکل بنا کر روک دیتے۔ ایک ہمسفر
سے ضبط نہ ہو سکا تو اس نے کہا "آخر آپ چھینک کیوں نہیں لیتے؟!
آخر وجہ کیا ہے؟"
وہ صاحب بولے "میری بیوی کا کہنا تھا کہ جب آپ کو چھینک
آئے تو سمجھ لیجئے میں نے آپ کو یاد کیا ہے اور آپ کو فوراً میرے پاس
آجانا چاہیئے۔"
"پھر کیا ہوا؟" ہمسفر نے پوچھا
وہ صاحب بولے "میری بیوی فوت ہو گئی ہے۔"

استاد۔ اردو زبان کو ہم مادری زبان کیوں کہتے ہیں؟
گڈو:۔ اس لئے کہ جب امی بولتی ہیں تو ابا جان کا نمبر ہی نہیں آتا۔

• ایک صاحب اپنے موٹاپے سے تنگ آ کر خودکشی کے لیے ایک
اونچی عمارت سے نیچے کود گئے۔ ہسپتال میں جب انھیں ہوش آیا
وہ بولے:۔
"کیا میں زندہ ہوں"
ڈیوٹی پر موجود نرس نے جواب دیا۔ "جی ہاں، لیکن وہ تینوں مر گئے
جن کے اوپر آپ گرے تھے۔"

• شوہر:۔ "کیا تم بتا سکتی ہو اس دنیا میں سب سے زیادہ خوش لوگ
کون تھے؟"
بیوی:۔ "آدم اور حوّا"
شوہر:۔ "وہ کس طرح؟"
بیوی:۔ "ان کی ساس نہیں تھی"

• بیوی (خاوند سے) "آج آپ دیر سے کیوں آئے؟"
خاوند:۔ دفتر میں بہت مصروف رہا۔ سارا دن ٹیلیفون پر بیٹھا رہا۔
بیوی (حیرت سے) "کیا دفتر میں بیٹھنے کے لئے کوئی کرسی نہیں تھی؟"

• دفتر سے واپس آ کر ایک شوہر نے اپنی بیوی سے کہا "ڈارلنگ!
جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج تو یہ جی چاہ رہا ہے کہ کھانا کسی اچھے سے
ریسٹوران میں کھایا جائے۔"
بیوی بولی "میں ابھی تیار ہوئے جاتی ہوں مگر تمہیں یہ نیا خیال سوجھا
کیسے؟" شوہر نے وضاحت کی "اس لئے کہ کھانا پکانے اور برتن دھونے
کو آج میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

• ایک صاحب کو راستہ میں سپاہی نے روک کر پوچھا کہ اتنی رات
کو وہ کہاں جا رہے ہیں تو ان صاحب نے جواب دیا "تقریر سننے۔"
سپاہی بولا "اتنی رات کو بھلا کہاں تقریر ہو رہی ہوگی؟"
وہ صاحب کہنے لگے "چل کر دیکھئے میری بیوی کے لئے تقریر کا یہی
وقت ہے۔"

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں اور جواب طلب امور
کے لئے جوابی کارڈ بھیجیں

پھر ان کا دل پگھلے گا!"

"جو کچھ کیجیے جلدی کیجیے! میں خرم کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ لیا جانا پسند نہیں کرتی۔"

"ایک بات میری مان لو۔ ترنم۔"

"کہیے۔"

"کسی کے احسان سے مرعوب ہو کر یا متاثر ہو کر آدمی ڈھنگ سے وہ نہیں کہہ سکتا جو کہنا چاہتا ہے۔ میں ڈیڈی اور ماجدہ خالہ کا مرہون احسان ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ احسان کے اس جوئے کو گلے سے اتار دوں اور پھر بے خوف ہو کر وہ سب کہہ دوں جو میرے دل میں ہے۔"

"پھر وہی غیریت۔!"

"غیریت نہیں ہے۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ تم بے چون و چرا میرا کہا مان لو۔ ورنہ پھر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ تم زبردستی مجھے اپنے والدین کے سامنے شرمندہ رکھنا چاہتی ہو۔"

"کتنا ہے ان دونوں کا واجب الادا قرض۔؟"

"کوئی بیس ہزار روپے۔!"

"سنئے دیکھئے۔ آپ کا کہنا سچ ہے۔ احسان آدمی کو جا بے جا حکم ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مگر آپ کے پاس اتنی رقم کہاں ہے!"

"تمہیں نے دی تھی۔ وہ ابھی تک الماری میں محفوظ ہے۔"

"خرچ نہیں کی!"

"نہیں!"

کب آئے گا۔

اڑانے لگیں۔

"ہاں وہ نا سمجھ ہیں۔ بیس برس کی ڈھو ڈو کو ان اولاد پھر چاہتے ہیں! وہ دن دور نہیں جب سر پکڑ کر آنسو بہائیں گے۔ ہمارے خرم کے لیے موتی کی بے تابش سے کھلونوں بازی کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور وہ انھوں نے اکیلا کیا اور ترنم کھنڈے پتوں سنا کیے! انہیں ساری باتیں سنا دی تھیں جو میں نے تمہیں سکھا دی تھیں۔ وہ بھول گئے ہوں گے۔ کہا نہیں کہ میری پانچ ہزار روپیہ آمدنی ہے؟"

"بکومت!" معظم صاحب جھلا گئے۔ وہ بیوی کے سے انتہا پرواز، عصیر، اور چالباز، خود غرض نہیں تھے ان میں بس یہ ایک خرابی تھی کہ عقل کے کچھ کمزور تھے۔ اور بیوی کو افلاطون سمجھ کر ان کی رائے اور عقل پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے!

"میں کہہ دیتا کہ میری آمدنی پانچ ہزار ہے: وہ بے حد بگڑ گئے لے۔ کل کو جھوٹ کھل جاتا تو میں صورت دکھانے کے بھی قابل نہ رہ جاتا!"

"مگر پھر گھاس کھود دی ہے آپ نے:" زحمت نے گلفشانی فرمائی: "جھوٹ اگر کھل جاتا تو کھل جانے دیا ہوتا۔ پھر شادی کے بعد کیا ہوتا تھا۔ تلوے تلے دبا کے رکھتی میں چھچھوکری کو..."

"کس کو؟؟" تعجب سے گنگ ہو کر معظم صاحب نے پوچھا۔

"اپنی نواب زادی کو جو باپ کی دو کوڑی کی موٹر پر اڑی اڑی پھرتی ہے۔ ہائے اللہ کسی طرح وہ موٹر اجڑ جائے۔ آپ ساری زندگی اتنی سی تنخواہ پر جھک مارا کیے مگر موٹر نہ خرید لی۔ جو کچھ پایا ہو دوستوں کی قبروں میں بھر دیا۔ آج ترستا کاہے کو پھرتا!"

"پاگل ہو گئی ہو۔ ماجد صاحب کی صاحبزادی کے متعلق ایسے برے خیالات

آپ ماں ہیں۔ اگر نہیں تو کسی کی بیٹی، بہو یا بہن ہوں گی اور آج نہیں تو ان شاء اللہ کسی روز ماں ضرور بنیں گی۔ عورت کی تخلیق کا مطلب اور مقصد اللہ کے نزدیک یہی تھا اور ہے کہ وہ ماں بنے۔

اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ہر عورت ماں بننا چاہتی ہے۔ جو کسی جسمانی نقص یا اور سبب سے ماں نہیں بن پاتیں۔ ان کی زندگی میں ایک ایسا خلا رہتا ہے جو کبھی دور نہیں ہو پاتا۔ مستثنیات کا ذکر نہیں، ویسے ہر عورت یہی چاہتی ہے کہ اس کی گود ہری ہو وہ ماں بنے، ماں کہلائے اور کوئی اُسے امی، اماں یا ممی کہکر مخاطب کرے۔ ماں بننے کیلئے عورت کیسی کیسی صعوبتیں اٹھاتی ہے۔ کس طرح ماں بنکر وہ گویا دوبارہ زندگی پاتی ہے۔ پھر بچے کے لئے وہ کس طرح اپنا سکھ چین سب کچھ برباد کردیتی ہے۔ اس کے لئے وہ راتوں کی نیند حرام کرلیتی ہے۔ اس کے لئے تن من دھن سب کچھ نچھاور کردیتی ہے۔ کوئی غور کرے ایک ماں بننے والی کی مشکلات کا۔ سوچے ان تکالیف کو جو اسے اٹھانا پڑتی ہیں۔ دیکھے ان شدائد کو جو اسے برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ کس بے چینی اور بے کلی کے ساتھ وہ، وہ دن گزارتی ہے۔ جب اس کا ہونے والا بچہ اس کی کوکھ میں ہوتا ہے۔ اور پھر سوچے اس اذیت کے متعلق جو اس وقت اسے اٹھانا پڑتی ہے جب اس کا بچہ عالم وجود میں آتا ہے۔ یقین کیجئے کہ اگر یہ فطری تقاضہ نہ ہوتا تو کوئی عورت ماں بننے کے لئے تیار نہ ہوا کرتی۔ لیکن جو بات قدرت چاہتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ قدرت سے بغاوت آسان نہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ قدرت کے تقاضے سے روگردانی ممکن ہی نہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ماں نہ بن سکنے والی اکثر عورتیں دوسروں کے بچوں کو گود لے لیتی ہیں۔ اور انھیں مثل اولاد کے ہی پالتی ہیں اور پھر ماں ہی کی طرح اپنا پیار عطا کردیتی ہیں۔ اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ ماں بننا ایک فطری تقاضہ ہے اور ہر عورت کو چاہیئے کہ اس تقاضے کو پورا کرے۔ اس فرض کو ادا کرے جس کے لئے قدرت نے اسے پیدا کیا اور جسے وہ تمام صلاحیتیں بخشیں، جن کی ماں بننے سے پہلے اور بعد میں ضرورت ہوتی ہے۔

بچوں

کے سلسلہ میں ماں کے فرائض

لاتعداد ہیں۔ اور انھیں ادا کرنا ہر ماں کا فرض ہے

نسیم انہونوی

یہ تو تھا اس تقاضائے فطرت کا اظہار اور اس کے بعد میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بچے کو جنم دے کر یا اپنا خون جگر پلا کر پال پوس لینے ہی سے ماں عہدہ برآ نہیں ہوجاتی، بلکہ اس پر دوسرے فرائض لاگو ہوجاتے ہیں۔ مثلاً

بچہ کو اس کی عمر کے اعتبار سے غذا دینا اور آرام پہنچانا۔

بچہ کو ابتدا ہی سے اخلاقی باتیں یا کہانیاں سنانا۔

بچہ کو کھیل ہی کھیل میں تعلیم دینا

بچہ کو صاف ستھرا رہنے۔ سچ بولنے، غیبت نہ کرنے اور بزرگوں کا ادب کرنے کی باتیں سکھانا۔

بچے کو خدا رسول اور بزرگان دین کی باتیں ایسے اختصار اور انداز میں سنانا کہ اس کا ذہن دلچسپی کے ساتھ انھیں سینے۔

بچے کو اچھے اسکول میں پڑھانا اور دینی تعلیم دینا۔

بچے کو اچھے ہی بچوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھیلنے کی اجازت دینا۔

بچے کو یہ سمجھانا کہ کیا برا ہے کیا بھلا ہوتا ہے۔

بچے کے سلسلے میں یہ خیال رکھنا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ کس سے ملتا ہے۔ اس کے مشاغل کیا ہیں۔ ماں کی نگاہیں گھر سے کی نگاہ کا کام کرتے

ہوئے اس کے تعاقب میں رہیں بچے کا ذہن کس طرف زیادہ راغب ہے۔ جس چیز سے اسے فطری دلچسپی ہو اسی کی تعلیم دینا۔

بچے کو اگر وہ بڑا ہو جائے تو نماز روزے کی تعلیم دے کر ان فرائض کی ادائی کے لئے اسے آمادہ کرنا۔

غرض اسی طرح کے بہت سے کام اور فرائض ماں کی ذات سے بچے کے سلسلے میں عائد ہوتے ہیں۔ اب آپ میں سے جو بھی ماں بن چکی ہوں وہ سوچیں کہ کس حد تک ان فرائض سے عہدہ برآ ہوتی ہیں۔

ماں بننا جیسا کہ میں نے لکھا ہے، فطری تقاضہ ہے، لیکن ماں بننے کے بعد اگر بچے کو اچھی تعلیم و تربیت نہیں دی جاتی اور اس میں ایسی صلاحیتیں پیدا نہیں کی جاتیں کہ وہ نیک سعادت مند۔ فرمانبردار اور تعلیم یافتہ بن سکے تو یہ فرض ادھورا ہی ہو پاتا ہے۔ ایک کسان کا کام اتنا نہیں ہوتا کہ کھیت میں بیج ڈال کر کھیت اور کھیت سے پیدا ہونے والی چیزوں سے لاپروا ہو جائے۔ کسی کسان کے عمل کو دیکھئے کہ وہ کس طرح کھیت کو جوتتا ہے۔ کس طرح تخم ریزی کرتا ہے اور کس طرح بعد میں کھیت کی نگرانی کرتا ہے۔ کس طرح گھاس پھوس کو صاف کرتا ہے اور کس طرح پودوں کی حفاظت کرتا ہے۔ کیڑا لگ رہا ہو تو اس کا تدارک کرتا۔ چڑیوں اور جانوروں سے، جو فصل کو تباہ و برباد کرتے ہیں، کھیتوں سے دور رکھتا ہے۔ فصل تیار ہو جانے پر غلّہ کو احتیاط سے نکال کر بھوسا جدا کرتا ہے اور اسے احتیاط سے بازاروں میں فروخت کرنے لے جاتا ہے۔ اس کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا غلہ عمدہ ہو۔ بازار میں اسکی قیمت اچھی ملے۔ اور جو اسے خرید کر کھائے اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اب سوچنے والی بات یہ ہے کہ معمولی غلہ اگانے کے لئے کسان کو ابتدا سے انتہا تک یعنی بونے کے لئے کھیت تیار کرنے سے فصل کٹنے تک اسے کیسی کیسی محنت کرنا پڑتی ہے کیسی کیسی احتیاطیں برتنا پڑتی ہیں۔ بچوں کی پیدائش اور پرورش و پرداخت تو کسان کے غلہ اگانے سے کہیں زیادہ اہم بات ہے۔ اس لئے والدین کو خصوصیت سے ماؤں کو اس سلسلہ میں پوری توجہ کرنا چاہئے۔ ان کی کوشش ہونی چاہئے کہ ان کے بچے ملک و ملت کے بہترین انسان بن کر نام پیدا کر سکیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فی زمانہ مائیں بچوں کی تربیت کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتی ہیں۔ ان کی اسی کم توجہی سے بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی لکھنے پر مجبور ہوں کہ اپنی آمدنی کے پیش نظر ہی بچے پیدا کیجئے تاکہ انھیں آپ اچھی طرح کھلا، پہنا اور تعلیم دلا سکیں۔ اس گرانی کے دور میں اوسط درجہ کی تربیت و تعلیم پر بھی سو روپیہ فی بچہ سے کم خرچ نہیں آتا۔ کم آمدنی والے والدین اگر کثیر العیال ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کو معیاری تعلیم و تربیت نہیں دے پاتے۔ جس سے نہ صرف خود انھیں تکلیف ہوتی ہے، بلکہ بچے بھی دل مار مار کر رہتے ہیں۔ نہ اچھی غذا انھیں میسر آتی ہے، نہ اچھا لباس، نہ اچھی تعلیم۔ ایسے بچوں سے آبادی میں اضافہ کرنا بے معنی سی بات ہے۔

کیسے افسانے لکھیں

حریم کی پچاسوں خریدار بہنیں اور بھانجیاں حریم میں شائع ہونے کے لئے اپنے افسانے روانہ کرتی ہیں، جنھیں افسوس کہ ہم جگہ نہیں دے پاتے۔ اول تو ان لکھنے والیوں کے ذہن میں افسانوں کے سوا کوئی اور چیز آتی ہی نہیں اور یہ افسانے بھی ۹۹ فی صدی محض عشق و محبت کی کامیاب یا ناکام داستانیں ہوتی ہیں جن میں نہ کوئی پیغام ہوتا ہے نہ سبق اور نہ نصیحت۔ اکثر بہنیں پوچھا کرتی ہیں کہ پھر کس طرح کے افسانے لکھوں۔ ایسی بہنوں سے عرض ہے کہ اسی حریم میں دو ویسے افسانے سکھ دکھ کا ساتھ اور زلزل کی عدالت شائع ہو چکے ہیں جو سبق آموز ہیں۔ اسیطرح کے بہت سے افسانے لکھے جا سکتے ہیں۔ روزانہ نہ جانے کتنے عبرتناک واقعات ہمارے علم میں آتے رہتے ہیں، انھیں کہانی کا روپ دے کر آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے کہ ہم صرف انھیں مضامین پر غور کرتے ہیں جن پر نمبر خریداری لکھا ہوتا ہے۔ ایسے مضامین جن پر نمبر خریداری نہیں لکھا ہوتا ہم تلف کر دیتے ہیں۔ (ادارہ)

سلام شوق

بحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

گذر ہو سوئے مدینہ جو تمہارا جب مقدر سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

عرب کے مہ لقا ہیں جو مرا کہنا سلام ان سے
نگار دلبربا ہیں جو مرا کہنا سلام ان سے
انیس بے نوا ہیں جو مرا کہنا سلام ان سے
غم ا رہی دوا ہیں جو مرا کہنا سلام ان سے
جو قرب حاصل ہو تم کو روضۂ پرنور و اطہر سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

سیاہی زلف لیلیٰ کی جو پھیلے ریگ زاروں پر
سکوت شب کا ہو جائے جو پہرہ کوہساروں پر
ضیا ملکی نظر آئے جو گردوں کے کناروں پر
جلا ہونے لگے جب نور کی مدھم ستاروں پر
نقاب اٹھنے لگے جب چہرۂ مہتاب انور سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

نئے انداز سے اٹھلا کے جب باد سحر آئے
صبا لے کر کوئی پیغام جب فرحت اثر آئے
تبسم جب لب نازک پہ کلیوں کے نظر آئے
گلوں کا غسل شبنم سے جو رنگ روئے نکھر آئے
سرور آنے لگے آنکھوں میں جب پرکیف منظر سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

جو لے جائے سوئے طیبہ تمہارا کارواں جائے
دل بیتاب کو اپنی منزل کا نشاں جائے
لے تسکین و فرحت سوزش قلب تپاں جائے
مدینے سے ہوا آکر جو بن عنبر فشاں جائے
مشام جاں معطر ہوں شمیم روح پرور سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

مبارک ہو تمہیں اب وہ مقدس سرزمیں دیکھو
نہے قسمت کہ شہر رحمت اللعالمیں دیکھو
جمال گنبد خضرا کو بے حد دلنشیں دیکھو
سرِ فرش زمیں تم جلوۂ عرش بریں دیکھو
منور دیدہ و دل ہوں جو نور رب اکبر سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

خبر دینا انہیں جا کر کہ ابتر حال امت ہے
نہیں اگلی سی باقی اب وہ ان کی شان و شوکت ہے
شجاعت رہ گئی ان میں نہ اخوت ہے نہ الفت ہے
مٹا کر غیرت اسلام بالکل پست ہمت ہے
یہ روداد الم ان کو سنا کر قلب مضطر سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

یہ کہنا مری جانب سے کہ محسنِ انبیا، آؤ ۔۔۔ ضرورت ہے تمہاری جلد شاہ دوسرا آؤ
اندھیرا کفر کا چھایا ہے اے نورِ الٰہی آؤ ۔۔۔ بھنور میں کشتی ملت ہے بن کر ناخدا آؤ

مری عرض تمنا کرکے ان کی ذات برتر سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

بہت منت سے کہنا آستاں بوسی کا ارماں ہے ۔۔۔ رسائی کا مگر کوئی نہیں اب بھی تو امکاں ہے
اندھیروں میں بھٹک کر رہ گئی روحِ درخشاں ہے ۔۔۔ کہ محروم سحر اس کی ابھی تک شام ہجراں ہے

دل حسرت زدہ کا حال کہہ کر میرے سرور سے
سلام شوق کہنا تم مرا خالق کے دلبر سے

——— درخشاں ملیح آبادی

اقوال زریں

۱۔ دولت سے کتابیں خریدی جاسکتی ہیں علم نہیں!
۲۔ دولت سے لڑکا خریدا جاسکتا ہے بیٹا نہیں!
۳۔ دولت سے نرم بستر خریدے جاسکتے ہیں نیند نہیں!
۴۔ دولت سے خوشامد خریدی جاسکتی ہے محبت نہیں!
۵۔ دولت سے زیورات خریدے جاسکتے ہیں حسن نہیں!
۶۔ دولت سے دوا خریدی جاسکتی ہے۔ صحت نہیں۔
۷۔ دولت سے عورت خریدی جاسکتی ہے وفاشعار بیوی نہیں!
۸۔ دولت سے عینک خریدی جاسکتی ہے آنکھوں کی روشنی نہیں!
۹۔ دولت سے جسمانی راحت خریدی جاسکتی ہے روحانی مسرت نہیں!

مرسلہ :۔ طلعت ناز رضوی۔ گیا

سُکھ دُکھ کا ساتھ

نعمت پروین

جیوں ہی بھائی جان نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا گھر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ دبلی پتلی چھریرا سا بدن لمبا قد ستواں ناک۔ گلاب کی پنکھڑیوں کے مانند ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں، کمر تک جھولتے ہوئے بال رنگت اتنی پیاری جیسے کسی نے دودھ اور میدے میں سندوری رنگ ڈال دیا ہو۔ یہ تھا بھیا کا خیال تھا کہ جو وہ اپنی دلہن کے لئے بنایا کرتے تھے اور یہاں.......... بوٹا قد، گول مٹول ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں کاندھے تک جھولتے بال، تانبے کی طرح تپتا ہوا گہرا بادامی رنگ۔ چ بھابھی کا ہر عضو بھیا کے خیالی تصور سے جدا تھا۔ ایں...... یہ کیا بھیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس سے بھلی صورت تو ہماری نوکرانی کی ہے بھیا نے بھابھی کا گھونگھٹ چھوڑتے ہوئے بے رخی سے کہا تھا۔

بس وہ دن اور آج کا دن حسن سیرت ہونے کے باوجود حسن صورت کی کمی کے بنا پر بھابھی بھیا کی پیاری نہ ہو سکیں۔ کاش کوئی میری آنکھوں سے بھابھی کو دیکھتا۔ بھابھی کی چھوٹی چھوٹی معصوم آنکھیں مجھے یوں لگتیں جیسے کسی نازک سی ننھی سیپی نے ہولے سے اپنا منھ کھول دیا ہو۔ سُرخ رنگ کے چھوٹی سی لونگ نے گول مٹول ناک میں خاصی کشش پیدا کر رکھی تھی۔ کاندھے تک جھولتے بال کسی مصوّر کے شاہکار سے کم نہ تھے اور پھر سانولے رنگ کی تعریف تو شاعر بھی اپنی غزلوں میں کیا کرتے ہیں۔ مگر بھیا تو اسے اپنی نوکرانی سے بھی کم سمجھتے تھے۔

جب سے بھابھی نے گھر میں قدم رکھا گھر کی فضا ہی بدل گئی خود کہہ رہے ہوتے بھابھی نوکروں کی ضرورت محسوس ہی نہیں [illegible] کرتی [illegible] سے بچا ہوا اگر کسی چیز کو ڈھونڈنے کی ضرورت [illegible] ٹیبل پٹی تھی کیونکہ بھابھی ہر چیز کے لئے ایک جگہ بنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ بھابھی کو جب بھی فرصت ملتی وہ مجھے [illegible] سے دو چار کراتیں۔

ہنس کر کہتیں "ناز دیہی چیز تو سسرال میں کام آئے گی۔" میں بھی مسکرا کر رہ جاتی۔ اُف کتنی پیاری ہیں میری بھابھی مگر بھیا کو کون سمجھائے جنھوں نے انھیں بھوت کا روگ سمجھ رکھا تھا۔

ایک دن جیوں ہی بھیا تھکے ہارے آفس سے آئے بھابھی ان کے ساتھ کمرے میں جا پہنچیں۔ جھک کر جیسے ہی انھوں نے جوتے کا فیتہ کھولنا چاہا بھیا نے انھیں خود سے یوں دور کر دیا جیسے وہ کوئی بجلی کا تار ہوں اور جس کے چھو جانے سے کرنٹ لگنے کا ڈر ہو۔ بھابھی دیوار کا سہارا لے کر اپنی کم نصیبی پر رونے لگیں۔ تبھی بھائی جان نے بڑی زوردار آواز میں کہا تھا "اگر کسی سے لپٹ کر رونے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہاں پر ٹیبل، کرسی، میز، چوکی کی کمی نہیں"۔

بھابھی سسکتی ہوئی کمرے سے باہر آگئیں اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں "ناز تو ہی بتا میں بدصورت ہوں تو بھلا اس میں میرا کیا قصور۔ تیرے بھیا مجھ سے بیزار ہیں"۔ بھابھی روتی رہیں میں ان کے بالوں کو سہلاتی رہی۔ یہ تو روز کا دستور تھا۔ جب بھی بھابھی کے زخم خوردہ دل پر ٹھیس لگتی وہ میرے سامنے دل کی بھڑاس نکالتیں اور میں انھیں تسلّی دینے کے لئے دو چار لفظ کہنے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔

بھائی جان کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا بھابھی ان کی خدمت میں دن رات ایک کیے ہوئے تھیں۔ بھیا اب ان سے اتنے بیزار تو نظر آتے لیکن سرد مہری جیوں کی تیوں برقرار تھی۔ بھیا کافی نحیف اور کمزور ہو گئے تھے ڈاکٹر کو بھی کافی تشویش تھی۔

بھابھی مصلّے پر سجدہ میں زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان کی ہچکیاں صاف مجھے صاف سنائی دے رہی تھی "اے میرے پروردگار میری زندگی کا ایک ایک قطرہ میرے محبوب کی زندگی میں شامل کر دے۔ میرے سہاگ کو مجھ سے نہ الگ کیا ہوا۔ [illegible] کیا کم ہے کہ وہ

میری نظروں کے سامنے ہیں۔ مجھے موت دے کر بھی انھیں زندگی بخش دے۔ تاکہ میرا سہاگ قائم رہے۔ وہی سہاگ جو ایک شریف بیوی کو سب سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بھابھی کا ایک ایک لفظ بھیا کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اچانک کھٹاک سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ بھابھی کی ہچکی تھم چکی تھی اندر مکمل خاموشی تھی۔ میرے ہاتھوں پر جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں آخر یہ خاموشی کیسی۔ میرا دل دھڑکنے لگا کہیں بھابھی نے کوئی غلط قدم تو نہیں اٹھایا۔ آخر یہ سکوت کیسا۔ میں تقریباً بھاگتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور کی ہول سے آنکھیں لگا دیں۔ اندر کا سماں ہی کچھ اور تھا بھابی بھیا کے سینے پر سر رکھے تھیں اور بھیا ان کے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پرو رہے تھے۔ تمہیں اور کیا چاہیئے بھیا کی دھیمی سرگوشی کمرے میں گونجی۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑا ہی ظلم کیا عابدہ مجھے معاف کر دو۔

"مجھے" بھابھی نے نگاہیں اوپر اٹھائیں "آپکے میرے سکھ دکھ کا ساتھ۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہ چاہیئے۔ مجھے کچھ نہ چاہیئے۔ کچھ نہ چاہیئے" فرط مسرت سے بھابھی رو پڑیں۔ سچ مچ آج ان کی حسن سیرت کا جادو بھیا پر اثر کر گیا تھا۔

اب مجھے آگے اور کیا دیکھنا تھا شرما کر میں نے "کی ہول" سے آنکھیں ہٹا لیں اور الٹے قدموں دوڑتی ہوئی واپس آگئی کہ جلد سے جلد امی کو بھی اس خوشی کا شریک بنا سکوں۔

لڑکیوں کی شادی

کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی دشوار ہو گیا ہے شادیاں شادیوں ہی کی طرح ہوتی ہیں، لیکن بیٹھے کے کپڑوں کے بغیر دلہن کسی کو نہیں بھاتی لیکن سونے چاندی کی گرانی سے کپڑوں کو چمکانے اور جھلملانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔

ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔ ذرا سی کرن بھی آنچل میں لگایئے تو بیس روپیہ میں آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔

پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں، خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سوتی بیلیں اور چھپا چمکی وغیرہ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔ ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ بھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم تاگوں کے ستارے سنہرے ستاروں کو ماند کرتے ہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولے میں لاتعداد چڑھے رہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ اس طرح کا تمام سامان آپکو

فری اسٹائل مشاعرہ

جلال ملیح آبادی

کردار

صدر . . . . . . صدرِ مشاعرہ

بے چونچ
بُدبُد
لورنگ
ڈگڈر . . . . . . فری اسٹائل شاعر

(اور زندہ دل سامعین)

صدر۔ حضرات! آپ کی خدمت میں ایک نئی چیز پیش کی جا رہی ہے یعنی مشاعرے تو آپ نے بہت دیکھے اور سُنے ہوں گے مگر یہ اپنی قسم کا انوکھا مشاعرہ ہے۔ یعنی فری اسٹائل مشاعرہ۔

پہلا آدمی۔ حضور! ذرا فری اسٹائل مشاعرے کی پوری تعریف فرما دیجیے۔

صدر۔ جناب! یہ مشاعرے کی ایک نئی ایجاد ہے یعنی فری اسٹائل شاعروں کی، فری اسٹائل شاعری کا ——— مشاعرہ۔

دوسرا آدمی۔ تو کیا جناب!؟ فری اسٹائل شاعری کا تعلق کچھ فری اسٹائل کشتی سے بھی ہوتا ہے؟

صدر۔ جی ہاں۔ جس طرح فری اسٹائل کشتی میں کان اینٹھنا اور مُرغے کی طرح اچھل کر دوسرے کے سینے پر لات جھاڑنا جائز ہے اسی طرح فری اسٹائل شاعری بھی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فری اسٹائل شاعری فری اسٹائل کشتی سے زیادہ خوفناک چیز ہوتی ہے۔

تیسرا آدمی۔ یہ حضور! یہ فری اسٹائل شاعر کیا ہوتا ہے؟ اور کہاں پایا جاتا ہے؟

صدر۔ جناب! فری اسٹائل شاعر کسی آبادی کے ویرانے، کسی قصبے اور کوئی بھی گاؤں میں پایا جا سکتا ہے۔ رہا یہ کہ فری اسٹائل شاعر ہوتا کیا ہے؟؟۔ تو یہ بات تو خود فری اسٹائل شاعر کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا ہوتا ہے؟ اور کیوں ہوتا ہے؟ دراصل فری اسٹائل شاعر کی طبیعت اسنوئین **Snow man** گوریلے کی طرح غضب کی فری اسٹائل ہوتی ہے وہ ہر وقت ایک مدہوشی کے عالم میں رہتا ہے اور اکثر آپے سے باہر ہی پایا جاتا ہے۔

پہلا آدمی۔ تو حضور! کوئی فری اسٹائل شاعر کا نمونہ پیش کر دیجیے نا جلدی سے!

صدر۔ میں ابھی آپ کی خدمت میں ایک فری اسٹائل شاعر پیش کرتا ہوں۔ اب آپ حضرات۔ جناب بے چونچ کے کلام سے لطف اُٹھائیں گے۔ تشریف لائیے۔ جناب بے چونچ!

دوسرا آدمی۔ (نیچی آواز) ہاں یہی ہیں بے چونچ

تیسرا آدمی۔ جی ہاں یقیناً یہی ہوں گے۔

پہلا آدمی۔ بھئی یہ چونچ صاحب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا آدمی۔ یہ کیوں؟

پہلا آدمی۔ ابھی دیکھیے نا لگتے ہیں بالکل چونچ اور تخلص رکھا ہے بے چونچ

(قہقہے)

صدر۔ حضرات!۔ اب آپ خاموش ہو جائیں ــــ خاموشی سے سنیئے۔

دوسرا آدمی۔ ارشاد بے چونچ صاحب!

بے چونچ۔ ایک مسلسل غزل یعنی مطلب یہ کہ ایسی غزل عرض کرتا ہوں جس میں ایک ہی خیال پیش کیا گیا ہے۔ غزل کی سرخی ہے "شاعر اور رقیب"

تیسرا آدمی۔ حضور! نظم کی سرخی تو سنتے آئے تھے یہ غزل کب سے سرخ ہونے لگی؟۔

صدر۔ حضرات! استاد غزل کو نظم اور نظم کو غزل کر دیں تو آپ کو ماننا پڑے گا۔

ــــ یہ نہ بھولیئے کہ یہ ہیں استاد۔ اور استاد بھی فری اسٹائل "بے چونچ"

پہلا آدمی۔ سمجھ گئے (معاف کیا جناب بے چونچ!)

بے چونچ۔ عرض کرتا ہوں ؎

میں تیری محبت میں، چھے مہینے سے تیری گلی میں پھرتا ہوں اپنا
گریباں پھاڑے ہوئے۔

تیسرا آدمی۔ اجی اس دیوانگی کے قربان بے چونچ صاحب ؎
میں تیری محبت میں، چھے مہینے سے تیری گلی میں پھرتا ہوں
اپنا گریبان پھاڑے ہوئے

پہلا آدمی۔ (پھڑک کر) بے چونچ! (مذاق نہیں کرتا) کیا چونچ کھولی ہے سبحان اللہ

دوسرا آدمی۔ اجی قلم توڑ دیا۔

تیسرا آدمی۔ اجی کیا قلم توڑ، دوات پٹخ شاعری ہے۔

(قہقہے)

صدر۔ حضرات!۔۔۔ معزز سامعین۔ خاموش ہو جائیے۔ خاموشی سے سماعت فرمائیے۔

(خاموشی)

ارشاد بے چونچ صاحب

بے چونچ۔ میں تیری محبت میں چھے مہینے سے تیری گلی میں پھرتا ہوں
اپنا گریبان پھاڑے ہوئے۔

اور۔ میرے جتنے رقیب تیری گلی میں بیٹھے حقہ پیا کرتے ہیں
ان میں سے سب ہیں مجھے تاڑے ہوئے لیکن ــ کسی رقیب کی مجال نہیں ــ جو میرے مقابلہ میں آئے کشتی لڑنے۔
حالاں کہ ــ۔۔۔۔۔۔ میرے پیچھے سب پڑے ہیں، پنجے جھاڑے ہوئے۔

(واہ وا کا غل)

دوسرا آدمی۔ (پکار کے) اجی بے چونچ صاحب! کیا چونچ ماری ہے رقیب کی چاند پر۔ سبحان اللہ۔

بے چونچ ــ آداب عرض۔ آداب عرض (جلدی میں) فرماتا۔ لاحول عرض کرتا ہوں۔

؎ اس لئے۔ کہ رقیبوں میں ایک ایک جانتا ہے کہ
جیب میں ڈالے ہوئے پھرتا ہوں میں۔ ہزاروں رقیبوں کے کان؟

پہلا آدمی۔ (چلا کے) کان اکھاڑے ہوئے۔

(واہ وا کا غل قہقہے)

صدر۔ خاموش ہو جائیے حضرات!۔ ذرا خاموش رہیئے مہربان

دوسرا آدمی۔ اجی آپ شاعری چھوڑ دیجئے حضرت بے چونچ

تیسرا آدمی۔ کسی دن رقیبوں سے فوجداری ہو جائے گی۔

پہلا آدمی۔ عشق جیل خانے چلا جائے گا۔

دوسرا آدمی۔ کہیں نوکری کر لیجئے محبوبہ آپ سے شادی کر لے گی۔

بے چونچ صاحب!

صدر۔ حضرات! آپ شاعر کو شادی کی ترکیب نہ بتائیے۔ یہ اُن کے نجی شوق کا معاملہ ہے۔

بے چونچ۔ اجی اب آپ دیکھئے صدر صاحب! میں نے مقطع میں اپنا اور رقیب کا مقابلہ یوں کیا ہے۔

تیسرا آدمی۔ فرما ڈالئے۔ فرما ڈالئے۔

بے چونچ۔ عرض کرتا ہوں ؎ کس رقیب کا دل گردہ ہے کہ میری سی دھڑ دھڑ دھک محبت کا جواب دے سکے اے بے چونچ

پہلا آدمی۔ اے سبحان اللہ بے چونچ صاحب! اجی آپ ٹھہرے جلالی شاعر، آپ کی محبت یقیناً دھڑ دھڑ دھک ہوگی۔

بے چونچ۔ بندہ کس قابل ہے آداب، عرض کیا ہے۔

؎ کس رقیب کا دل گردہ ہے کہ میری سی دھڑ دھڑ دھک محبت کا

جواب دے سکے اسے بے چونچ کیوں کہ ۔۔۔ ہر رقیب کے دل
کترے پر میری محبت ہے دولتیاں جھاڑے ہوئے۔

(واہ واہ کا غل)

دوسرا آدمی۔ (پکار کے) اجی اس شاعر کی دولتیاں جھاڑنے
والی محبت کے سامنے تو
تیسرا آدمی۔ رقیب کیا۔ گدھا تک نہیں ٹھہر سکتا۔

قہقہے قہقہے

(قہقہوں کے درمیان پکار کے)

پہلا آدمی۔ ہاں بے چونچ! تمہارا چڑیا خانے تک جواب نہیں۔
صدر۔ معزز سامعین! یہ فری اسٹائل مشاعرہ ضرور ہے مگر اسکے یہ معنی
نہیں کہ آپ داد بھی فری اسٹائل دینے لگیں۔ سنجیدگی سے
داد دیجئے۔ حضرات! اب میں حضرت ہُدہُد سے استدعا
کروں گا کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے فری اسٹائل کلام سے
سامعین کے دل کو باغ باغ کردیں۔ ارشاد حضرت ہُدہُد۔۔۔
ہُدہُد۔ ایک قطعہ۔ محبوبہ کی سرمگیں آنکھوں میں کاجل کی لکیر
دیکھ کر کہا ہے۔
پہلا آدمی۔ اُف ایک تو محبوبہ کی آنکھیں پھر سرمگیں۔ توبہ
دوسرا آدمی۔ اور اس پر کاجل کی لکیر قیامت ہے۔
تیسرا آدمی۔ واللہ آپ ہی کا دل گردہ تھا ہُدہُد صاحب جو ایسی
قاتل آنکھیں دیکھ کے زندہ بچ گئے۔

(قہقہے)

صدر۔ حضرات خاموش۔ شعر سنا نہیں ہوا اور قطعے بنانے لگے۔
ارشاد ہُدہُد صاحب!
ہُدہُد۔ ملاحظہ ہو ؎ سرمگیں آنکھوں میں کاجل کی لکیر
صدر۔ ؎ سرمگیں آنکھوں میں کاجل کی لکیر
ہُدہُد۔ ؎ سرمگیں آنکھوں میں کاجل کی لکیر ۔۔۔ بیل گاڑی
کے حسین پہیوں کے ہیں بد نشان
پہلا آدمی۔ واہ واہ۔ ہاں بیل گاڑی کے حسین پہیوں کے ہیں بد
نشان ہے۔ اور کاجل کی لکیر ہے
دوسرا آدمی۔ کیا تو ڑ جوڑا ہے ہُدہُد میاں
تیسرا آدمی۔ واقعی سبحان اللہ

ہُدہُد۔ آداب عرض۔ آداب عرض
صدر۔ (ترشی سے) حضرات! خاموشی سے سنیئے
پہلا آدمی۔ اجی صدر صاحب! حضرت ہُدہُد تو ہماری تعریف سے
خوش ہو رہے ہیں۔
دوسرا آدمی۔ اور آپ ناراض
صدر۔ میں کہتا ہوں۔ آداب محفل کا خیال رکھیئے۔
تیسرا آدمی۔ کوشش کریں گے۔
ہُدہُد۔ عرض کیا ہے ؎ اور یہ کاجل کی لکیر کیسی حسین، جیسے
چمکتی تلوار اور یہ تلوار۔ مرے دل میں اُترتی ہی چلی جاتی ہے۔
پہلا آدمی۔ دیکھا نا؟ کاجل کی لکیر نے۔ شاعر کے دل کو ڈبل روٹی
کی طرح کاٹ کے دو ٹکڑے کردیا۔

(قہقہے)

صدر۔ حضرات! پوری بات تو سنیئے۔۔۔۔۔ ارشاد ہُدہُد صاحب
ہُدہُد۔ اس کے آگے عرض کیا ہے ؎ اور یہ تلوار ۔۔۔ مرے دل میں
اُترتی ہی چلی جاتی ہے۔

جیسے ۔۔ مرغ آبیاں۔ شام کے وقت
کود پڑتی ہیں۔ کسی جھیل کے بیچ

دوسرا آدمی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا مرغ آبیاں گرائی ہیں
ہُدہُد صاحب! اس طرح کوئی بند تو نہیں کرا سکتا۔
تیسرا آدمی۔ (پکار کے) اجی ہُدہُد صاحب! شہروں کی رونق بڑھانے
کے لئے زندہ رہیے ویرانوں میں۔

(قہقہے)

صدر۔ حضرات!۔ خاموش۔ اگر آپ حضرات، خاموشی سے
سننے کا وعدہ کریں تو میں ہُدہُد صاحب سے نظم سنانے کی درخواست
کروں۔
پہلا آدمی۔ اجی آپ درخواست پیش کردیجئے ہُدہُد صاحب کی خدمت
میں۔
دوسرا آدمی۔ ہم خاموشی سے سنیں گے۔
صدر۔ اب میں ہُدہُد صاحب کی خدمت میں عرض کروں گا کہ
وہ کوئی نظم سنا کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔
ہُدہُد۔ نظم کا نام ہے خودکشی:

تیسرا آدمی۔ کہیں خودکشی نہ کر لیجئے گا ہُدہُد صاحب
پہلا آدمی۔ شاعر سے یتیم ہو جائیں گے۔
ہُدہُد۔ عرض کرتا ہوں کہ دل یہ کہتا ہے۔ کہ میں ڈوب مروں ــــ
چلّو بھر پانی میں۔

دوسرا آدمی۔ ارادہ اچھا ہے۔
تیسرا آدمی۔ آدمی شریف معلوم ہوتے ہو۔

(قہقہے)

صدر۔ حضرات! اگر آپ خاموش نہ رہے تو ہُدہُد صاحب کی
شاعری سے کیا لطف اٹھا سکیں گے؟۔ ارشاد ہُدہُد صاحب

ہُدہُد۔ دل یہ کہتا ہے۔ کہ میں ڈوب مروں۔ چلّو بھر پانی میں۔
ان کا دامن نہ ملا۔ اور میں کہتا ہوں کہ مرنے کا مزہ تب ہے کہ
جب اُن کے ہاتوں میں ہو ایک تیر کمان
تیر وہ ایسا چلائیں۔ کہ نکل جائے جگر چیر کے میرا
پھٹر پھڑا کر میں گروں
اور گر کر اچھلوں
اور تڑپتا رہوں بسمل کی طرح
پہلا آدمی۔ سبحان اللہ ہُدہُد۔ کیا خودکشی کی ہے
دوسرا آدمی۔ اور خودکشی کے بعد۔ کیا جمناسٹک کی ہے۔
تیسرا آدمی۔ جمناسٹک کر کے مرے۔

قہقہے۔ قہقہے

صدر۔ معزز سامعین! آدابِ محفل کا خیال رکھیئے۔ شاعر کو
خاموشی سے سنیئے ــــ
اب میں حضرت بوکھل سے گذارش کروں گا کہ وہ اپنے کلام
سے حاضرین کا دل مسرور فرمادیں۔ بوکھل صاحب! ــــ
تشریف لائیں۔

(تالیاں ــــ خاموشی)

پہلا آدمی۔ ہاں یہ سچ مچ بوکھل لگتے ہیں۔
دوسرا آدمی۔ کنوتیاں کھڑی ہیں۔
تیسرا آدمی۔ اجی ذرا ہشکا دیجئے بجلی کے کھمبے پر چڑھ جائے گا۔

(قہقہے قہقہے)

صدر۔ حضرات! خاموش (خاموشی) ــــ ارشاد جناب بوکھل

بوکھل۔ حضرات تین شعر کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔
پہلا آدمی۔ اجی تین شعر کی غزل کیوں؟ کوئی پچیس پچاس شعر کی غزل
ہو جائے۔ ذرا کس کا ہے؟
بوکھل۔ (بُرا مان کے) کیا مطلب۔ آپ کا مطلب کیا ہے جی!؟
پہلا آدمی۔ اجی خفا کیوں ہوتے ہیں بوکھل میاں فرمایئے نا
بوکھل۔ جی ہاں۔ عرض کرتا ہوں ؎ وہ زلف بھوری بھوری جو
اس رُخ سے لٹک گئی۔

دوسرا آدمی۔ سبحان اللہ رُخ سے کیا زلف لٹکی ہے
تیسرا آدمی (آواز بدل کے) جیسے ڈال میں بندر

(قہقہے قہقہے)

صدر۔ پھر وہی آدابِ محفل کے خلاف آوازے بلند ہونے لگے۔
میں کہتا ہوں حضرات! خاموشی سے سنیئے۔
پہلا آدمی۔ مگر صدر صاحب! یہ فری اسٹائل مشاعرہ ہے اس
لئے فری اسٹائل داد دینے دیجئے۔
صدر۔ فری اسٹائل داد پر اگر شاعر کو فری اسٹائل غصّہ آ گیا تو
کیا ہوگا۔ اس لئے فری اسٹائل داد "سخت منع" ہے ــــ
ارشاد بوکھل صاحب!
بوکھل۔ ؎ وہ زلف بھوری بھوری جو اس رُخ سے لٹک گئی ــــ
میری زندگی کتنی معصوم تھی کہ اُن کی زلفوں کی راہوں میں
بھٹک گئی۔
پہلا آدمی۔ (ہنس کے) واللہ واہ کیا چیز ہے یہ فری اسٹائل شاعری بھی۔
دوسرا آدمی۔ (ہنس کے) جیسے بے نکیل کا اونٹ۔

(قہقہے۔ ہنسی)

صدر۔ اس قسم کی داد سے آپ بوکھل صاحب کو بوکھلا رہے ہیں
ایک تو وہ پہلے ہی سے بوکھل ہیں۔ ارشاد جناب بوکھل۔
بوکھل۔ ؎ آ رہی تھی میرے پیچھے پیچھے اپنے گھر سے وہ گل رعنا
صدر ؎ آ رہی تھی میرے پیچھے پیچھے اپنے گھر سے وہ گل رعنا
بوکھل۔ ؎ پلٹ کے جو میں نے دیکھا تو وہ رقیب کے گلے میں تھا جلنے
کو مرا
پہلا آدمی۔ (چلا کر) تو سٹک گئی
(واہ وا قہقہے داد کا غل)

دوسرا آدمی۔ (آواز) محبوبہ رقیب کے محلے میں ٹنگ گئی ؟
تیسرا آدمی۔ ہمدردی ہے آپ سے بکھل
پہلا آدمی۔ ٹوٹی کہاں کمند

قہقہے

صدر۔ حضرات! آپ اسی طرح داد دیتے رہے تو داد کا
اسٹاک ختم ہو جائے گا۔ ارشاد بکھل صاحب
بکھل۔ ؎ اللہ رے نزاکت کہ جبلی کا ایک پھول
صدر۔ ؎ اللہ رے نزاکت کہ جبلی کا ایک پھول
بکھل۔ ؎ سر پر جو اُن کے رکھ دیا تو ان کی کمر تک لچک گئی۔

(سبحان اللہ۔ واہ واہ کا غل)

تیسرا آدمی۔ (آوازہ) واہ کیا نزاکت ہے آپ کی محبوبہ کی
پہلا آدمی۔ ایسی محبوبہ اگر پوڈر لگائے تو پوڈر کے بوجھ سے
دوسرا آدمی۔ زمین پر دھم سے گر کر شہید ہو جائے۔
صدر۔ حضرات! اب آپ کے سامنے ایسے فری اسٹائل شاعر
تشریف لائیں گے جو فری اسٹائل شاعری کے ستون یعنی کھمبے شمار
کیے جاتے ہیں ۔۔۔ اور جیسے کیتلی کی بھاپ دیکھ کر ریل گاڑی
کا انجن ایجاد ہوا تھا اسی طرح ان کی شاعری سن کر فری
اسٹائل شاعری ایجاد ہوئی ہے۔ تشریف لائیں۔ جناب نورنگ
تیسرا آدمی۔ ابی صدر صاحب! یہ نورنگ کے کیا معنی ہوئے۔
صدر۔ مطلب یہ کہ نورنگ صاحب کی شاعری میں نو قسم کے رنگ
ہیں۔ بہرحال شعر سنئے۔
نورنگ۔ سامعین! اس سے پہلے کہ میں کچھ سناؤں ۔ عرض
کردوں کہ میں گل و بلبل کا شاعر نہیں۔ کھیتوں اور کھلیانوں
کا شاعر ہوں۔ لب و رخسار کا شاعر نہیں۔ ٹریکٹروں اور
بل ڈوزروں کا شاعر ہوں
پہلا آدمی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں
دوسرا آدمی۔ مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔
تیسرا آدمی۔ ٹھیک کہا ہے۔
نورنگ۔ مطلب یہ ہے جناب کہ آج تک ہماری شاعری میں
بکل کی دقیانوسیت جاری ہے
اور میں آنے والے کل کا پیغام دیتا ہوں

پہلا آدمی۔ دے ڈالئے وہ پیغام
نورنگ۔ صدر صاحب! نظم کا عنوان ہے روشنی
صدر۔ ارشاد۔ ارشاد
نورنگ۔ عرض کیا ہے ؎ کاٹ دو ناک ستاروں کی
دوسرا آدمی۔ ابی نظم کا عنوان ہے روشنی
تیسرا آدمی۔ اور آپ چھوٹتے ستاروں کی ناک کاٹنے دوڑ پڑے؟
صدر۔ حضرات لفظوں پر نہ جائیے۔ فری اسٹائل شاعری کا خیال کیجئے
خیال کی دھار دیکھئے۔
ارشاد نورنگ صاحب!
نورنگ۔ کاٹ دو ناک سیاروں کی
کوئی تارہ نہ گنے۔
والہ فانوس کی محبت میں گرفتار نہ ہو۔
اب کسی محنت کش کو
پیار کا آزار نہ ہو۔
اب کوئی ہجر میں آہیں نہ بھرے
پہلا آدمی۔ اب کوئی ہجر میں آہیں نہ بھرے۔
نورنگ۔ تارے نہ گنے۔
کاٹ دو ناک ستاروں کی۔
دوسرا آدمی۔ اچھا یعنی کوئی ہجر میں آہیں نہ بھرے
تیسرا آدمی۔ اس لئے بے چارے ستاروں کی ناک اڑا دو۔
پہلا آدمی۔ واہ۔ کیا مجرمانہ خیال ہے۔
دوسرا آدمی۔ ابی نورنگ صاحب! آپ نے فاؤنٹن پن سے
تیسرا آدمی۔ کیا ناک کاٹی ہے غریب ستاروں کی۔

(قہقہے۔ ہنسی)

صدر۔ حضرات! خاموش ۔۔۔ کہا کیسے بھی ہو مگر خیال اچھا ہے
ارشاد جناب نورنگ
نورنگ۔ کاٹ دو ناک ستاروں کی
کھیت کی مینڈ پہ
دل کے اس بینڈ پہ
میری محبوب ٹریکٹر چلاتی آ جا
پہلا آدمی۔ ابی یہ کیوں رے ہوئے کل کی محبوب آگئی ٹریکٹر چلاتی ؟

دوسرا آدمی ۔ اسے ڈھکیل دیجئے نورنگ صاحب ٹریکٹر ہے۔

(قہقہے)

صدر ۔ خاموش حضرات! ذرا خاموش ۔ میں کہتا ہوں سنیئے زیادہ غور کم کیجئے۔

ارشاد نورنگ صاحب!

نورنگ ۔ کاش دو ناک ستاروں کی ۔

کھیت کی مینڈ پہ

دل کے اس بینڈ پہ

میری محبوب ٹریکٹر کو چلاتی آجا

اور اس وقت تک

آرام نہ کر

جاؤں میں شہر

لے کے ٹرک

کھاد لینے کے لئے

اپنے کھیتوں کے لئے

صدر ۔ واہ کیا نازک خیال ہے نورنگ صاحب ۔ نہ کھاد لینے کے لئے"

نورنگ ۔ آداب عرض ہے صدر صاحب، عرض کرتا ہوں ۔

جاؤں میں شہر

لے کے ٹرک

کھاد لینے کے لئے

اپنے کھیتوں کے لیے

تو اداس نہ ہو نہیں

اپنے ٹریکٹر کو چلاتی رہنا

صدر ۔ واللہ واقعی اداس نہ ہو نہیں اپنے ٹریکٹر کو چلاتی رہنا

نورنگ ۔ آرام نہ کرنا ۔

اک پل

جب تلک

تیرے حسین بستر کو

پہلا آدمی ۔ وا ۔ جب تلک ـــــ تیرے حسین بستر کو

نورنگ ۔ جب تلک تیرے حسین بستر کو ۔ چاٹ نہ لے ۔

نورنگ (زور سے) دیمک ۔

تیسرا آدمی ۔ (تڑپ کر) واللہ وا دیمک دیمک جواب نہیں دیمک کا ۔

پہلا آدمی ۔ یعنی محبوب اس وقت تک ٹریکٹر چلاتی رہے ۔

دوسرا آدمی ۔ جی ہاں، جب تک اس کے حسین بستر کو ۔ چاٹ نہ لے ۔

تیسرا آدمی ۔ دیمک

(قہقہے)

پہلا آدمی ۔ (آوازہ) نورنگ صاحب! آپ کی محبوب نہ ہوئی بلڈوزر

(واہ وا کا غل)

صدر ۔ معزز سامعین! خاموش ہو جائیے مہربانی! بالکل خاموش ہو جائیے ۔

(خاموشی)

صدر ۔ حضرات! اب میں ایسے بے جوڑ ۔ فری اسٹائل شاعر کو پیش کرتا ہوں کہ آپ نے زندگی بھر ایسا فری اسٹائل شاعر سنا ہوگا نہ ایسا فری اسٹائل آدمی دیکھا ہوگا ۔

دوسرا آدمی ۔ اجی جلدی وہ نمونہ بھی دکھا دیجئے ۔

صدر ۔ معزز سامعین! اب آپ، شہسوارِ سخن، رستمِ فن پہلوانِ فری اسٹائل شاعری ۔

حضرتِ مگدر کا کلام سننے پر تیار ہو جائیں

(ہلکی تالیاں)

تیسرا آدمی ۔ صدر صاحب! وہ پہلوان غزل ہیں کہاں ؟

صدر ۔ ابھی آپ کے سامنے تشریف لائیں گے ـــــ تشریف لائیے مگدر صاحب!

پہلا آدمی ۔ (نیچی آواز) واقعی یہ شاعر کم ہے پہلوان زیادہ ہے

دوسرا آدمی ۔ اماں یار اسے کچھ نہ کہنا

تیسرا آدمی ۔ ورنہ اسٹیج سے کود کے پنڈال کے باہر تک دوڑائے گا ۔

(ہنسی)

صدر ۔ حضرات! براہ کرم خاموش ـــ مہربان خاموش

(خاموش)

پہلا آدمی ۔ اجی صدر صاحب! ان پہلوان شاعر کا تخلص ایک مرتبہ پھر بتائیے ۔

صدر ۔ میں نے عرض کیا تھا نا ؟ استاد مگدر

دوسرا آدمی ۔ داہنے ہات کا مگدر کہ بائیں ہات کا ؟ (ہنسی)

صدر۔ (زور دے کر) بار بار درخواست کر چکا ہوں جناب! کہ آداب محفل کا خیال رکھئے۔

ارشاد حضرت مگدر

مگدر۔ میں آپ کو ایک قصیدہ سناؤں گا۔

پہلا آدمی۔ اجی کوئی غزل فرمائیے نا

مگدر۔ میرے استاد نے منع کیا تھا کہ غزل کبھی نہ کہنا

دوسرا آدمی۔ یہ کیوں صاحب؟؟

مگدر۔ استاد فرماتے تھے غزل کہنے سے شاعر دبلا ہو جاتا ہے کیونکہ غزل کے شعروں میں آہیں بھرنا۔ رونا پیٹنا اور گریبان نوچنا زیادہ ہوتا ہے۔

دوسرا آدمی۔ تو کوئی نظم جھاڑ دیجئے لگے ہاتوں۔

مگدر۔ استاد نے کہا تھا نظم کی شاعری میں "انقلاب زندہ باد" بہت ہوتا ہے قصیدہ لکھا کرو

تیسرا۔ آپ کے استاد نے قصیدہ لکھنے کی وصیت کیوں فرمائی تھی جناب مگدر؟

دوسرا آدمی۔ استاد کہتے تھے قصیدہ سنانے والا خوش سننے والا خوش مطلب تعریف سے ساری دنیا خوش

پہلا آدمی۔ آپ کے استاد شاعری میں آپ کے استاد تھے کہ پہلوانی میں

مگدر۔ میرے استاد پہلوان تھے پچیس برس ان سے کشتی لڑی۔ انہیں کی شان میں یہ قصیدہ بنایا ہے ــــ اجازت ہے سناؤں

دوسرا آدمی۔ اجی بھلا ہم سنانے سے آپ کو روک سکتے ہیں؟ آپ ہیں پہلوان۔

تیسرا آدمی۔ اور آج کل کی پبلک دُبلی پتلی

مگدر۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ جو شعر پسند آئے داد دیجئے۔

پہلا آدمی۔ اور جو شعر پسند نہ آئے تو؟

مگدر۔ اکھاڑے میں آ کے غلطی بتلائیے۔

دوسرا آدمی۔ اکھاڑے پر نہیں مگدر پہلوان۔ ہمیں اپنی جان پیاری ہے۔

(قہقہے)

صدر۔ معزز حضرات! میاں مگدر کو قصیدہ سنانے کا موقع دیجئے۔ خاموشی سے سماعت فرمائیے

مگدر۔ استاد کی شان میں عرض کرتا ہوں۔ ؎

رستم و سہراب سے بھی بڑھ کر استاد کا ورزش میں دم خم دکھانا یاد آتا ہے

پہلا آدمی۔ ؎ رستم و سہراب سے بھی بڑھ کر استاد کا ورزش میں دم خم دکھانا یاد آتا ہے۔

مگدر۔ ؎ دو ہاتھیوں کی دم پکڑ کر۔ مگدر کی طرح۔ وہ دو دو دن ہلاتا یاد آتا ہے۔

دوسرا آدمی۔ واہ وا واہ وا۔ مگدر صاحب! آپ کے استاد، دو ہاتھیوں کی دم پکڑ کر۔ دو دن مگدر کی طرح ہلاتے تھے؟

مگدر۔ اس میں کوئی شک ہے آپ کو؟

تیسرا آدمی۔ اجی شک نہیں مگر دو ہاتھیوں کو؟ دو دن؟ مگدر کی طرح گھماتے تھے؟؟

مگدر۔ جی ہاں۔

پہلا آدمی۔ مطلب یہ کہ دو ہاتھی مگدر کی طرح گھماتے تھے

دوسرا آدمی۔ یا وہ گدھے۔

(ہنسی)

مگدر۔ (گرج کر) استاد کی شان میں ایک لفظ نکالا تو وہ لتیڑ دوں گا کہ مرگی آجائے گی گستاخوں کو۔

تیسرا آدمی۔ زبان کو لگام دو مگدر

مگدر۔ ہمت ہو تو سامنے آ کر بات کرو۔

پہلا آدمی۔ مٹی چٹا دوں گا مگدر

مگدر۔ کیا کیا؟

صدر۔ اجی جناب مگدر صاحب! آپ غور نہ فرمائیں آخر پبلک ہے پبلک

مگدر۔ اجی صدر صاحب! جب مشاعرے کی پبلک گستاخ ہو جائے تو شاعر کیسے تمیزدار رہ سکتا ہے؟

صدر۔ تمیزدار رہنے کی کوشش کرتے رہئے آپ لاکھ پہلوان سہی مگر شاعر ہیں۔

مگدر۔ اجی صدر صاحب! آپ کی مروت میں شعر عرض کرتا ہوں ؎ وہ جنگل میں ایک آدم خور شیر ببر کی مونچھ پکڑ کر

صدر۔ ؎ وہ جنگل میں ایک آدم خور شیر ببر کی مونچھ پکڑ کر

مگدر۔ ؎ میرے استاد کا، وہ چھیڑ کے، شیر ببر کو گھنٹوں جھلاتا یاد آتا ہے

دوسرا آدمی۔ نصف جھوٹ۔
تیسرا آدمی۔ بالکل بکواس
پہلا آدمی۔ جھوٹا ہے جھوٹا ہے
گمدر۔ (غصّے سے) دیکھیے صدر صاحب! اب بدتمیزی حد سے گذر رہی ہے۔
صدر۔ (نرمی سے) گمدر صاحب! یہ نہ بھولئے کہ یہ فری اسٹائل مشاعرہ ہے
گمدر (گرمی سے) اجی، میں اس فری اسٹائل مشاعرے کو فری اسٹائل کشتی کا اکھاڑا بنا سکتا ہوں
دوسرا آدمی (آوازہ) شاعری نہیں چلی تو کشتی پر اتر آئے؟
صدر۔ مہربانی فرماکر آپ شعر سنائیے گمدر صاحب
گمدر۔ (بگڑ کے) آپ کے کہنے سے نہیں صدر صاحب! اس آدمی کی ضد پر شعر سناؤں گا جو ابھی کہہ رہا تھا کہ شاعری نہیں چلی تو میں پہلوانی پر اُتر آیا۔ ذرا ایک گلاس پانی منگائیے
صدر۔ اے جناب! ذرا کسی سے پانی منگائیے
پہلا آدمی۔ (نیچی آواز) سنو یار، اب کی یہ گمدر، لڑنے کی دھمکی دے تو تم ہم سب میں دُبلے ہو
دوسرا آدمی۔ ہاں تم کُرتا بنیائن اُتار کے، اس گمدر کو کشتی کا چیلنج دے دینا۔
تیسرا آدمی۔ اچھا — گر یار وہ میرے پیچھے دوڑا تو؟
پہلا آدمی۔ انتظام کر لیا ہے لائٹ آف ہو جائے گی۔
گمدر۔ اجازت ہے صدر صاحب؟
صدر۔ ارشاد گمدر میاں
گمدر۔ عرض کیا ہے
؎ میرے اُستاد کے ہاتھے کی طاقت کی یہ حالت تھی کہ ڈیڑھ من یخنی پینے کے بعد
پہلا آدمی۔ ؎ میرے استاد کے ہاتھے کی طاقت کی یہ حالت تھی کہ ڈیڑھ من یخنی پینے کے بعد
گمدر۔ ؎ پھر بھی بھوک سے بے قرار ہو کے، پہاڑوں کی چٹانوں کا چبانا یاد آتا ہے۔
پہلا آدمی۔ سچ کہتا ہوں، اس جھوٹ پر لعنت
گمدر۔ میں کہتا ہوں تم پر لعنت
دوسرا آدمی۔ جلدی بنیائن بھی اُتار دو ہوا میں مُکا گھما کے گمدر سے کہو آجاؤ میدان میں
گمدر۔ (طیش میں) میں کہتا ہوں یہ آدھر سے جو صاحب مجھ پر لعنت بھیج رہے تھے ہمت ہو تو سامنے آئیں
کون ہیں؟ صاحب!؟ بس ڈر گئے؟؟
تیسرا آدمی۔ (ڈانٹ کے) میں ہوں۔ کیا بکتے ہو گمدر۔ میدان میں آؤ۔ یہ دیکھو میرے ڈنڑ بلّے
گمدر۔ (گرج کے) مجھ سے لڑو گے؟ ایک ایک ہڈّی پسلی نظر آرہی ہے۔
تیسرا آدمی (اطمینان سے) یہ ہڈّی پسلیوں کو ایک کردینگا۔ روئی کے گمدر!!
گمدر۔ آئیں؟ کیا کہا؟ میں روئی کا گمدر؟ میں تجھے چٹنی بنادوں گا۔
تیسرا آدمی۔ آئیں؟ کیا کہا؟ میں تجھے رائتہ بنادوں گا۔
گمدر۔ اچھا تو میں آیا۔
صدر۔ اجی گمدر صاحب کیا؟۔ کیا کرتے ہیں آپ؟؟ اجی سنئیے تو!!
گمدر۔ چھوڑ دیجئے صدر صاحب! ٹھنگا سا مسخرہ ہاتھی کو ڈنڑ بلّے دکھا رہا ہے چھوڑ دیجئے۔
تیسرا آدمی۔ اماں آرہا ہے وہ — اماں وہ چل چکا۔ وہ کودا اسٹیج سے
(شور)
(ارے لائٹ۔ لائٹ آف ہوگئی۔ لائٹ (سیٹیاں) لائٹ لا گئی لائٹ)
پہلا آدمی۔ ابے گمدر! کدھر گیا گمدر
گمدر۔ تو کدھر ہے سامنے آ —
دوسرا آدمی۔ تو کدھر ہے روئی کے گمدر
گمدر۔ تو کدھر ہے مجنوں کی اولاد
تیسرا آدمی۔ اور تو کہاں ہے گمدر کے بچے۔
(قہقہے قہقہے قہقہے)

دل کی عدالت

زینب رحمٰن

صبح کا وقت تھا۔ میں منّو کو نہلانے لے جا رہی تھی کہ یکایک برآمدے سے منصور نے آواز دی "ممی ممی اوپر والے مکان میں لوگ آ گئے۔ سامان اتر رہا ہے" میں منّو کو گود میں لئے ہی کمرے سے باہر آ گئی۔ نیچے ایک تانگہ کھڑا تھا۔ کافی سامان اتارا جا رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص ٹیکسی والے کو کرایہ چکا رہا تھا۔ دو مزدور سامان اٹھا رہے تھے۔ دیکھنے سے تو مہذب سے لگتے۔ میں نے بھرپور نظر نئے کرایہ دار کے چہرے سے نگاہیں پھیر لیں۔ اور سامنے الماری پر سے ایک چابی کا گچھا لے کر منصور کو تھمایا "جاؤ جلدی سے انہیں دے کر اندر آ جاؤ" میں نے نئے کرایہ دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر منّو کو لے کر نہلانے اندر چلی گئی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد جب منّو نہا کر سو چکا تھا اور میں گھر کے کام نپٹا کر منصور کو ہوم ورک کرانے بیٹھی تب سیڑھیاں چڑھتے کرایہ دار کی طرف گیا۔ اوپر سے سامان کی اٹھا پٹخ کی آوازیں آ رہی تھیں تو یہ حضرت جگ موہن ہو گئے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ان کا نام پچھلے دو تین سال سے اخباروں میں پڑھتے پڑھتے ہم سب کے لئے جانا پہچانا ہو چلا تھا۔

پچھلے مہینے جب شرما صاحب کی چٹھی آئی کہ انہوں نے اوپر والا حصہ جگ موہن صاحب کو، جو کہ حال ہی میں اپنی بیوی کے قتل کے الزام سے بری کئے گئے تھے، دیا ہے تو میں بہت گھبرائی۔ شرما صاحب ہمارے مکان دار تھے اور پہلے وہ خود ہی اوپر والے حصہ میں رہتے تھے۔ ہم دونوں کو انہوں نے اپنے بچوں کی طرح پیار دیا تھا اور ہم انہیں بہت مانتے تھے جب ان کے بڑے لڑکے نے ان دونوں میاں بیوی کو [illegible] بلا لیا تو [illegible] اوپر والا حصہ [illegible] دو تین سال [illegible] اوپر والا حصہ خالی ہو گیا۔ [illegible] جگ موہن صاحب [illegible] ہوئے [illegible] ان کے کچھ عزیز ہوتے تھے انہیں کی سفارش سے شرما صاحب نے یہ گھر جگ موہن صاحب کو دے دیا۔ یہ سارا قصہ شرما آنٹی نے مجھے لکھا ساتھ ہی لکھا "میں جانتی ہوں جس شخص کے سر ایسا الزام لگ چکا ہے اس سے بدگمانی کوئی نہیں ہے۔ لیکن ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کو تکلیف نہ ہوگی۔ تم تو میری بیٹی ہو۔ بنا بھروسہ ہم کسی آدمی کو تمہارے پاس کیسے بھیجیں گے؟" اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ میرے شوہر نے بھی مجھے بہت کچھ سمجھایا کہ وہ آدمی جیسا بھی ہو ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟ — مگر میں پریشان ہی رہی۔ میں نے اخباروں میں اس کیس کی تفصیل پڑھی تھی اور مجھے یقین تھا کہ قاتل وہی ہے چاہے عدالت اسے بے قصور کیوں نہ قبول چکی ہو۔ کئی اخباروں نے بھی دبے دبے اس کے بے قصور ہونے پر شک ظاہر کیا تھا اور جب سے ہمارے محلہ کی عورتوں میں یہ خبر پھیلی کہ وہ ہمارے مکان میں آ رہا ہے سب نے مجھے خبردار کرنا اور تلقین کرنا کہ رہنا وہ تو خوف سے خونی! میں تو اپنے شوہر کے پیچھے لگی رہی کہ گھر خالی کر دیجئے مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ ہر لحاظ سے ہمارا گھر آرام دہ اور محفوظ تھا۔ ایسا مکان ہم کو اتنے کرایہ میں اور اتنی سہولیات کے ساتھ کہیں نہ مل سکتا تھا غرض ہم نے گھر نہ چھوڑا اور وہ حضرت [illegible] نازل ہو گئے اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ میرے شوہر [illegible] گئے تھے۔

منصور ہوم ورک کب کا ختم کر چکا تھا اور تصویروں والی کتاب دیکھ رہا تھا جب میں اپنے خیالات سے چونکی۔ بارہ بجنے کے تھے کھانا بنانا تھا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ تبھی باہر کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا اس وقت کون ہو سکتا ہے اور جا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ میرے [illegible] پہنچے گئے۔ ایسا لگا کہ [illegible] کر [illegible] بے اختیار میں دروازہ بند کرنے لگی کہ میں نے کہا "بیگم صاحبہ [illegible] [illegible] اخبار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

احساس تھا مگر میں نے سوچا کہ ایک خونی سے کسی طرح کا تعلق پیدا نہ ہونے دینا چاہیئے اور میں کچن میں چلی گئی۔ مگر شام تک مجھے بار بار افسوس ہوتا رہا کہ میں نے بڑی بد اخلاقی سے کام لیا۔

پانچ بجے منصور اور منو دودھ پی کر باہر کھیلنے نکلے تو میں بھی برآمدے میں نکل آئی۔ اسی وقت وہ زینہ اتر رہا تھا۔ ہمارا دہ ہماری نظریں مل گئیں۔ وہ فوراً جھینپ کر دوسری طرف دیکھتا ہوا تیزی سے باہر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے برتاؤ سے اسے ٹھیس پہنچی ہے۔ اور مجھے کچھ زیادہ ہی افسوس ہوا۔ پھر چار پانچ دن گزر گئے میں نے اس کی جھلک بھی نہ دیکھی۔

ایک شام منصور اور منو گیٹ میں جھول رہے تھے کہ وہ کہیں باہر سے آ گیا۔ بچوں کو اس طرح جھولتے دیکھ کر وہ مسکرایا اور ان سے بات کرنے لگا۔ پھر اپنی جیب سے چاکلیٹ نکال کر دیئے۔ میں یہ سب ڈرائنگ روم سے دیکھ رہی تھی۔ اور اپنے آپ کو کنٹرول کر رہی تھی کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے خاموش ہی رہنا چاہیئے مگر اس کے خونی ہونے کے خیال سے دوسرے ہی لمحہ محسوس ہوا کہ میں اپنے بچوں کو ایک خونی کے جنگل میں پھنسا رہی ہوں۔ فوراً میں نے باہر نکل کر زور سے دونوں کو پکارا اور اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے دیکھا وہ افسردہ سی مسکراہٹ لئے سر جھکا کر اپنی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ مجھے اپنی اس حرکت پر بھی افسوس ہوا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ اس کے بھی دو لڑکے ہیں۔ اخبار میں پڑھا تھا کہ اس کیس کے بعد بچوں کا نانا انھیں لے گیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اس پر ترس آنے لگا کہ اسے اپنے بچے یاد آتے ہوں گے لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے خونی ہونے کا احساس ہر دوسرے احساس پر غالب آ گیا۔ اور میں اپنے کام میں لگ گئی۔

ایک دن منصور اپنے کسی دوست کے ساتھ کھیلنے اس کے گھر چلا گیا۔ منو نے بھی جانے کی ضد کی تو میں نے منع کر دیا۔ اب وہ میرے سر ہو گیا کہ مجھے بازار لے چلو۔ دن کا وقت، گھر کے پچاس کام ادھورے پڑے تھے میں بھلا بازار کیسے جاتی؟ میں نے منع کیا تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگ گیا۔ یہ سب ڈرامہ برآمدے میں ہو رہا تھا۔ تبھی جگ موہن باہر جانے کے لئے نیچے اترا۔ منو کی چیخ پکار آخری حدوں کو چھو رہی تھی میں نے جھنجھلا کر اسے ایک چانٹا لگا دیا۔ اترتے ہوئے اس نے یہ دیکھ لیا اور بے اختیار کہہ اٹھا "چلو بیٹے ہم تمہیں بازار لے چلتے ہیں" منو جانے کے لئے مچل گیا۔ اس نے بڑے مہذب انداز سے کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اسے ذرا گھما لاؤں" میں پریشان کہ کیا جواب دیا جائے۔ ادھر منو مچل رہا تھا۔ وہ بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "چلیئے نا انکل" میں کشمکش و پیچ میں تھی اور وہ یعنی خونی میرے جواب کا منتظر تھا۔ یکدم مجھے لگا جیسے کہ میرا منو گھومنے ہی جا رہا ہے۔ مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی منو کہہ اٹھا "یہ انکل آپ مجھے چھرے سے تو نہیں مار دیں گے؟ سب کہتے ہیں آپ لوگوں کو چھرے سے مار دیتے ہیں" جگ موہن کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ ایک دم چیخ پڑا "نہیں بیٹے نہیں" میں نے منو کو ڈانٹا "منو خاموش رہو۔ چلو اندر جاؤ" وہ بیچارہ لٹے ہوئے جواری کی طرح سر لٹکا کر لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرہ واپس چلا گیا۔ میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے اس کے ساتھ کچھ ہمدردی سی ہو چلی تھی مگر یہ خیال دل سے نہ نکلتا تھا کہ وہ خونی ہے۔

میرے شوہر کے آنے میں دو ہی دن رہ گئے تھے۔ میں اور بچے بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ منصور اور منو پھر گیٹ پر چڑھے کھیل رہے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ یکایک منو کی زور سے رونے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی منصور کی چیخ۔ میں باہر دوڑی اور جو کچھ دیکھا اس سے میرے ہوش اڑ گئے۔ منو گیٹ پر سے گرا تھا اور نیچے ایک نکیلا پتھر اس کی پیشانی میں دھنس گیا تھا۔ لال لال گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا اور دونوں بچے ڈر سے چیخ رہے تھے۔ میں نے منو کی پیشانی سے پتھر کھینچ کر نکالا۔ خون کا ایک فوارہ بہہ نکلا جس سے میرا چہرہ گلنار ہو گیا۔ میں نے زخم کے منہ کو کس کے پکڑا۔ اور دہشت سے رو پڑی۔ اسی وقت جگ موہن دوڑتا ہوا نیچے اترا۔ لپک کر وہ ہمارے پاس آیا "رویئے نہیں۔ میں ابھی ٹیکسی لاتا ہوں" کہتا ہوا وہ باہر دوڑا اور پانچ منٹ میں ٹیکسی لے آیا۔ پھر ہم کو اسپتال لے گیا۔ منو کو چار ٹانکے لگے۔ واپسی میں اس نے دوائیں وغیرہ خرید دیں۔ رات بھر منو سویا نہیں۔ میں جاگتی رہی اور مجھے ایسا لگا کہ وہ بھی جاگتا رہا کیونکہ دو تین بار جب منو کو تکلیف زیادہ ہوئی اور وہ زور سے رونے لگا تو وہ فوراً اتر کر دروازے سے اس کی خیریت پوچھتا رہا۔ صبح سات بجے وہ پھر پوچھنے آیا۔ دن بھر وہ ہمارا سب کام کرتا رہا۔ منصور کو اسکول لے گیا اور واپسی میں ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ دوائیں لا کر دیں غرض سبھی کچھ کیا۔ شام تک منو کافی بہتر ہو گیا اور ڈاکٹر نے کہا کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اسی وقت

دو سکھی دیں تھا۔ ڈاکٹر کو پہنچا کر وہ سیڑھیوں کے پاس سے کہنے لگا "اب آپ منو ٹھیک ہے لیکن رات میں کسی وقت بھی کوئی ضرورت پڑے تو مجھے فوراً بلا لیجئے گا" میرے منھ سے شکریہ کے الفاظ برابر سے نکل بھی نہ سکے۔ اس وقت مجھ پر تشکر احسان مندی ندامت شرمندگی سبھی جذبات کا یلغار تھا۔ میں بس دروازہ تک جا کر اتنا ہی کہہ سکی "آپ نے جو کچھ منو کے لئے کیا اس کا شکریہ میں کیسے ادا کروں" [illegible] وہ بہت ہی شریفانہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر "مجھے شرمندہ نہ کیجئے" کہتا ہوا اوپر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اتنے شریف اور ہمدرد انسان سے میں نے اتنے دن کیا سلوک کیا اور اس نے ہم کو اس کا کیا بدلہ دیا!

دوسری صبح میرے شوہر آگئے۔ میں نے انھیں سارا قصہ شروع سے آخر تک سنایا۔ وہ فوراً جگ موہن صاحب کا شکریہ ادا کرنے گئے۔ اور انھیں ساتھ ہی بلا کر لائے۔ اس رات انھوں نے کھانا ہمارے ہی ساتھ کھایا اور پھر میں بچوں کو سلانے اندر چلی گئی اور دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تبھی میں نے جگ موہن صاحب کا سارا قصہ سنا بیچارے کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی تھی! کم جہیز لانے کی سزا میں ان کی بیوی کو ہمیشہ ساس سسر کے طعنے سننے پڑتے تھے۔ مگر وہ بھی تیز مزاج کی تھیں۔ برابر ساس سسر کو جواب دیتی تھیں اور جھگڑا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی شوہر سے بھی جھگڑتی تھیں کہ تمہارے ماں باپ مجھے ستاتے ہیں۔ ادھر ماں باپ بھی بیٹے سے بہو کی شکایت کرتے اور کہتے کہ تم اس کو روکتے کیوں نہیں بے چارے جگ موہن کس کو سمجھاتے۔ نہ کسی کی طرف داری کر سکتے' حالات بگڑتے ہی گئے اور روز روز کے لڑائی جھگڑے گھر کا معمول بن گئے۔ بے چارے جگ موہن گھریلو زندگی سے عاجز تھے۔ پھر ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ بیوی کے ساتھ زندگی ذرا سنبھلنے لگی تھی کہ ایک رات کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ ہمیشہ کی طرح بیوی خوب بولیں خوب جھگڑیں۔ اور باپ کے گھر چلے جانے کی دھمکی دینے لگیں۔ جگ موہن بھی آخر انسان تھے۔ وہ بھی خفا ہو کر اپنے کسی دوست کے گھر رات گزارنے چلے گئے۔ صبح آئے تو بیوی نہ تھیں۔ سمجھا باپ کے پاس چلی گئی ہوں گی۔ لیکن ان کے گھر پر بھی نہ تھیں [illegible] ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد بیوی کی لاش ملنے کی اطلاع ملی [illegible] [illegible] کہ ان کے ساتھ [illegible] کی جان [illegible] لوگوں نے انھیں مجرم قاتل ٹھہرایا

اور مقدمہ دائر کر دیا۔ اور بچوں کو بھی لے گئے۔ جگ موہن کی بھرائی ہوئی آواز آ رہی تھی "رحمان صاحب! بیوی جیسی بھی تھی میری شریک زندگی تھی اس کی موت کے صدمے کے ساتھ اس ذلت [illegible] مجھ پر قتل کا الزام لگا کر مجھے سونپ گئی اور پھر اپنے بچوں کی جدائی کا صدمہ بتائیے اتنے سارے صدمے کیسے برداشت کر لوں۔ بتائیے میں کیا کروں"

میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے دل کی عدالت نے بھی اسے بری کر دیا تھا!

ڈرامہ

ٹیلی فون

ــــ از راحیل بانو

ڈرامہ کے کردار

راحت :۔ انیس سال کی حسین لڑکی
فرحت :۔ راحت کی خالہ زاد بہن اور رازدار سہیلی
فیضان :۔ ٹیلیفون پر راحت کو ستانے والا

پہلا منظر

فرحت محل کا خوبصورت ڈرائنگ روم۔ صوفہ سے ٹیک لگا کر راحت قالین پر بیٹھی کسی رسالہ کے مطالعہ میں منہمک ہے۔ قریبی تپائی پر رکھا فون بج اٹھتا۔ ٹرن ۔۔ ٹرن۔ ٹرن ۔۔ راحت نے برا سا منہ بنا کر فون کی طرف دیکھا اور اندر ۔۔ دالان میں کھلنے والے مغربی دروازے کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگی۔ دیر تک کوئی نہ نکلا۔ اچانک پس منظر سے آواز آئی ۔۔۔۔۔۔۔۔

چھوٹی چچی :۔ (غصہ سے) ارے ریحانہ۔ راشد۔ عدنان۔ ارے کوئی اندر ہے۔ فون تو اٹھائے کوئی۔ بہرے ہوگئے کیا سب کے سب نگوڑا کب سے پڑا چیخ رہا ہے۔ راحت ارری بنو۔ میں سمجھ گئی۔ نہیں تو جو اندر۔ فون تو اٹھا لو بڑھ کے اری بزدل لڑکی۔۔۔
ہائے نگوڑی یہ تمہاری شرم کب جائے گی۔۔

راحت :۔ (ہڑبڑا کر، ہنسے بغیر۔ فون اٹھا کر بے دلی سے۔ ہیلو ہیلو۔

آواز :۔ (چہک کر) بڑی دیر لگادی اٹھانے میں ۔۔ کیا پھول توڑنے تشریف لے گئی تھیں۔۔

راحت :۔ (لڑکھڑاہٹ میں گھٹے ریسیور کو سنبھال کر ۔۔۔ جی ۔۔ ک۔ کون ہیں آپ۔ کس سے ملنا ہے۔۔۔

آواز :۔ ملنا۔ ابھی ملادلتا۔ فون پر کیا۔ ظاہر ہے فون پر کسی سے ملا نہیں جا سکتا۔ کیوں کیا آپ مجھے فون پر ہی ملیں گی۔۔

راحت :۔ (پریشان ہو کر) کیا مطلب ۔۔ آپ کو تو بات کرنے کی تمیز نہیں۔ کیا کام ہے آپ کو ۔۔۔

آواز :۔ دیکھئے کام تو کچھ بھی نہیں اور پھر آج تو سنڈے ہے۔ آرام کا دن۔ بے کار بیٹھے بور ہو گیا تو سوچا آپ سے ہی ذرا باتیں ہو جائیں۔

راحت :۔ (شرم اور غصہ سے) چپ رہیئے بدتمیز ۔۔۔۔ بیہودے
فون رکھ کر وہ صوفہ پر گر پڑی غصہ سے آنکھیں بھر آئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
اچانک فرحت اسے پکارتی کمرے میں داخل ہوئی۔

فرحت :۔ راحت ۔۔ او راحت ۔۔۔ یہ کہاں کی خبر لی جا رہی ہے (کمر پر ایک دھول جما کر) ابھی تک تو تیار بھی نہیں ہوئیں تم ۔۔۔ وہ لوگ ہماری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ پروگرام مس کر دیا ہے تو ارشد بھائی کی ڈانٹ سننے کو بھی تیار ہو جا۔۔ اٹھو۔

راحت :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میں نہیں جاؤں گی فری۔ آج معاف کر دو۔

فرحت :۔ لو اور سنو۔ میں نہیں معاف کرنے والی۔ سنو تمہیں ہوا کیا ہے۔ کسی نے ایسا کیا کہہ دیا جو چہرہ اتنا سرخ ہو رہا ہے؟

راحت :۔ (بگڑ کر) ہاں اب میرا چہرہ ۔۔ کسی کی ۔۔ سے ۔۔ فون کی گھنٹی نہیں سنائی دی تھی ۔۔۔

فرحت :۔ تعجب ہے ۔۔ کیا ہوا۔ تمہیں فون اٹھا لیتیں۔

راحت :۔ میں نہیں اٹھانے والی اب ۔۔ بدتمیز ہے بیہودہ۔

آواز۔ جی۔ جی میرا مطلب۔۔۔ یعنی۔۔۔ وہ آواز۔ یعنی وہ جنھوں نے پہلی مرتبہ فون اٹھایا تھا۔
فرحت۔ اچھا تو آپ آواز کا فرق بھی پہچانتے۔ بہت گستاخ ہیں۔ آپ دیکھئے مسٹر یہاں دال نہیں گلنے والی۔۔۔ جاؤ بیچ ہمارا وقت برباد نہ کیجئے۔
آواز۔ جی۔۔ جی ہاں۔ د۔۔ دیکھئے کچھ بھی کہہ لیجئے لیکن میں سچ کہتا ہوں۔۔۔۔
سیریسلی کہہ رہا ہوں۔ ایک بار سنی ہے لیکن ہزاروں میں یہ پہچان لوں گا۔ اسی وجہ سے بے حیا بنکر فون کر بیٹھتا ہوں۔
بدقسمتی جو سمجھ رہی ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔ ہاں اک بات اور کہ آپ فون بہت زور سے پٹختی ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائے اور میں کہیں اس وسیلہ سے بھی محروم۔۔۔۔
فرحت:۔ (چیخ کر) آپ اپنے سر کی فکر کریں۔۔۔ مسٹر۔۔۔ شریف بنتے ہیں تو کیا یہی ہے آپ کی شرافت۔۔۔ سچ مچ شرم تو آپ کو ہے ہی نہیں۔ جانتے بھی ہیں کہ کس کے گھر میں بار بار بدتمیزیاں کرنے کی جسارت فرما رہے ہیں۔۔۔
آواز۔ محترمہ برائے مہربانی یہ آپ ہی بتادیں۔۔۔ یہ نمبر ڈائرکٹری میں مل گیا تھا اور پھر جب سے آج تک۔۔ اب کیا کہوں۔۔ اچھا بھلا تھا جانے کیا ہو گیا۔۔۔
فرحت:۔ بے عقل ہو گئے آپ۔۔۔ دماغ پھر گیا۔ کسی ڈاکٹر سے فوری طور پر رجوع کیجئے ورنہ پاگل ہونے اور پاگل بنانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے گی۔ مجھے کافی ہمدردی ہے آں جناب سے اسلئے وارننگ دے رہی ہوں کہ آئندہ سے کافی زحمت اٹھانی پڑے گی اپنی جرأت پر۔ سمجھے آپ۔
(زور سے فون پٹک کر) توبہ توبہ۔ کس سے پالا پڑا ہے۔
راحت (روہانسی ہوکر) فرحی آخر یہ ہمارا دشمن کیوں بن گیا ہے کیا بگاڑا ہے ہم نے اس کا۔
فرحت:۔ (ہنس کر) ہم نے کی جگہ تم نے صرف میں کہا ہوتا تو بات کچھ جچتی بھی۔
راحت:۔ کیوں بھلا۔۔۔
فرحت۔ کیوں کہ وہ تمہاری آواز کو سننے کی خاطر ہی بار بار فون کرتا ہے۔۔۔۔ (ہنستے ہوئے) تمہاری خوبصورت آواز کا شیدائی۔۔۔
راحت۔ (تقریباً رو کر) میرا مذاق نہ بناؤ فرحی۔ بھاڑ میں جائے یہ آواز۔ اللہ کیا وہ مجھے بدنام ہی کرکے چھوڑیگا شاید۔۔۔ ہائے فرحی اب میں یہاں نہیں رک سکتی گھر چلی جاؤں گی۔ اب تو چھٹیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔
فرحت۔ (آنکھیں دکھا کر) تم نے تو بچپنے کی حد کر دی راحت۔ آخر کیا جانے تمہارا نام چیز۔۔۔۔ میں تمہیں کتنی بار سمجھاؤں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بے کار لوگوں کو کوئی نہ کوئی شغل تو چاہئیے ہی۔ یہی سہی۔ فون کے ذریعہ لوگ بیوقوف بناتے بھی ہیں اور بنتے بھی۔۔۔ دو ایک بار اس نے کیا ہے۔ دو ایک بار اور کرے گا۔ لفٹ نہ ملنے پر کہیں اور کرے گا۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بیکار فکر میں گھل رہی ہو۔ چلو۔ اٹھو۔ کچھ دیر باغ میں ٹہلتے ہیں۔۔۔

دونوں اٹھکر باغ کی طرف چلی جاتی ہیں۔

تیسرا منظر

راحت کمرے میں اکیلی خاموش بیٹھی ہے۔ چہرے سے غم اور پریشانی ظاہر ہے کبھی بے چین ہوکر اٹھ بیٹھتی ہے کبھی بیٹھکر کسی خیال میں ڈوب جاتی ہے۔ دفعتاً فون کی آواز سے چونک پڑتی ہے خوفزدہ نظروں سے فون کو دیکھکر بڑبڑاتی ہے۔ اُف یہ آفت۔ رسیور اٹھاکر الگ رکھنا چاہتی پھر کچھ سوچکر کانوں سے لگالیتی ہے۔ (دھیمے سے) ہیلو۔ کون صاحب ہیں۔
آواز۔ وہی جانی پہچانی (پرمسرت لہجے میں) اوہ۔ آپ۔ کیا اب بھی میں کسی تعارف کا محتاج ہوں۔ زہے قسمت کہ آج آپ کی آواز سنی۔ خدا نے میری دعائیں سن لیں۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔ (کچھ ٹھہر کر) لیکن۔ آ۔ آپ خاموش کیوں ہیں۔ کیا ناراض ہیں۔ میری کوئی غلطی۔۔۔۔ کوئی خطا۔۔۔۔ بے شک ڈانٹ لیجئے۔ چاہیے گالیاں دے لیجئے۔ سر آنکھوں پر۔ بس یہ معطر آواز سنی ہے۔ الفاظ کی چاہے اس کی پرواہ نہیں۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔ پلیز کچھ تو کہئے۔
راحت۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) میں بھلا کون ہوتی ہوں۔ ڈانٹنے

پشکارنے والی۔ اور پھر ڈانٹا تو اسے جاتا ہے جس کے سمجھنے
کی کوئی امید بھی ہو .... کیا آپ کو معلوم نہیں ..... آپ کی
اس حرکت نے ..... اس مذاق نے مجھے کتنا پریشان کر دیا ہے
آخر اس طرح ستانے سے آپ کا کیا مقصد ہے ......

آواز ۔ (سنجیدہ لہجے میں) بے شک برا ہوں کہ آپ کے دل کو ٹھیس
پہونچائی ہے۔ پہلی بار ہاں۔ پہلی بار ..... بے شک مذاق تھا مگر
لیکن یقین جانیے یہ ...... یہ مذاق قطعی نہیں۔ میں آپ کی صورت
تک سے واقف نہیں۔ صرف آواز کا سرگم سنا ہے۔ سچ مانیے
میں خود نہیں جانتا۔ میں کیوں بے اختیار فون کر لیتا ہوں۔ لیکن
پھر بھی آپ کی آواز سننے سے محروم رہتا ہوں۔ جس نے میری
روح تک کو ..... اب کیا کہوں ...... ہزار بار اپنی خطا پر
معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ لیکن ایک التجا ہے۔ للہ اپنی شیریں
آواز سے محروم نہ کیجئے گا۔ میں بے باک ضرور ہوں۔ بدتمیز
نہیں۔ مجھے غلط نہ سمجھئے گا پلیز .....

راحت :۔ آپ معافی کیوں پیش کر رہے ہیں۔ جو کچھ آپ نے کہا
وہ کافی نہیں ہے کیا .....؟

آواز :۔ جی ... جی، آپ برا مان گئیں ...... دیکھئے غصہ نہ ہوئیے
میں فون رکھ رہا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے مجھ سے یہ واحد ذریعہ
نہ چھینئے گا۔ جس سے آپ کی آواز تو سن لیتا ہوں۔ خدا حافظ
(فون رکھنے کی آواز)

لیکن راحت بے حس و حرکت فون تھامے کھوئی سی کھڑی
ہے کہ فرحت کمرے میں داخل ہوتی ہے ..... اسے اس
حالت میں دیکھ کر متحیر ہو جاتی ہے۔ ہاتھ سے ریسیور لے کر
کریڈل پر رکھ دیتی ہے۔

فرحت :۔ (جھنجھوڑ کر) راحت ۔ راحت ہوش میں تو ہو ....
کیا پھر وہی فون .....

راحت :۔ (کھوئے کھوئے انداز میں) ہاں ..... فرحی میں بہت
پریشان ہوں ....

فرحت :۔ لگتا ہے بے حد متاثر ہو گئی ہو۔ ان حالات سے آخر اتنی
جھنجھلاہٹ کیسے لگتی ہو .... تم ... تم سمجھتی ہو
شاید یہ اچھا نہیں ہے۔ دو ماہ بعد تمہاری شادی ہونے والی ہے

پھر ....

راحت :۔ (رنجیدگی سے) مجھے خود ہمیشہ کسی نادیدہ گناہ کا احساس ہوتا
ہے فرحی۔ لیکن تمہارے سوا کس سے کہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہے
اس نے اس طرح پریشان کر کے میرا صبر و قرار چھین لیا ہے۔
(کرب سے) کبھی اجنبیت میں بھی کوئی رشتہ پیدا ہوتا ہے فرحی

فرحت :۔ رشتے کسی شے کے محتاج نہیں ہوتے پگلی ..... تمہیں دیکھ کر
مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن اچھا ہے تم اس سے صاف صاف کہہ دو
امی مجھ سے کئی بار پوچھ چکی ہیں کہ یہ فون آج کل اتنا پر اسرار کیوں
ہو گیا ہے اور راشد بھائی ..... راشد بھائی مجھ سے
رانگ نمبر کہتے کہتے تنگ آ چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ دونوں میں
شبہ سر اٹھانے لگے کہہ دو ..... جو کچھ کہنا ہے اس نامراد سے۔

راحت :۔ (سسک کر) ہائے فرحی کیا مرا کیا انجام ہوتا ہے۔

فرحت :۔ دیوانی مت بنو۔ پرسوں چلی ہی جاؤ گی۔ اس بیچ ہو سکتا
ہے فون آ جائے .... اچھی طرح جتا دینا .....

(چوتھا منظر)

ٹرن ..... ٹرن ... ٹرن ..... فون چیخ رہا ہے۔ دروازہ
کھلتا ہے۔ راحت اور فرحت گھبرائی ہوئی کمرے کے اندر آتی
ہیں۔ راحت خوفزدہ نظروں سے پلٹ کر دروازے کی طرف
دیکھتی ہے۔

فرحت :۔ تم اٹھاؤ میں باہر جاتی ہوں (دروازہ بند کرتے ہوئے باہر
جاتی ہے) راحت مضطرب ہو کر اسے جاتے دیکھتی ہے۔

راحت :۔ (ریسیور اٹھا کر بوجھل آواز سے) ہیلو .....

آواز :۔ (سنجیدگی سے) آداب عرض ..... (کچھ ٹھہر کر) کیا جواب نہیں
دیں گی .... شاید میں اسی قابل ہوں بھی ... مجھ سے بات کرنا
آپ کو گوارا نہیں شاید ..... کیا میری محبت ہی میری خطا
ہے محترمہ ..... جس کی یہ اذیت ناک سزا مل رہی ہے مجھے

راحت :۔ (بے اختیار ہو کر) ... نہیں ... نہیں ...

آواز :۔ کیا نہیں ... آپ کو حق ہے۔ جو چاہیں آپ کہہ لیجئے ...

راحت :۔ (روہانسی ہو کر) ہائے خدا ... کیا کہوں آپ کی حرکتیں خدا نہ
میری رسوائی کا سبب بنیں گی۔

آواز :۔ (دھیمے لہجے میں) ایسا نہ کہیئے۔ پلیز ایسا نہ کہیئے۔ اس کو

پہلے کہ میری محبت آپ کی رسوائی کا سبب بنے۔ میں اب بھی فون کروں گا آپ سے عزیز یہ نامراد جان تو نہیں... ہمدرد زندگی ختم کر سکتا ہوں لیکن...... فون محبت میں سہہ نہ سکوں گا

راحت :۔ خدا کے لیے آپ میری پریشانیوں کو تو سمجھیے۔ کاش کہ میں نے اس روز فون نہ اٹھایا ہوتا۔ بہرحال اب اور کیا کہوں۔ اتنا کہوں گی کہ سراب کے پیچھے بھاگنا دانشمندی نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس واقعہ کو بھول جائیں... میں ..... میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ آئندہ فون کرنے کی زحمت بیکار ہوگی ...

آواز :۔ (کرب سے) آہ۔ کیا آپ۔ آپ میری وجہ سے جا رہی ہیں۔ نہ جائیے ...... خدا کے لیے نہ جائیے میں (آہ بھر کر)... میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب اگر دل تڑپا تو اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا... لیکن روح کی وادیوں میں آپ کی آواز کی بازگشت باقی رہے گی۔ کہیے۔ اس کے لیے کیا کروں ....

بہرحال تکلیف دہی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ خدا حافظ ... ہاں جانے سے پہلے اپنے کرم فرما کا نام جاننا چاہتا ہوں کیا ...... میری ...... یہ آخری خواہش پوری ہو سکے گی۔

راحت :۔ (آہ بھر کر) شاید نہیں..... میرا نام کسی کی امانت ہے۔ دیکھا

آواز :۔ اور اس امانت کا میں احترام کرتا ہوں راحت ....

راحت :۔ (حیرت سے) کیا۔ آپ ... آپ میرے نام سے کیسے واقف ہوئے ......

آواز :۔ اس کا جواب آپ کی انگوٹھی سے وابستہ ہے۔ جی ہاں۔ انگوٹھی ..... منگنی کی ....

راحت :۔ انگوٹھی ..... کیا مذاق ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ..... کیا ..... کیا آپ۔ میرا مطلب ہے ... وہ ..... یعنی کہ ... اف خدا ...

آواز :۔ (ہنس کر) کہیے کہیے۔ اب نام لینے میں کیا حجاب ہے آپ تو میری شکل ..... میری آواز دونوں سے انجان رہیں ... لیکن میں بھلا اس آواز کو سن کر بھول سکتا تھا بھلا شبنم جیسی دھلی ...... لطیف سی وہ آواز ... ہوا کے دوش پہ سوار میرے کمرے تک آ پہنچی تھی۔

...... یاد ہے وہ صبح ...... ہائے ...آپ رو رہی تھیں ....

راحت ..... راحت۔ بہتر ہے معاف کر سکیں تو کر دیجیے ...

راحت :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) معاف ..... کچھ اندازہ ہے کہ میں اس عرصہ میں کتنا پریشان رہی ہوں ..... یہ دل لگی مجھ سے کرنی تھی .....

آواز :۔ تو اور بھلا کس سے ..... لیکن مجھے معلوم نہ تھا .... تمہارے دل کو اتنا دکھ پہنچے گا ..... میں ..... میں ... واقعی بہت شرمندہ ہوں ..... اپنی محبت کی سچائی دیکھنا چاہتا تھا اور ... اور یہ حرکت سرزد ہو گئی راحت۔ سچ۔ ایک بار تو میں خود اس آزمائش سے گھبرا گیا تھا ..... اسے .... کیا معاف نہیں کرو گی ......

راحت :۔ بہت ستایا ہے۔ یاد رکھیے گا۔ فرحت معاف نہیں کرے گی ......

آواز :۔ (شوخی سے) فکر نہ کرو۔ دو مہینے بعد ہی آ رہا ہوں ..... برات کے ساتھ ...... ساری کدورت مٹا دوں گا ......

راحت :۔ (شرما کر) ہٹیے اب اور زیادہ پریشان مت کیجیے۔ اوہ۔ دیکھیے۔ خالہ امی ادھر ہی آ رہی ہیں ... میں فون رکھ رہی ہوں ..... خدا حافظ .... فیضان صاحب

فیضان :۔ خدا حافظ جان فیض ... خدا حافظ ...

راحت فون رکھ کر بھاگتی ہوئی فرحت کے کمرے کی طرف جاتی ہے ...

(پردہ گرتا ہے)

ہے اسے میری محرومی سمجھئے یا تلخ کامی کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصہ ملا ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ میں بچپنے میں مٹھاس کا شائق نہ تھا کئی بار یہ کوشش کی کہ اپنے آپ کو مٹھاس کا شائق بناؤں مگر ہر مرتبہ ناکام ہی رہا۔ بہر حال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا مگر معاملہ اس پر ختم کہاں ہوتا ہے۔

ایک دقیق سوال اس کی نوعیت کا بھی ہے عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جا سکتی ہے۔ وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیئے۔ اس کے لئے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دانوں کی دو بارہ شکر، جو پہلے جاوا اور موریشس سے آتی تھی۔ اور اب ہندوستان میں بنے لگی ہے، چائے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ حالانکہ چائے کا معاملہ دوسری چیزوں سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ اسے حلوے پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے اس کا مزاج اس قدر لطیف اور بے میل ہے کہ کوئی چیز بھی، جو خود اس کی طرح صاف اور لطیف نہ ہو گی، فوراً مکدر کر دے گی گویا چائے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا!

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کئے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے۔ صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چائے میں ڈالیے گا اس کا ذائقہ متاثر اور لطافت آلودہ ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ اثر ہر حال میں پڑتا ہے تاہم دودھ کے ساتھ پیجئے تو چنداں محسوس نہیں ہوتا کیونکہ دودھ کے ذائقہ کی گرانی چائے کے ذائقے پر غالب آجاتی ہے اور کام چل جاتا ہے۔ لیکن سیاہ چائے پیجئے تو فوراً بول اٹھے گی۔ اس کے لئے ایسی شکر چاہیئے جو بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے۔ اور اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالب گلاب سے لیا کرتے تھے۔

میرے لئے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا جیسے شربت پینے والوں کے لئے ٹھنڈا اور گرم کا فرق ہوا۔ لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کرا سکتا جس کسی سے کہا اس نے یا تو اسے مبالغے پر محمول کیا یا میرا وہم و تخیل سمجھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے ہی منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے یا پھر دنیا میں کسی کے منہ کا مزہ درست نہیں ہے۔ بہت سے لوگ چائے کے لئے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں کا رواج ہے مگر یہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ چائے کے ذائقے کے لئے کوئی ضروری چیز ہوئی بلکہ محض تکلف کے خیال سے، کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتاً قیمتی ہوتی ہے۔ آپ انہیں معمولی شکر ڈال دیجئے بلا و غش پی جائیں گے، اور ذائقے میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کریں گے۔

شکر کے معاملے میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا تو وہ ایرانی ہیں۔ چائے کی نوعیت کے بارے میں ایرانی لوگ اگرچہ بے حس نہیں ہیں مگر یہ نکتہ انھوں نے پا لیا ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لئے قند کی جستجو میں رہتے تھے۔ اور اُسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے، کیونکہ قند صاف ہوتی ہے اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کیا حال ہے! چائے کے معاملے میں سب سے زیادہ کس گروہ کا مذاق ہوا؟ تو میں بلا تامل انگریزوں کا نام لوں گا یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منت پذیر ہے تاہم پھر بھی انگریزی چائے کے حقیقت حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انہیں چھو بھی نہیں گیا جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلدوں کا جو حال ہو گا معلوم ہے۔ انھوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا مگر اور کچھ نہ سیکھ سکے۔ اول تو ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتی اُن کے ذوق چائے نوشی کا منتہا کمال ہوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے ایک قلم گدلا کر دیں گے۔ جو پتی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے اور ایک تیزی پیدا ہو جائے چائے ہے اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے کا ایک ماہر فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک سمجھائے گا۔

اگر فرانس اور بر اعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا رہا تاہم اعلیٰ طبقے کے لوگ چائے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اور ان کا ذوق بہر حال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے وہ زیادہ تر چینی چائے پیتے ہیں اور اگر سیاہ چائے پئیں گے تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے لیموں کی ایک قاش کے ساتھ جو چائے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ نکھار

دیتی ہے۔ یہ لیموں کی ترکیب در اصل روس، ترکستان اور ایران سے چلی پھر قند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چائے کا تیسرا فنجان لیموں ہوگا۔ بعض ایرانی بھی اور کا خاتمہ لیموں ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے۔

اب ادھر ایک اور نئی مصیبت پیش آگئی ہے۔ اب معاملہ صاف صاف گڑ تک پہنچنے والا ہے

ہندوستان قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کرکے لال شکر بنانے لگے تھے۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دور تھی۔ مگر نا صاف گڑ سے ایک قدم آگے نکل آئی تھی۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی تو اس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا۔ چنانچہ آجکل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اہل ذوق کہتے ہیں۔ کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی۔ اب یہاں ہندوستان کے اصحاب ذوق بھی براؤن شوگر BROWN SUGAR کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشین گوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ براؤن شوگر کا ہلکا سا پردہ بھی اٹھ جائے گا۔ اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائے گی۔ یاران ذوق جدید کہیں گے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے۔ نہ کافی، فرمائیے، اب اس کے بعد کیا باقی رہ گیا ہے جس کا انتظار کیا جائے!

پنڈت جواہر لال نہرو چونکہ مٹھاس کے بہت شائقین تھے اس لئے گڑ کا بھی شوق رکھتے تھے۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق، جو میرے لئے اس درجہ نمایاں ہے۔ انھیں بھی محسوس کراؤں، لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کے رہ گیا!!

بہرحال زمانہ کی حقیقت فراموشیوں پر کہاں تک ماتم کیا جائے! آیئے آپ کو کچھ اپنا حال سناؤں، ایک مدت سے چینی چائے کا عادی ہوں وہ وائٹ جسمین WHITE JASMIN کہلاتی ہے، یا کہیں سفید یا ہائیٹ اردو میں یوں کہئے کہ گوری چنبیلی اس کی فکر بھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبا چلے گا کب تک؟ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دور واقع ہوئی ہے؟ عمریں گذر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوق لطیف کا شہرستان کیف و سرور، اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پری کی گھٹی۔

پنڈت جواہر لال نہرو بلا شبہ چائے کے عادی تھے۔ اور چائے پیتے بھی تھے۔

خواص یورپ کی ہم مشربی کے ذوق سے بے نیاز ہو وہ کی، لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکے اور اپنی لپچو و پچو ہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا تھا۔ چائے کی خوشبو جس قدر لطیف ہے مزہ بدرجہا بہتر ہے، میں (آزاد) سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں سمجھئے کہ جیسے کسی سورج کی کرنیں حل کرکے بلوریں فنجان میں گھول دی ہوں۔ ...... قید خانوں میں چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی ہو لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی!!

دیکھئے صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہوگئی اور فنجان خالی ہے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی ....

ہم جیسے لوگ تو چائے کو ٹانک سمجھ کر استعمال کرتے ہیں یا یوں کہئے صبح و شام ناشتہ کرنے کے بعد چائے پینا بھی ایک اسٹم بنا ہے۔ آج کل مہمانوں کی محفل میں چائے نہیں رہی تو وہ محفل ہی کیا رہی۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے ایک پیالی چائے سب سے سستی لیکن اہم بھی جاتی ہے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا صرف ایک ایک شعر ہر ماہ چھپ سکتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ سنجیدہ، معیاری اور پاکیزہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ اگست کے لئے عنوان ہے آنسو اور ستمبر کیلئے پروانہ یا پروانے۔

جب کسی سے کوئی پیمان وفا کرتا ہے
کانپ جاتی ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

مرسلہ:۔ ایم۔ ایس جہاں محی الدین پوری

انجام وفا یہ ہے جس نے بھی محبت میں
مرنے کی دعا مانگی جینے کی صدا آئی

مرسلہ:۔ فرزانہ انوری (بکرم پور باندہ)

غم زیادہ مجھکو تم سے چھڑا رہا ہے
انجام زندگی کا نزدیک آ رہا ہے

مرسلہ:۔ عائشہ صدیقہ احمدی ناز (آمبور)

ہر پھول کے دامن میں شعلے نظر آتے ہیں
انجام چمن زاہد کیا ہوگا خدا جانے

مرسلہ:۔ رخسانہ پروین۔ کھونٹی۔ رانچی

فنا کے بعد پروانے کی میت بھی نہیں اٹھتی
گنہگار محبت کا یہی انجام ہوتا ہے

مرسلہ:۔ فی عظمت ترنم (آمبور)

یوں کم نہ ہوئی رونق ہنگامۂ محفل
محفل میں کوئی واقف انجام نہ آیا

مرسلہ:۔ مس فضیلت بہار (دربھنگہ)

آئینہ ٹوٹ گیا، عکس بھی ٹوٹا ہوگا
کس نے سوچا تھا یہ انجام تمنا ہوگا

مرسلہ:۔ کہکشاں اختر
(سوگول چھپاون)

ارماں بہت ہیں کم کر دے، ہستی یہ نہیں اک غفلت ہے
آغاز سراپا دھوکہ ہے، انجام سراسر حسرت ہے

مرسلہ:۔ صابرہ قمر نظامی (کانپور)

کون ناواقف انجام تبسم ہے امیر
میرے حالات پہ پھر کس کو ہنسی آتی ہے

مرسلہ:۔ مسز عذرا کلام روحی۔ بیگو سرائے

اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا

مرسلہ:۔ محمد رئیس اعظم انصاری (بہار شریف)

یہ اگر آئین قدرت ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

مرسلہ:۔ کے نیلو فر غوث (آمبور)

اے خضر موت ہی ہے انجام زندگی کا
کتنا ہی دن بڑا ہو، ہوتی ہے شام آخر

مرسلہ:۔ مس شائستہ شریف و مس جبیں شاہین (آگرہ)

ہے یہ انجام اگر زینت عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر

مرسلہ:۔ محمد غوث الاعظم مجبوری (بہار شریف)

زیست کی اقدار اعلیٰ کو بھلا بیٹھے ہیں لوگ
اب نظر کا رخ نہیں انجام ہستی کی طرف

مرسلہ:۔ سید احمد و نجیب اللہ خاں (ہنسور)

انجام سفر دیکھ کے رو دیتا ہوں
ٹوٹے ہوئے پر دیکھ کے رو دیتا ہوں

مرسلہ قمر نگار جلیلی (آمبور)

ہر برائی کا انجام ہوگا برا، چاہ کسی کے لئے چاہ در پیش ہے
کامیابی میسر نہ ہوگی اسے چاہے جتنی بھی وہ چال چلتا رہے

مرسلہ:۔ مقصود عالم محسن چھپری (آرہ)

گل کا انجام گلستاں میں جو ہوتا معلوم
پھول بننے کی تمنا کبھی کرتی نہ کلی

مرسلہ:۔ شہناز پروین صدیقی
(کانپور)

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

تبصرے

دنیا تباہی کے راستے پر۔ مصنف محمد اسحاق صدیقی۔ سائز ۲۲x۱۸ ـــــــ صفحات ۱۴۲۔ قیمت پانچ روپیہ۔ ناشر: صبا پبلشرز ۳۱ سنجرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ۔

محمد اسحاق صدیقی محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایسی کتب کی تالیف اور تصنیف میں صرف کیا ہے جو معلومات کے خزانے کہی جا سکتی ہیں۔ اسحاق صاحب کی بیشتر تصانیف سائنس سے متعلق ہوتی ہیں۔ کائنات سے متعلق چیزوں پر ان کی ریسرچ نے اردو میں معلومات کا ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے، جن سے ہمارے طلبا ہی نہیں پڑھے لکھے لوگ بھی استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسی معلومات عام طلبا کو اسکولوں اور کالجوں کی کتب سے بھی نہیں حاصل ہوتیں۔

اسحاق صاحب کی تصانیف کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ انھیں حکومت یو۔ پی اور سنٹر نے اکثر گرانقدر انعامات سے نوازہ ہے۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب پر بھی وزارت تعلیم اور سماجی بہبود حکومت ہند نے مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

"دنیا تباہی کے راستے پر" میں قابل مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح دنیا تباہی کے راستے پر جا رہی ہے۔ یہی نہیں کہ ہم ایٹم بم جیسے مہلک اور تباہ کن چیزیں تیار کر رہے ہیں بلکہ اور بھی صدہا اسباب ہیں جو دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مثلاً جنگلوں کا صفایا۔ فیکٹریوں کا دھواں۔ جانوروں کا قتل عام وغیرہ۔ چنانچہ جن عنوانات پر کتاب لکھی گئی ہے وہ یہ ہیں۔

جانور جو غائب ہو رہے ہیں۔ زمین کا زہریلا ماحول ایٹمی جنگ کا خطرہ۔ جھلکتا ہے میں دنیا۔

کتاب اس قابل ہے کہ ہم اسے خود پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک خبر ہر ماہ شائع کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجی جائے۔ خبر میں کتابت کی کوئی غلطی ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہیں ہوتا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

• حاجرہ نسرین لاری (کانپور) میری سہیلی تحسین فاطمہ عرف مقی کی زندگی میں اللہ پاک نے پہلی دفعہ ۱۹ اپریل سنہ بروز سنیچر بوقت ۹ بجے صبح ایک چھوٹی سی گڑیا عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ اسے نیک، صالح اور صاحب نصیب بنائے۔

• کسی بہن کے دولھا بھائی محمد محسن کے سلسلہ میں خبر آئی ہے مگر نہ نمبر خریداری لکھا ہے نہ وہ نام جس کی طرف سے یہ خبر دی جائے گی۔

• نجم النساء ابراہیم مانڈلک (کھٹکل) میری سہیلی اور میرے سرتاج ابراہیم کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بار بتاریخ ۲۳ مئی سنہ بروز دوشنبہ بوقت سوا بارہ بجے شب، بمقام اندھیری۔ بمبئی ایک ننھا چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ نام ابرار احمد قرار پایا۔ دعا ہے کہ وہ ہمارے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• کہکشاں جمال۔ حسین جمال شمسی (آنولہ) میری پیاری بہن رضیہ جمال اور بہنوئی محمد افضل صاحب کی زندگی کو پُر بہار بناتے ہوئے اللہ پاک نے ۲۶ اپریل سنہ بروز منگل بوقت صبح ۷ بجے ایک پھول کھلایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ میرے نومولود بھانجے کو عمر طویل بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

• خیر النساء الخلاد (مروڑ، مجھرو) میرے خالہ زاد بھائی عماد الہدیٰ قادری (بی اے ایل ایل بی) اور [illegible] کے گلشن حیات میں ۱۰ جون سنہ بروز جمعہ بوقت ۲ بجے سہ پہر اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ نام ثاقب قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

پیغاماتِ نشاط

• خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ خبر حریمی بہنوں کو سنا رہا ہوں کہ میری دوسری بیٹی عزالہ سلمیٰ کی شادی عزیزی علی باقر رضوی سلمہ ایم ایس سی، فرزند دلبند جناب علی عباس رضوی صاحب (انکم ٹیکس انسپکٹر، امیور) کے ساتھ ۲۲ جون سنہ مطابق ۲ رجب المرجب ۱۴۰۰ھ بروز چہار شنبہ بوقت ۹ بجے شب بمقام کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ نکاح استاد الواعظین فخر الذاکرین نادرۃ الزمن مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ نونہروی اور عمدۃ العلماء جناب مولانا سید محمد تقی صاحب قبلہ مجتہد نے صدہا معززین کی موجودگی میں پڑھایا۔ اللہ پاک میری اس بیٹی کو بھی نجم السحر ہی کی طرح شاد و خرم رکھے۔

حریمی بہنیں حیران ہوں گی کہ یہ میری دوسری بیٹی کہاں سے آگئی۔ واقعی عزالہ میرے آفس منیجر بلکہ روح روانِ نسیم بک ڈپو، سید جمیل الحسن صاحب ردولوی کی دختر نیک اختر ہے لیکن میں اسے بھی اپنی بیٹی ہی جیسا سمجھتا ہوں۔ جب جمیل صاحب ہمارے ادارے سے متعلق ہوئے تو یہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اپنی محبت، خوش اخلاقی، بُردباری اور ذہانت کے باعث وہ سب ہی کو پیاری تھی۔ میں اس سے جتنی محبت کرتا تھا، اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہی سبب ہے کہ نجم السحر کی رخصتی کے بعد مجھے پھر اسی طرح رونا پڑا جس طرح نجم السحر کو جدا کرتے ہوئے رویا تھا۔ عجیب بات ہے کہ والدین لڑکیوں کی شادی کرنے کے لئے متفکر اور بے چین رہتے ہیں لیکن جب وہ وقت آجاتا ہے تو صدمہ سے ان کا حال بُرا ہو جاتا ہے۔ مجھے عزالہ سلمیٰ کی شادی کی بڑی فکر تھی اور اس فکر سے نجات ملی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی دولت کھو دی۔ شاید بیٹیوں سے سب ہی محبت کرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہوگا۔ بیٹی مستقل خلش ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد بھی۔ بہرحال یہ قانونِ قدرت ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے امیر غریب سب ہی مجبور ہوتے ہیں۔

نسیم انہونوی

(اس کا بعد صفحہ ۲۲ ملاحظہ فرمائیں)

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

مرسلہ: کے جمیلہ فرحت آبیور

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں شمعیں بجھتی جاتی ہیں
مرتب خود بخود انجام محفل ہوتا جاتا ہے

مرسلہ: صوفیہ مظفر (جمشید پور)

انجام پہ بجھے مسادیں ملیں دل
صد قہ حسنؓ حسینؓ کا مرتضیٰ علیؓ

مرسلہ: آمنہ خاتون زیدی (دہلی)

راتوں کو تصور ہے ان کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا انجام مرا کیا ہوتا ہے

مرسلہ: رعنا خاتون (رجہت نوادہ)

آغاز سفر کہتے ہیں کسے انجام سفر کیا ہوتا ہے
بیگانے ہیں اپنے حال سے ہم اب کس کو خبر کیا ہوتا ہے

مرسلہ: رعنا کوثر (جمن پٹی)

نا سمجھ دل کو بھرم تھا کر لے گی منزل
آخر انجام جو ہوتا تھا ہوا ٹوٹ گیا

مرسلہ: مس صغرا ریشان (ببلا گوڑے)

جلوہ ترا اس طرح سے ناکام نہ ہوتا
ہم طور پہ جاتے تو یہ انجام نہ ہوتا

مرسلہ: عقیلہ ہارون پالوجی (مرودھنجیرہ)

چندہ

عطیہ پروین کا وہ ناول جس نے انھیں سب سے پہلے قارئین سے متعارف کرایا اور جسے اتنا پسند کیا گیا کہ مصنفہ کے دوسرے ناولوں کی مانگ ہونے لگی

چندہ کی کہانی اتنی دلچسپ، پاکیزہ اور متاثر کن ہے کہ ناول شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر پڑھنے والے کو قرار نہیں آتا۔

قیمت مجلد۔

تیرہ روپیہ پچاس پیسے

چند قابل دید ناول

ناول	مصنفہ	قیمت
غیمہ	مشرف تنویر	12/-
پہیلی	〃	16/-
دستکیں	〃	16/-
کیسی	سلمیٰ کنول	18/-
دل اک کشکول	〃	16/-
اکیلی	〃	9/-
اُجالا	〃	16/50
شہپر	اقبال	18/-
جنم جنم کے ساتھی	رضیہ فرحت	12/50
دیکھے ہیں صنم پتھر کے	مینا ناز	10/50
جسے پیا چاہے	〃	10/-
طرز ستم	〃	12/-
انتظار کے پھول	〃	10/-
صنم تیری قسم	دیبا خانم	10/-
پردہ نشین	〃	12/-
اجنبی ہم سفر	〃	12/-
حنا کی خوشبو	〃	12/-
دل سے دل تک	〃	11/-
انتظار کا موسم	〃	10/-
امانت	حمیدہ جبیں	10/-
فاصلے	رضیہ بٹ	16/50
رفاقتیں کیسی	〃	16/50
سوزیہ	روبینہ نازلی	12/-
طوسیہ	〃	8/-
شمیمہ	فیروز جہاں بیگم	10/-
فاریہ	ماجدہ خاتون	13/50
طوبیٰ	زبیدہ خاتون	16/50
شعلۂ شبنم	اعجاز	12/-
ماہم	زبیدہ خاتون	16/-
سراب اور سائے	زبیدہ سلطانہ	15/-

ادناؤں سے پیار کرتا رہوں۔ میری سوچ کا خزانہ۔ اگر اسے گم کر دوں تو پھر ابھی دل مر جاؤں۔ میری زندگی کی بہت مجھ پر سے اترنے والی ہے! عمر کھو گئی اب کیسے آواز دوں! میرے پاس کون آئے گا؟ جب دل کی ٹیڑھی میڑھی گلی گلیاں پیار کے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹیں پتہ دینے لگیں گی تو ویرانوں میں کون آتا ہے۔

تب۔

کا ماضی الجھ گئے۔ آس پاس کے رتیلے تودے ان پگڈنڈیوں پر گر پڑے اور راستوں کے نشان تک مٹا دیے۔ آہٹیں اب بھی آتی ہیں۔ مگر کوئی آتا نہیں!۔

سردی کی تیز لہر برف کے خنجر کے مانند میری پسلیوں کو چیر گئی ہے۔ لیکن آج مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں کہ میں کمبل کندھوں تک سرکا سکوں۔ اے معبود۔ کتنی جلدی میں اتنا شدید بیمار ہو گیا ہوں۔۔ کتنی جلدی۔ کیا دل کا داغ۔ سارے جسم پر محیط ہونے لگا ہے؟ خدا جانے۔ خدا جانے۔

بچھ بچھ۔ زیادہ سوچنا میرے لیے سم قاتل ہے۔ اب تو جو ہونا ہے۔ وہ ہو گا۔ میں نا فوچا ہا کر اپنی بے چاری مجبور زندگی کو زیادہ دکھی نہیں بناؤں گا۔ کیا سوچے گی میری زندگی اپنے دل میں۔ کیسے کمزور مجھ کو سونپی گئی ہوں جو میری حفاظت بھی نہ کر سکا!۔

نہ جانے کیوں۔ آج بہت کچھ یاد آ رہا ہے! اب بھی ذہن تہ و بالا ہے معلوم ہوتا ہے ذہن کے سارے دریچے تیز و تند آندھیوں سے ایکدم کھل گئے ہیں۔ آج بہت ساری یادیں سمیٹ لایا ہوں۔ بہت دور دور سے۔ ہسپتال کے اس بستر پر پڑے پڑے ماضی کے نقوش کیلئے شاہراہوں سے اکٹھا کر لایا ہوں۔

آنسو بہانے میں کتنی لذت ہے۔! (باقی آئندہ)

لاحول ولا قوۃ۔ میں ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ اتنی اچھی لڑکی تمھارے گھر میں آ کر برباد ہو جائے

"یہ تم کیوں اس لڑکی کے عاشق ہو کر رہ گئے ہو؟" فرحت نے ہاتھ نچا کر جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ وہ میری بیٹی کے برابر ہے" منظم صاحب نے برہم لہجے میں کہا اور اپنی طرف سے بات ختم کر کے چلے گئے!۔

"آپ پر لعنت بھیجئے" خرم صاحب نے فرمایا: "وہ کوشری ہو چکے ہیں! کسی بات پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ جو کچھ کرنا ہے آپ ہی کیجئے!"

چنانچہ اسی شام کو فرحت پھر کچھ تحفے لے کر کچھ پکا کر ماجرہ صاحب کے گھر جا دھمکیں!۔

ماجرہ بیگم تابش کو دیکھنے جا رہی تھیں۔ برقعہ پہن رکھا تھا۔ صحن میں پالک پھل سے بھری رکھی تھی۔ بدرن دیٹا کے ڈبے، کنڈینسڈ ملک کے ٹن بسکٹ کا پیکٹ اور جانے کیا کچھ تھا!۔ فرحت کے دل میں پھر لڑکا سا اٹھ گیا۔ اب بھلا بات کرنے کا موقع کہاں ہے؟۔ بڑی بڑی گالیاں پانی کر دینے والے کوسنے اور گھلا دینے والی بددعائیں ان کے سینے سے نکلنے لگیں!۔

"اچھا ہوا فرحت تم بھی آگئیں" ماجرہ خاموش ہو کر بولیں: "شمسہ کی بہت گھڑی ہو جائے گی۔ اے خدا۔ ان کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی!۔"

"کیوں کیا ہوا۔ تابش کو فصلی بخار ہی تو ہے" فرحت نے تلخ لہجے میں کہا: "مجھے چھوٹے بچوں کو آ رہا ہے۔ کم ہو جائے گا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"تابی کو پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔ اس پہ اللہ اپنا رحم کرے" ماجرہ بیگم نے کہا: "میں تو اسے دیکھ آئی ہوں۔ ایسا گم صم اور مبہوت ہو کر رہ گیا ہے کہ جیسے بولنا

بھول گیا ہو۔ نہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے نہ اسے اپنے پرائے کا ہوش ہے۔"

"کیوں آخر؟" اپنی بے پناہ خوشیوں کو زبردستی ضبط کر کے نہایت تشویش سے فرحت نے پوچھا۔ "پتہ نہیں۔" ہاجرہ نے نقاب گراتے اور باسکٹ سنبھالتے ہوئے کہا: "شاید سے بھی "انھوں" نے پوچھا تھا۔ وہ کبھی کچھ نہیں بتاتا۔" چپ رہتی ہو ...

"بے چاری ثمینہ پہلے اب میرے بھر آئے بیٹا:"

"یہ کیا بک رہی ہو فرحت۔ باپ کی جان سے دور۔ ان میں بیٹے کو کیوں مار رہی ہو۔"

"خدا خدا کرو ..." فرحت ہوش میں آگئیں۔ "میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ بے چاری بس پریشانیوں ہی کی ہو کر رہ گئی ہیں۔"

ہاجرہ کو ان کی بات اس قدر گراں گزری تھی کہ انھوں نے ان سے چلنے پر بھی اصرار نہیں کیا۔ دروازے کی طرف مڑ گئیں۔

"تزئین کہاں ہے؟" یکایک فرحت نے پوچھا۔

"دو دن سے ثمینہ کے پاس ہے۔ میں نے ان کی تنہائی کے خیال سے اسے ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔"

ہاجرہ بیگم کے جواب نے فرحت کو سکتہ زدہ کر دیا۔

انھوں نے برسوں میں پہلی بار کبھی بھی منظر دیکھا۔

ثمینہ بیگم اپنا آنکھ ... سوالات ہی میں اٹھا لائی تھیں وہ بیٹی کچھ پکار رہی تھیں۔ تزئین تابش کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ فرحت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر وہ جھٹ کر تابش کے پاس آئیں۔ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا۔ پھر سہم کر بولیں۔

پھر دھڑکنے لگا!۔

تابش اس کی طرف پشت کیے لیٹا تھا!۔

ابھی ابھی اس سے سب مل کر گئے تھے۔ ان سب کی آمد نے اس پر بہت ناخوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اس نے بد اخلاقی کی باتیں کر کے انھیں اپنے پاس سے چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ ثمینہ بیگم روتی رہ گئی تھیں۔ لیکن نجانے کیوں تابش کا دل بھر چکا تھا۔

اب اس کے آس پاس سناٹوں کا راج تھا۔

کوئی آہٹ نہ آواز۔ سیلنگ فین چپکے چپکے سرسرا رہا تھا۔ اور اس دریچے کے باہر دھندے میں لپٹے درخت ساکت کھڑے تھے۔

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کوئی آرزو ہوک بن کر سینے سے نکل رہی تھی۔

وہ اس ویرانے سے کہیں دور چلا جائے۔

اپنی پرانی دنیا کی طرف۔ جہاں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا۔ نغمہ و نور کی دنیا۔ تفکر و آلام سے خالی دنیا۔ خیالوں کی وادی۔ جہاں ترلا کا نام ہو۔ جسے کبھی نہیں مل سکا۔ ایسی دنیا کہیں تھی ہی نہیں۔!

ڈاکٹر تاکید کر گیا تھا۔ سوچنا چھوڑ دو۔!

اسے ان نادان دوستوں اور ناسمجھ چارہ گروں پر ہنسی آرہی تھی۔ کہتے ہیں سوچنا چھوڑ دو۔

پھر میں جیوں کیسے؟ اور کیا ہے میرے پاس؟ اس جہان خراب میں زندگی کو بنانے رکھنے کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا؟ مگر میری تقدیر میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ میں اپنے خوابوں کے اندھیرے محلوں میں آسودہ ...

بالکل احمق خشک کا چاند اُفق فلک پر چمک رہا تھا!۔

ہسپتال کے وسیع و عریض لان میں عجیب سی سوگوار چہل پہل تھی۔ کاروں۔ رکشوں اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم تھا۔ وہ خوب ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی!۔ کہیں ہارن کی آواز کہیں اسٹریچر کی گھڑ گھڑ۔!

ترنم کو دھکے کھاتے دیر ہو چکی تھی!۔ تقریباً دو گھنٹے سے چکراتی پھر رہی تھی نہ اسے نمبر کا پتہ تھا نہ روم نمبر!

بالآخر بدحواس اور پریشان سی وہ نرسوں کے اسٹاف روم میں پہونچی! ہیڈ نرس کا رجسٹر دیکھا! پتہ چلا ابھی وہ قطاری نہیں ہوئی۔ تابش اسکنڈ فلور، اور ایمرجنسی وارڈ میں تھا!

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ادھر چلی!۔

باسکٹ میں کچھ پھل تھے۔ مگر اس میں کافی۔ باسکٹ اتنی بوجھل تھی کہ۔ بار بار ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ اور بازو دکھ چکے تھے!۔

وارڈ کے باہر بیٹھا ہوا بیڈ مین اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا!۔

- مجھے تابش صاحب سے ملنا ہے۔ وہ آج صبح کو داخل کرائے گئے ہیں!۔

- جی ہاں۔ جی ہاں۔ تشریف لے جائیے!۔ وہ تنہا تم ہوا۔

اس نے جھکے سے پردہ سرکایا! اور دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ کسی تیز آگاہ بولنے والی نے اس کا استقبال کیا۔! اور اس کا دل خلش آمیز فرق

اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔ ماشاء اللہ کیسا اچھا بیٹا ہے تو بچہ ہوا ہے! جل رہی ہے تو ٹھنڈی بھی ہو جائے گی۔ فرحت آنٹی۔ آپ انھیں کیوں دیتی ہیں! یک بیک ترنم پھٹ پڑی۔

فرحت پر پہاڑ ٹوٹ جاتا تو انھیں اتنی حیرت نہ ہوتی۔ جتنی ترنم کے لہجے سے ہوئی۔ اجرہ نے باسکٹ میز پر رکھ دی۔ پھر پیار سے تابش پر جھکیں۔

اللہ جلدی سے تمھیں صحت دے۔ میرے بچے۔ کیسے ہو!۔ انھوں نے اپنے سرد ہاتھوں میں اس کا جلتا ہوا پہونچا تھام لیا۔

تابش کی خوشنما آنکھوں میں آنسو بھر آئے: مرنے کے لیے بھی بہانہ چاہیے خالہ امی:

دور پار دشمن۔ کیسی بدبختی کی باتیں کرتے ہو: انھوں نے اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھے۔ کیا کھاؤ گے۔ گرم گرم دودھ میں اولٹین ملا دوں!:

نہیں خالہ امی۔ کچھ بھی نہیں۔ ... اس نے سانس بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔

ساری رات اس کی عجیب ہولناک کشمکش میں گزری تھی۔ ہر لمحہ مرتا تھا ہر لمحہ جیا تھا۔ اور پھر بھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ اسے فوری طور پر سینی ٹوریم میں شریک ہو جانا چاہیے! اور وہ خود اپنی منحوس بیماری کا پتہ کسی کو دینا نہیں چاہتا تھا نہ ماں کو نہ کسی جان پہچان والے کو۔ حتیٰ کہ اس نے شاہد کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔! ایک طرف وہ اپنا مرض سب سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا دوسری طرف اس کا اسپتال میں داخل ہونا بھی اتنا ہی اہم اور ضروری تھا۔

- مجھے کیا کرنا چاہیے!:

اس سوالیہ نشان سے ٹکرا ٹکرا کر وہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اب تو یہ عالم تھا

کے لئے چٹان کی طرح جما ہوا تھا۔ سینے میں وہ دوزخ بھڑک رہی تھی۔ آنکھوں میں پگھلی ہوئی آگ بھری تھی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بھسم ہو چکی تھیں۔

وہ آخری فیصلے پر پہونچ کر پر سکون ہو گیا تھا۔

بلا سے۔ جو کچھ ہونا ہے۔ ہو جائے۔

میں دواسپتال جاؤں گا۔

نہ کسی پر اپنی بیماری واضح کروں گا!۔

کچھ فکر نہیں۔ اگر مر گیا۔

اسی کو روگ کے ذرتے بالآخر مر جانا ہی جائے گا۔

لیکن میں اپنے بارے میں یہ سننا پسند نہیں کروں گا کہ میں دق میں مبتلا ہوں۔

میرے پاس کسی کا آنا جانا ٹھیک نہیں۔

میری بیماری دوسرے کو لگ جائے گی۔

لوگ مجھ سے پرہیز کرنے لگیں گے۔

کیا مجھے یہ گوارہ ہے۔؟

نہیں۔ ہرگز نہیں!۔

بعض لوگ ایسے ہی انتہا پسند ہوتے ہیں۔ موت کو بخندہ پیشانی گوارہ کرتے ہیں مگر اپنی آن اور عزت پر بال برابر فرق گوارہ نہیں کرتے۔ اشاعت ہمسایہ سے زیادہ انھیں نقصان ایہ پیارا ہوتا ہے۔ اپنی ہی ہستی سے جو کچھ ہو۔ اپنی ذات گفتگو کا موضوع نہ بنے۔!

پھر اس کے چلتے پھرتے دماغ میں کوئلے سے چیخ جاتے! بجلیاں چمکتیں اور سوچے سمجھے خیالوں کے خرمن میں آگ لگنے لگتی!۔

آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئیں۔ ترنم الگ بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔ بیچ و تاب کھا رہی تھی۔ آج اس پر بھی غم پڑے تھے۔ تابش کے سلوک کا غم۔ اس کی بیماری کا غم اور مستزاد۔ سب سے بڑا غم سے وابستگی کا غم۔!

ممی۔ آپ انھیں منع کر دیجئے۔ اس قسم کی بکواس کرنے ہمارے گھر نہ آیا کریں وہ بگڑ کر بولی۔

ان کا دماغ الٹ گیا ہے۔ ناجرہ بیگم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ نہ وقت دیکھیں نہ موقعہ۔ بس اپنی لن ترانی سے کام۔ حالانکہ وہ بھی کہہ چکے ہیں۔ لیکن اپنی ہانکے جاتی ہیں!۔

اپنے ننگے بیٹے پر انھیں بڑا ناز ہے۔ صورت حرام۔ جاہل ہے ایک دم کندۂ ناتراش۔ تم گھر جاؤ۔ میں ٹھہر جاؤں گی۔

ممی آج تابی نے مجھ سے بہت بھڑک بھڑک کر باتیں کیں۔

غریب پریشان ہو گیا ہے۔ کون سا شیطانی بخار ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی باتوں کا برا مت مانو۔ آدمی اپنوں ہی سے کھلتا ہے۔

ممی۔ میں جاؤں تابی کو دیکھنے!۔

ترنم اٹھ کر چلی گئی!۔ ناجرہ تخت پر لیٹ کر اونگھنے لگیں!۔

ایک بوجھل دن آہستہ آہستہ رات سے گلے ملنے رینگ رہا تھا۔ شجر شجر پر اداسی طاری تھی۔

ترنم گھر گئی۔ غسل کیا۔ اور گیلے بالوں سے سجدے میں گر پڑی۔ دل کا لاوا خون بن کر آنکھوں سے بہنے لگا!۔

پھر جیسے ہی چار بجے۔ اس نے اپنے سیدھے کپڑے بدلے۔ اور خادمہ کو دے کر اکیلی ہی ہسپتال چلی گئی!۔

تم کیسی ماں ہو کہ تمھارا اختیار نہیں۔

میں کیا کروں۔ ابھی اس کے ڈیڈی ہرگز نہیں مانیں گے۔ وہ شادی کی بات بھی سننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ دو تین سال بعد دیکھا جائے گا! خرم کا بھی ابھی کچھ ٹھیک نہیں۔ نہ پڑھائی مکمل ہے نہ ملازمت کا کہیں ٹھکانہ ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ دیکھتے بھالتے ہم لڑکی کو کیسے خرم کے سپرد کردیں۔

آج کل تعلیم کسی کو کیا دیتی ہے۔ جیسے بڑے بڑے ڈگری یافتہ ملازمت کی تلاش میں چکراتے پھر رہے ہیں۔ اصل مطلب سرمائے سے ہے۔ سرمایہ ہے تو بے تعلیم بھی لڑکا اپنی بیوی کو مکمل آرام سے رکھ سکتا ہے۔

یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن جب تعلیم کی بزنس کے سامنے کوئی وقعت نہیں تو سارے اسکولوں کالجوں اور تمام یونیورسٹیوں کو بند ہو جانا چاہیئے!۔ اگر سبھی آدمی بزنس میں لگ جائیں تو بڑے بڑے نامی گرامی جج بیرسٹر، وکیل انجینئر اور ڈاکٹروں کے نام دنیا کے صفحوں سے مٹ جائیں۔ تاجر اور سوداگروں کی منڈی بن جائے۔ یہ پڑھی لکھی دنیا۔

"اے لو۔ تم تو خفا ہو گئیں۔

بار بار ایک بات کا دہرانا مجھے پسند نہیں۔ میں کہہ چکی ہوں۔ ترنم کے مختار اس کے ڈیڈی ہیں۔

انھوں نے تو انکار کر دیا۔

تو پھر یہی جواب میرا بھی ہے۔

تم نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ ہماری دوستی اتنی گہری ہے۔

اگر رشتہ ناطوں کو دوستی پر اثر انداز نہ ہونے دو تو وہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

اچھا باجرہ۔ جیسی تمھاری مرضی۔ فرحت نے دل ہی دل میں آہ بھر کر کہا اور نقلی

ترنم کی شخصیت کا جلال اس کی باتوں کا جمال۔ اس کے تصور سے دامن چھڑا لینا آسان نہیں تھا!

کوئی چیز دل کے اندر بیٹھی آواز دے رہی تھی۔

پاگل۔ زندگی بھر ملنے والی چیز نہیں۔

یہ تو خدا کا عطیہ ہے۔ اسے اپنی نادانی سے کیوں ٹھکرا رہا ہے۔ کسی کے کہنے سننے کی مطلق پرواہ نہ کرے سنوار لے اپنی زندگی!۔

کیا دنیا میں کوئی بیمار نہیں ہوتا

آخر یہ ڈھیروں اسپتال کیوں بنے ہیں!۔

تو پھر اچھا ہو جائے گا۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ اس مرض کو مستقل کر کے پچھتائے گا۔ پھر وہ جانے والا نہیں۔

لیکن آناً فاناً پھر خیالات میں بھی میں ابھرنے لگی!۔

بات منھ سے نکلے گی پرائی ہو جائے گی!

وہ ہسپتال چلا جائے گا۔!

اس کے بعد۔ آگے سناٹا پیچھے ویرانی۔ پھر ترنم کو اس کے پاس جانے سے منع کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دق کا نام سُن کر خود بھی اس کے قریب نہ آئے!۔

کیا وہ اس کی دوری برداشت کر سکتا ہے!۔

نہیں۔ وہ بے صبری میں سسک پڑا۔

میں بہت بدنصیب ہوں۔ بچپن سے لے کر آج تک میں نے کسی خوشی کا منھ نہیں دیکھا۔ حرماں نصیبی میری دولت ہے۔ ترسنا، کلپنا میرا مقدر۔ کیا میں عمر بھر اس طرح مضطرب اور کسی چیز کی آرزو میں سرگرداں رہوں گا

اگر کچھ دنوں اور قسمت ساتھ دیتی تو میں تعلیم ختم کر لیتا۔ ملازم ہو جاتا۔ اور پھر فرنوز تم میری خواب زدہ زندگی میں بہار جاوداں بن کر چلی آتی۔

لیکن میرے ظالم مقدر نے پھر میرا راستہ کاٹ دیا۔

اب کوئی امید نہیں۔

کوئی آس نہیں۔

جانتے ہو مجھے کون ہے جو اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دیدے ۔

اور میں خود بھی برداشت نہیں کروں گا کہ اس کی بے داغ زندگی دق کی پھنکار سے داغ دوں!۔

کیا میں اپنا مرض اس سے چھپا کر اس کی آرزو کرنے میں حق بجانب ہوں؟۔

دق کبھی ختم نہیں ہوتا۔ نسلاً بعد نسلاً چلتا ہے!۔

مجھ سے ترنم میں منتقل ہو گا۔ اس سے اس کے بچوں میں۔ ہمیشہ موجود رہے گا!

نہیں نہیں... میں ہرگز پسند نہیں کرتا۔ میں اسے خود سے متنفر کرا دوں گا۔

وہ میری شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرے گی!۔

بس... مجھے آج سے یہ سوانگ رچانا ہے۔ کہ۔ میں ترنم کے قرب سے بیزار اس کے وجود سے اکتایا ہوا ہوں۔ میری کا بے رخی۔ سرد مہری اور بد زبانی اسے خود بخود مجھ سے دور کر دے گی!۔ وہ بچ جائے گی۔

میری محبت [illegible] ابدی جدائی اس کی زندگی کا ناسور بن جاتی!۔

لیکن۔ میری نفرت۔

اس کی اپنی زندگی تو سنوار دے گی۔ جائے۔ مجھ پہ جو گزرے۔ گزرے!!۔

تالی: کسی کو ہتھوڑا پڑ رہا تھا۔ یا شاید لیب کا درد بھرا نوحہ۔ جو جانک تا بلبل کے کانوں میں گونجا تھا۔

بولا۔ گھر پر جتنی نقل و حرکت ہوتی۔ اسی قدر بیمار کی حالت بھی بگڑتی جاتی ہے۔ میں فوری مدد ملتی ہے۔ آرام ملتا ہے۔ ہفتہ بھر بعد واپس آجائیں گے!۔

بہت اچھا ہوا! ساجد صاحب نے کہا۔

مگر وہ وہاں اکیلا ہے۔ ناجرہ بیگم نے کہا۔

کسی کو رہنے نہیں دیا جاتا۔ آنٹی ورنہ میں خود رہ لیتا: شاہد بولا

غذا کا بندوبست: نہایت دردمندی سے فرحت نے پوچھا۔

غذا وذا کچھ بھی نہیں: شاہد نے نفی میں سر ہلایا: اور دودھ وغیرہ دیا کریں گے:

ان سے ملنے کا کون سا وقت ہے: ترنم نے چپکے سے پوچھا۔

شام کے چار بجے سے سات بجے تک!۔

یا خدا۔ اسے اصل خیر سے گھر پہنچا دے۔ پروردگار: شمسہ بیگم نے آہیں بھرتے ہوئے آنچل آسمان تلے پھیلا دیا۔

اس وقت سب اپنے کام سے لگ گئے!۔ مگر فرحت بڑی لگاوٹ سے ناجرہ اور شمسہ بیگم کے پاس ہی بیٹھی رہیں۔ شمسہ بیگم کا دل تو گرفتار پرندے کی طرح سینے کے قفس میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ ناجرہ بیگم ان کو دلاسے دیتی رہیں۔ یا رب خدا خدا کر کے وہ کچھ دیر کے لیے سو گئیں۔ ساری رات جاگتی رہی تھیں۔ فرحت اور ناجرہ دالان میں آ بیٹھیں کچھ دیر تا بش ہی کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہی پھر فرحت نے دبی زبان میں اپنا مدعا بیان کیا۔

میں کہہ چکی ہوں۔ فرحت: ناجرہ کے دل میں اب ان کی رتی بھر محبت باقی نہیں رہی تھی۔ رکھائی سے بولیں: لڑکی پر میرا اختیار نہیں۔ اس کے باپ کی جو مرضی ہو گی وہ کریں گے:

اس نے بدقت تمام پلکیں سے پلکیں جدا کیں۔ ترنم کا معصوم بھولا بھالا چہرہ اس
پر جھکا ہوا تھا۔ سیاہ کالی آنکھوں میں بے نام سی نمی۔ درد کی تڑپ [illegible]
وہ آنکھیں تابش کی آنکھوں میں سو گئیں!۔
دل میں جوار بھاٹے تڑپنے لگے!۔
اس معصوم بچی روح کو وہ اپنی زبان سے کیونکر نفرت کا پیغام سنا سکے گا!!۔
کیونکر۔؟
وہ اسے ٹکٹکی باندھے تکنے لگا!۔
نرما حیا سے۔ یا فور جذبات سے۔ ترنم کا چہرہ گلابی ہونے لگا۔ اس کی پلکیں جھکیں
اور وہ نظریں چرانے لگی!۔
"ترنم" : اس نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔
جی۔ مدھم سی آواز میں اس نے جواب دیا۔
ترنم : "ابھی وہ بے بس ہو کر رو دینے لگا۔
کیا ہو گیا ہے۔ تابی : ترنم نے بے تاب ہو کر اس کے کندھے پکڑ لیے : ساری رات
کراہتے آہیں بھرتے گزاری ہے۔ اب بھی سوچے جا رہے ہیں۔ رو رہے ہیں! با
کیا ہوا ہے؟
ترنم ... گھٹی گھٹی سسکیاں۔ دل دوز کراہیں۔ ترنم پریشان ہو گئی۔
آپ کو میری قسم۔ کہیے کہاں درد ہے : اس نے جھک کر اس کے سینے پر اپنا
سر رکھ دیا۔
"ترنم۔ تم میرے پاس سے جاؤ۔ میری سانسیں سفر میں تمہارے لیے۔ مجھے
بہت تیز بخار ہے۔ میں جل رہا ہوں۔ تمہیں بھی جلا ڈالوں گا۔ تمہاری زندگی تو
شگفتہ کلی کی طرح ہے۔ میری سموم سانسیں تمہیں جھلس دیں گی۔!"

تو پھر کیسے کرا اچھے ہو گے۔!
کب کہتا ہوں کہ اچھا ہونا چاہتا ہوں۔
میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے دماغ پر بھی اثر ہو گیا ہے۔ اچھی بری بات
نہیں سوچتے۔ چلو میرے بھائی۔ اٹھو۔ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ اگر کوئی پوچھے
گا تو بتا دوں گا کہ میعادی بخار کے لیے ضروری ہے کہ مریض کو اسپتال میں
شریک کرا دیا جائے:
"پاگل ہو بالکل پاگل۔ کیا لوگ اسپتال اور دق گاہ کا فرق نہیں سمجھتے"۔؟
کیا ڈاکٹر سب سے کہہ نہ دیں گے کہ مجھے کون سا مرض ہے۔!"
کہہ دیں کہہ دیں : شاہد جھنجھلا گیا! : ڈاکٹر ولی اللہ نہیں۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا
ہے اس کی تشخیص غلط بھی ہو سکتی ہے۔ تم کیا لوگوں کے کہنے سننے کے ڈر سے مرض کو
پال پوس کر بڑا کرو گے۔ خدا چاہتے ہو!۔
"تم کیا دیوں پھیلے!: وہ ہنسنے لگا۔
اٹھو چلو۔ وقت ضائع ہو رہا ہے!۔ قسم بخدا تمہارے سر پر قرآن رکھ دوں گا"
بہرحال زبردستی شاہد اسے لے کے چلا گیا!۔
اسپتال میں تابش کو اسی وقت رکھ لیا گیا!۔ اس نے ہزار ہاتھ پاؤں مارے
لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس پر دو دو مزدوروں کو متعین کر دیا۔
پھر ادھر فوری حسب کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایکسرے۔ مختلف قسم کے امتحان
کیا گیا۔ شاہد گھر واپس آیا۔
اپنی ذمہ داری پر کوئی کام کیا تھا تو بہت پریشان تھا!۔
تابش کہاں ہے : پہنچتے ہی خسر بیگم نے پوچھا۔
ٹی بی۔ معائنہ کے بعد پتہ چلا کہ انھیں میعادی بخار ہے : ہکلا کر شاہد نے جھوٹ

لب بھی: اس نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا: مجھے ایسی باتیں پسند
ہو لیے۔ کیا پئیں گے!۔

"زہر"

توبہ توبہ۔!

تو پھر کیا پوچھ رہی ہو کہ کیا پئیں گے؟۔

زہر میں پی لوں گی۔ اگر میرا دل جلایا ایسی باتیں کرکے!۔

وہ تلخ انداز میں کہنے لگا: اِس میں جانتا ہوں۔ تمھیں مجھ سے بہت محبت ہے۔

اے۔" اس نے للکارا۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی: ذرا آہستہ۔ کمرے سے
باہر سب لوگ بیٹھے ہیں۔ سن لیں گے تو کیا سوچیں گے؟"

تم بھی انہی کے پاس جا بیٹھو۔" تابش نے یہ کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ بدل
لی اور اس شدت سے دانت پر دانت جکڑے کہ گالوں کی رگیں ابھر آئیں!۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ برش کر لیجئے تو پھر اوولٹین لے آؤں:

آخر یہ پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ ترنم۔ تمھیں میری تیمارداری کا کیا حق ہے
تم جاؤ۔ امی کو بھیج دو۔ وہ سب کچھ کر لیں گی!:

ترنم کو اس کے جواب سے بہت صدمہ ہوا۔ وہ ساری رات اس کے پاس
جاگی تھی کبھی سر دبایا تھا کبھی پنڈلیاں دبائی تھیں۔ اعضا شکنی میں وہ اٹھ اٹھ کر
بھاگ رہا تھا اسے واپس پلنگ تک لائی تھی۔ دانتوں پسینہ آیا تھا مگر اس
نے اف بھی نہ کی تھی۔ اور اس کی ساری خدمت و خلوص کا یہ صلہ!۔

پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ برا
ماننے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اچھا ہوئے تو پھر وہ بھی گن گن کے بدلے لے گی!۔

اس نے جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تابش...:"

چلی جاؤ۔ یہاں سے!۔" وہ اتنے زور سے دہاڑا کہ ترنم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

اتنے میں شاہد اندر آیا۔

کیا بات ہے۔ ترنم!" اس نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

کچھ نہیں...: ترنم نے سر ہلایا اور پردہ ہٹا کر کمرے سے نکل گئی۔

یہ کیا۔ تم رو رہے ہو۔ تابش: شاہد اس کے پیچھے بیٹھ کر اس پر جھکا!۔

میں نے اسے خفا کر دیا۔ شاہد۔ جان بوجھ کر: ہچکیاں لیتے ہوئے تابش نے
کہا: اب وہ میرے پاس کبھی نہیں آئے گی۔ مجھ سے۔ جنگلی کہے گی مجھے۔ وحشی
کہے گی میرے ساتھ ساری رات جاگتی رہی تھی۔ اور میں۔ میں نے اسے ناراض
کر دیا: وہ بھاری بھاری سسکیاں لینے لگا۔

چھوٹی چھوٹی باتوں کا کلیجے پر داغ لیتے لیتے تمھارا یہ حشر ہوا ہے: شاہد نے
اپنے ہاتھوں میں اس کے آنسو سمیٹ لیے: پاگل نہ بنو تابش۔ اٹھو۔ اپنے میں
ہمت پیدا کرو۔ کیا تم کو اپنی دکھیاری والدہ کا خیال نہیں آتا۔ وہ کتنی پریشان
ہیں!۔ چلو! میں تمھیں ساتھ لے چلنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ اسپتال میں سارا
بندوبست کر دیا ہے۔ ہفتہ بھر رہ کر چلے آنا۔ مرض کے شروعات میں اس پر قابو
پا لیا جائے تو پھر آئندہ مرض کے بڑھنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ کسی کو آواز دو۔ وہ کوئی
پینے کی چیز لے آئے تمھارے لیے۔!"

میں ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ شاہد۔ میں کسی کو خبر نہیں ہونے دوں گا۔ کہ ایک
نامبارک مرض کا آغاز ہو چکا ہے!:

یہ ضد اچھی نہیں۔ تابش۔ تمھیں میری قسم۔ اٹھو اور چلو!:

نہیں... میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا۔

ٹیلیفون نمبر آفس :-
۲۲۵۵۹
اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر رہائش :-
۲۵۴۳۴
قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

گذشتہ ۵۵ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں

ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے۔

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۷۷ء نمبر ۸

معاونین۔ شوکت جہاں سلیم ۔ عصمت الہ ۔۔۔ جاں نثار بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	ممالک غیر سے	بیس روپیہ
خصوصی خریداری		اٹھارہ روپیہ
عمومی خریداری		پندرہ روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد

غیر ممالک سے بقدر ... روپیہ یا دو پونڈ سالانہ کے حساب سے ایئر میل سے

مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ماہ کی پہلی تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں ۱۰ تاریخ سے پہلے کی گئی شکایتوں پر غور کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں پہنچ جانا ضروری ہے ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کرتے وقت جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ آفس اور ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو ۔ ۲۵ ۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی ، مالک و ناشر ، سرفراز پریس لکھنؤ ۔۔۔ پرنٹر

مردوں سے عورتوں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ اس صنف قوی نے ہمیشہ صنف نازک پر ستم توڑے ہیں۔ ان پر ظلم و ستم کیے ہیں۔ انھیں چہار دیواریوں میں قید کر کے رکھا ہے انھیں اپنا محکوم سمجھا ہے انھیں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسے اپنے پیروں کی جوتی سمجھا۔ جب چاہا پہنا، جب چاہا اتار دیا۔

یہ ایسے الزامات ہیں جو مرد پر لگائے جاتے رہے ہیں اور اب بھی جبکہ خواتین نے مغربی پروپیگنڈوں سے متاثر ہو کر آزادی کا علم لہرا دیا ہے ایسے الزامات مردوں پر لگائے جانے کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔ آج بھی جبکہ عورتیں ہر شعبہ زندگی میں داخل ہو چکی ہیں اور مردوں ہی کی طرح ملازمت کر کے روپیہ کما رہی ہیں گھروں سے تنہا نکلتی ہیں دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ اس کے باوجود مردوں سے جو شکایتیں تھیں وہ برقرار ہیں۔ آخر کیوں؟ اب ایسا تو نہیں کہ عورت مرد کی دست نگر رہ گئی ہو۔ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر نہ نکال سکتی ہو۔ نامحرموں کے سامنے نہ آ سکتی ہو سودا سلف نہ خرید سکتی ہو۔ جہاں چاہے جا سکتی ہو، جو چاہے کر سکتی ہو۔ مردوں کی برابری اور ہمسری کی دعویدار بن گئی ہے۔ اپنے کو ہر اعتبار سے مردوں کے برابر سمجھنے لگی ہے۔ کسی بھی اس کام میں بند نہیں جو مرد کر سکتا ہو۔ اس کے باوجود مرد کی ذات سے جو تکالیف پہلے ملتی تھیں جب وہ آزاد نہ تھی وہ اب بھی مل رہی ہیں۔ اب بھی وہ مرد کے جبر و استبداد کا شکار ہو رہی ہے۔ وہ اب بھی شادی کر کے اس پر ظلم کرتا ہے۔ [illegible] کھانے پینا [illegible] اور تباہ و برباد کر جاتا ہے جب چاہے طلاق دے دیتا ہے، جیسا چاہے اس پر تہمت [illegible]

ہیں کہ عورتوں کو تباہ و برباد کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ انھیں زبردستی اغوا کر کے لوٹا جاتا ہے۔ انھیں سبز باغ دکھا کر اغوا کیا جاتا ہے۔ اور فروخت کر دیا جاتا ہے۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور یہ کیسا سماج ہے۔ یہ کیسی بدنامی ہے کہ ہر جگہ ہدف عورت رہتی ہے۔ نقصان وہی اٹھاتی ہے۔ تباہ و برباد وہی ہوتی ہے۔ ظلم و ستم اسی پر کیے جاتے ہیں۔ پھر کیا فائدہ ہوا چہار دیواری سے نکلنے اور آزادانہ زندگی بسر کرنے میں۔ بات تو تب ہوتی جب ہم ایسی خبریں سنتے کہ عورتیں اپنے شوہروں پر ظلم کرنے لگی ہیں۔ مردوں کو اغوا کیا جانے لگا ہے۔ ان کی عزت و آبرو عورتوں کے ہاتھوں لوٹی جانے لگی ہے۔ مگر ایسی تو ایک خبر بھی ہمیں کسی اخبار میں نظر نہیں آتی۔ پھر اس انقلاب سے کیا حاصل ہوا۔ یہی نا کہ گھروں سے نکل کر بسوں کے انتظار میں دھوپ اور بارش میں سڑکوں پر لائن لگانا پڑتی ہے۔ دفتر پہنچنے میں تاخیر ہو جائے تو جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ کام خراب ہو جائے تو غیروں کی گھڑکیاں سننا پڑتی ہیں۔ حسن اور جوانی سے [illegible] کے تیر کھانے پڑتے ہیں۔ گندے اور غلط جملے اور چھینٹوں کے سننا پڑتے ہیں۔ بھیڑ میں دوسروں کی رگڑ اپنے نازک جسموں پر محسوس کرنا پڑتی ہے۔ گھر میں مقید رہنے پر صرف شوہر یا ساس ہی کی باتیں سننا پڑتی تھیں، لیکن اب آزاد ہونے پر ایسے کتنے ہی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے شوہر یا ساس کی باتیں سننا پڑتی تھیں تو ان کا پیار بھی ملا کرتا تھا اب تو صرف باتیں ہی سننا پڑتی ہیں یا پھر ایسے فقرے [illegible]

روزِ حشر

ایسے مردوں کا حشر برا ہوگا جو جہیز کی فرمائش کر کے لڑکیوں کی شادیاں ہونے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ایسے مردوں کو شرم آنی چاہئے جو لڑکی والوں سے بھیک مانگتے ہیں۔

— نسیم انہونوی

تھا وہ اب نہیں ہے۔ ہاں مگر اس انقلاب سے مردوں کے دلوں سے جذبات نکل گئے ہوتے۔ ان کے مظالم ختم ہو گئے ہوتے۔ ان کی درندگی کم ہو گئی ہوتی تو میں سمجھتا کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اس سے ان کو سبق تو ملا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا۔ صرف اس لئے کہ فطرت نہیں بدلا کرتی۔ سرکس کا شیر بھی جب موقع پاتا ہے حملہ کر دیتا ہے، کیوں۔ محض اس لئے کہ یہ اس کی فطرت ہے۔ نہیں ہم اس انقلاب سے متاثر ہوتی ہیں۔

مجھے معاف کریں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ اسلام نے جو معاشرہ بنایا تھا۔ جو طریقہ زندگی کا سکھایا تھا وہی بہتر تھا۔ اور اسی میں مفر تھا۔ بلاشبہ مرد اپنی فطرت کے تحت عورت کے لئے سخت گیر اور ظالم ہوتے ہیں لیکن سب ہی مرد تو ایسے نہیں ہوتے — اور میں تو یہ کہوں گا کہ عورتوں میں بھی اچھی اور بری ہوتی ہیں۔ بہت سی عورتیں خود ان تحقیق اور مظالم کی ذمہ دار ہوتی ہیں جو شوہروں کی طرف سے ان پر روا رکھے جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ عورت کو قدرت نے ایک ایسی جنس بنایا ہے جو اگر چاہے تو مرد اس پر نثار ہو سکتا ہے، اس پر پروانہ وار فدا ہو سکتا ہے، اس کے اشاروں پر ناچ سکتا ہے۔ اس بات پر عورتوں کو غور کرنا چاہیئے کہ وہ کس طرح اس شیر کو رام کر سکتی ہیں جسے مرد کہتے ہیں۔ مستثنیات کو چھوڑ دیا جائے تو مرد پر عورت ایسا قابو حاصل کر سکتی ہے کہ اسے کبھی شکایت پیدا نہ ہو سکے۔ عورت تو ایک ایسی حسین مخلوق ہے جس کی ہر ادا پر مرد فدا ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے یہ سمجھنے کی ضرورت ضرور ہے کہ اس منہ زور کو کیسے قابو میں کیا جائے۔ میاں بیوی کے درمیان جو مناقشات پیدا ہوتے ہیں، جو جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں جو ناچاقیاں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سراسر قصور وار ہمیشہ مرد ہی کا نہیں ہوتا۔ درحقیقت عورت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مرد کا کام بس ظلم کرنا ہی ہے، اس لیے وہ مشکل ہی سے یہ کبھی سوچتی ہے کہ اس سلسلہ میں اس کی خود اپنی کیا کمزوریاں ہیں۔ تالی دونوں ہی ہاتھوں بجا کرتی ہے۔ جو بیبیاں فہم و فراست کے ساتھ عمل کرتی ہیں انھیں کمتر ہی شوہروں کی سخت گیری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حریم نہ ملنے کی شکایت

اس کے باوجود کہ حریم کی کسی اشاعت کا ناغہ نہیں ہوتا اکثر بہنیں پرچہ نہ ملنے پر یہ تصور کرتی ہیں کہ دفتر ہی سے نہیں بھیجا گیا۔ حالانکہ حریم پوری احتیاط سے چیک کر کے ہر ماہ روانہ ہوتا ہے۔ پھر بھی مندرجہ ذیلی اسباب پرچہ نہ ملنے کے ہوتے ہیں۔

۱۔ محکمہ ڈاک کا غیر ذمہ دارانہ طرز عمل

۲۔ حریمی بہنوں کا تبدیلی پتہ کے سلسلہ میں قبل از وقت اطلاع نہ دینا۔ حریمی بہنیں اس پر عمل کرتی ہیں۔

۳۔ اکثر بہنیں کہیں باہر چلی جاتی ہیں اور قیبے دو مہینے کے بعد واپسی پر شکایت لکھتی ہیں۔ بہنوں کو باہر جانے سے قبل دفتر کو اطلاع کرنا چاہیئے کہ وہ باہر جا رہی ہیں۔ فلاں فلاں پرچے دفتر میں روک لئے جائیں۔ واپس آنے پر منگا لے جائیں گے۔ بہر حال ہم اسی وقت دوسرا پرچہ بھیجنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں جبکہ ۲۰ تاریخ کے بعد فوراً اطلاع دی جائے۔ خط لکھنے کے دس بارہ روز بعد اگر دوسرا پرچہ نہ ملے تو پھر خط لکھیں۔ کبھی کبھی دوسرا پرچہ بھی کسی وجہ سے نہیں پہنچ پاتا۔

سچی باتیں

از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

آپ کی والدہ ماجدہ اگر خوش قسمتی سے ہنوز زندہ ہیں، اور آپ کو ان کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ تو آپ نے کبھی سوچا ہے۔ کہ آپ کا برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہیئے؟ آپ اپنے روزمرہ کے چوبیس گھنٹوں میں سے کتنے گھنٹے، نہیں، کتنے منٹ ان کی خدمت میں صرف کرتے ہیں؟ آپ چلتی زندگی کے کتنے مشاغل میں ان سے اجازت لینا ضروری خیال فرماتے ہیں؟ آپ کو جو دلچسپی اپنی بیوی، بچوں اور دوست احباب سے ملنے میں ہوتی ہے، اتنی دلچسپی، اس کا کوئی حصہ بھی اور کبھی ماں کی سیوا کرنے میں ہوتی ہے؟ ان کے حکم کی تعمیل میں آپ نے کتنی مرتبہ اپنے ارادوں کو قربان کیا ہے؟ انھوں نے آپ کے بچپن میں آپ کی بے شمار ضدیں پوری کی تھیں آج ان کے بڑھاپے میں آپ ان کی ضدیں، ہزاروں نہیں، سیکڑوں نہیں، بیسیوں نہیں، اکا دکا ہی کی تعداد میں پوری کر رہے ہیں؟

جس درس گاہ میں آپ نے تعلیم پائی ہے۔ کبھی آپ اسے اپنی ماں (الما میٹر) بتلاتے ہیں جس سرزمین پر آپ پیدا ہوئے ہیں کبھی آپ اسے اپنے "مادر وطن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، جس دنیا میں آپ نے آنکھیں کھولی ہیں کبھی آپ اسے "مادر گیتی" کا خطاب عطا فرماتے ہیں۔ پر یہ کیا غضب ہے کہ ان تمام فرضی و مصنوعی ماؤں کی خدمت گزاری میں پڑ کر آپ اپنی اصلی اور حقیقی ماں کو بھولے رہتے ہیں، اور اس سچی، خالص، بے آمیز اور بے مقدار محبت کا جو آپ کے وجود میں لانے کا باعث ہوئی ہو، کوئی حق تسلیم نہیں فرماتے؟ کل جب آپ بچے تھے اور وہ سب کچھ تھی اس نے اپنا جسم گھلا گھلا کر، اپنا خون پلا پلا کر آپ کو کچھ نہیں سے کچھ بنا دیا۔ آج آپ بڑے [illegible] اور [illegible] تک کی [illegible] اس محبت کی [illegible] کی!

مانا کہ آپ ایک [illegible] شاعر ہیں، مانا کہ آپ ایک پنجۂ ور مقرر ہیں، مانا کہ آپ ایک اعلیٰ مصنف و صاحب قلم، مانا کہ آپ کونسل کے ممبر ہیں، مانا کہ آپ ایک مقتدر عہدہ دار ہیں۔ مانا کہ آپ کی علمی قابلیت کی شہرت سارے ملک میں ہے۔ مانا کہ عزت، شہرت، دولت کے لحاظ سے آپ وہ سب کچھ ہو گئے جو ہونا چاہتے تھے۔ لیکن بڑے بڑے موتیوں کی یہ ساری جگمگاہٹ آپ کے باطن کو پُرنور نہیں بنا سکتی۔ جنت کی ابدی راحت کی اگر تلاش ہے اس نور کی جستجو ہے، جس پر حور و ملائک بھی رشک کریں۔ تو وہ ماں اور صرف ماں ہی کے قدموں کے نیچے ہے! حنفیت و وہابیت، صوفیت و نجدیت کے مناقشے ممکن ہے کہ آپ کو کسی ایک فریق کی سرداری دلا دیں، لیکن جنت کا سیدھا راستہ ماں ہی کے قدموں کے نیچے ہو کر ہے!

(بشکریہ صدق جدید لکھنؤ)

بدکاری کی محرک تعلیم

"جنسیات" کی تعلیم عرصہ سے دوسرے متمدن مغربی ملکوں کی طرح برطانیہ کے اسکولوں میں بھی جاری ہے حال میں لندن سے شائع ہونے والے دو بڑے اخباروں میں دو طویل مضمون اس کے مضر اثرات پر شائع ہوئے ہیں۔ ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جنسیات کی یہ تعلیم نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کو بدکاری کی طرف لے جا رہی ہے۔ بارہ سے سولہ سال تک کی ہزاروں لڑکیاں حاملہ ہو رہی ہیں۔ شادی سے قبل لڑکیاں عام طور سے مانع حمل آلات اور ادویہ کا استعمال کرتی ہیں اس لیے اب جنسیاتی تعلیم کا سلسلہ بند کیا جائے۔ ایک غیر مسلم [illegible] کے [illegible] سے [illegible] خیالات [illegible] کا [illegible] ہے کہ [illegible] کے [illegible] کا [illegible] ہے کہ [illegible] سکتے ہیں [illegible] ہے کہ اسلامی تعلیمات کو اختیار کیا جائے۔

ان مغربی ممالک کی دیکھا دیکھی ہندوستان اور دوسرے ایشیائی و افریقی ممالک کے اسکولوں میں بھی طلبہ و طالبات کو جنسیات کی تعلیم دینے کے دعوت مشورے اور جنسی تعلیم کی طرف سے دیکھے جا رہے ہیں۔ بلکہ ان پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا ہے کاش برطانیہ وغیرہ کے یہ تلخ تجربے مغرب کے اندھے مقلدوں کی آنکھیں کھول سکیں۔

(بشکریہ صدق جدید لکھنؤ)

جی چاہتا ہے

(ریاض فاطمہ ریاضی)

حرم تک آ جانے یہ جانے کو جی چاہتا ہے
مقدر بنانے کو جی چاہتا ہے

جہاں روضۂ شاہ ہر دو سرا ہے
وہیں جانے آنے کو جی چاہتا ہے

بلائیں جو نازل ہوئیں عاصیوں پر
وہ سب کچھ سنانے کو جی چاہتا ہے

عطا کر دیا تم کو اُمت نے آقا
مگر پھر منانے کو جی چاہتا ہے

ریاضیؔ گنہگار کو دل جگر کیا
ہر اک چیز مظہر پر لٹانے کو جی چاہتا ہے

کیا آپ کو علم ہے کہ

لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

خواتین کے لکھے ہوئے پاکیزہ ناول

ناول	مصنفہ	قیمت
گود کا لال	والدہ افضال علی	20/-
بجھتے چراغ	سعیدہ بیگم	5/-
اللہ بیگم	طیبہ بیگم	8/-
مسیحا	عذرا جمال	8/-
فوقیہ	فرحت یاسمین	4/50
رفاقتیں کیسی	رضیہ بٹ	15/-
اجالا	سلمیٰ کنول	14/50
میں کیوں شرماؤں	آمنہ حسن عسکری	15/-
سراب اور سائے	زبیدہ سلطانہ	15/-
گل خوشبو گل ہزارہ	دیبا خانم	12/-
امانت	حمیدہ جبیں	10/-
جنم جنم کے ساتھی	رضیہ فرحت	12/50
ماہم	زبیدہ خاتون	15/-
حنا کی خوشبو	دیبا خانم	12/-
صابرہ	روبینہ چودھری	10/-
آئینہ	بیگم وائی خاں	9/-
فاصلے	رضیہ بٹ	16/-
پردہ نشین	دیبا خانم	12/-
دل اک کشکول	سلمیٰ کنول	16/-
غزل	بیگم نسیم آصف	18/-
جسے پیا چاہے	مینا ناز	10/-
صنم تیری قسم	دیبا خانم	10/-
طوبیٰ	زبیدہ سلطانہ	16/50
اجنبی ہمسفر	دیبا خانم	12/-
انتظار کے پھول	مینا ناز	10/-
جینے کی آرزو	فریدہ حق انجم	9/-
فارعہ	ماجدہ خاتون	13/50
انتظار کے پھول	مینا ناز	10/-
دل سے دل تک	دیبا خانم	6/-
صابرہ	روبینہ چودھری	10/-

حریمی دسترخوان

میدے کا حلوہ

سامان:- میدہ عمدہ قسم کا یعنی پرانا نہ ہو ۵۰۰ گرام، شکر ۷۵۰ گرام، گھی ۵۰۰ گرام، روح کیوڑہ ۵۰ گرام، ناریل ۱۰۰ گرام۔ ممکن ہو سکے تو بادام اور پستے بھی ہوائی کاٹ کر شامل کر سکتی ہیں۔ چھوٹی الائچی اور لونگ ۲۔ چاندی کے ورق بڑے ۶ عدد

گھی کو قلعی دار پتیلی میں کڑکڑائیں۔ لونگ الائچی ڈال دیں۔ میدہ چھان کر گھی میں ڈال دیں اور کفگیر سے بھونیں۔ جب ہلکا گلابی رنگ آجائے تو اتار لیں۔

شکر کو صرف ایک پیالی چائے کی بھر کر پانی ڈالیں اور تیز آنچ پر پکائیں۔ اُبلنے لگے تو تھوڑا دودھ ڈالدیں، میل کٹ کر اوپر آ جائے گا۔ اسے کسی چمچے سے نکال لیں۔ ایک بار پھر دودھ ڈالیں۔ تمام میل صاف ہو جائے گا۔ کچھ ہی دیر بعد قوام تھوڑا سا رہ جائے گا اور اس میں بلبلے سے اٹھنے لگیں گے۔ اب اس قوام کو میدہ میں ڈال کر پکائیں جلد ہی میدہ گھی چھوڑ دے گا اور حلوہ جمنے کے قابل ہو جائے گا۔ اب کھوپرا (ناریل) کے باریک باریک ٹکڑے شامل کر کے روح کیوڑہ ڈال دیں اور کسی طباق یا سینی میں جما لیں۔ اگر بادام و پستے کی ہوائیاں ہوں تو اوپر سے چھڑک کر چاندی کے ورق لگا دیں۔ میدے کا حلوہ بنانا بہت دشوار ہے۔ اکثر جگہ پہلے میدے کو ذرا سے گھی میں بھون لیا جاتا ہے اور پھر زیادہ پانی ڈالکر قوام تیار کیا جاتا ہے۔ پھر بھنا ہوا میدہ قوام میں ڈال کر گھی ڈالا جاتا ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس طرح اچھا حلوہ نہیں بن سکتا زیادہ امکان اس کا ہے کہ میدہ گھول جائے گا۔ جو طریقہ میں نے لکھا ہے۔ اس طرح بنانے سے نہایت ہی عمدہ حلوہ تیار ہوتا ہے۔ بشرطیکہ گھی میدے کے ہم وزن ہو اور پورے گھی میں میدے کو بھون لیا گیا ہو۔ قوام بناتے وقت اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قوام بہت ہی کم نہ رہ جائے یا یہ کہ بہت ہی کم پکے۔ دو ایک بار بلبلے اٹھنا شروع ہو جائیں تاکہ قوام [illegible] کیا جائے۔

طباق یا سینی میں جمانے کے بعد [illegible] کاٹ لیں [illegible] اسی وقت جب حلوہ بالکل ٹھنڈا ہو جائے۔ [illegible]

اقوالِ زرّیں

- خود اعتمادی، خود فہمی اور خود گیری ہی زندگی کو بھی طاقت بخشتی ہیں۔
- اپنے فرض کی ادائیگی میں جٹے رہنا اور اپنے منہ پر قفل لگا لینا بدظنی کا سب سے مناسب جواب ہے۔
- جس کام کو آپ کر سکتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ کر سکیں گے، اسے شروع کیجئے۔ جرأت میں جلال طاقت اور جادو ہوتا ہے۔ کام شروع آپ کر دیجئے، ختم وہ اپنے آپ ہو جائے گا۔
- خود اعتمادی کی کمی ہی ہماری بہت سی ناکامیوں کی وجہ بنتی ہے۔ اعتمادی میں طاقت ہے۔ وہ سب سے کمزور ہیں انھیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہوتا۔

(بھیجنے والے نے نام نہیں لکھا)

- اللہ کے نزدیک سب سے اچھا وہ ہے جو متقی و پرہیزگار ہو۔
(قرآن پاک)
- جو روزہ دار جھوٹ بولنے یا اس پر عمل کرنے کو نہ چھوڑے اس کو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کھانا پینا ترک کرے۔

مرسلہ: محمد غوث الاعظم (بہار شریف)

- حسد، خود غرضی اور غصہ تینوں دل کو تاریک کر دیتے ہیں۔
- عقلمند غصہ کو ضبط کرتا ہے۔ بیوقوف غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔
- جب بھی کسی سے ملو مسکرا کر متوجہ ہو۔
- عقلمند وہ ہے اپنی تعریف سے خوش و اپنی مذمت سے رنجیدہ نہ ہو۔

مرسلہ: مس فضیلت بہار (دربھنگہ)

- گناہ کر کے خوش ہونا گناہ کرنے سے زیادہ برا ہے۔
- معاف کر دینا بہت بڑا احسان ہے اور احسان انسان کو غلام بنا دیتا ہے۔
- بدوں کی صحبت سے تنہائی اور نیکوں کی صحبت تنہائی سے بہتر ہے۔
- بیکاروں کے دلوں میں شیطان اپنا کارخانہ کھول دیتا ہے۔
- اہل ایمان کے دل اللہ کے ذکر سے سکون پاتے ہیں، خبردار کہ دلوں کا چین اللہ کے ذکر ہی میں ہے۔
- عقل انسان کی دوست اور جہالت اس کی دشمن ہوتی ہے۔

مرسلہ: ایم۔ ایس جہاں محی الدین پیسی

مجنوں، مرزا غالب اور ظریف

ہلال ملیح آبادی

کردار

مرزا رنگین

میر شعلہ

اُستاد شگفتہ

یتن زندہ دل

سخن فہم

مرزا رنگین ۔ آداب بجالاتا ہوں اُستاد شگفتہ اور میر شعلہ صاحب!

شگفتہ ۔ آؤ بھئی بڑی عمر ہے مرزا رنگین ۔ ہم اور میر شعلہ تمہیں یاد کر رہے تھے ۔ تشریف رکھیئے ۔ تشریف رکھیئے

بھئی مرزا رنگین! ابھی میر شعلہ سے حضرت ظریف لکھنوی کی شاعری پر بات چل رہی تھی ۔

رنگین ۔ اے حضت! جناب ظریف، کیا رنگا رنگ آدمی تھے جدھر سے گذرے دلوں کے پھول کھلاتے گذرے ۔

شگفتہ ۔ بات تو یہی تھی مرزا رنگین! ۔ مشاعروں میں پڑھتے تو قہقہوں سے در و دیوار گونجتے تھے ۔

رنگین ۔ میرا بچپن تھا شگفتہ صاحب! ۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں ظریف صاحب نے اپنی نظم شاعرہ پڑھی ۔ حال یہ تھا سنجیدہ اور بردبار لوگوں نے اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال دی تھیں ۔

شگفتہ ۔ اس میں کیا شک ہے مرزا رنگین! بلا کی ظرافت تھی ظریف کے کلام میں ۔

میر شعلہ ۔ اماں مرزا رنگین! آپ مجنوں سے تو یقیناً واقف ہوں گے؟

رنگین ۔ مجنوں ؟ ابی میر شعلہ! بات ہو رہی تھی جناب ظریف کی ؟ یہ اچانک مجنوں کی یاد تمہیں کیوں کر آئی ؟ ؟

شعلہ ۔ بھئی رنگین! ظریف صاحب کی شاعری کے اسی پہلو پر بات چل رہی تھی کہ انھوں نے کس کس زاویے سے مجنوں پر شعر کہے ہیں ۔ اس لئے مجنوں کی یاد آگئی ۔

رنگین ۔ ہاں میر شعلہ! مجنوں وہی ؟ قیس نامی عرب کے صاحبزادے جو بچپن میں قیس کہلاتے تھے ؟

شعلہ ۔ جی ہاں وہی صاحبزادے جو بڑے ہو کر مجنوں ہو گئے ۔

رنگین ۔ تو یوں کہو ۔ وہ مجنوں ۔ اجی اُن مجنوں کو تو میں ایسا جانتا ہوں کہ ہندوستان میں مجھ سے زیادہ مجنوں کو جاننے والا "ابھی تک تو" پیدا نہیں ہوا ۔

شگفتہ ۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو مرزا رنگین ؟

رنگین ۔ اجی سچ کہہ رہا ہوں ۔ میں تو مجنوں پر ایک کتاب لکھنے والا ہوں ۔ مجنوں ہندوستان بھی تو آئے تھے

شعلہ ۔ مجنوں ہندوستان آئے تھے ؟ یہ کب !؟

رنگین ۔ مرزا غالب کے بچپن میں ۔

شگفتہ ۔ اماں مرزا رنگین! ہذیان بکنے کے موڈ میں ہو نا ؟

رنگین ۔ سنجیدگی کے موڈ میں کہہ رہا ہوں حضور! آپ تو واقف ہیں کہ بچپن میں مرزا غالب آگرے میں رہتے تھے ۔

شعلہ ۔ جی ہاں یہ واقعہ ہے ۔

رنگین ۔ بس حضور! اسی زمانے میں مجنوں ہندوستان آئے تھے ۔

شگفتہ ۔ اماں ۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو ۔ مرزا رنگین! ۔ غالب کے زمانے میں ؟ مجنوں ہندوستان آئے تھے !؟

رنگین ۔ جی ہاں ہندوستان آئے تھے اور آگرے آئے تھے ۔

شگفتہ ۔ آگرے ؟ بھلا مجنوں کو آگرے آنے کی کیا ضرورت پڑی ۔

رنگین ۔ مجنوں کو آگرے آنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی مجنوں کے باپ کو مجنوں کو آگرے لانے کی ضرورت ہوئی تھی ۔

شعلہ ۔ وہ کیوں

رنگین ۔ مجنوں، آگرے کے پاگل خانے میں بھرتی کرائے گئے تھے ۔ ایک دن پاگل خانے سے رسّیاں تڑا کے نکل بھاگے اور شہر میں گھومنے ۔

شگفتہ ۔ پھر کیا ہوا ؟

رنگین ۔ جی آگرے جیسا شہر ۔ اور پھر آگرے کی گلیوں کے لڑکے ۔ سب مجنوں کو پاگل ہے پاگل ہے کہتے ہوئے پیچھے پڑ گئے ۔

شعلہ ۔ اچھا ! تو پھر ؟

رنگین ۔ اور کہیں مرزا غالب بھی گلی میں کھیل رہے تھے (بچپنا ہی تو تھا) غالب نے مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اٹھا لیا ۔

شگفتہ ۔ اماں غالب نے ؟ مجنوں کو مارنے کے لئے پتھر اٹھا لیا ؟ یہ کب کا واقعہ ہے ؟ ؟

رنگین ۔ حضور ! اسی وقت کا واقعہ ہے جب مجنوں پھٹے کپڑوں کا ماتم اور ایک لنگوٹی کمر سے باندھے گلی میں جا رہے تھے ۔

شگفتہ ۔ اماں میں کہتا ہوں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ؟ مرزا رنگین !

رنگین ۔ اور میں کہتا ہوں حضور ! کیا آپ مرزا غالب کو جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں ۔

شگفتہ ۔ نہیں ۔

رنگین ۔ تو پھر آپ یہ کیوں نہیں مانتے کہ مرزا غالب نے مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تھا ۔

شگفتہ ۔ اماں ماننے کی بات ہو تو مانیں مرزا رنگین ۔

رنگین ۔ جی میں سند میں مرزا غالب کا شعر سنا سکتا ہوں سنئے

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

شگفتہ ۔ (قہقہہ) اماں ۔ مرزا رنگین جیتے رہو ۔ تم نے اپنے دعوے کی سند میں ایسا شعر سنایا ہے کہ ماننا ہی پڑتا ہے

شعلہ (ہنس کے) شگفتہ صاحب ! اس شعر سے تو یقین ہوتا ہے کہ مجنوں واقعی غالب کے زمانے میں آگرے آئے تھے ۔

شگفتہ ۔ اجی میر شعلہ ! (اب مجھ سے سنئے) مجنوں آگرے ہی نہیں لکھنؤ بھی آئے تھے ۔

رنگین ۔ مجنوں لکھنؤ آئے تھے شگفتہ صاحب ؟ یہ کب ! ؟

شگفتہ ۔ اجی مرزا رنگین ! جب آگرے کے لڑکوں نے بہت ستایا تو مجنوں کا منہ اٹھ گیا پورب کی طرف ۔ اور چند دنوں بعد مجنوں پاگل پن کی لہر میں اچھلتے کودتے، گاتے بجاتے لکھنؤ آ پہنچے ۔

رنگین ۔ اجی شگفتہ صاحب ! کیا آپ سند میں کوئی شعر سنا سکتے ہیں ؟ جس سے ثابت ہو کہ مجنوں لکھنؤ آئے تھے

شگفتہ ۔ اجی سند میں شعر ہی نہیں واقعہ بھی سنا سکتا ہوں ۔

رنگین ۔ کیا واقعہ ہوا تھا حضور ! ؟

شگفتہ ۔ واقعہ یوں ہوا مرزا رنگین کہ لکھنؤ کے جس ناکے سے مجنوں شہر میں داخل ہو رہے تھے اسی ناکے سے ظریف صاحب شہر سے باہر نکل رہے تھے ظریف صاحب نے دیکھا ایک آدمی لنگوٹی باندھے ہوئے تار تار، گریبان چاک چاک سر کے بال اور ناخنوں کے ناخون بڑھائے، ہاتھ میں ایک چابک لئے آ رہا ہے، بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کس قسم کا آدمی ہو سکتا ہے ۔

قریب جا کے ظریف نے پوچھا آپ کی تعریف ؟

مجنوں بولے پہلے آپ اپنی تعریف کیجئے !

ظریف نے کہا "میں ظریف لکھنوی ہوں"

مجنوں نے کہا "میں مجنوں"

ظریف نے پوچھا "وہی نجد والے مجنوں ہیں آپ" ؟

مجنوں ہنسے بولے "دیوانہ، دیوانے کو خوب پہچانتا ہے"

ظریف نے کہا "میرے ساتھ چلئے نہا کے نئے کپڑے پہن لیجئے"

مجنوں نے قہقہہ لگایا پھر اپنے کرتے کی دھجیوں کی طرف اشارہ کر کے بولے "یہ کچھ خراب لباس ہے" ؟ ؟

ظریف نے جواب میں مجنوں کو شعر سنایا

یہی وحشت، اگر ہے عشقِ لیلیٰ میں تو اے بھائی
دوپٹہ اوڑھ لو جس میں گریباں [illegible] مال ہو

رنگین ۔ (ہنس کر) بہت خوب شگفتہ صاحب ! آپ نے سند میں کیا شعر سنایا ہے ۔

شعلہ ۔ اور مجنوں نے ظریف کا شعر سن کے کیا کہا شگفتہ صاحب ! ؟

شگفتہ ۔ پہلے تو مجنوں بہت زور سے ہنسے ۔ پھر ظریف سے بولے یار آدمی دوستی کے قابل معلوم ہوتے ہو ۔ کبھی ہمارے گھر آؤ ۔

ظریف نے پوچھا۔ آپ کا مکان کہاں ہے؟
مجنوں بولے۔ یہ بھی سارا نجد کا ریگستان اپنا مکان ہے:
اور یہ کہہ کر ایک قہقہا لگایا پھر منہ سے موٹر سٹارٹ ہونے کا بھڑ اٹھا
کیا۔ پھر اپنے پاؤں پہ زور سے چابک مارا اور یہ جا وہ جا غائب
رنگین۔ (ہنستے ہوئے) حضور! آپ نے مسند میں اس طرح واقعہ بیان کیا
اور ایسا شعر سنایا ہے کہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مجنوں ظریف
کے زمانے میں لکھنؤ آئے ہوں گے۔

شیفتہ۔ اجی لکھنؤ نہیں مرزا رنگین! جب ظریف صاحب نے عرب کا
سفر کیا تھا۔ ظریف مجنوں سے ملنے نجد بھی گئے تھے۔
شعلہ۔ (ہنس کر) کیا ان کی ملاقات مجنوں سے ہوئی تھی شیفتہ صاحب؟
شیفتہ۔ جی ہاں بہت تلاش کے بعد، ایک دن ظریف کو مجنوں اس حالت
میں نجد کے ریگستان میں ملے کہ ریت پر پریڈ کر رہے تھے۔
شعلہ۔ مجنوں ظریف جنگ کو پہچان تو گئے ہوں گے۔
شیفتہ۔ اجی سنئے تو۔ ظریف نے کہا "السلام علیکم مجنوں میاں"
مجنوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے کنوتیاں بدل کر ظریف کو سر سے پاؤں
تک دیکھا اور بولے
"تم کون ہو جی!"؟
ظریف بولے۔ میں ظریف لکھنوی
شیفتہ۔ مجنوں نے قہقہا لگا کے کہا "ایک ملک میں دو بادشاہ اور
ایک ریگستان میں دو مجنوں نہیں رہ سکتے"
شعلہ۔ (ہنس کر) بات تو اچھی کہی مجنوں نے
شیفتہ۔ جی ہاں یہ کہکر جو سرپٹ بھاگے تو گرد میں غائب ہوگئے۔
رنگین۔ ظریف صاحب کو بڑی کوفت ہوئی ہوگی؟
شیفتہ۔ جی ہاں ظریف کو مجنوں پر بہت رحم آیا اور یہ شعر ظریف
نے وہیں کھڑے کھڑے موزوں کیا تھا۔
رنگین۔ کون سا شعر شیفتہ صاحب؟
شیفتہ۔ آوارہ گردیوں سے رہا کچھ نہ امتیاز
شعلہ۔ آوارہ گردیوں سے رہا کچھ نہ امتیاز
شیفتہ۔ مجنوں میں اور اک شتر بے مہار میں
رنگین۔ (قہقہا) کیا خوب استاد شیفتہ یعنی مجنوں بے نکیل کے اونٹ
ہو گئے تھے؟

شیفتہ۔ جی ہاں
شعلہ۔ پھر کیا ہوا شیفتہ صاحب مجنوں پھر کبھی ملے؟ یا ظریف صاحب
مایوس واپس آگئے۔
شیفتہ۔ جی نہیں ظریف کئی ہفتے نجد میں رہے ایک دن ظریف نے دیکھا
کہ جیسے ہی نجد میں لیلیٰ کا اونٹ آیا ویسے ہی دور سے اونٹ
کے پیچھے گرد کا ایک بگولہ دوڑا۔ اور جب وہ گرد کا بگولہ اونٹ
کے پیچھے پہنچا تو گرد سے، مجنوں "لیلیٰ" کا نعرہ مارتے نکلے۔ اونٹ بھڑک
کے بھاگا۔ مجنوں تڑپ کر دوڑے۔
— اب کیفیت یہ تھی کہ مجنوں لیلیٰ لیلیٰ چلاتے اونٹ سے دس گز
آگے بھاگ رہے تھے مجنوں نے ٹھوکر جو کھائی تو حضرت یہ پوزیشن کہ
نیچے مجنوں۔ مجنوں پر اونٹ۔ اونٹ پر محمل۔ محمل میں لیلیٰ۔
شعلہ۔ (قہقہا) اجی کیا منظر ہوگا؟
رنگین (ہنسی) بہت خوب شیفتہ صاحب!
شیفتہ (ہنس کر) سنئے مرزا رنگین! اس واقعے کو ظریف صاحب یوں
نظم فرماتے ہیں ؎
لگی ٹھوکر تو سارا عشق لیلیٰ دب گیا آخر
رنگین۔ لگی ٹھوکر تو سارا عشق لیلیٰ دب گیا آخر
شیفتہ۔ کہ نیچے قیس اوپر اونٹ ہے اور اس پہ محمل ہے
شعلہ۔ (قہقہا) واہ شیفتہ صاحب!
شیفتہ۔ اور سنئے یہ شعلہ ظریف کہتے ہیں۔
جناب قیس دبلے پتلے، لیلیٰ موٹی تازی تھی
شعلہ۔ جناب قیس دبلے پتلے لیلیٰ موٹی تازی تھی
وہ ناقے سے جو گر جاتی تو یہ امداد کیا کرتے؟
رنگین۔ (قہقہا) واقعی مجنوں ایسے لاغر اتنی موٹی لیلیٰ کو کیسے اٹھاتے
شعلہ۔ رنگین صاحب! ہم تو آج تک یہی سنتے تھے کہ لیلیٰ پان قسم کی نازک
تھیں؟
شیفتہ۔ یعنی شعلہ صاحب! ظریف صاحب نے لیلیٰ کو اپنی آنکھوں سے
دیکھا تھا۔
رنگین (ہنس کر) یہ ظریف کا حصہ تھا! واقعی قیس نے لیلیٰ کو دیکھا تھا؟
شیفتہ۔ جی مرزا رنگین! ظریف نے تو ایک مصرعہ سے پہلے بھی کہا تھا؟
شعلہ۔ جی مذاق نہ کیجئے شیفتہ صاحب! اچھا بات ہوتی تھی لیلیٰ کی؟

شگفتہ ۔ واقعہ یوں ہوا میر شعلہ! کہ لیلیٰ تھی اونٹ پر ۔ اور مجنوں بیٹھا ہوتا پچھے اونٹ کے پیچھے چل رہے تھے جوتا تھا پھٹا ، اس لئے چلنے میں دشواری تھی کہ یکایک مجنوں نے پاؤں جھٹکے ، دونوں جوتے ہوا میں اڑ کر دور جا گرے اب مجنوں ننگے پاؤں تیزی سے ہو لئے اونٹ کے پیچھے ۔۔۔ اس حالت کو دیکھ کر ظریف نے لیلیٰ کو یہ شعر سنایا ۔

رنگین ۔ ارشاد

شگفتہ ۔ مجنوں کا جو اے لیلیٰ جوتا نہ پھٹا ہوتا ۔

شعلہ ۔ مجنوں کا جو اے لیلیٰ جوتا نہ پھٹا ہوتا ۔

شگفتہ ۔ پیچھے ترے ناقے کے ، کیوں برہنہ پا ہوتا ۔

شعلہ ۔ (قہقہا) خوب شگفتہ صاحب ! یہ شعر سن کے لیلیٰ نے کیا جواب دیا ؟

شگفتہ ۔ لیلیٰ نے ظریف سے کہا "آپ اجنبی ہیں ان کی حالت جانتے نہیں" ظریف صاحب نے کہا : مگر مجنوں کی سالگرہ پر کم از کم ایک جوڑا جوتا تو آپ کو دینا ہی چاہئے " ۔

لیلیٰ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔ جناب ! ہر سالگرہ پر جوتا ، موزہ بنیائن ، قمیض سوٹ اور ٹائی ، انکو دے جاتی ہوں مگر جب آتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ سارے کپڑے پھینک کر یہ بنیائن کی لنگوٹی اور ننگے گلے میں ٹائی باندھے پھر رہے ہیں " ۔

رنگین ۔ (قہقہا) آئیں ! مجنوں بنیائن کی لنگوٹی ! اور ننگے گلا میں ٹائی باندھے پھرا کرتے تھے ! !

شعلہ ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ لیلیٰ وفادار عورت تھی شگفتہ صاحب !

شگفتہ ۔ اجی شعلہ صاحب ! جب مجنوں بے چارے ، آدمی سے کارٹون ہوگئے تھے تو لیلیٰ کو خبر گیری ضروری ہی ، نا کرنا ہی پڑتی تھی ۔ مگر لیلیٰ مجنوں سے تنگ ضرور آچکی تھی ۔ ثبوت میں یہ شعر سنئے ۔

شعلہ ۔ ارشاد ۔

شگفتہ ۔ چڑھنے لگتا ہے ، سر اُدم کا پکڑ کر مجنوں

رنگین ۔ چڑھنے لگتا ہے ، سر اُدم کا پکڑ کر مجنوں

شگفتہ ۔ شتر بے مہار لیلیٰ ہے کھڑا ہوتا ہے

رنگین ۔ (قہقہا) بھئی خوب ! مجنوں اونٹ کی دم پکڑ کر اونٹ پر کیوں چڑھنے لگے تھے ؟

شعلہ ۔ لیلیٰ کی محمل تک پہنچنا چاہتے ہوں گے ۔

شگفتہ ۔ (ہنس کر) جی ہاں ۔ اگر کسی دن محمل تک مجنوں پہنچ جاتے تو لیلیٰ کو محمل سمیت لے کر اونٹ سے نیچے کود پڑتے ۔

رنگین ۔ (قہقہا) بجا ارشاد فرمایا ۔ اور جب مجنوں دُم پکڑ کر اونٹ پر چڑھنے لگتے تھے تو اونٹ کی کیا حالت ہوتی تھی شگفتہ صاحب ؟

شگفتہ ۔ اجی اونٹ گھبرا کر اس زور سے اُچھلتا کہ مجنوں کے ہاتھوں سے اونٹ کی دم چھوٹ جاتی اور مجنوں دھم سے ریت پر

شعلہ ۔ اور مجنوں کی ہڈی پسلی ؟

شگفتہ ۔ ہڈی پسلی سلامت ، دیوانوں کے چوٹ کم ہی لگتی ہے ۔۔۔ مجنوں گرتے مگر جیسے ہی لیلیٰ اونٹ ہانکنے لگتی مجنوں ، دوڑ کر پھر اونٹ کی دم میں لٹک جاتے ۔

رنگین ۔ (قہقہا) پھر دم میں جھول جاتے ؟

شگفتہ ۔ جی ہاں ظریف صاحب نے اس واقعے کو یوں موزوں کیا ہے ؎

میاں مجنوں کو اتنا ہوش ہے دیوانگی میں بھی

شعلہ ۔ میاں مجنوں کو اتنا ہوش ہے دیوانگی میں بھی

شگفتہ ۔ پکڑ لیتے ہیں دم کو ، اونٹ لیلیٰ نے جہاں ہانکا

رنگین ۔ (ہنس کر) شگفتہ صاحب ! لیلیٰ کا اونٹ بھی مجنوں سے تنگ آ گیا ہوگا ۔

شگفتہ ۔ اجی اونٹ جب تنگ آ گیا تو جنگ پر اُتر آیا

شعلہ ۔ یعنی مجنوں اور لیلیٰ کے اونٹ میں جنگ چھڑ گئی

شگفتہ ۔ جی ہاں ؎ ناقۂ لیلیٰ نے مستی میں جڑی مجنوں کے لات

شعلہ ۔ ؎ ناقۂ لیلیٰ نے مستی میں جڑی مجنوں کے لات

شگفتہ ۔ یہ شتر غمزہ بہ رنگِ لغزشِ مستانہ تھا

شعلہ ۔ (قہقہا) اونٹ کی لات کھا کے مجنوں کو تو انتقال فرما جانا چاہئے تھا ۔

شگفتہ ۔ اجی مجنوں نے ذرا سا بھی انتقال نہیں فرمایا ۔ اتنا ضرور ہوا کہ اونٹ نے لات ماری اور مجنوں دس گز دور جا گرے ، اونٹ بھاگا اور دیکھا کہ مجنوں اُٹھے کھسیانی ہنسی ہنس کے اُٹھے ، جیب میں ہاتھ ڈال کے ٹٹولنے لگے مگر جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجنوں کو

محسوس ہوا ۔

؎ کھا کے وحشت میں قلابازی بچھے جب کپڑے

رنگین ۔ ؎ کھا کے وحشت میں قلابازی بچھے جب کپڑے

شگفتہ ۔ ؎ جیب میں ہاتھ جو ڈالا، تو گریبان نکلا

رنگین ۔ (قہقہہ) یعنی مجنوں نے جیب میں ہات ڈالا۔ تو معلوم ہوا جیب پھٹ کر گریبان ہو چکی ہے ؟

شگفتہ ۔ جی ہاں اور وہ جو مثل مشہور ہے کہ دیوانہ اپنے کام میں ہوشیار ہوتا ہے۔ اس دن سے مجنوں صاحب کبھی اونٹ کی لات کی زد میں نہیں جاتے تھے۔ جب بھی اونٹ پر حملہ کیا نکیل پر چھاپا مارا۔

شعلہ ۔ یعنی پھر وہ اونٹ کی دم پر نہیں اونٹ کی نکیل پر شب خون مارنے لگے ؟

شگفتہ ۔ اجی ہوا یوں کہ ایک دن جیسے ہی لیلیٰ نجد میں داخل ہوئی مجنوں تیر کی طرح دوڑے اور اونٹ کی نکیل پر ہاتھ مارا نکیل ہات آگئی تو خوشی سے لگے اچھلنے کودنے اور "لیلیٰ ۔ لیلیٰ" کہہ کے اونٹ کے چاروں طرف بھنگڑا ناچنے لگے

اونٹ بے چارہ گھن چکر ہوگیا ۔ اس اچھل کود اور بھنگڑا بازی میں ہوا یہ کہ اونٹ کی نکیل اونٹ کی دُم میں اُلجھ گئی۔

رنگین ۔ (قہقہہ) اجی اونٹ کی دم میں نکیل اُلجھ گئی ؟

شگفتہ ۔ جی ہاں ۔ اب اونٹ کی حالت یہ کہ جدھر جدھر اس کی دُم جا رہی تھی اُدھر اُدھر اونٹ ناچ رہا تھا اور مجنوں کولھے پر ہاتھ رکھے چاروں طرف ٹاپ رہے تھے۔

شعلہ (قہقہہ) اجی شگفتہ صاحب! یہ عجیب سماں ہوگا۔

شگفتہ ۔ یہ سماں ظریف نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

؎ اور اضافہ ہو گیا قیس کے خلفشار میں

شعلہ ۔ ؎ اور اضافہ ہو گیا قیس کے خلفشار میں

شگفتہ ۔ ؎ جب اُلجھ گئی ناقے کی دُم، مُہار میں

رنگین ۔ واللہ کیا کہنا ظریف صاحب کا۔

؎ [illegible] جب اُلجھ گئی ناقے کی دُم، مہار میں

شگفتہ (ہنس کر) جی ہاں ناقے کی دُم مہار میں اُلجھی ہوئی تھی اور [illegible] جدھر جاتا اُدھر مجنوں بھی [illegible] رہے تھے۔

اور اُدھر محمل میں لیلیٰ کی جان عذاب میں تھی۔

شعلہ ۔ (قہقہہ) اجی اس عذاب سے لیلیٰ کو کیسے نجات ملی ؟

شگفتہ ۔ اجی جب لیلیٰ نے دیکھا کہ محمل اونٹ کی پیٹھ سے کھسک کر اونٹ کے پیٹ میں لٹکنے والی ہے تو اس نے اونٹ کی مہار کو جو جھٹکا دیا تو مہار دم سے چھوٹی ۔ اِدھر اونٹ کی دم نکیل سے چھوٹی اُدھر مجنوں چکر کھا گرے۔

"لیلیٰ" یہ نعرہ سن کے اونٹ بھڑک کے جو بھاگا تو یہ حالت تھی کہ

؎ صدائے نعرۂ مجنوں سے بھڑکا ناقۂ لیلیٰ

رنگین ۔ ؎ صدائے نعرۂ مجنوں سے بھڑکا ناقۂ لیلیٰ

شگفتہ ۔ ؎ کبھی ناقے پہ محمل تھی، کبھی ناقہ تھا محمل میں

شعلہ ۔ (قہقہہ) اجی بہت خوب مگر

؎ کبھی ناقے پہ محمل تھی، کبھی ناقہ تھا محمل میں ۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے شگفتہ صاحب ؟

شگفتہ ۔ ہاں میر شعلہ! اونٹ بھڑکا اور کود کے بھاگا اور بھاگنے میں جب اونٹ پلٹ پلٹ کے مجنوں کو دیکھتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اونٹ محمل کے اندر ہے۔

رنگین ۔ (قہقہہ) ارے شگفتہ صاحب! تھک گیا میں تو ہنستے ہنستے۔ واللہ ظریف کا جواب نہیں۔

شعلہ ۔ شگفتہ صاحب! لیلیٰ تو ڈرنے لگی ہوگی مجنوں سے ؟

شگفتہ ۔ اجی لیلیٰ ہی نہیں لیلیٰ کا اونٹ تک ڈرنے لگا تھا مجنوں سے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

رنگین ۔ ارشاد

شگفتہ ۔ ؎ تھامنا قیس کا وہ ناقۂ لیلیٰ کی مہار

رنگین ۔ ؎ تھامنا قیس کا وہ ناقۂ لیلیٰ کی مُہار

شگفتہ ۔ ؎ ٹوک دُم بھاگا اس کا وہ ہراساں ہونا

رنگین (ہنس کر) یعنی اونٹ مجنوں کو دیکھ کے ٹوک دُم بھاگا ؟

شگفتہ ۔ جی ہاں! واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن پھر لیلیٰ نجد آئی مجنوں اونٹ دیکھتے ہی پھر سر پٹ دوڑے اور "لیلیٰ" کا نعرہ لگا کے اونٹ کی نکیل پر حملہ کیا نکیل تھامی تھی کہ اونٹ نے [illegible] ماری ۔ نکیل چھوٹی۔ اونٹ بھاگا۔ اور مجنوں لیلیٰ [illegible] اونٹ کی [illegible] گئے اب نقشہ یہ تھا کہ جب مجنوں چلاتے "لیلیٰ" اونٹ [illegible] بھاگتا

لیلیٰ کی یہ حالت تھی کہ جیسے بیا بجھڑ کا بک میں پھڑکتا ہے بالکل اسی طرح لیلیٰ محل میں اچھلتی کودتی نظر آرہی تھی

شگفتہ۔ (قہقہا) پھر کیا ہوا شگفتہ صاحب؟

شگفتہ۔ جی ہوا ایک اونٹ لیلیٰ کو کہتا ہوا اور مجنوں کو گلے میں جھلاتا ہوا ایک نخلستان میں غائب ہوگیا۔

شعلہ۔ پھر کبھی حضرت مجنوں نظر آئے یا اسی دن لیلیٰ کے اونٹ کے قدموں میں شہید ہوگئے؟

شگفتہ۔ اماں میر شعلہ! مجنوں کہیں اتنی جلدی شہید ہونے والے تھے انھیں تو دنیا میں نام پیدا کرنا تھا ایک دن ایسا ہوا کہ ظریف صاحب نے دیکھا۔ ایک وحشی سا آدمی بغل میں سرکی کی پال دبائے کھڑا ہے۔

رنگین۔ وہ کون تھا شگفتہ صاحب؟

شگفتہ۔ ہوتا کون سوا مجنوں کے نجد کے ریگستان میں کون زندہ رہ سکتا تھا۔

شعلہ۔ مگر یہ مجنوں صاحب سرکی کی پال کیوں بغل میں دبائے پھر رہے تھے۔

شگفتہ۔ بھئی ریگستان میں بارش نہیں ہوتی مگر نخلستان میں تھوڑے بہت چھینٹے پڑ جاتے ہیں اسی لئے مجنوں اپنا پورا مکان بغل میں مارے، بارش کے زمانے میں پھرا کرتے تھے ظریف نے اسے یوں کہا ہے۔

شعر سرکی کی پال ساتھ ہے مجنوں کے دشت میں

رنگین۔ شعر سرکی کی پال ساتھ ہے مجنوں کے دشت میں
شعر بجر کی طرح گھومتے ہیں، گھر لئے ہوئے

رنگین (ہنس کر) بھئی غضب یعنی گھر لئے ہوئے، خانہ بدوشوں کی طرح۔ جناب مجنوں گھوما کرتے تھے؟

شگفتہ۔ جی ہاں۔

رنگین۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی شگفتہ صاحب!

شگفتہ۔ بھئی وہ کون سی بات ہے مرزا رنگین؟

رنگین۔ صاحب! نجد کا ریگستان۔ کیف دست میدان۔ آدم نہ آدم زاد۔ پھر مجنوں روٹی کہاں کھاتے تھے؟

شگفتہ۔ مرزا رنگین! اس کا جواب ظریف کی زبانی سنئے۔

سے دن رات نہیں بجر میں کھاتا ہے تو صاحب
غم اپنا بریک فاسٹ بھی ہے اور ڈنر بھی

رنگین۔ (ہنس کر) صبح کا ناشتہ (یعنی بریک فاسٹ) اور رات کا کھانا (یعنی ڈنر) تو مسٹر مجنوں غم ہی سے فرمایا کرتے تھے اب یہ فرمائیے دوپہر کو مجنوں کیا کھاتے تھے شگفتہ صاحب؟

شگفتہ۔ اجی مرزا رنگین! نجد کا ریگستان، سارا ریگستان تھوڑی ہے وہاں نخلستان بھی ہیں اور نخلستان میں رسیلی کھجوروں کے درخت ہوتے ہیں۔

شعلہ۔ تو یوں کہیئے شگفتہ صاحب! کہ غم کا بریک فاسٹ اور ڈنر کرنے کے ساتھ ساتھ، حضرت مجنوں کھجوروں سے بھی شوق فرمایا کرتے تھے۔

شگفتہ۔ ہاں، اور پھر نخلستان کی بھیڑوں، بکریوں کا دودھ پیتے ہونگے۔

رنگین۔ مگر شگفتہ صاحب! مجنوں کو دیکھ کر تو بھیڑ بکریاں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگتی ہوں گی؟

شگفتہ۔ آپ جانوروں کی فطرت سے واقف نہیں مرزا رنگین۔ جب آدمی جانوروں کی طرح وحشی ہو جاتا ہے تو جانور آدمی کو اپنی برادری میں لے لیتے ہیں۔

رنگین۔ یہ بات تو صحیح ہے شگفتہ صاحب!

شگفتہ۔ اجی، چرندے پرندے اور حد ہے کہ درندے مجنوں کے دوست ہوگئے تھے۔

شعلہ۔ یعنی درندے تک مجنوں کے دوست تھے۔

شگفتہ۔ جی ہاں، نخلستان میں ریچھ کی پیٹھ کو بے تکلفی سے گاؤ تکیہ سمجھ کر لیٹ گئے۔

رنگین۔ اجی، ریچھ کی پیٹھ کو گاؤ تکیہ سمجھ کے لیٹ جاتے تھے مجنوں؟

شگفتہ۔ جی ہاں، اور ریچھ کی آنکھ کھلی گردن گھما کے دیکھا مجنوں ہیں۔ ریچھ نے گردن موڑی اور پھر آنکھیں بند کرکے سو گیا۔

شعلہ۔ (قہقہا) اجی شگفتہ صاحب! آپ مذاق کر رہے ہیں۔

شگفتہ۔ مذاق! مستند بات کہتا ہوں پرندے مجنوں کے کندھے پر بیٹھے سیر کیا کرتے تھے اور چرندوں پر خود مجنوں بیٹھے گھوما کرتے تھے۔

شعلہ۔ مثلاً

شگفتہ۔ اجی مثلاً حضرت مجنوں جنگلی گدھوں پر سوار گھوما کرتے تھے۔

رنگین۔ یعنی۔ مجنوں گدھے پر سوار پھرتے تھے؟

شگفتہ۔ جی ہاں، مگر رات کو ہرن کی سواری سب سے زیادہ پسند تھی۔

شعلہ۔ آپ کا مطلب یہ کہ مجنوں ہرن کو گھوڑے کی طرح استعمال کرتے تھے۔
شگفتہ۔ جی
رنگین۔ مگر شگفتہ صاحب! ہرن تو چھلاوا ہوتا ہے جدھر منہ اٹھ جائے بھاگ لے پانچ دس میل
شگفتہ۔ تو مجنوں کو اس کی پروا کب تھی؟۔ جدھر مرضی ہو ہرن نکل جائے مجنوں کو پورے دس بجے کلرکی کرنے کسی دفتر میں تھوڑی جانا ہوتا تھا۔
رنگین۔ میرا مطلب یہ ہے شگفتہ صاحب! کہ گھوڑے کی تو خیر لگام ہوتی ہے جدھر مرضی ہو موڑ لو ۔۔۔ اور ہرن پر مجنوں بیٹھا کرتے ہوں گے تو وہ یقیناً بے لگام ہوتا ہوگا۔
شگفتہ۔ جی نہیں مجنوں ہرن کے بھی لگام ڈالتے تھے۔
شعلہ۔ تو کیا مجنوں نے کوئی لگام ایجاد کی تھی۔
شگفتہ۔ جی ہاں
شعلہ۔ وہ کون سی لگام مجنوں نے ایجاد کی تھی۔
شگفتہ۔ کمربند کی لگام
رنگین (قہقہہ) آئیں؟ کمربند کی لگام؟
شگفتہ۔ جی ہاں۔ جب مجنوں ہرن پر سوار ہوتے تو اپنے کمربند کی لگام ہرن کے سینگوں میں لگاتے تھے۔
شعلہ۔ اب آپ حد سے زیادہ مذاق کے موڈ میں ہیں شگفتہ صاحب
رنگین۔ اب آپ، ہوائی قلعے بنا رہے ہیں شگفتہ صاحب
شگفتہ۔ اجی نہ میں مذاق کر رہا ہوں نہ ہوائی قلعے بنا رہا ہوں جو بات کہتا ہوں اس کی سند رکھتا ہوں
شعلہ۔ اچھا اس بات کی کیا سند ہے کہ مجنوں ہرن پر سوار ہوتے تھے؟
شگفتہ۔ اجی حضرت ظریف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مجنوں لنگوٹی باندھے ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے جا رہے، کمربند کی لگام ہاتھ میں ہے تیزی سے کوچ کرتے جا رہے ہیں۔
شعلہ۔ اچھا پھر کیا ہوا۔
شگفتہ۔ ظریف صاحب نے ہنس کر مجنوں سے کہا آپ بھی سواری پسند کی

پھر مجنوں نے ظریف سے کہا "ہرن پر بیٹھنے میں ایک مصلحت ہے۔"
رنگین۔ اجی ہرن پر بیٹھنے میں کیا مصلحت تھی مجنوں کی۔
شگفتہ۔ میں نے بیان کیا تھا مرزا رنگین! کہ ایک مرتبہ اونٹ نے مجنوں کے لات جھاڑی تھی۔
رنگین۔ جی ہاں یاد ہے۔
شگفتہ۔ تو جناب جو مجنوں نے کہا وہ ظریف نے اس شعر میں موزوں کیا ہے ؎

ع۔ قیس کہتا تھا، یہی فکر ہے دن رات مجھے

شعلہ۔ ع۔ قیس کہتا تھا، یہی فکر ہے دن رات مجھے
شگفتہ۔ ع۔ ارد ے ناقۂ لیلیٰ نہ کہیں لات مجھے
رنگین۔ (قہقہہ) اچھا تو مجنوں ہرن پر اس لئے بیٹھتے تھے کہ جب وہ لیلیٰ کے اونٹ کو دوڑائیں تو اونٹ ان کے دولتی نہ جھاڑ پائے؟
شعلہ (ہنس کے) واقعی یہ ترکیب تو خوب سوجھی مجنوں کو
رنگین۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجنوں بھی بعض اوقات بڑی عقلمندی کر گزرتے تھے۔
شگفتہ۔ عقلمندی؟ اجی مجنوں ہرن پر جو بیٹھے تھے اس میں ایک اور مصلحت بھی تھی
شعلہ۔ وہ مصلحت کیا تھی شگفتہ صاحب؟
شگفتہ۔ ہوا یوں کہ ایک دن لیلیٰ کے ساربان نے، مجنوں کو لیلیٰ کا ایک خط دیا۔ لیلیٰ نے لکھا تھا "میں کچھ دن نجد میں نہیں آسکتی" نیا اونٹ خرید لوں تب آؤں گی کیونکہ پرانا اونٹ جسے تم دوڑایا کرتے تھے، پاگل ہو گیا ہے تم کو چاہئیے پرانا اونٹ اگر کہیں نظر آئے تو نزدیک ہرگز نہ جانا۔
رنگین۔ (ہنس کر) لیلیٰ کے خط کا مجنوں پر کیا اثر ہوا شگفتہ صاحب
شگفتہ۔ اثر یہ ہوا کہ مجنوں پیڑ پر رہنے لگے اور نجد میں پیدل گھومنا چھوڑ دیا۔ جب نکلے ہرن پر سوار ہو کے۔
شعلہ۔ پھر کیا ہوا شگفتہ صاحب؟
شگفتہ۔ جی ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ایک کارواں جا رہا تھا کچھ لوگ اونٹ پر سوار .... کچھ پیدل چل رہے تھے کہ ناگہاں ایک جنگلی سا اونٹ ... [illegible]

کی طرف اور کارواں میں پہنچ کر، کرنے لگا کوشش آدمیوں کی کوپڑی منھ میں پکڑنے کی۔ لوگ بھاگے۔ چلتے کچھ نے بھالے نیزے چلائے لیکن نے کنستر پیٹے۔ بجائے تب ہو اونٹ بھاگ کھڑا ہوا۔

رنگین۔ یہ کیسا اونٹ تھا شگفتہ صاحب!؟

شگفتہ۔ ظریف صاحب سے پوچھئے کہتے ہیں۔

کہ ایسا نہ ہو کہ دوڑ کے مجنوں کو کاٹ کھائے۔

شعلہ۔ کہ ایسا نہ ہو کہ دوڑ کے مجنوں کو کاٹ کھائے۔

شگفتہ۔ یہ لیلیٰ کا اونٹ نجد میں دیوانہ ہو گیا

شعلہ (ہنس کے) اچھا تو یہ وہی اونٹ تھا جو مجنوں کے پاگل پن کی وجہ سے پاگل ہو اٹھا۔

رنگین۔ پھر کیا ہوا شگفتہ صاحب؟

شگفتہ۔ پھر ہوا یوں کہ ایک دن مجنوں ہرن پر بیٹھے قوالی گا رہے تھے۔

شعلہ۔ اجی.... مجنوں قوالی گا رہے تھے۔

شگفتہ۔ جی ہاں، باقاعدہ کان پر ہات رکھ رکھ کے، ٹھک ٹھک کے قوالی گا رہے تھے۔

رنگین۔ کیا قوالی تھی شگفتہ صاحب؟

شگفتہ۔ سنئے۔ غزالوں ہاں غزالوں تمہاری انکھڑیوں میں

اہے وا۔ مری لیلیٰ کی آنکھوں کا نشا ہے ــــ اہے وا نشا ہے کہ لیلیٰ خود نشا ہے۔

اور مجنوں تالیاں بجا بجا کر دہرا ہی رہے تھے کہ اہے وا نشا ہے کہ "لیلیٰ خود نشا ہے" کہ اچانک جو اونٹ کے بلبلانے کی آواز آئی تو اچھل گئے ایک فٹ اونچے ہرن کی پیٹھ سے اپلے۔ دیکھا اونٹ سر پر ہرن بھاگا، اونٹ تڑپ کے پیچھے لپکا مجنوں نے ہرن کو کاوا دیا اور صاحب بس۔ اس لطافت سے اونٹ کے پیٹ کے نیچے سے مع ہرن کے نکل گئے کہ دیکھ کر ظریف دنگ رہ گئے۔

اب اونٹ پیچھے اور ہرن پر مجنوں آگے۔ ہرن کو ایڑ لگاتے ڈپٹتے۔ یہ جا، وہ جا ـــ کہاں اونٹ کہاں ہرن۔ اور ادھر ظریف صاحب کے قریب سے ایک آواز آئی "آداب بجالاتا ہوں"

رنگین۔ اجی یہ کس کی آواز تھی۔

اجی خود ظریف صاحب اچھل پڑے۔ یا مظہر العجائب! بھلا یہ کہ پریت۔ اس ریگستان میں آ نکلا کہاں؟ پلٹ کے دیکھا تو ایک لکھنوی نواب لادے دو پلی ٹوپی، چکن کا انگرکھا، چوڑی دار پاجامہ پہنے سلیم شاہی پاؤں میں، اور ہات میں بٹیر لئے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

ظریف صاحب دیکھ کے لپٹ گئے۔

"ارے یار تم؟ پیارے نواب!!"

نواب بولے۔ اے حضرت غضب کرتے ہیں آپ، خدا جھوٹ نہ بلائے ایک سال ہو گیا آپ کو لکھنؤ سے آئے اور پلٹنے کا نام ہی نہیں لیتے حضور!.... صاحب!! سارے مشاعرے سونے ہو گئے آپ کے نہ ہونے سے۔ چلئے حضور لکھنؤ چلئے۔

"ارے یار نواب" ظریف نے کہا، "میں تو ترس گیا تھا انسان کی آواز کو اس ریگستان میں۔ تم پہلے تو میں سمجھا کوئی جنات بولا"۔

نواب بولے۔ اے حضور! بہت دیکھ لی اونٹ اور ہرن کی دلیں آئیے چلئے اپنے لکھنؤ۔ اور ظریف اپنے نواب دوست کے ساتھ لکھنؤ چل دیئے۔

رنگین۔ (ہنس کے) شگفتہ صاحب! آپ کے حسن بیان کا جواب نہیں کیا کہنا

شعلہ۔ اور آپ کی ظرافت کا بھی جواب نہیں شگفتہ صاحب!

شگفتہ۔ مری ظرافت؟۔ حضرت ظریف کی ظرافت کا طفیل ہے میر شعلہ!

رنگین۔ جناب ظریف کا کیا کہنا شگفتہ صاحب، کیا زندہ دل آدمی تھے۔

شگفتہ۔ اجی ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اگر شادی سے پہلے کبھی گڑبڑ ہوتی تو کتنا المیہ ہوتا، لڑکا کافی سمجھدار معلوم ہوتا ہے ویسے بھی یہ منگنی ٹوٹنی تھی، وہ حیرت سے بولیں، ہیں تجھے کیسے معلوم؟"

"دراصل ایک بڑے نجومی نے بتایا کہ پہلی منگنی خیر و عافیت سے ٹوٹ جائے گی۔"

"توبہ توبہ دیکھ رہی ہو اپنی لونڈیا کو کیسے مزے سے چٹخارے لے کر بتا رہی ہے، آج کل ہمدردی نام کی چیز رہی ہی نہیں۔"

ذرا کسی میاں بیوی میں کھٹ پٹ ہو جائے انھیں فوراً بھنک پڑ جاتی سب سے کہتی پھریں گی کہ دیکھ لینا اسے تو اس کا خاوند واپس ماں باپ کے گھر بھیج دے گا۔ اگر کہہ دیں کہ بڑا ہی سمجھدار خاوند ہے۔ والدین کو ہنسی کی یا دستانی ہے۔ اس نے ملنے بھیج دیا۔ انکار کرنے سے رہا۔ آپ کا بس چلے تو لڑکیوں کے میکے جانے آنے پر کرفیو نافذ کرا دیں تو ناراض ہو جاتی ہیں۔

اگر کوئی تو بیاہتا ایک آدھ ہفتے میکے رہ جائے تو ان کے پیٹ میں گدگدی شروع ہو جاتی ہے، فوراً اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کہیں گی، ویسے یہ ناز والے دن سے میکے بیٹھی ہے ذرا ادھر سے کوئی لے کر جاتا ہے وہ ادھر سے کوئی لینے آتا ہے۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ گھر بسانے والی نہیں اس کے تو لچھن ہی ایسے تھے۔" جب دوسرے دن پتہ چلے گا کہ ناز و ہنسی خوشی سسرال چلی گئی ہے تو ان کا چہرہ اتر جاتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت بی پڑوسن نے محلے والوں کو خوب صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ وجہ پوچھی تو فرمانے لگیں تین دن سے میرے گھر کے صحن سے انڈے برآمد ہو رہے ہیں۔ ہم پر کوئی جادو چلا رہا ہے اسے خدا غارت کرے اس کا کیا اس کے آگے آئے۔ جس دن سے انڈے ملے ہیں میرے کلو کے پیٹ میں درد رہنے لگا ہے۔"

ہم نے مشورہ دیا کہ کسی ڈاکٹر کو دکھائیں وہ بولیں "ڈاکٹر بھلا کیا کرے گا یہ تو جادو ٹونا ہے یہ کسی مولوی سے ہی اترے گا۔"

چوتھے دن ہمارے گھر مسکراتی ہوئی داخل ہوئیں اور بولیں "اے بیٹا تیری مرغی انڈے دیتی ہے؟"

ہم بولے: "نہیں آج کل ہڑتال کر رکھی ہے۔"

وہ ایک انڈہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"پتہ ہے آج کیا ہوا۔؟"

"جی آپ ہی بتائیں۔"

"جب میں کیاری کے پاس سے گذری تو دیکھا تمہاری مرغی وہاں بیٹھی ہے اور انڈہ بھی وہیں پڑا ہے میں ساری بات سمجھ گئی کہ یہ تمہاری مرغی کی کارستانی تھی۔"

اتنا سن کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی کہ شک کی بنا پر ہمارے تین انڈوں کو شہید کر ڈالا۔ ہم نے پوچھا۔

"اب کلو صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اب قدرے آرام ہے۔"

وہ لیجئے بڑی عمر ہے ان کی کوئی ٹھیر کتی ہوئی خبر لے کر آ گئی ہیں مگر انھوں نے ہمیں لکھتے ہوئے دیکھ لیا تو کل ایک نیا اسکینڈل سننے میں آئے گا کہ آمنہ کی لڑکی اپنے کسی نامراد عاشق کو چٹھی لکھ رہی تھی اور اگر غلطی سے کسی دوسری نے تجسس سے پوچھ لیا کہ کیا تم سچ کہہ رہی ہو تو دیکھیں پھر کہیں گی "خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے، اے وہ تو مجھے دیکھ کر جلدی جلدی لفافے میں بند کرنے لگی تھی۔ اب دیکھ لینا یہاں کوئی نیا گل کھلے گا۔"

کھسک لینے میں ہی عافیت ہے۔ اب ہم فلمی ستاروں کی طرح تردید کرنے سے تو رہے۔

وہ اور میں

جی ایم سندگی بیجاپور

پکچر چل رہی ہے۔ لوگ دیکھنے میں مصروف ہیں۔

لیکن ہمارے سامنے تھوڑی دور پر بیٹھا ہوا آدمی اسکرین کم اور ہمیں زیادہ دیکھ رہا ہے، شاید وہ سینتا کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے سینتا میری بیوی ہے ـــــــ ہماری شادی ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ سینتا کو جانتا ہو۔ اس کا کلاس فیلو یا اس کا کبھی کا عاشق ہو۔ میں نے کنکھیوں سے سینتا کی طرف دیکھا۔ وہ فلم پوری لگن توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے بہت ہی معصوم لگا پھر میری آنکھیں سکرین کی طرف مڑ گئیں۔ میں پکچر سے بور ہو رہا تھا۔ اور انٹرول کا انتظار کر رہا تھا۔ انٹرول ہوا۔ تھیٹر کے دروازے کھلے اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے آنے سے مجھے گرمی سے تھوڑا سکون محسوس ہوا۔

ہم چار پینے کے بعد جلد ہی اپنی جگہ پر آبیٹھے۔ وہ گیٹ پر ہماری طرف دیکھتا ہوا کھڑا تھا۔ آس پاس لوگ چائے شربت اور سگریٹ پینے اور آپس میں باتیں کرنے میں لگے تھے۔ لیکن وہ بس ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جب کوئی مرد کسی ایسے مرد اور عورت کی طرف نظر ڈالتا ہے جو ساتھی ہوں تو اس کی نظر صرف عورت ہی پر ہوتی ہے۔ سینتا نے بھی اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

سینتا مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اس نے بتایا کہ وہ جو کھڑا ہوا اور بعد اسم کا مرد کھڑا ہے وہ اس شہر کالج میں لیکچرار ہے اور اچھے خاندان کا فرد ہے اور یہ بھی بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے بچے والا ہے۔ بالکل گھنٹی بجی اور اندھیرا چھا گیا۔ لوگ پھر اپنی سیٹوں پر آکر بیٹھنے لگے۔ لیکچرار ہمارے سامنے سے گزرتا اور کنکھیوں سے سینتا کی طرف دیکھتا ہوا اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

فلم کے ہیرو ہیروئن اور دوسرے کردار پھر سکرین پر چلنے پھرنے اور باتیں کرنے لگے۔ اب مجھے پکچر اچھی لگ رہی تھی۔ ایک ایکٹر کچھ ایسے انداز سے باتیں کرتا تھا کہ اس کی باتوں پر سب کو ہنسی آرہی تھی لیکن میرے سامنے والا لیکچرار کچھ زیادہ ہی زور سے ہنس رہا تھا۔ میری نظر اسکرین پر ہوتی مگر دماغ میں وہی ہوتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ سینتا کے لئے ہی اتنی زور سے ہنس رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ سینتا کا دل دماغ اور آنکھیں سینما دیکھ رہی تھیں۔ وہ نہ میری بےچینی کو دیکھ سکی اور نہ ہی اسے اس کی ہنسی کی پروا ہوئی مگر میں بےچین تھا اور اپنے کو چھوٹا محسوس کرنے لگا۔ دماغ میں آیا کہ اسی وقت سینتا کو لے کر گھر چلا جاؤں۔ پکچر چلے جا رہی تھی، میری آنکھیں سکرین پر تھیں اور دماغ کہیں اور کچھ سوچ رہا تھا۔

یہ کیسا لیکچرار ہے جسے صرف لڑکیوں سے عشق لڑانا آتا ہے ایسے لیکچروں سے ہی تو کالج کے طلبہ بگڑ جاتے ہیں۔ یہ کالج میں پڑھاتے نہیں بلکہ لڑکیوں کو ایک طرح کا محبت سے بھرا دھوکا دیتے ہیں۔ اور ان کی زندگی برباد کرتے ہیں اپنے لیکچروں کو پڑھانا کم اور عشق کرنا زیادہ آتا ہے۔ یہ سماج کو بہت بڑا نقصان پہنچاتے ہیں۔ آج جو ہمارے کالج کی طلبہ کی حالت ہے اس کے ذمہ دار ایسے ہی لیکچر ہوتے ہیں۔ دھڑام سے گولی چلنے کی آواز آئی اور خیالات ٹوٹ گئے۔ ہیروئن پر گولی چلایا تھا اور وہ بچ نکلا تھا۔

میں نے دیکھا وہ لیکچرار پھر مڑکر دیکھ رہا ہے۔ میں اس کو اور سینتا سینما دیکھ رہی تھی اور میرا ہاتھ تھامے ہوئی تھی جیسے وہ کبھی نہ چھوڑے گی۔ میں اپنے کو اس ہیرو کی طرح محسوس کرنے لگا جو ابھی ہیروئن کو ولن کے ہاتھوں سے اپنی جان کی بازی لگا کر بچاتا ہے۔ پکچر ختم ہوئی۔ پورے ہال میں روشنی پھیل گئی۔ لوگوں کی بھیڑ زیادہ رہنے کی وجہ سے ہم سب سے پیچھے تھے۔ میں نے باہر آتے ہوئے پیچھے مڑکر سینما ہال کو دیکھا جو تین گھنٹے لگاتار کام کرنے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ پورا ہال خالی تھا۔ پنکھے بھی اب ساکت ہوگئے تھے لائٹیں البتہ جل رہی تھیں۔

باہر آکر سینتا اور میں شاپنگ کے لئے بازار کی طرف چل پڑے۔ سینما سے تھوڑی دور جانے کے بعد سیدھی طرف ایک موڑ آتا ہے جہاں سے دکانیں شروع ہوتی ہیں۔ میرا دماغ جس کی سوچ میں تھا موڑ پر اس

کو گھورا پایا جو سینتا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سینتا بھی کچھ جھجک سی گئی۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا سامنے والی دوکان میں گھسا۔

"چاقو کس لئے خریدا" سینتا نے آہستہ سے پوچھا۔

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جو دوکان کے سامنے موجود تھا۔ بولا "ضرورت کے وقت کام آئے گا۔"

"گھر میں ایک چاقو ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے سینتا کو جواب نہیں دیا۔ اسے اپنے ہاتھ میں تھامے بازار کی طرف چل پڑا۔ شاپنگ کے دوران میں نے دیکھا وہ لیکچرار ہمارے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ بازار سے گھر جانے والی کچی سڑک پر اندھیرا ہوتا ہے — میں اسی راستہ سے سینتا کو گھر کی طرف لے چلا۔ کچی سڑک تھی، مدھم روشنی تھی، زیادہ لوگ بھی سڑک پر آجا نہیں رہے تھے۔ اکا دکا یہاں وہاں کوئی نظر آجاتا تھا۔ میں نے تھکنے کے بہانے مڑ کر دیکھا۔ وہ لیکچرار پیچھے آرہا تھا۔ میرے دماغ میں آیا کہ "یہ لیکچرر تمہاری بیوی سے عشق کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ایسے ہی نہ جانے کتنے عشق کر چکا ہوگا۔ یہ تمہاری معصوم سینتا کی زندگی بھی برباد کرنا چاہتا ہے، ختم کر ڈالو اس کو۔"

سڑک کی وہ جگہ جس کا مجھے انتظار تھا ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم سے سینتا کا ہاتھ تھامے اس کو گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا اور وہ ہمارے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے میرے ہاتھ میں کھجلی سی ہو رہی تھی اور میرے ماتھے پر پسینہ جم گیا تھا۔ میرا دماغ چکرانے لگا اور میں غصہ کے جوش میں آگیا۔ میرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں چلا گیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں تھا اور اس کا پھل اندھیرے میں چمک رہا تھا۔ میں یکایک رک گیا اور پیچھے کی طرف مڑا۔ وہ اجالے سے اندھیرے میں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اور میرے بہت قریب آگیا۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے چاقو اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ مجھے اپنی کلائی پر گرمی محسوس ہوئی۔ وہ چلا کر پیچھے کی طرف سڑک پر گر کر تڑپنے لگا۔ مجھے اس کے سینے میں چاقو گھسا ہوا اور اس کے اطراف خون چمکتا نظر آرہا تھا۔ سینتا گھبرائی ہوئی مجھ سے آکر لپٹ گئی۔ دھڑام کی آواز [illegible] شاپنگ کا سامان سینتا کے ہاتھوں سے سڑک پر گر گیا۔

نیم کا اونچا اور گھنا درخت اپنی شاخیں زور زور سے ہلا رہا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔

"تم نے اس کا خون کر دیا۔ یہ کیا کیا تم نے" سینتا نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"ہاں میں نے اس کا خون کر دیا ہے۔ انسان نے انسان کا خون کیا ہے جو صدیوں سے وہ کرتا آیا ہے، میں نے بھی وہی کیا ہے۔" وہ لیکچرار تڑپ رہا تھا۔ اور چلا رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ذرا بھی رحم پیدا نہ ہوا۔ مجھے تو اپنی پڑی تھی۔ اب کیا ہوگا۔ پولیس۔ اور پولیس کا خیال آتے ہی میرے ہوش و حواس اڑ گئے۔ مجھے لگا کہ پھانسی کا پھندا میری گردن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اس اندھیرے سے اسے خون میں لت پت چھوڑ کر سینتا کو کھینچتا ہوا زندگی سے دور زندگی کی طرف بھاگنے لگا۔ میں پیچھے رہ گیا اور سینتا مجھے چھوڑ کر مجھ سے دور چلی گئی۔ میں نے جس کے لئے خون کیا تھا وہی مجھے چھوڑ کر دور چلی جا رہی تھی۔ میرے قدموں کو زمین اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بہت کوشش کے بعد میں آہستہ آہستہ ایک ایک قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ میں اسی کوشش میں زمین پر اپنے کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سینتا مجھ سے بہت دور جا چکی تھی اور ایک دھندلا سا سایہ آگے بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں سینتا کو واپس بلانے کے لئے چلایا لیکن میری آواز حلق میں دب کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں اور زخمی ہرنی کی طرح وہیں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔

کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ بہت دور سے سینتا کی آواز آرہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ میں پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ سینتا میرے سر پر ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ "کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے آپ نے۔"

میں نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور اسے اپنی باہوں میں لے لیا۔ اور اپنے دل میں، میں نے کہا کمبخت یہ خواب ؎

انسانیت

حنا بدر

دسمبر کا مہینہ تھا کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اتنی
سخت سردی میں سب ہی اپنے اپنے گھروں میں بند تھے کسی
کی بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ گھر سے باہر نکل سکے میں رات
کو کافی دیر سے گھر آیا تھا اس لئے بہت گہری نیند آئی
کچھ اس وجہ سے بھی کہ سارا دن مصروف رہا تھا، اور
آرام کرنے کے لئے وقت نہیں ملا تھا۔ نہ معلوم
رات کا کون سا پہر تھا جب کسی آواز سے میری
آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میں سمجھ نہیں پایا کہ میری آنکھ کس
وجہ سے کھل گئی پھر آہستہ آہستہ میرے حواس خمسہ
بیدار ہوئے تو میں نے اندازہ لگایا کہ کہیں
قریب ہی کسی کا دروازہ پیٹا جا رہا ہے۔ دروازہ
پیٹنے والا مستقل تیز آواز سے پیٹے ہی چلا جا رہا
تھا میری نگاہ ٹائم پیس کی جانب اٹھ گئی ڈھائی
بجے کا وقت تھا۔ میں سوچنے لگا۔

اُف خدایا! اتنی رات میں اور اتنی سردی
میں کون آیا ہے۔

اچانک میرے بائیں بازو والے فلیٹ کا دروازہ
کھلنے کی آواز آئی اور اس بھیانک رات کے سناٹے
کو چیرتی ہوئی آواز گونجی۔

کون ہے اتنی رات گئے کیا کام ہے۔

میں نے پہچانا ڈاکٹر جگدیش کی آواز تھی پھر
ایک کانپتی لرزتی نسوانی آواز سنائی دی

ڈاکٹر صاحب میرا بچہ —

اور ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات پوری بھی نہیں
ہونے دی اور چیخنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب تمہارا بچہ نہیں۔ بھاگو چلو بھاگو
جاؤ دماغ خراب کرنے کے لئے آجاتے ہیں لوگ۔

نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب میرے حال پر رحم
کیجئے وہ مر جائے گا۔ وہ سسکی۔

مرے میری بلا سے، کیا دنیا کے سارے ڈاکٹر
ناپید ہو گئے ہیں۔ وہ شاید بہت زیادہ غصہ
میں تھے۔

وہ ایک بار پھر گڑگڑائی لیکن ڈاکٹر صاحب نے
کوئی پرواہ نہ کی جھٹکے سے دروازہ بند کر لیا
اس عورت کی سسکیوں کی آواز پھر بھی گونج
رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید
دنیا میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی
انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی ہے ڈاکٹر
اگر اس عورت کے بچے کو دیکھ لیتا تو اس کا
کیا بگڑ جاتا۔ ڈاکٹر کو تو بہت رحم دل ہونا
چاہیئے۔ لیکن یہ کیا ڈاکٹر ہے۔ میں نے سوچا کہ
میں باہر نکل کر دیکھوں اور اس عورت کے بچے
کو کسی اور ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے کہوں۔ میں
اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سوچ
ہی رہا تھا کہ باہر کسی کے بولنے کی آواز آئی
میں نے ہمت کر کے کمرے کی کھڑکی اور کھڑکی کے دبیز
پردے کو ذرا سرکا کر دیکھا سامنے سڑک سنسان
پڑی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف [illegible]
بازو پھیلائے اندھیرے کو اپنے اندر سمیٹنے کی
کوشش میں مصروف تھی وہ انسانی زندگی کے [illegible]

خول کو تو روشنی بخشتی رہی تھی. لیکن انسان کے دل کے
اندھیروں کو دور کرنے میں ناکام تھی۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی میرے فلیٹ
سے تھوڑی دور پر مجھے دو سائے نظر آئے غور
کرنے پر ایک تو میرے پڑوس کا لڑکا شاداب تھا
اور دوسرا شاید اسی عورت کا تھا۔ شاداب پکے
محلے کا ایک آوارہ لڑکا تھا۔ جوا کھیلتا، شراب پیتا
غرض یہ کہ اس میں ہر بری عادت تھی میں نے دیکھا
کہ وہ اسی عورت سے باتیں کر رہا تھا میرے دل
میں تجسس پیدا ہوا کہ یہ اس وقت باہر اس
عورت سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ عجیب عجیب طرح
کے خیالات میرے دماغ میں آ رہے تھے میں نے
دیکھا کہ شاداب تھوڑی دیر بعد اپنے فلیٹ میں
چلا گیا اور ذرا سی دیر بعد واپس آیا اور
اس عورت کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ میں سوچنے
لگا کہ یہ اچھا لڑکا نہیں ہے، نہ معلوم اس
عورت کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اسے کہاں لیے
جا رہا ہے۔ میں باقی تمام رات عجیب [illegible] و پیچ
میں مبتلا رہا۔ صبح اٹھنے کے بعد سیدھا باہر نکل کر
اس کے فلیٹ کے پاس گیا۔ مگر وہاں تالا لگا ہوا
تھا۔ میں واپس آ گیا۔ ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد
میں تیار ہو کر جب عدالت جانے کے لیے باہر نکلا
تو میں نے دیکھا کہ وہ آہستہ قدم آ رہا تھا اور
اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی
تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس سے سوال
کرنا چاہا، مگر اس سے پہلے ہی اس نے مجھے
سلام کیا میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس
سے پوچھا کل رات کیا شور تھا وہ عورت کون
تھی اب اس کا بچہ کیسا ہے۔

میرے اتنے سارے سوال سن کر وہ مسکرایا
عجیب مضمحل سی مسکراہٹ تھی۔

پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا وکیل صاحب آپ
مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں میں بہت برا آدمی
تھا مگر رات جبسے اس عورت کا رونا نہ دیکھا گیا
رات مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کسی نئے
اور اچھے آدمی نے جنم لیا ہے

میں نے کہا یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر
اس کے بچہ کا کیا ہوا۔

وہ کہنے لگا - وہ تو رات کو ہی اپنے مالک
حقیقی سے جا ملا۔ کافی دن سے بیمار تھا۔ باپ
بہت دن ہوئے ہیضہ میں مر گیا تھا میں سوچتا
ہوں وہ بھی کسی بد دماغ ڈاکٹر کی بے توجہی
کا شکار ہوا ہوگا۔ پھر تھوڑی دیر چپ رہا
جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اور کچھ نہ کہہ پا رہا ہو۔

پھر خود ہی کہنے لگا وکیل صاحب میں آپ
کی بہت عزت کرتا ہوں آپ سے ایک مشورہ
لینا چاہتا ہوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو
نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں تم ضرور مجھ سے
مشورہ لے سکتے ہو نہ جانے کیوں میں اس سے
کل تک بہت نفرت کرتا تھا، پر آج میرے دل میں
اس کے لئے ہمدردی کے جذبات امنڈ پڑے
مجھے کہنے لگا وکیل صاحب وہ بہت غریب عورت ہے
اس کا اس دنیا میں کوئی سہارا بھی نہیں ہے اگر
آپ پسند کریں تو میں اس کا سہارا بن جاؤں

میں بہت حیران ہوا مگر میں نے کہا
ہاں ہاں ضرور تم یہ کام ضرور کر لو تمہارا
جذبہ قابل ستائش ہے۔

وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا اور میں سوچ
رہا تھا انسانیت ابھی بالکل مردہ نہیں ہوئی ہے۔
انسان کو شیطان سے فرشتہ بنتے دیر نہیں لگتی یہ تو
سب اللہ کا کرم، اور اس کی عنایتیں ہیں۔۔۔●●●

افسانچہ

خلش

نفیس امام ملک (چھارہ)

کیا آج کی رات بھی نیند نہیں آئے گی؟ بیڈ پر لیٹی لیٹی میں سوچ رہی ہوں۔

چاند ابھی تک بہت پوش پہاڑوں کے اس پار اجنبی وادیوں میں ہے۔ نہ جانے چاند کب نکلے لیکن کیا مجھے چاند کے نکلنے کا انتظار ہے نہیں، مجھے چاند کے نکلنے اور ڈوبنے سے کیا مطلب؟ کیونکہ یہاں نہ تو اب کسی کو پانے کی آرزو رہی ہے نہ کھونے کا غم۔

دیکھے میں بہت دیر سے خیالات کے تانے بانے میں الجھی ہوں۔ عجیب عجیب سی سوچ نے میرے ذہن کو آتش کدہ بنا دیا ہے۔ میرا جسم برف کی طرح جل رہا ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی چیز جسے میں نے برسوں سے اپنے نہاں خانے میں محفوظ کر رکھا تھا۔ ٹوٹ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ!۔

ایسے میں مجھے فردوس اور سوزین بھی بے پناہ یاد آ رہی ہیں۔ ان کم بختوں نے مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔ کبھی ایک خط سے بھی یاد نہیں کریں۔ ہاں! اب خط لکھنے کی فرصت ہی کسے ہے؟ کوئی اپنے ننھے ویلے دولہا کے ساتھ ہنی مون کا پروگرام بنا رہی ہوگی تو کوئی اپنے چنو منو کے لیے سوئیٹر اور موزے بن رہی ہوگی۔ کوئی اپنی چھوٹی نندوں کی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی احساس برتری کا اور فخر کے ساتھ اسکول اور کالج کے زمانے کی داستانیں سنا رہی ہوگی۔ ایسی ایسی داستانیں کہ الف لیلیٰ کی کہانیاں بھی مات ہو جائیں۔ بڑی بے شرم ہیں یہ سب کہتی ہیں ہم سب الگ پچھلی نیک اپنے شوہر میاں کو پوجتی ہیں۔ اور نہیں تو کیا۔

یہ فردوس کم بخت بھی جانے کہاں تو مردوں کی ذات سے ہی نفرت تھی۔ کہتی تھی میں مردوں کو ایک آنکھ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی ہوں۔ وہ دن رات مردوں کی بے مروتی اور بے وفائی کے قصے نمک مرچ لگا کر بیان کرتی تھی۔ اور اب کہاں یہ حال ہے کہ

بیچاری ہشام کے نام کا مالا جپا کرتی ہے۔ اگلے سال ملاقات ہوئی تو کہنے لگی "ارے بنو! ہمارے ہشام صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں ایسے ایسے لطیفے سناتے ہیں کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں کبھی روٹھ جاؤں تو عشق عشق کر اٹھتی۔ بیچارے مجھے تو اتنی محبت کرتے ہیں کہ بس۔ بھلا میں کیوں عشق عشق کرنے لگی میں بیاں ہشام کو کیا نہیں جانتی؟ دن رات یہاں چاتے رہتے ہیں۔ رات گئے دوستوں کی محفل میں بیٹھے رہتے ہیں جیسے گھر بار سے کوئی مطلب ہی نہیں۔

نیلو بھی بالکل بھول گئی۔ کالج کے زمانے میں تو فلسفہ اور فلسفی دونوں سے سخت نفرت تھی۔ فلسفی کو جھکی کہہ کر اس کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ بڑا منہ بنا بنا کر فلسفیوں کی ایسی نقل کرتی تھی کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی اب ساری افلاطونیت ہوا ہو گئی۔ ارشاد کا جادو ایسا چلا کہ اب خود فلسفہ بگھارنے لگی۔ جاوید کی شادی میں ملاقات ہوئی تو لگی بے پر کی ہانکنے۔

"ارے عصمت! تجھے کیا بتاؤں کہ ارشاد صاحب مجھے کس قدر چاہتے ہیں اور جب کسی بات پر بحث ہونے لگتی ہے تو میں ان کے بولنے کے انداز پر دنگ سا رہ جاتی ہوں۔ بڑی اونچائی کی باتیں کرتے ہیں، دن رات پڑھتے رہتے ہیں آنا بجا دماغ انھیں کہاں سے ملا۔

طلعت بیچاری کو کیا کہوں! اس کی تو ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ سنا ہے شوہر میاں شاعر بھی ہیں۔ اب تو غریب طلعت کو آٹھ آٹھ آنسو رونے پڑ رہے ہوں گے۔ وہ اپنی غزلیں سنا سنا کر سارا دن بور کرتے رہیں گے۔ اور بیچاری طلعت کڑھتی رہے گی۔ مجھے ان بیچاریوں کے حال پر رحم آتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی عورت اور اپنی زندگی کا احساس کرنے والا شوہر نہیں ملا۔ جب کہ سب کا آئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے! مجھے ایسے کسی آدمی سے پالا نہیں پڑا۔ عمران صاحب کا ان سب کے شوہروں سے کیا مقابلہ۔ یہ بیچارے زبان سے کچھ نہیں کہتے۔

اَدھورا انسان

ثریا صفدر

جمیل بہت اچھا ناول نگار تھا۔ اس کے اکثر ناول چھپتے رہتے تھے۔ ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پرائیوٹ فرم میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ معقول تنخواہ ملتی تھی۔ چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر آتا اور آرام کرسی پر لیٹ جاتا۔ سلمیٰ اس کے آنے سے پہلے ہی کام کاج سے فارغ ہو جاتی اور چائے تیار کر کے اس کا انتظار کرنے لگتی۔ ادھر جمیل گھر میں قدم رکھتا ادھر سلمیٰ دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھامے آ جاتی اور لبوں پر مسکراہٹ کی لہر پھیلتے ہوئے کہتی۔

"کپڑے پھر اتارنا پہلے چائے پی لو"

جمیل کپڑے بدل کر آرام کرسی پر لیٹ جاتا۔ سلمیٰ اس کے قریب بیٹھ جاتی۔ وہ ناول پڑھتا رہتا۔ وہ غور سے سننے میں مصروف رہتی۔ اس وقت وہ کائنات کی ہر چیز کو بھول کر ناول میں غرق ہو جاتی۔ ایک ایک لفظ کلیوں کی مہک بن کر کانوں میں داخل ہو جاتا۔ شعور سے ٹکراتا اور احساس میں تاثرات کے بے تاب دھارے اٹھنے لگتیں۔ سلمیٰ بے اختیار ہو کر داد دینے لگتی۔

بہت پیارا جملہ لکھا ہے تم نے۔ تمھارے اکثر جملے آبشار کی طرح بہتے ہوئے آتے ہیں اور گنگنا ہٹیں بکھیر کر گزر جاتے ہیں۔ واہ واہ زندگی ساون کی بھیگی اور البیلی راتوں کی طرح حسین اور خوش گوار تھی۔ مسرتیں یوں جنم لے رہی تھیں جیسے گلاب کی شاخوں پر لگے ننھے چٹک کر پھول بن رہے ہوں۔ ایک دن جمیل کو دفتر سے واپس آنے میں دیر ہو گئی۔ سلمیٰ کو ایک ایک پل پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔

اچانک برابر والے فلیٹ سے ٹیلیفون کی آواز آئی۔

"بھابی فون ہے آپ کا۔"

وہ دوڑی دوڑی گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رسیور اٹھایا۔ [illegible]

جمیل صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے آپ فوراً ہسپتال پہنچ جائیے

وہ بھاگی بھاگی ہوئی فلیٹ کا زینہ اترنے لگی۔ پوری مہلت سے وہ ہسپتال پہنچی۔ جہاں جمیل کو بے ہوش کر کے آپریشن کیا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بھی بے کار ہو چکی تھیں۔ وہ دو مہینے تک ہسپتال میں پڑا رہا۔

یہ مہینے سلمیٰ کے لیے قیامت سے کسی طرح کم نہ تھے اس نے بہت مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ تنہائی میں روئی۔ جمیل کے سامنے اپنے آپ پر جبر کر کے مسکراتی۔ جمیل گھر آیا تو اس خاص کا جشن صحت منایا۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے احساس پر رکھا ہوا بوجھ ہلکا ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو تندرست سمجھنے لگے۔ جمیل نے ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی نیلی اور سرخ جھنڈیوں کو دیکھ کر کہا۔

سلمیٰ یہ سب کیا ہے؟ تم ایک ادھورے آدمی کو تندرست سمجھ کر خوش ہو رہی ہو۔ میں کہتا ہوں کب تک اپنے ضمیر کو فریب دو گی میرے ہاتھ بے کار ہو گئے ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا اور تم ان جھنڈیوں سے مجھے بہلا رہی ہو؟ جمیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سلمیٰ کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر رو دے۔ لیکن اس نے اپنی چھاتی پر پتھر کی سِل رکھ لی اور ہنس کر بولی۔

جمیل! آدمی کبھی ادھورا بھی ہوا ہے؟ وہ ہر حالت میں مکمل ہے۔ انسانیت پیروں میں نہیں دل و دماغ میں ہے۔ جسے تنا مکمل نہیں کیا جا سکتا۔

[illegible] اس کی دونوں آنکھیں ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح آنسوؤں کے سمندر میں ڈگمگانے لگیں۔ روتے کیوں ہو جمیل؟

اور کیا ہنسنے لگوں؟ تمھاری طرح میرے دو دل نہیں۔ تم میرے سامنے آتی ہو تو ہنستی ہو اور الگ جا کر روتی ہو۔ میں بچہ نہیں ہوں سلمیٰ ایک ہاتھ نہیں دوسرے کی انگلیاں غائب ہیں، کام وہ بھی نہیں دیتا، نوکری گئی، لکھنا چھوٹ گیا، تیرے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کیسے آ سکتی ہیں۔ اول تو تم نے میری محبت کا جشن منا کر مجھے اور اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کی دوسری طرف سر سے پاؤں تک سوگ میں ڈوب کر تم نے مجھے مردہ کہا!۔

ایسا نہ کہو جمیل! سلمیٰ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ کیوں نہ کہوں سلمیٰ تم روز میرا شیو بناتی ہو، بالوں میں کنگھا بھی کر دیتی ہو۔ لیکن اپنے بال نہیں سنوارتیں، آنکھوں میں کاجل نہیں لگاتیں، تمھارا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ غسل کرنے کے بعد بال درست کرتی تھیں لپ اسٹک لگاتی تھیں۔ تمھاری ان بڑی بڑی کنول سی آنکھوں میں کاجل کتنا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ تمھاری یہ بہاریں میرے ساتھ ہی خزاں بن گئیں۔

سلمیٰ بری طرح بوکھلا گئی۔ اسے پہلی بار اپنی بھول کا احساس ہوا اور جمیل کی باتیں دل میں چبھ کر رہ گئیں اس نے سوچا میں مجرم ہوں۔ میں نے جمیل کو اس کے نکمے پن کا احساس دلا کر جشن کی خوشیوں کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔

"مجھے معاف کر دو جمیل۔ اتنی سی بات پر رو دئیے کیوں لگے؟"

"سلمیٰ! میں اپنی موت پر رو رہا ہوں ایسا محسوس ہو رہا ہے میں زندہ نہیں ہوں اور تم میرا سوگ منا رہی ہو"

سلمیٰ کا سر جھک گیا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اسی وقت سنگار میز کے سامنے بیٹھ کر اس نے سہاگ کی تمام علامتوں کو زندہ کر لیا اور پھر ریشمی شانوں پر بکھیرے آنکھوں میں کاجل کے ڈورے کھینچے جمیل کے کمرے میں آئی۔ وہ جوش میں آ کر بولا۔

"میں زندہ ہوں سلمیٰ! تم نے مجھے مرنے سے بچا لیا۔ تندرستی کی گرمی رگوں میں دوڑنے لگی ہے۔ جلدی سے چائے بناؤ اور قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاؤ ایک کہانی کا پلاٹ کئی دن سے ذہن میں گھوم رہا ہے کہیں بھول جاؤں تم لکھتی جاؤ"

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ٹائپ کی مشین کا کور اتار کر اسے صاف کر دوں۔ کہانی تم آپ ہی ٹائپ کرنا چاہتے ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے، تم سہارا دے کر مجھے اٹھاؤ۔ میں آپ ہی ٹائپ کروں گا۔ کہانی نہیں اب میں اپنا ایک ناول پورا کرنا چاہتا ہوں بہت دنوں سے یوں ہی پڑا ہے"

سلمیٰ ٹائپ رائٹر صاف کرنے کے بعد اس کے پاس آ کر بولی "اب تم چل سکتے ہو"

جمیل بہت مشکل سے اٹھا۔ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو بالکل نہ ٹیک سکا تو بائیں ہاتھ کا سہارا لینا چاہا۔ وہ بھی اس کے بھاری جسم کو نہ سنبھال سکا جمیل سرک کر کرسی پر آ گیا اور کمزور پیروں پر کھڑا ہو گیا سلمیٰ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ سانس روکے کھڑی تھی۔ اسے خوف تھا کہ سانس لیا تو چیخ نکل جائے گی اور وہ مشرقی عورتوں کی طرح شوہر کی مجبوری پر رونے لگے گی۔ بہت مشکل سے سلمیٰ نے بولنے کی فضا بنائی۔

"شہر و جمیل ہاتھوں نے ساتھ نہ دیا تو کیا ہوا اگر پیر بھی کانپ رہے ہیں تو پروا مت کرو۔ میں تمھارے لیے ہاتھ پیروں سے کم ہوں؟"

جمیل کوشش کر کے ہنسا۔ وہ غور سے سلمیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ لیکن لبوں پر سیلاب امڈ رہے تھے۔ وہ آنکھوں سے نہیں ہونٹوں سے رو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ جمیل نے بائیں ہاتھ سے ٹائپ کرنے کی مشق کر لی، وہ انگوٹھے اور باقی دو انگلیوں میں سیفٹی ریزر تھام کر شیو بھی کرنے لگا۔ سلمیٰ کا کام کم ہو گیا۔ لیکن ایک اور غم اس کی جان کو گھن کی طرح چاٹنے لگا۔ پیسے آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے تھے وہ جمیل سے اپنی مالی مشکلات کا اظہار بالکل نہ کرتی تھی لیکن وہ سب کچھ سمجھتا تھا اور اپنے ادھورے ناول کو جلد ہی پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو کچھ لکھتا رات کو سلمیٰ اصرار کر کے سن لیتی۔ آخری حصہ کئی دنوں تک جمیل نے سلمیٰ کو نہ سنایا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک دن سلمیٰ نے سوال کیا۔

"جمیل تمھارے ناول کا کیا بنا؟"

"پورا ہو چکا ہے، اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں"

"پہلے میں سن کر پاس تو کر دوں" کئی دنوں سے [illegible]

تمہیں سناؤں یا نہ سناؤں۔
آخر کیا بات ہے ایسی۔؟
ناول کا انجام ذرا المناک ہو گیا ہے۔
تمہیں تو ٹریجڈی سے چڑ ہوتی۔ تمھاری ہر تخلیق طربیہ اور رجائیت سے بھرپور ہوتی ہے۔ مگر۔
مگر۔ میں اگر مگر ایک نہ سنوں گی۔ تم پڑھ کر سناؤ مجھے!
جمیل پڑھنے لگا۔ حالات اس پر منطبق ہو رہے تھے۔
جب بنیادی کردار نے اپنی بیوی سے کہا۔
"میں تمھاری عمر برباد نہ کروں گا۔"
"کیا مطلب؟" سلمیٰ تیور بدل کر بولی۔
"سنتی جاؤ بیچ میں مت بولو۔" جمیل پڑھنے لگا۔

شادی سے پہلے شوکت تم سے محبت کر رہا تھا۔ اچانک میں بیچ میں آگیا۔ وہ اب تک کنوارا ہے تم اسے۔۔۔
"جمیل! پھاڑ ڈالو اس ناول کو! ایسا غلط اور جھوٹا ناول تمھارے نام سے نہیں چھپے گا۔ تم جتنے اچھے ناول نگار ہو اتنے ہی برے مشورے دیتے ہو۔ تم عورت کی نفسیات کو بالکل نہیں سمجھتے۔ تم نہیں جانتے وہ شوہر ہی کو اپنی کائنات سمجھتی ہے، اسی کو زندگی جانتی ہے، اسے پیسے کی پروا نہیں، وہ نوکری کر سکتی ہے، مزدوری کر سکتی ہے۔ بھوکی پیاسی رہ سکتی ہے لیکن شوہر کو نہیں چھوڑ سکتی، بے شک وہ نامکمل انسان ہی کیوں نہ ہو اس کا مجازی خدا تو ہوتا ہے۔ میں اس ناول کو آگ میں ڈال دوں گی! اس نے ایک شریف بیوی کی توہین کی ہے۔" سلمیٰ کا گلا رندھ گیا۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔
"ارے تو پاگل تو نہیں ہو گئی۔ ناول سنتے سنتے یوں رونے لگی ہے جیسے اس کے کرداروں میں سچ مچ لڑائی ہو گئی ہو۔!"

نذرانۂ عقیدت

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

سید یعقوب علی مسلم بھوپالی

تمنا ہے مدینہ کا حسین دربار دیکھیں گے
گلستان بہشت سید ابرار دیکھیں گے
کبھی جالی کبھی ہم روضۂ سرکار دیکھیں گے
نظر جس سمت اٹھے گی جمال یار دیکھیں گے
مری دیوانگی عشق کی ہوگی پذیرائی
مرے دامن کا جب میرے گلے میں ہار دیکھیں گے
یہ اعجاز تصور ہوگا دنیائے تصور کا
مدینے کے ہر اک ذرے میں روئے یار دیکھیں گے
جو لوٹیں گے مدینہ سے جو چھوڑیں گے مدینہ کو
تو مڑ مڑ کر بصد ارمان سو سو بار دیکھیں گے
دیار مصطفیٰ دیکھا جبین شوق خم کر کے
بہ چشم تر مزار حیدر کرار دیکھیں گے
تم اپنے نامۂ اعمال پر مسلم نظر رکھو
خبر بھی ہے کہ اس کو احمد مختار دیکھیں گے

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے۔ بشرطیکہ خبر ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ صاف صاف اور مختصر سے مختصر لکھی گئی ہو۔ خبر پر نمبر خریداری لکھنا اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ روانا کرنا ضروری ہے۔ خبر کی اشاعت میں کسی طرح کی غلطی ہو جائے تو اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے ——— ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

- عصمت ترنم (آمبور) میری پیاری سہیلی ایم ظیلو فر سلطان اور ان کے بھائی سید سلطان (ایم۔ ایس۔ سی) کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بار یکم جون [illegible] کو ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ نام سید ریحان قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر دراز دے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- عطیہ لاری ادیب (لار) میری آپا رضیہ صاحبہ اور بھائی حاجی اقبال احمد صاحب کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے خدائے تعالیٰ نے ایک اور پھول ۲۲ جون [illegible] بروز جمعہ بوقت ایک بجے دن بمقام کان پور کھلایا۔ اللہ پاک عمر دراز دے اور فخر خاندان بنائے ——— نام کاشف جمال عرف چندا قرار پایا۔
- انیس قادر (مدراس) ۱۱ر جون [illegible] کی صبح کو اور شام کو بھیا ذکریا سیٹھ عزت حسین اور بھابی نور جہاں ذکریا کو اللہ پاک نے ایک نازک سی پیاری گڑیا عطا فرمائی۔ ہم نے پیاری گڑیا کا نام مختار رکھا۔ اللہ پاک اس کی عمر دراز کرے اور میرے بھیا اور بھابی کو اس کی تمام خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔
- اسد اکبر بانو (چتوار پور۔ بستی پور) میری نند نظیر ظہیر ادھیق (بلبل) ظہور علی کے گلشن حیات میں ۱۱ر جون [illegible] بروز منگل بوقت پانچ بجے شام پہلی بار ایک پھول کھلا۔ نام اس چاند کا عرفان احمد رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ اسے عمر نوح عطا کرے اور فخر انسانیت بنائے۔
- نسرین نظام (دچشنہ) میری بہن کشور آزاد اور بہنوئی آزاد اختر کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۔ جولائی [illegible] بروز جمعہ بوقت ۳ بجے دن ایک ننھی سی کلی کھلائی۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔
- حسن ناز فریدی (مراد آباد) میرے دوسرے بھیا ارشد عالم فریدی و بھابی شبانہ کے گلشن حیات میں پہلی بار ۱۱ر جون [illegible] بروز ہفتہ بوقت ساڑھے سات بجے شام ایک پھول کھلا جس نے سارے گھر کو معطر کر دیا۔ نام فیضان فریدی قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ پھول ہمیشہ شاداب رہے اور باغ عالم میں اس کی خوشبو باعث فخر ہو۔
(آپ نے تین خبریں روانا کیں۔ دو کے ٹکٹ بھیجے ایک شائع کر دی گئی۔ دوسری جو خبر جا بیں ستمبر میں چھاپ دی جائے گی۔ ایک ماہ میں ایک ہی خبر چھپ سکتی ہے۔)
- حکیم نور (میل وشارم) میری چھوٹی بہن اشرف ناز اور بہنوئی کلیم اللہ (نائب صدر سیدار) کے گلستانِ زیست میں اللہ جل شانہٗ نے دوسری دفعہ ۲۵ر جون [illegible] بروز ہفتہ بوقت صبح ۷ بجے ایک کلی کھلائی۔ نام آسیہ پروین قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ کلی سے پھول بنے۔ عمر نوح پائے اور صاحب نصیب ہو۔
- مہر افروز لکھنیاں (بیگو سرائے) میری نند آصفہ خاتون کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے ۱۴ر جون [illegible] بوقت شب ۱۰ بجے ایک گلاب سا بیٹا عطا فرمایا۔ اللہ اسے عمر خضر عطا فرمائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ نام سید فیاض حسین (انجم) قرار پایا۔
(سہرہ یا رخصتی کی طباعت کے لئے بیس روپیہ لئے جاتے ہیں)
- رابعہ طارق (بہورہا) میری نند رفعت سلیم و نندوئی سلیم الدین کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۲۰ر جون [illegible] بروز سوموار بوقت صبح چار بجے ایک ننھی منی چاند سی گڑیا عطا کی۔ خدا سے دعا ہے کہ بچی عمر دراز پائے۔ نیک اور صاحب نصیب ہو۔ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- نازنین بانو (بہورہا) میری عزیزہ باجی فیروزہ خاتون صاحبہ اور بھائی مصباح الحق صاحب کے چمن حیات کو منور کرنے کے لئے پروردگار نے ۲۲ر جون [illegible] بروز بدھ بوقت ۴ بجے صبح ایک چاند سا بیٹا

۱۰ جون ۱۹۸۰ء بروز منگل نماز فجر ادا کرکے دعا مانگتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ جس صورت میں انتقال ہوا وہی ان کے خدا رسیدہ ہونے کا ثبوت ہے۔ بڑے ہی متقی پرہیزگار اور مخیر انسان تھے۔

—— تسیم انہولوی

• رخسانہ نفیس بہوردی۔ بڑے ہی دکھ کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے محترم چچا ناظم احمد صاحب ۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو ساڑھے گیارہ بجے دن میں ایک مختصر سی علالت کے بعد ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر کی قوت عطا فرمائے۔

• آفتاب سعید (اچھن پٹن) یہ خبر آنسوؤں سے لکھ رہی ہوں کہ میرے عزیز چچا ایم آر نصیر الدین احمد صاحب (فرزند جناب ساہوکار ریاض الدین احمد صاحب) ۵۸ سال کی عمر میں ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کو ایک مختصر سی علالت کے بعد اس دنیائے ناپائدار سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑے ہی خلیق ملنسار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ اپنی یادگار میں ایک بیوہ، تین لڑکیاں اور دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ اللہ پاک ان سب کے ساتھ ہی والدین اور بھائیوں بہنوں کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

• بیوی۔ آپ بہت رات گئے گھر آئے ہیں۔
شوہر۔ اور تم بہت رات گئے تک جاگتی رہا ہو۔
بیوی کار میں پانچ گھنٹے سے تمھارے انتظار میں جاگ رہی تھی۔
شوہر۔ اور تمھارے انتظار میں پانچ گھنٹے سے باہر کھڑا تھا کہ تم سو جاؤ تو اندر آؤں۔

شوہر۔ میں زیادہ بولنا پسند نہیں کرتا۔ جب میں اشارہ کروں سمجھ جانا کہ میں بلا رہا ہوں۔
بیگم۔ میں خود بھی زیادہ بولنے کو اچھا نہیں سمجھتی۔ اگر گردن ہلا دوں تو سمجھ جانا کہ میں آنا نہیں چاہتی۔

دلہن میں ایک آدمی کو چھینک آرہی تھی مگر وہ اسے برابر روک رہا تھا۔ پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ آپ چھینک کیوں روک رہے ہیں جناب۔
اس نے جواب دیا۔ میری بیوی کہا کرتی تھی کہ جب بھی تمہیں چھینک آئے تو سمجھ لیا کرو کہ میں تمہیں یاد کر رہی ہوں اور تم فوراً میرے پاس آجایا کرو۔ مگر اب وہ مر چکی ہے۔

• ماں:۔ منے ذرا بازار تک چلے جاؤ۔
منا:۔ امی میرے پیروں میں درد ہے۔ میں نہ چل سکوں گا
ماں:۔ بس مٹھائی والے کی دکان تک ہی جانا ہے۔
منا:۔ وہ تو دور نہیں۔ لائیے میں چلا جاؤں گا۔
ماں:۔ یہ پیسے لو۔ مٹھائی والے کی دکان کے برابر کی بنئے کی دکان سے جھاڑو لیتے آؤ۔

لڑکی کا باپ:۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ لڑکی بھی دو اور جہیز بھی۔
لڑکے کا باپ:۔ جناب اگر دونوں چیزیں دینا آپ کو گراں گزرتا ہے تو آپ صرف جہیز دے دیجئے۔ لڑکی نہ دیجئے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر جو ہمارے عنوان کے تحت ہو شائع کیا جاتا ہے۔ شعر کا معیاری، سنجیدہ اور موزوں ہونا ضروری ہے۔ جو اشعار ۱۰ تاریخ تک آتے ہیں وہی شائع کیے جاتے ہیں۔ ستمبر کے لیے عنوان ہے "پروانہ" یا پروانے اور اکتوبر کے لیے عنوان ہے "اللہ"

جولائی کے حریم میں کاتب کی غلطی سے

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

کے سلسلے میں مومنہ مختار صاحبہ میسور کے بجائے دوسرا نام چھپ گیا تھا

مستقل روتے رہنے تو ہے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

مرسلہ فضل امام ملک (جوارہ۔ مونگیر)

دونوں کے دل بھر آئے، ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح سے آنسو بہے رواں

مرسلہ۔ آمنہ خاتون زیدی (دہلی)

آنکھ سے آنسو بہیں اور چشم گریاں تر نہ ہو
لب پہ ہو آہ و فغاں، لیکن اثر دل پر نہ ہو

مرسلہ۔ [illegible] نگار جلیلی (رامپور)

یہ رکے رکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

مرسلہ: مسز عذرا کلام روحی (بیگو سرائے)

تم سے یہ عہد لے کے غم دل سنائیں گے
ہنستے رہو گے آنکھ میں آنسو نہ آئیں گے

مرسلہ: مس شائستہ شریف دس ہزار شاہی (آگرہ)

مرغول مت رہ یہاں آنسو بہانا ہے منع
اس چمن میں بلبلوں کو چہچہانا ہے منع

مرسلہ: [illegible] اعظم انصاری (بہار شریف)

دل میں یادوں کی طرح، آنکھ میں آنسو کی طرح
تم مرے پاس رہو پھول میں خوشبو کی طرح

مرسلہ: نیلوفر گورے (بدایوں)

آیا ہی تھا خیال کہ آنسو چھلک پڑے
آنسو کسی کی یاد سے کتنے قریب ہیں

مرسلہ: رفیعہ یاسمین (بیلا سیتا مڑھی)

اک چوٹ سی لگی دل پہ اور زخم ابھر آیا
پھر بہنے لگے آنسو اور یاد نے تڑپایا

مرسلہ: مس نسیمہ بیگم بھولی (بھاگلپور)

برباد ہی دل کو کیا روئیں، آنسو بھی نہیں رو لینے کے لئے
ہم ان سے جدا، وہ ہم سے جدا، پایا تھا انہیں کھونے کے لئے

مرسلہ: زینب (مدراس)

چاندنی رات چمیلی کے یہ پھولوں کا چمن
کس کی آنکھوں سے گرے کس کے کفن پر آنسو

مرسلہ: صبیحہ سلطانہ صبا (چھپرا)

احساس عمل کی چنگاری جس دل میں فروزاں ہوتی ہے
اس لب کا تبسم ہیرا ہے، اس آنکھ کا آنسو موتی ہے

مرسلہ مس ملکہ بانو (چکمنگلور)

مرسلہ: رعنا کوثر (چن پٹن)

دل کھول کر بھی رونا ہوا کہاں نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا

مرسلہ: پروین ریحانہ وشبانہ (رائے سین)

اسے آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیام درد دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

مرسلہ: حلیمہ لاری ادیب (لاس)

یہ آنسو یاد کرتے ہیں یہ آہیں یاد کرتی ہیں
تمہیں تھا ناز جن پر وہ وفائیں یاد کرتی ہیں

مرسلہ: ڈ۔ عظمت ترنم (آجمیا)

کہاں تک داد دوں تم کو تمہارے اس سلیقے پر
کہ آنسو پونچھتے ہو اور دامن نم نہیں ہوتا

مرسلہ: رخسانہ پروین [illegible]

رسوا نہ کرو ضبطِ غم و رنج و الم کو
ہے آنکھ میں آنسو بھی چھپا تو نہیں ہے

مرسلہ: کہکشاں اختر (سوگرگنڈ چپارن)

اب دل کے فسانے کو بیاں کرتے ہیں آنسو
اب ہم سے ترے غم کی حفاظت نہیں ہوتی

مرسلہ: مس قمر فاطمہ نیازی (آگرہ)

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پر
یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

مرسلہ: نگار سلطانہ (شیخ پورہ گورکھپور)

سچ ہے آنسو بھی تو ہیں جو آبروئے غم کو ڈبوتے ہیں
کبھی آنکھوں سے بہہ نکلیں کبھی پلکوں پہ آ ٹھہرے

مرسلہ: ایم۔ اے۔ سید جمال محی الدین پوری (محی الدین پور)

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرے قہقہوں کی دنیا مری ترجماں نہیں ہے

مرسلہ: ساجدہ نسرین قادری (کانپور)

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

مرسلہ: مس طلعت ناہید (بعقوبہ۔ العراق)

خریداری نمبر ۱۵۳۱، ۵۸ و ۱۰۶۷۔ مرسلہ اشعار ناموزوں تھے

جس شوخِ نظر کی محفل میں آنسو بھی تبسم بن جاتے ہیں ...
واں شمع جلائی جائے گی، پروانے کا ماتم کیا ہوگا

مرسلہ: محمد غوث الاعظم چھجوی (بہار شریف)

دل میں جو آرزوؤں کی شمعیں نہ جل پڑیں
اتنا بھی مت ستاؤ کہ آنسو نکل پڑیں

مرسلہ: ہما زرور (کسیا)

جم کے آنکھ کے پردے میں چھلکتے رہے آنسو
در اصل یہی چہرۂ انوار [illegible] ہے

مرسلہ: مس فرزانہ قادری (بانسہ بستی پور)

مرے چہرے کو دیکھا تو یہی بھر آئے آنسو
دل کا عالم تو ابھی آپ نے دیکھا ہی نہیں

مرسلہ: حنیفہ سکندر (لکھنؤ)

وہ کیا بہائیں گے آنسو ہمارے مرنے پر
جو زندگی میں کبھی دردِ غم بٹا نہ سکے

مرسلہ: مس فرحانہ شریف (آگرہ)

مقدر کا لکھا مٹتا نہیں آنسو بہانے سے
جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہیگا ہر بہانے سے

مرسلہ: ساجدہ فیاض (مودگرے)

شبِ غم کی تیرگی میں مری آہ کے شرارے
کبھی جگنو بن گئے ہیں آنسو کبھی بن گئے ہیں تارے

مرسلہ: نگرم النساء لاری (جرول بہرائچ)

ہماری آنکھ سے جب دیکھئے آنسو نکلتے ہیں
جبیں کی ہر شکن سے داد کے پہلو نکلتے ہیں

مرسلہ: تبسم سلطانہ (چھپرہ)

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

مرسلہ: کے نیلو فر غوث (آمبور)

اپنے ہی غم میں جو نکلے تو ہے آنسو لیکن
غیر کے درد میں ٹپکے تو گہر ہوتا ہے

مرسلہ: نشاط کوثر دھوراجوی (حیدرآباد)

خوشی کی بزم میں شرکت تو کوئی بات نہیں
کسی کے غم میں جو آنسو بہا دیئے تو سہی

مرسلہ: مس زاہدہ فضلی (رامپور)

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

مرسلہ: تسلیم نور (مادیشرم)

دل خون کے آنسو روتا ہے دنیا کے مصائب سہہ سہہ کر
اس حال میں بھی ہم ہنس ہنس کر ہر روز گزارہ کرتے ہیں

مرسلہ: سعید احمد و نجیب اللہ خالد (مہنور)

شبِ غم کی تیرگی میں مری آہ کے شرارے
کبھی بن گئے ہیں آنسو کبھی بن گئے ہیں تارے

مرسلہ: نزہت عابدہ، نکہت عابدہ [illegible]
[illegible]

آہستہ بولو۔ ساجد صاحب نے سر تھام لیا: میرا سر چکرا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ابھی کل تک ترنم ہماری زبان سے خرم کا سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ آج اس سے شادی پر کیسے آمادہ ہو گئی وہ بھی جلد سے جلد۔ بیگم۔ بلاؤ۔ اس بے شرم لڑکی کو۔ میں خود اس سے پوچھنا چاہتا ہوں:

آپ کیا پوچھیں گے: انھوں نے خائف ہو کر کہا: کیا وہ آپ کے سامنے منہ بھی کھول سکے گی؟۔ میں کھلواؤں گا۔ اس کا منہ۔ پکار دو اسے۔ ساجد صاحب نے کہا۔

ماجرہ بیگم کو قطعی یقین نہیں تھا کہ کوئی بات ایسی ہو سکتی ہے جو ترنم کو مجبور کر سکتی ہے پھر بھی ایک نئی خلش ان کے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ ساجد صاحب اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ان کے چہرے سے بے پناہ پریشانی مترشح تھی۔ انھوں نے دفعتاً رک کر ماجرہ سے کہا: میں سنبھل رہا ہوں۔ تم جا کر پوری تفصیل معلوم کر آؤ۔!"

ماجرہ بیگم کے لیے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا وہ ترنم کے کمرے میں گئیں۔ ترنم کھڑکی میں کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں تابش کا گھر تھا!۔

بیٹی سنو: انھوں نے نرم لہجے میں کہا: تم جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ تمھارے ڈیڈی نے سن لیا ہے۔ انھیں بہت افسوس ہے۔ کیا سچ مچ تم سنجیدہ ہو ترنم!:

ہاں ممی۔!"

کیا بات ہے: ان کا دل منہ میں آنے لگا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے میں بدنام اور آپ شرمندہ ہوں۔ لیکن یہ میری خواہش ہے

ساجد صاحب اور ماجرہ ترنم کی دیدہ دلیری اور دیدہ دلیری پر دنگ تھے۔ اپنی لڑکی کا معاملہ تھا کرتے تو کیا کرتے۔ ماجرہ کہہ سمجھا کر تھک گئیں۔ ساجد صاحب نے ہر طرح کی دھمکی دی مگر ترنم دفعتاً اتنی دلیر اور خود سر ہو گئی تھی کہ اس نے اپنی ضد نہیں چھوڑی۔ (باقی آئندہ)

آج میں جان بوجھ کر اکیلا ہو گیا ہوں۔

آج سب آ چکے۔ مگر۔

آج میری ترنم نہیں آئی۔ خفا ہو گئی۔ تنہا بیٹھی میری زندگی پر رو رہی ہو گی۔

"تابی!" دفعتاً ایک ننھا سا ہاتھ اس کے کندھے پر آ کر رکا۔ اور چھن چھن کر کے تابی کے سارے خیالی شیش محل زمین پر آ رہے!۔

وہ مڑا۔ ترنم ہی تو تھی۔ اپنی تمام معصومیت اور دلکشی کے ساتھ۔ سفید چمکتے ہوئے لباس میں سماوی حور لگ رہی تھی!۔

تابش کا دل چاہنے لگا۔ وہ اپنے بازو پھیلائے اور حسن و عشق کی ایک معصوم مورتی کو اپنے سینے سے بھینچ لے!۔

مگر وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا!۔

ترنم نے باسکٹ میز پر رکھ دی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

اس نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا!۔ پھر خوش ہو کر بولی۔

"اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ تابی۔ اب آپ کو بخار نہیں ہے!:

اس نے فرط مسرت سے دل تھام لیا۔

اور درد کی ٹیسیں تابش کے سارے بدن میں پھیلنے لگیں!۔ اسے اپنا ایکسرے فوٹوگراف یاد آ گیا۔ اس کے بائیں پھیپھڑے کا فوٹو تھا جس پر نصف انگل کے برابر سیاہ داغ بالکل واضح تھا۔ اسے اپنے تھوک اور خون کی۔ رپورٹ یاد آ گئی جس میں ٹی بی کے جراثیم کافی مقدار میں پائے گئے تھے!!۔ پھر اسے اپنی وہ تیز و تند خاموش گلا دے کی طرح پگھلتی ہوئی محبت یاد آ گئی۔ جو اسے ترنم سے تھی۔

اس کے اندر دل و دماغ کی رسہ کشی شروع ہو گئی!۔

وہ ترنم سے پیار بھری باتیں کرے۔ پیار کرے لیے نقصان دہ ہے۔

ماجرہ بیگم نے ان نگاہوں سے ترنم کو دیکھا جیسے انھیں اس کے حواس پر شبہ ہو۔ وہ دفعتاً پاگل تو نہیں ہوگئی!۔

ترنم ان کے سامنے اس انداز سے بیٹھی تھی۔ جیسے ان کے مقابلہ پر کمربستہ ہو۔ اس کا بھولا بھالا چہرہ اس وقت غصے اور جوش سے سرخ ہو رہا تھا! لب کپکپا رہے تھے! اپنے آنسو چھپانے کے لیے وہ بار بار پلکیں جھپکا رہی تھی!۔

تمھیں ایسی واہیات باتیں نہیں کرنی چاہئیں!: ماجرہ نے سرد آواز میں اس سے کہا: لوگ مجھے بدنام کر جائیں گے۔ ہم نے لڑکی کو اتنی آزادی دے رکھی ہے کہ وہ اپنے منھ سے شادی بیاہ کی بات کرنے لگی ہے۔ تمھارے ڈیڈی سنیں گے۔ ان کا غصہ تم جانتی ہو!:

چاہے لوگ سنیں چاہے ڈیڈی تک بات پہنچ جائے!: ترنم نے سر اٹھائے بغیر دھیمے لہجے میں کہا: میں کوئی ناجائز اور نامناسب بات نہیں کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنی پسند کا حق ہے:

حق کی بچی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے: ماجرہ بیگم بھڑک کر بولیں: اپنے کمرے میں جاؤ اور سوچو کہ کیا کہہ رہی تم اتنی بے باک اور خود سر کیوں ہوگئی ہو:

میں خود وہ کام کروں گی جو کہہ رہی ہوں:

خبردار ترنم۔ منھ توڑ دوں گی۔ اگر زیادہ بکواس کی: ماجرہ بیگم چیخ کر بولیں۔

ترنم لپک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماجرہ بیگم حیرت، غصے اور تشویش کے عالم میں

بہار رہے تھے! سب ہی نکروں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ اگر کوئی خوش تھا تو فرحت اور خرم۔ وہ اسم بامسمیٰ تھا۔ انھیں اپنی وہ آرزو بار آور ہوتی معلوم ہوئی جس کا بیج انھوں نے ایک بنجر زمین میں بویا تھا۔ وہ پاس بیٹھی تھیں۔ جب ترنم نے غصہ اور غم کی ملی جلی کیفیت میں تابش سے اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔

شاہد اور خرم وغیرہ بھی تھے۔

شاہد نے متحیرانہ لہجے میں کہا: کیوں اس پر طوفان توڑتی ہو۔ وہ تو تیرے ہی رحم کا جویا رہتا ہے۔ ایسی بے چارگی اور عاجزی سے باتیں کرتا ہے کہ لہجہ دل کے آر پار نکل جاتا ہے!

میں بھی تو بولا تھا اس سے: خرم نے کہا: ذرا سی بھی تلخی نہیں تھی اس کے لہجے میں۔ آخر تم ہی سے اسے کیا دشمنی ہوگئی ہے:

کیا معلوم!۔ ترنم نے بے رخی سے جواب دیا۔

اس شام پھر سب کے سب مل کے ہسپتال گئے۔ ساجد صاحب پہلے سرجن اسلام سے ملے! انھوں نے تابش کی مکمل ہسٹری دی۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ ابھی تابش کو ٹریٹمنٹ کے لیے چند ہفتے یہیں قیام کرنا پڑے گا! گھر پر رہنے اور لاپروائی برتنے سے مرض کے بڑھنے کا قطعی اندیشہ ہے!۔

براہ کرم اس کے اعزہ سے ملت کیجیے گا۔ اسے کیا مرض ہے؟: ساجد صاحب نے خوشامد سے کہا: اس کی ماں بیچاری اور خالہ۔ ان لوگوں پر نہایت خوفناک رد عمل ہو جائے گا!:

آپ مطمئن رہیے!۔

ڈاکٹر صاحب یہ آخر اتنے کم عمر لڑکے کو ایسا مرض ہوا کیونکر ہے!۔

آپ یہ پوچھ کے دیکھیے۔ شاید اس کی والدہ یا والد یا خاندان میں کوئی نہ کوئی اس مرض میں ضرور مبتلا ہوگا!:

ڈاکٹر صاحب ایمبنا چاکر چلے گئے۔

اور وہ نت نئی پریشانیوں میں جکڑ گیا۔

جب وہ اچھا ہو سکتا تھا!۔ اس کے اچھے ہونے کی پوری توقع تھی تو اس نے اپنی حالت سے تم کو کیوں خود سے متنفر کر دیا ہے؟۔

اتنی جلد بازی کیوں کی تھی۔

اسے کچھ انتظار کرنا چاہیے تھا۔

ہر مرض کے دو پہلو ہوتے ہیں۔

یا مریض اچھا ہو جاتا ہے۔

یا اچھا نہیں ہوتا۔

اسے الہام تو نہیں ہوا تھا کہ وہ اچھا نہیں ہوگا؟۔

اس نے صحت مند ہو جانے کے امکان کو سامنے کیوں نہیں رکھا تھا۔؟

اب کیا ہوگا!۔

اگر وہ تم سے کہہ دے کہ وہ اس سے مذاق کر رہا تھا کہ وہ کیا سوچے گی۔؟۔

بہر دیہہ ہے۔ چلبلا رنگ بدلتا ہے۔ جا سے۔ وہ جو چاہے۔ سوچے۔ مگر وہ تو موت سے زندگی کی طرف پلٹ آیا ہے!!۔

ٹھیک ہے!۔

اس نے زیر لب کہا۔ میں اسے سب کچھ بتا دوں گا۔ وہ بہت پیاری ہے۔ ضرور معاف کر دے گی اور سمجھ جائے گی کہ میں اس سے مذاق ہی کر رہا تھا!!۔

شاید اسے خواب آور انجکشن دیا گیا تھا یا پھر ڈاکٹر اور نرس کی تسلیوں کا اثر تھا۔ یا پھر اس کی اپنی پرسکون سوچ کا رد عمل تھا۔

وہ گہری نیند سو گیا!۔

ساجد صاحب وارڈ میں واپس آ گئے۔

تابش سوچتے سوچتے اور کڑھتے کڑھتے اپنی پہلی شکل کھو چکا تھا۔ چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ آنکھیں حلقوں میں اتری ہوئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے اور جسم ہو کر رہ گیا تھا۔

ساجد صاحب اس کے پاس جا بیٹھے۔ اس نے اتنے رحم طلب انداز میں ان کی طرف دیکھا کہ ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

بیٹے اپنے مرض کو اتنی اہمیت نہ دو۔ انھوں نے اس کے بال پیشانی پر سے ہٹاتے ہوئے پیار سے کہا تارے دنیا میں کون بیمار نہیں ہوتا۔ یہ بھی زندگی کا ایک ہیر پھیر ہے۔ گزر جائے گا!۔

انھیں کیا معلوم؟۔ تابش کا دل رونے لگا۔

کل تمھارے بہت سے دوست آئے تھے تم سے ملنے: انھوں نے اسے بہلایا۔

جی ہاں۔ فریدی: اس نے کسمسا کر کہا۔ ان سے پتہ چلا کہ امتحان اگلے مہینے ہے۔

لاحول ولا قوۃ۔ لوگ بڑے بڑے امتحانوں میں فیل ہو جاتے ہیں: انھوں نے کہا۔

تم انشاءاللہ امتحان دو گے ابھی تو ایک مہینہ باقی ہے۔ کچھ کہہ رہے تھے۔ امتحان کی فیس کیا ہے؟۔

میں نے پوچھا نہیں...

تم تو ہر سال امتیازی پوزیشن لاتے ہو: خرم بولا: پرواہ کیا ہے۔ اگلی بار پاس ہو جاؤ گے۔

کیا خبر: اس نے مایوس ہو کر جواب دیا۔

بیٹے اندر سے جی کیسا ہے۔ کچھ ہو گے؟: نزہت نے پوچھا۔

جی نہیں۔

مگر اجرہ نے گرم دودھ میں دیتا لا کر اسے پلا ہی دیا۔

جب ساجد صاحب اس سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو ان کے پیچھے نرس بھی نکل گئی۔

ساجد بھائی۔ آپ سے ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔!

تم بہت حسرت سے گھبرا گئی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

نرس اس کے ایکسرے رپورٹ دیکھ رہی تھی!۔

سب کی دیکھتی ہے۔ اس میں تمھاری پریشانی کی کیا بات ہے؟

آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں!۔

بالکل نہیں:

ترنم جان بوجھ کر آج اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اس کا سلوک اس سے کیسا ہوتا ہے!۔

مانتے ہو مجھے کہ قریب وہ لگ اس سے جدا ہو گئے۔

ترنم اس کے پاس آئی۔ دل میں امید و بیم کی لہریں اٹھ بیٹھ رہی تھیں۔

تابش نے بہت سرد اور اجنبی نگاہوں سے اسے دیکھا!۔

تابی۔ تم کہہ رہے تھے کہ میں تمھیں آپ کہہ کر مخاطب نہ کروں۔ تمھیں اچھا نہیں لگتا تھا! اب میں آپ کہہ کر نہیں پکاروں گی:

تابش کے سینے میں درد ہونے لگا۔ وہ اسے کیسے واپس کرے گا۔ کیسی التجا کتنی تڑپ ہے اس کی آنکھوں میں۔ لہجے میں۔ کیا سوچے گی وہ۔

لیکن اس نے خود کو ایک نفت پکڑ دار بنا لیا۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دیوار کو تکنے لگا۔ اور سرد لہجے میں بولا۔

مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟:

پکارا کروں تمھیں؟: ترنم نے حسرت سے پوچھا۔

نہیں!: اس نے منہ پھیر لیا۔

سے معلوم نہیں ہوتے کہ اتنے اونچے درجے میں پڑھ رہے ہیں!:

پہلے بہت اچھی صورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب!: اس نے انتہائی بے ساختگی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھی ہنس پڑے۔

ڈونٹ وری: انھوں نے اس کے گال پر تھپکی دی: ہم اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں کہ تمھیں جلد از صحت ہو جائے۔ امتحان سے پہلے

اب سینے میں درد تو نہیں ہوتا؟: ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔

جی نہیں...!

کھانسی بھی نہیں آتی؟۔

جی نہیں!۔

ٹھیک ہے!۔

ڈاکٹر صاحب!...

کہو۔!"

ڈاکٹر صاحب۔ وہ کالا دھبہ جو میرے کلیجے پر ہے۔ وہ کب مٹے گا؟۔

تم ہمیشہ خوش رہو گے۔ ہنستے رہو گے۔ سوچو گے نہیں.... اچھے ہونے کی کوشش کرو گے تو بہت جلد مٹ جائے گا!:

تو ابھی تک وہ مٹا نہیں ہے؟:

کیسے مٹے گا؟۔ میں تمھارے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی دیکھ رہا ہوں۔ کیوں روتے رہتے ہو۔ آدمی کو معمولی سی باتوں پر اس قدر اداس نہیں ہو جانا چاہیئے!:

اب میں کبھی نہیں روؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب۔ کبھی نہیں!:

زیادہ خوش و خرم رہنا چاہیئے۔!

کہہ کر اس نے پیالہ اس کے لبوں میں انڈیل دیا اور آستین بازو تک چڑھا کر سوئی اندر گھونپ دی۔

مسٹر۔؟!

یس!:

ایک بات پوچھوں۔

ضرور پوچھو!۔

اس دق گاہ سے کوئی بیمار اچھا ہو کر بھی واپس گیا ہے کہ سب لے جائے گئے ہیں!:

نرس!: اس نے ہونٹ سکوڑ لیے: یہ دق گاہ نہیں۔ صحت گاہ ہے۔ یہاں کا ریکارڈ بڑا شاندار ہے۔ پچانوے فیصد بیمار صحت پا کر اپنے پیروں سے چلتے ہوئے واپس جاتے ہیں۔۔۔ اور آپ تو ابھی نوجوان ہیں۔ بہت جلد تندرست ہو کر گھر چلے جائیں گے۔!

بیمار کو ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرنی چاہیئں!:

پھر سرجن اسلام وارڈ میں آئے۔ ان کے پیچھے دو ڈاکٹر اور بھی تھے۔

تابش: وہ مسکرا کر اس پر جھکا!۔

تابش نے انھیں سلام کیا۔

ڈاکٹر صاحب: اس نے گڑگڑا کر لہجے میں کہا: اگلے مہینے میرا امتحان ہے۔ میں اچھا ہو کر امتحان دے سکوں گا؟!:

ضرور ضرور۔ آپ کو اسٹڈی کا وقت بھی مل جائے گا!: وہ محبت سے بولے: میٹرک کر رہے ہیں آپ؟:

جی نہیں۔۔۔: وہ مسکرایا: ایم اے کا فائنل ایر ہے۔

ایم۔ اے فائنل ایر۔ بہت خوب۔ بہت اچھے۔۔۔: وہ خوش ہو گئے۔ آپ صحت

مجھ سے کیوں خفا ہو گئے، ہو۔ کیا میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہے۔۔۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں تابی۔۔۔

تمہاری بہت سی باتیں مجھے بری لگتی رہی ہیں۔۔۔ یاد کرو۔ جب اسی شاہد نے مجھ سے جھگڑا کیا تھا۔ ان دنوں خرم اور شاہد میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی تائید میں تم نے مجھے کتنا برا بھلا کہا تھا۔ نا۔؟ جاؤ اکھاڑے میں اترو۔ کسی پہلوان کو چیلنج کرو۔ میں تم پر خوا مخواہ اپنا حق جتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میری دوستی پسند نہیں کرتیں۔ تم میرا کیا لگتی ہے؟:

اب ایسے کچھ نہ دیکھئے: ترنم کی اپنائیت رخصت ہو گئی۔ اسے محسوس ہونے لگا وہ ایک لڑکی ہے کمزور بے بس، مرد کی توجہ اور دلچسپی کی بھیک مانگتی ہوئی۔ اور تابش وہ واقعی مرد ہے۔ جسے ہر قسم کی دل شکنی، ظلم، زیادتی اور بے مروتی سزاوار ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر پھر ترنم نے کہا۔

میں سچ مچ بدتمیز ہوں۔ مجھے اعتراف ہے۔ مگر آئندہ کے لیے کیا میں نے توبہ نہیں کر لی تھی۔ مجھے بہت شرمندگی ہے تابش۔ اگر آپ نے وہ باتیں دل سے نہ نکال دیں تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گی!۔ کہہ دیجئے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ کتنی بہت سی بدتمیزیاں معاف کر چکے ہیں!۔

جب کوئی چنگاری بدن پر آبلہ ڈال دیتی ہے تو اس وقت تک اپنے ظلم کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ تب تک کہ آبلے کا نشان جسم پر باقی رہتا ہے:

اتنی گراں گزری تمہیں میری باتیں: ترنم احساس ندامت اور ذود غم سے پانی پانی ہونے لگی۔ اس وقت میری باتیں تمہیں گراں گزر رہی ہے کہ نہیں!: وہ سفاک ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

چھلنی کر دیا میرا کلیجہ!: ترنم کے عارض بھیگنے لگے۔

"نہیں تابی نہیں": وہ سسکتی ہوئی اس کے پہلو میں گر پڑی۔ "خدارا کہہ دیجئے کہ یہ سب آپ مذاق کر رہے ہیں":

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں": وہ بے رخی سے بولا اور اس کے پاس سے ایک طرف سرک گیا۔ ترنم نے اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس پر پیشانی ٹیک دی۔

"تابی۔ ایک بار اور معاف کر دیجئے":

"ان سب باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ترنم۔ اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہو۔ میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ کوئی آ رہا ہوگا۔ وہ کیا کہے گا۔!"

"تابی۔ خدارا":

"کچھ نہیں۔ تم جاؤ۔ وقت ہو رہا ہے۔ اور براہ کرم آئندہ میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

اس نے آنسوؤں سے تر بتر چہرہ اٹھایا۔

"اتنی نفرت ہوگئی ہے آپ کو مجھ سے؟"

"یہ میں نے ہرگز نہیں کہا۔"

"ابھی اس دن پارک میں اپنی محبت کی کون سی راگنی مجھے سنا رہے تھے؟ یاد کیجئے۔"

"مجھے یاد نہیں۔"

"کیوں یاد ہوگی۔ میں اتنی احمق تھی کہ آنکھیں بند کر کے آپ کی لن ترانی پر ایمان لے آئی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ سب جھوٹ تھا اس فریب اور دھوکا تھا۔!"

"میں بھی سب کچھ جانتا تھا!" اس نے آہ بھر کر زیر لب کہا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

"خوب پہچانتا تھا": ترنم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا: "آپ پتھر ہیں پتھر کسی کے آنسو آپ کو متاثر نہیں کر سکتے۔ مجھے اتنا بھی ٹھکرا دینے پر ... آپ ..."

"ہاں ہاں۔ کہو۔ رک کیوں گئیں۔ کیا کہہ رہی تھیں ترنم۔ اور میں کیا کیا کرتا ہوں!": وہ ہنسنے لگا

"میری شرمندگیوں پر آپ کو ہنسی آ رہی ہے": ترنم کی نسائیت پر بہت سی ضربیں پڑ چکی تھیں وہ بے ضبط ہو گئی: "خدا کرے کہ ایسی ہی بے کلی آپ کو بھی نصیب ہو جائے۔ خدا کرے کہ ساری عمر آپ جلیں۔ کسی پل آپ کو قرار نہ آئے۔ خدا کرے کہ —!"

تابش نے قہقہہ لگایا: "اور کچھ۔ اور کچھ۔ ترنم۔ یہ کیا۔ تم رونے کیوں لگیں۔ پتھر ہو تم پتھر۔"

وہ ہوا کے جھونکے کی طرح پلٹی۔ پردہ ہٹایا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

"ترنم۔ واپس آؤ": وہ ہنستے ہنستے رو پڑا۔ "بتاؤ مجھے کس طرح میں وہ نقوش تمہارے لوح دل سے کھرچ سکتا۔ جو میری ذات تک تمہاری رہنمائی کرتے ہیں۔ اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ نہیں ہونا چاہیے۔"

"مسٹر تابش!": دفعتہ نرس اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دوا کا پیالہ تھا۔ دوسرے ہاتھ میں سرنج تھا۔

اس نے سر اٹھایا۔ اس کے آنسو دیکھ کر نرس بہت متاثر ہوئی۔ پیالہ اور سرنج میز پر رکھ کر اس پر جھک گئی۔ اور اس کے گال اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔

"کیا بات ہے۔ ابھی یہ لڑکی آپ کے پاس آ کر واپس جا رہی ہے۔ آپ رونے لگتے ہیں۔ کیا یہ آپ کی بیوی ہے؟":

"نہیں":

"بہن ہے؟!"

"کوئی نہیں... کوئی نہیں ہے نرس... وہ میری کوئی نہیں ہے۔"

"آپ کے حق میں دعا مفید نہیں ہے آپ... اسلام صاحب کہتے ہیں کہ آپ کو

لمعات

یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب میری عمر ۱۸ سال کی تھی میں نے اپنا ناول طرزِ زندگی لکھا تھا۔ اس وقت میں نے علامہ راشد الخیری مرحوم کی بہت سی کتب پڑھی تھیں۔ راشد الخیری مرحوم نے جو خدمت طبقۂ اناث کی اپنے رسائل اور اپنی تصانیف سے کی ہے اس کے متعلق کچھ لکھنا سورج کو شمع دکھانے کے مترادف ہوگا۔ بہرحال میں موصوف کی تحریروں سے اس درجہ متاثر تھا کہ صبحِ زندگی اور شبِ زندگی کے وزن پر اپنے ناول کا نام بھی طرزِ زندگی رکھا اور کوشش یہ کی یہ ناول بھی ہماری بہنوں ماؤں اور بہوؤں کے لئے نصیحت و سبق کا باعث بن سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ طرزِ زندگی کو میری حیثیتِ علمی سے کہیں زیادہ پسند کیا گیا۔ شاید اس لئے کہ میرا مقصد صداقت پر مبنی تھا۔ اس کامیابی کے بعد ہی میں نے ۱۹۴۹ء میں خواتین کے لئے ماہنامہ حریم کا اجرا کیا۔ اس وقت عصمت کو سب سے زیادہ شہرت حاصل تھی۔ لیکن تیز روشنیوں کے ساتھ ہی معمولی چراغ اور شمعیں بھی آخر جلتی ہی رہتی ہیں۔ حریم کو بھی پسند کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزی تہذیب سے ہندوستانی خواتین اتنی متاثر ہونے لگی تھیں کہ پردہ کے خلاف بہت سی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے پردہ کرنے والی خواتین کو تنگ کیا جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے اور انگریزوں کے جلسوں اور تفریحات میں شرکت کرنے پر مجبور تھے۔ انگریزوں کی نظر میں یہ بات معیوب تھی کہ وہ بیوی کو پردہ میں رکھیں۔ اور حکومت [illegible] بیگمات کے بغیر آئیں [illegible] ہندوستانیوں نے اس بات کو محسوس کر کے اپنی بیگمات کو [illegible] شروع کیا جن کا چلن انگریزوں

سے ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بیگمات برقعہ پہن کر تو جا نہیں سکتی تھیں، اس لئے کہ اتنی ہمت ہی نہ تھی ان لوگوں میں جنھوں نے اس کی پہل کی تھی۔ انھوں نے تو خود بھی انگریزوں ہی کا لباس اختیار کر لیا تھا۔ یہ تو انگریز ہی ہے کہ وہ اپنے کردار کو نہیں بدلتا۔ اپنی تہذیب میں کسی سے متاثر ہو کر تبدیلی نہیں کرتا۔ چند ہزار یا چند لاکھ انگریز کروڑوں ہندوستانیوں کے ساتھ سو برس تک رہے مگر کسی انگریز مرد نے دھوتی باندھی نہ کسی میم نے ساڑی زیب تن کی۔ اس کے برخلاف کروڑوں ہندوستانیوں نے کوٹ پتلون کو اپنایا اور خواتین نے برقع ہی نہیں اتار پھینکا ان کے لباس کو بھی تبدیل کیا۔ آپ کہیں گی کہ اس وقت انگریز حاکم تھا اور حاکمِ وقت کا اثر رعیت کے تہذیب و تمدن پر پڑتا ہی ہے۔ مانے لیتا ہوں اس بات کو بھی مگر اب تو انگریز ہندوستان پر حکمران نہیں۔ تیس برس گزر گئے مگر پھر بھی کسی انگریز کو میں نے دھوتی یا چوبند میں نہیں دیکھا۔ کسی بھی میم کو میں نے ساڑی یا چوڑی دار پائجامہ پہنے نہیں دیکھا۔ کیوں۔ میں تو صرف یہی کہوں گا کہ یہ اس کا کردار ہے اور کچھ نہیں۔ وہ غلامی میں بھی اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو نہیں بدلتا۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ جب حریم شائع ہونا شروع ہوا تو پردہ کی دھجیاں اڑائی جا رہی تھیں۔ میں نے اسی لئے نیاز صاحب مرحوم کے مشورے سے اس کا نام حریم رکھا اور اس کا نصب العین یہ بنایا کہ اس سے بے پردگی کے خلاف جہاد کیا جائے۔ یہ حریم کی ایک واضح پالیسی تھی اس لئے اسے ایسے ناقدوں سے بھی الجھنا پڑا جن میں پردہ نہیں رہا تھا اور وہ بے پردگی ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے بے پردگی انگریزی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ بڑھتی گئی۔ حریم

جہیز
کے سلسلہ میں فرمائش کرنا
ایک ذلیل ترین فعل ہے
لڑکی کے والدین اپنی حیثیت
کے مطابق خود ہی سب کچھ اپنی
پارۂ جگر کو دے ڈالتے ہیں اس
سے زیادہ کچھ طلب کرنا بڑی
ہی گری ہوئی بات ہے۔
—— نسیم انہونوی

اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بھی بہت بڑے حامیان
پردہ تھے۔ بکر کے اشارہ سے عبدالماجد صاحب کے مقالات نے بے پردگی
کی دھجیاں اڑا دیں۔ لیکن تحریک تیر سے زیادہ پر قوت ہوتی ہے۔
کسی کا بس نہ چلا۔ بے پردگی بڑھتی ہی گئی۔ اور اس کا مقابلہ حریم
اس طرح کرتا رہا جس طرح کوئی طوفانی ندی میں کوئی تیراک
بہاؤ کے خلاف تیرنے کی کوشش کرتا ہو۔ لیکن ہم نے قدم
پیچھے نہیں ہٹایا۔ [illegible] کے ساتھ نہیں چلا۔
جس مقصد کے تحت حریم کو شائع کیا تھا اسے بڑے عزم اور استقلال
کے ساتھ چلاتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بھی حریم کے پرستاروں
کی کمی نہیں۔ ہزاروں شریف گھرانوں میں اسے عزت کی نگاہ سے
دیکھا جاتا ہے اور اس کی قدر ہوتی ہے۔ اور اس کی اشاعت دو
رسائل کے بعد ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے۔ اور یہ بات
اس کی کامیابی کی ایک کھلی دلیل ہے، اس
لئے کہ نہ تو اس کے ٹائیٹل پر عریاں قسم کی
کسی حسینہ کی رنگین تصویر ہوتی ہے نہ اندر ہیجان خیز رومانی
افسانے۔ اس لئے کہ اس دور میں ایسے ہی رسائل کی اشاعت
کثیر ہوتی ہے۔ حریم تو اتنا ہی سادہ نظر آتا ہے جس طرح ایک
عصمت مآب خاتون اپنے گھر میں کام میں منہمک نظر آتی ہے۔ جس کا
نہ لباس بھڑکدار ہوتا ہے نہ وہ میک اپ میں رہتی ہے۔

حریم نے اس طویل مدت میں صرف پردہ ہی کے لئے کوشش
نہیں کی۔ اس نے خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے اور بھی راہیں
متعین کیں۔ مشورے دیئے تاکہ حقیقی معنوں میں خواتین کی خدمت ہو سکے،
جیسا کہ میرا اور حریم کا نصب العین تھا۔ لیکن اس راہ میں جو ایک بڑی
کمزوری تھی وہ حرام ہوتی رہی اور اس کے باعث مخلص ہوتے ہوئے بھی
مجھے ان بہنوں کے تلخ تیر و نشتر سہنا پڑا جو آزادی کی حدوں کو پھلانگ
کر کہیں کی کہیں جا چکی ہیں جنہیں دیکھ کر تہذیب مشرق شرم سے
پانی پانی ہو جاتی ہے۔ ان بہنوں کا وہی عالم ہے جو ان بے نمازیوں کا
ہوتا ہے جنہیں نماز پڑھنے کی ہدایت کی جاتی ہے وہ شرمندگی محسوس
کرنے کے بجائے ہدایت کرنے والوں پر برس پڑتے ہیں بلکہ سخت سست
کہنے لگتے ہیں۔ اس طرح کی حریمی بہنیں بھی ہیں جو مجھ پر الزامات لگاتی
آئی ہیں۔ حال ہی میں ایک بہن نے لکھا ہے۔

—— آخر آپ مرد ہیں، جو ازل سے ہی عورت
کا دشمن رہا ہے۔ شب و روز آپ کے پیارے ہیں عورت کی فلاح و
بہبود کا ڈھونگ رچا کر اسے قعر مذلت میں گرانے کی کوشش
کرتے رہتے ہیں۔ مرد کیسا ہی کیوں نہ ہو عورت کا دشمن
ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں ایسا ہی لکھتی ہوں۔ ایسی
باتیں کوئی عورت لکھتی تو شاید ان کا اثر ہوتا۔ آپ خدا کے لئے
[illegible] اور ہماری بہنوں کو گمراہ نہ کیجئے بلکہ
[illegible] آپ چاہتے ہیں۔
اب ہم بہنیں کسی کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آ
سکتیں۔ وہ متمدن بننا چاہتی ہے۔ ساری دنیا کی
خواتین سے بھی زیادہ آزاد اور قدم بڑھا کر ——

آگے چل کر اور بھی سخت سست کہا گیا ہے۔ مجھے لکھنا مناسب نہیں
سمجھا۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو نیک ہدایت
نہیں کرتا۔ کیا ایک بھائی اپنی بہن کو نیک راہ نہیں دکھا سکتا۔ صرف
اس لئے کہ وہ مرد ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہونا مناسب اور درست ہے تو
واقعی میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ بھی مناسب نہیں۔ لیکن یہ بات کسے
نہیں معلوم کہ میں نے ابتدا ہی سے حریم کی ہر خریدار کو بہن کہہ کر مخاطب
کیا۔ اور اب ان کی بیٹیوں کو بھانجی کہتا ہوں اس لئے میں صرف مرد نہیں
—— حریم کی خریداروں کا بھائی اور ماموں ہوں اور اس رشتہ سے
نصیحت کرنے کا حق مجھے پہنچتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اعتراض
کرنے والی ہستیاں میرے رشتوں کو بھی حقیقت پر مبنی نہ سمجھیں۔ اس کا
تو پھر کوئی علاج نہیں کہ کوئی ناخلف بیٹا اپنے باپ سے یہ کہے کہ کیا ثبوت
کہ آپ واقعی میرے باپ ہیں۔

انتظار ختم پت جھڑ کی بہار شروع

اس ماہ میں عفت بہن کا ناول انتظار ختم ہو گیا۔ حریمی بہنوں
نے اس ناول کو بھی سابقہ ناولوں ہی کی طرح دلچسپی سے پڑھا۔ اور
انتظار کے انتظار میں نہ جانے کتنے خطوط ہمیں وصول ہوتے اور ہو رہے ہیں۔
[illegible] ناول پت جھڑ کی بہار [illegible] سے
شروع کیا جا رہا ہے۔ اس ناول کا نام [illegible]
[illegible]

ہریجنوں کی حفاظت اور خوشحالی ہمارا اوّلین نصب العین ہے

ہریجنوں کی حفاظت کی ذمہ داری ذاتی طور پر ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس سپرانٹنڈنٹوں پر

- ہریجنوں کو زمین اور رہائشی مکانوں کے لئے پلاٹوں کی تقسیم کا کام تیزی سے پورا کیا جائے گا۔ اور انھیں زمینوں پر قانونی قبضہ بھی دلایا جائے گا۔

- تقسیم کی گئی زمینیں چھیننے والوں کو سماج دشمن عناصر مان کر انھیں سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔

- ہریجنوں کی زمینوں پر زبردستی کھیتی کرنے والوں کو فصل سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور دوسری سزائیں بھی دی جائیں گی۔

- چھوت چھات برتنے والوں پر اجتماعی جرمانہ بھی کیا جائے گا اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے چناؤ لڑنے سے روکا جائے گا۔

- ہریجنوں کے لئے ایسے کاروبار کے انتظامات کئے جارہے ہیں جن سے وہ اپنے گھروں پر ہی رہ کر کچھ زیادہ کما سکیں۔

- ہریجنوں کو تعلیم، علاج اور سینچائی وغیرہ کے سلسلہ میں اور زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

- سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں میں ان کے لئے نشستیں مخصوص کی جائیں گی اور سختی سے عمل بھی کیا جائے گا۔

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش کے ذریعہ شائع کیا گیا۔

آخری نعتیہ غزل

(از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مرحوم)

آہ اِک شب تو با اثر ہوتی
وہ تجلیِ حق اِدھر ہوتی

پائے اقدس پہ چشم تر ہوتی
شب گزرتی یونہی سحر ہوتی

نالہ نارسا رسا ہوتا
سوزشِ چشم کارگر ہوتی

کچھ تو ارمانِ دل نکل جاتا
کچھ تو تسکینِ چشم تر ہوتی

نقشِ پا کو لگاتے آنکھوں سے
یوں دوائے دل و جگر ہوتی

حسرتِ دید دل میں لب پہ درود
اب تو ہر شب ہے یوں بسر ہوتی

بے حضوری نصیب میں شاید
ہند میں اب نہیں بسر ہوتی

(بشکریہ صدق جدید)

نذرانۂ عقیدت

مجھ کو بھی دکھا دیجئے وہ راہِ مدینہ
منزل پہ جو پہنچاتی ہے اے شاہِ مدینہ

اِس راز کو دنیا بھی سمجھنے سے ہے قاصر
کیوں رحمتِ باری ہے بہی خواہِ مدینہ

روکو نہ مجھے جانے دو جس سمت بھی جاؤں
کعبہ کی وہی راہ، وہی راہِ مدینہ

تا حشر ملے گی مجھے دیدار کی دولت
ہو جاؤں اگر دفن سرِ راہِ مدینہ

محبوب تو دنیا میں ہوئے اور بھی لیکن
کہلاتے ہیں محبوبِ خدا شاہِ مدینہ

تسلیم کہ قبضے میں ہیں آپ کے جنت
دکھلا دو مجھے خضر فقط راہِ مدینہ

ہیں وقت کے مارے ہوئے دنیا کے ستائے
مسلم کی مدد کیجئے یا شاہِ مدینہ

(سید یعقوب علی مسلم بھوپالی)

حضرت علیؓ کی ایک اہم وصیت

بیٹے، زمانے کی گردش، دنیا کی بے وفائی اور آخرت کے قرب نے مجھے ہر طرف سے غافل کر کے آنے والی زندگی کے اندیشوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب مجھے صرف اپنی فکر ہے، تمام نشیب و فراز پیش نظر ہیں اور حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے۔ ایسی حالت میں تمہارے لئے یہ وصیت لکھ رہا ہوں۔

بیٹے خدا سے خوف کھاتے رہو، اس کے احکام پر کاربند رہو، اس کے ذکر سے دل کی بستی آباد رکھو، اس کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو کیوں کہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس سے بڑھ کر مستحکم رشتہ اور کوئی نہیں ہے۔

بیٹے اپنے دل کو موعظت سے زندہ رکھو، زہد سے مارو، یقین سے قوت بخشو، حکمت سے روزگار سے ڈراؤ اور بچھڑ جانے والوں کی حکایتیں سناؤ۔ گزرے ہوئے لوگوں کی تباہی سے عبرت دلاؤ، ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں گشت کرو، ان کی عمارتوں کے کھنڈر دیکھو اور دل سے پوچھو کہ ان لوگوں نے کیا کیا اور کہاں جا کر آباد ہو گئے۔ اس طرح تمہیں اپنی فانی زندگی کا احساس ہوگا۔

بیٹے، اپنے ٹھکانے کو درست کر لو، آخرت کو دنیا کے بدلے میں نہ بیچو، بے علمی میں سکوت اختیار کرو، بلا ضرورت گفتگو سے پرہیز کرو، جس راہ میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہو اس سے باز رہو، اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور اس کا حق ادا کرو، اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھاؤ، حق کی خاطر مصائب کے طوفانوں سے ٹکرا جاؤ۔ دین میں تفوق حاصل کرو اور مکروہات زمانہ کو برداشت کرنے کے عادی بنو۔

بیٹے، میرے لئے بہت مسرت کی بات ہے کہ تم اللہ سے ڈرتے رہو، اس کے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کرو، خوب سمجھ لو کہ جس کے ہاتھ میں موت ہے اسی کے قبضہ قدرت میں زندگی بھی ہے۔ جو پیدا کرنے والا ہے وہی مارنے والا بھی ہے، جو فنا کے گھاٹ اتارتا ہے وہی حیات نو بھی بخشتا ہے اور جو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے وہی نجات بھی دیتا ہے۔ یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ کے [illegible] پر دنیا قائم ہے کہ [illegible] ممکن [illegible] آخرت میں [illegible] بھی دیا جاتا ہے جس کا [illegible] بیٹے اگر کوئی [illegible]

اس سے انکار نہ کرو، بلکہ اپنی کم فہمی پر محمول کر کے اس پر غور اور فکر کرو کیونکہ پہلے پہل تم جاہل پیدا ہوئے تھے، پھر بتدریج علم سے نوازے گئے۔ کتنی ہی باتیں ہیں جن سے آج تم لاعلم ہو، جن کے بارے میں تمہاری عقل حیران رہ جاتی ہے اور بصیرت کام نہیں کرتی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ چند روز کے بعد تمہیں ان کا علم ہو جائے۔ تمہیں اس ذات ستودہ صفات سے وابستہ رہنا چاہیئے جس نے تمہیں پیدا کیا اور رزق عطا کیا۔ عبادت کرو تو اسی کی، سر جھکاؤ تو اسی کے آگے، اور ڈرو تو اسی سے بیٹے، جن لوگوں نے دنیا کو پرکھ لیا ہے، وہ اس کی جدائی سے نہیں گھبراتے۔ ان کی مثال ایسے مسافروں کی ہے جو ناموافق اور قحط زدہ علاقے چھوڑ کر سرسبز اور زرخیز علاقے کی طرف چل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ مسافر احباب کی جدائی گوارا کرتے ہیں، سفر کی مشقتیں جھیلتے ہیں، خوراک کی خرابی سہتے ہیں اس لئے کہ کشادہ اور راحت افزا مقام تک پہنچ جائیں۔ وہ کسی تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتے، کسی مصرف [illegible] ان کی نظر میں سب سے زیادہ پسندیدہ قدم وہ ہے جو منزل مقصود کی طرف اٹھتا ہے، لیکن جو لوگ دنیا سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے ان کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو سرسبز و شاداب زمین چھوڑ کر خشک اور بنجر زمین کی طرف چل رہا ہو۔ یہ سفر اس کے لئے بدترین اور بھیانک ثابت ہوگا۔

بیٹے، دوسروں کے لئے اپنی ذات کو معیار بناؤ، جو بات تم اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی ان کے لئے پسند کرو اور جو اپنے لئے ناپسند ہو اسے ان کے لئے بھی ناپسند کرو۔ جس طرح تم یہ نہیں چاہتے کہ لوگ تم پر ظلم کریں، اسی طرح تم بھی کسی پر ظلم نہ کرو۔ جیسے حسن سلوک کی توقع تم دوسروں سے کرتے ہو ویسا ہی حسن سلوک [illegible] سے پیش آؤ۔ خود پسندی حماقت ہے اور نفس کے لئے ہلاکت، اپنا [illegible] سلامت روی سے اپنا راستہ طے کرو۔

بیٹے تمہیں ایک لمبا اور کٹھن سفر درپیش ہے۔ اس سفر میں حسن طلب کی بڑی ضرورت ہے۔ اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ مت اٹھاؤ۔ [illegible] بن جائے گا۔ [illegible] اگر کوئی [illegible]

بیٹے، تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی میں ایک ہلکا پھلکا آدمی بوجھل آدمی سے [illegible] دشت رفتار تیز رو سے بہتر ہے۔ تمہیں لازماً اس گھاٹی سے گزرنا ہے اس کے بعد [illegible] ہے یا دوزخ۔ آخری منزل پر پہنچنے سے پہلا بنا جس [illegible] اپنی جگہ ٹھیک کر لو۔ مرنے کے بعد نہ معذرت ممکن ہو گی نہ دنیا کی طرف واپسی۔

بیٹے، جس ذات کے دست تصرف میں زمین و آسمان کے خزانے ہیں، اس نے تمہیں اپنے سے مانگنے کی اجازت بھی دی ہے اور قبول کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے۔ وہ کہتا ہے: "مانگ تجھے مل جائے گا" رحم کی التجا کر، تجھ پر رحم کیا جائے گا۔ تاننے اور تمہارے درمیاں دربان کھڑے نہیں کئے جو تمہیں اس کے حضور میں پہنچنے سے روکیں۔ نہ تمہیں سفارشیوں کا محتاج بنایا ہے۔ وہ تمہاری مناجات پر کان دھرتا ہے تم اس سے مرادیں مانگتے ہو، اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہو۔ اپنی بپتا سناتے ہو، اپنی مشکلات میں مدد مانگتے ہو، اس سے درازی عمر، تندرستی اور رزق کی فراخی چاہتے ہو اور اس کی رحمت کے ایسے خزانے طلب کرتے ہو جو اس کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ غور کرو، اس نے طلب کی اجازت دے کر اپنی رحمت کے خزانوں کی کنجیاں تمہارے حوالے کر دی ہیں، تم جب چاہو دعا کرو، اس کی نعمتوں کا دروازہ کھل جائے گا اور رحمتوں کا مینہ برسنے لگے گا۔ لیکن اگر اجابت دعا میں دیر ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ قبول دعا کا مدار نیت کی درستی پر ہے۔ کبھی اجابت دعا میں اس لئے دیر ہوتی ہے کہ سائل کو زیادہ ثواب ملے، امیدوار کو زیادہ بخشش دی جائے اور اگر سائل محروم رہتا ہے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم کتنی مرادیں ایسی ہیں کہ پوری ہو جائیں، تو انسان کی عاقبت برباد ہو جائے۔ پس تمہاری دعا ان ہی باتوں کے لئے ہونی چاہیئے جو تمہارے لئے سود مند ہوں۔ نقصان دہ باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

بیٹے دنیا میں دنیا داروں کی محویت اور اس کی طلب میں مسابقت سے فریب مت کھانا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ تمہارا کا ساری امیدیں بر نہیں آسکتیں۔ زندگی بہر حال محدود ہے اور تم اسی راستے پر گامزن ہو جس پر تم سے پہلے لوگ جا چکے ہیں۔ اپنی طلب میں اعتدال کو ملحوظ رکھو۔ رزق کے حصول میں سلامت روی سے تجاوز نہ کرو، وہ بھلائی بھلائی نہیں جو برائی کی راہ سے آئے، اور وہ دولت دولت نہیں جو ذلت کے ذریعے حاصل ہو۔ غیرت دار آدمی حرص و ہوس کا نہیں ہوتا

کے گھاٹ پر نہ لے جائے۔ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی کے احسان کو حائل ہونے نہ دو۔ تمہارا حصہ بہر حال تمہیں مل کر رہے گا۔ اللہ کا کم عطا کیا ہوا مخلوق کے زیادہ دئیے ہوئے سے بہت زیادہ بھی ہے اور باعث عزت بھی۔ خاموشی سے پیدا ہونے والی خرابی کا تدارک آسان ہے، مگر گفتگو سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا ازالہ سخت مشکل ہے۔

بیٹے، نکوکار لوگوں کی صحبت اختیار کرو گے تو نیک ہو جاؤ گے، بدعمل کی صحبت سے احتراز کرو گے، تو برائی سے محفوظ رہو گے۔ حرام رزق بدترین کھانا ہے۔ کمزوروں پر ظلم سب سے بڑا ظلم ہے۔ موہوم امیدوں پر تکیہ نہ کرو، بہترین تجربہ وہ ہے جو نصیحت آموز ہو۔ بیٹے، خیال رکھو کہ حرص تمہیں اندھا نہ کرنے پائے اور عداوت عقل سے محروم نہ کر دے۔ دوست کے دشمن کو دوست نہ بناؤ، ورنہ دوست بھی دشمن ہو جائے گا۔ دوست کو بے لاگ نصیحت کرو، خواہ اسے اچھی لگے یا بری۔ غصہ پی جایا کرو۔ غصے کے جام سے بڑھ کر شیریں جام میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ رزق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کی تم جستجو کرتے ہو، دوسرا وہ جو تمہاری تلاش میں رہتا ہے۔ پس اگر تم جستجو چھوڑ دو، تو رزق خود ہی تمہارے پاس آئے گا۔ دانا معمولی تادیب سے مان جاتا ہے مگر چوپایہ مار ہی سے باز آتا ہے۔ کتنے اپنے ہیں جو غیروں سے زیادہ غیر ہیں اور کتنے غیر ہیں جو اپنوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ پردیسی وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں، جو دنیا پر بھروسہ کرتا ہے دنیا اس سے بے وفائی کرتی ہے۔ جب حکمران بدلتے ہیں تو زمانہ بھی بدل جاتا ہے۔ سفر کے ساتھیوں اور قیام سے پہلے اپنے پڑوسیوں کو جانچ لو۔ جو راہ حق چھوڑ دیتا ہے اس کا راستہ تنگ ہو جاتا ہے، جو اپنی حیثیت برقرار رکھتا ہے، اس کی عزت برقرار رہتی ہے۔ سب سے زیادہ مضبوط تعلق وہ ہے جو بندے اور خدا کے درمیان ہے۔

بیٹے، میں تمہاری دنیا اور آخرت اللہ کے حوالے کرتا ہوں اور دونوں جہاں میں اسی ذات برحق سے تمہارے لئے خیر و بہبود کی دعا کرتا ہوں۔ (بشکریہ ذکریٰ)

طلعت ۔ ذرا سنبھالو طبیعت

شوکت ۔ آدھا موڈ رہ گیا مگر اب بھی کہئیے تو آپ کی اس الماری پر اُچک کر کھڑا ہو جاؤں ۔

طلعت ۔ ارے نہیں بابا ۔ الماری شیشے کی ہے

شوکت ۔ کہئیے تو اچھل کر چھت کے پنکھے میں لٹک جاؤں ! ؟

اوشا ۔ (قہقہہ) اچھا ہوا اتنا را موڈ آدھا رہ گیا ۔

طلعت ۔ نہیں تو اوشا یہ میرے ریڈیو کے بانس پر چڑھ جاتے ۔

(قہقہے)

شوکت ۔ میں کہتا ہوں بھابی اب آپ شرارت کا موڈ چھوڑ کر شرافت کے موڈ میں آجائیے ۔

طلعت ۔ اچھا بابا ! اے لو آگئے شرافت کے موڈ میں ۔۔۔ کہو کہنا کیا چاہتے ہو ۔

اوشا ۔ تکلیف کیا ہے ۔

شوکت ۔ تکلیف ؟ اجی تکلیف نہیں خوش خبری ہے

اوشا ۔ خوش خبری

شوکت ۔ جی

طلعت ۔ کیا خوش خبری ہے صاحب ! ؟

شوکت ۔ ارے خوش خبری یہ ہے بھابی کہ تمہارا گویا کہ دیور یعنی کہ شوکت ۔ مطلب میں ۔ آج سویرے سے شاعر ہو گیا ہوں شاعر

طلعت ۔ غضب ہو گیا ۔ تم ؟ اور شاعر ! ؟ ارے کل تک تو تم بالکل ٹھیک تھے ۔

شوکت ۔ یعنی کہ آپ کا مطلب ہے کہ کل تک میری صحت ٹھیک تھی ۔ آج شاعر ہو گیا ہوں تو گویا کہ مجھے مرگی کا مرض ہو گیا ہے ؟ مالیخولیا ہو گیا ہے ! ؟

طلعت ۔ بھئی شاعری کی مرگی اور مالیخولیا ہی نہیں شاعری کا ملیریا اور ہسٹیریا بھی آج کل بہت چل رہا ہے ۔

اوشا ۔ اور شاعری کے ملیریا کا جلدی علاج نہ کرایا جائے تو شاعری کا ٹائی فائیڈ ہو جاتا ہے ۔

طلعت ۔ اور شاعری کا ٹائی فائیڈ ہو جائے تو کوئی لاکھ علاج کرائے مگر شاعر بنا رہتا ہے ۔

شوکت ۔ پھر شرارت شروع ؟

طلعت ۔ اچھا نہیں پھر شرافت شروع

اوشا ۔ اچھا بھئی تم کس قسم کی شاعری کرنے لگے ہو ۔

شوکت ۔ قسم ؟ اجی ہر قسم کی شاعری ۔ نظم معرّیٰ شاعری نثر مقفّا شاعری پابند شاعری ، آزاد شاعری ، کمر بند شاعری بے لگام شاعری مقطع شاعری چقلع شاعری

اوشا ۔ چقلع شاعری ؟ یہ بھئی چقلع شاعری کیا ہوتی ہے ۔

شوکت ۔ چقلع شاعری مقطع شاعری کی طرح ہوتی ہے ۔

طلعت ۔ اور مقطع شاعری ؟

شوکت ۔ مقطع شاعری کی سہیلی ہوتی ہے جیسے آپ اور اوشا دیدی

طلعت ۔ بڑا خطرناک دورہ پڑا ہے تم پر شوکت !

اوشا ۔ حالت واقعی سنگین ہے ۔

طلعت ۔ ٹھہرو ، میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں ۔

اوشا ۔ ارے بیٹھو ۔ بیٹھو تو طلعت ۔ بھئی ان کی شاعری سن کر اندازہ لگانا کہ ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت ہے کہ پولس کو ۔

شوکت ۔ اوشا دیدی ! آپ بھی مذاق کرنے لگیں ؟

اوشا ۔ اچھا مذاق نہیں شوکت ۔ یہ بتاؤ تم کس قسم کی شاعری کے استاد ہو

شوکت ۔ اُستاد ؟ اجی استاد کس کھیت کی مولی ہوتا ہے میں علامہ ہوں علامہ اور علامہ بھی کیا چیز ہوتا ہے ۔ میں ملک الشعراء ہوں ۔ یعنی کہ شاعروں کا بادشاہ بھی کیا پدی کیا پدی کا شوربہ میں شہنشاہ ہوں زبانی شاعری کا ۔

طلعت ۔ یہ زبانی شاعری کس عجائب گھر کی چڑیا ہے ؟

شوکت ۔ چڑیا ؟ اجی لاحول آپ کی سمجھ پر بھابی ! زبانی شاعری کا مطلب ہے ۔ منہ زبانی شاعری ۔

اوشا ۔ یعنی

شوکت ۔ یعنی یہ کہ آپ جس چیز کی طرف ، بس اشارہ کر دیں ۔ میں اس چیز پر چٹا پھٹ شاعری بولنے لگوں گا ۔

طلعت ۔ شاعری بولنے لگو گے ؟ ؟

شوکت ۔ جی ۔ میں نہ شاعری کرتا ہوں ۔ نہ کہتا ہوں بلکہ شاعری بولتا ہوں ۔

اوشا ۔ اچھا اونٹ پر شاعری بول سکتے ہو ؟

شوکت ۔ اجی میری شاعری کے سامنے ۔ اونٹ تو بچہ ہے ۔ اونٹ

بھی ۔ آم گھاس ۔ کاکروچ کچھ بھی ۔ آم غلط تمام لوٹ پھوٹ کا
پڑھنا ۔ ہر چیز پر منظوم زبانی شاعری بول سکتا ہوں ۔ کہئے پتھر پر
شاعری بولوں ؟ یا آدم خور شیر پر منظوم زبانی شاعری کہنے لگوں ؟

طلعت ۔ اچھا کنگھجورے پر کہو۔

اوشا ۔ ہاں مگر ایسے کنگھجورے پر جو اگلے دنوں بچوں پر حملہ کرتا تھا

شوکت ۔ ابھی لیجئے ۔ سنئے ہوشیار ہو جائیے ۔ بولنا شروع کرتا ہوں ۔

طلعت ۔ ارے تم بیٹھ تو جاؤ ۔ کھڑے کھڑے دستیں بگھار رہے ہو۔

شوکت ۔ اے لیجئے یہ بیٹھ گیا ۔ ہاں تو دیکھئے کنگھجورے پر کیا نازک خیال پیش
کرتا ہوں ۔

اوشا ۔ ارشاد!

شوکت ۔ عرض ہے ۔ پہلے لم ہیڈ پئیں

طلعت ۔ کیا تمہارے لئے لم ہیڈ منگاؤں ؟

شوکت ۔ اے لیجئے ستیاناس شاعری کا ۔ اوشا دیدی! بھابی سمجھیں میں
لم ہیڈ پینا چاہتا ہوں ۔ اے بھابی میں یہ کنگھجورے سے کہہ رہا ہوں
کہ ۔ پہلے
آؤ لم ہیڈ پئیں ۔

طلعت ۔ (ہنس کر) اچھا تو یک بیک ہر آپ کی ملاقات کنگھجورے سے
ہوئی تو آپ نے کنگھجورے سے کہا
پہلے
آؤ لم ہیڈ پئیں
(ہنس کر) بھئی خوب بہت خوب

شوکت ۔ اوشا دیدی! بھابی سے کہئے بیچ میں نہ بولیں

اوشا ۔ بھئی تم خاموشی سے سنو طلعت

طلعت ۔ اچھا فرمائیے شوکت صاحب

شوکت ۔ عرض کرتا ہوں ۔
پہلے
آؤ لم ہیڈ پئیں
اور پھر
پاس بٹھا کر تم کو
یہ سمجھاؤں وہ جو
چلا جا کر جو ان
یا
کوئی چھوٹا بچہ
شانتی سے جہاں رہتا ہے
تو
حملہ
کسی پر نہ کرو
میرے دوست!

اوشا ۔ بھئی واہ شوکت تم نے تو بس قلم توڑ دیا

طلعت ۔ ارے لاؤڈ سپیکر پھاڑ کے توڑ دیا ۔

شوکت ۔ اوشا دیدی! چپ رکھئے نا بھابی کو ۔

اوشا ۔ چپ رہو نا طلعت ! ۔ ہاں آگے کیا کہتے ہو ۔

شوکت ۔ کہتا ہوں ۔
مجھ کو دینا تو
ہو سگرٹ کیس
تم بھی
سگرٹ سلگاؤ

طلعت ۔ (ہنس کر) بھئی خوب لم ہیڈ کے بعد آپ کنگھجورے کو سگرٹ
پلا رہے ہیں ؟

شوکت ۔ بھابی تم عورت ہو کہ بتاشا ۔ جب دیکھو بیچ میں پٹاخ پٹاخ
بول اٹھتی ہو ۔

طلعت ۔ مگر بھلا کہیں کنگھجورا لم ہیڈ پیتا ہے ؟ سگرٹ پیتا ہے ؟

شوکت ۔ میں شاعر ہوں ۔ میں کنگھجورے کو لم ہیڈ پلاؤں سگرٹ پلاؤں
حقہ پلاؤں ۔ گانجا پلاؤں ، چرس پلاؤں ، دھتورا پلا دوں آپ سے
مطلب ؟

اوشا ۔ یہ تو ہے ۔ تم بولنا بند کرو طلعت ۔ اور تم بولنا شروع کرو
شوکت ۔

شوکت ۔ کنگھجورے سے کہتا ہوں ۔
مجھ کو دینا تو ہو سگرٹ کیس
تم بھی سگرٹ سلگاؤ
دو کش لے کر
وہ مجھ کو جواب

طلعت۔ بہت بہت خوب بہت خوب

شوکت۔ اب شعر پھر سنئے بھابی زیادہ مزا آئے گا۔

عشق پھر ایک آفت ہے، چناجورگرم

عشق کی آہ قیامت ہے، چناجورگرم

اوشا۔ بھئی خوب۔ اچھا اور شعر!

شوکت۔ غزل ختم ہوگئی

طلعت۔ ارے یہ تو ایک شعر تھا!

شوکت۔ جی ہاں میں ایک شعر کی غزل کہتا ہوں

اوشا۔ او پھر بھئی

طلعت۔ ابھی ٹھیک باتیں کرنے لگے تھے

شوکت۔ اب کچھ اور سناؤں

اوشا۔ وہ کیا۔

شوکت۔ ؏ نہر پر چل رہا ہے پن چکی

طلعت۔ نہیں

شوکت۔ ؏ مینڈکی بھی چلی مداروں کو

اوشا۔ نہیں

شوکت۔ اچھا ؏ لاٹھی بانس بریلی کو (وغیرہ)

طلعت۔ ہا ہا نہیں

شوکت۔ ؏ چل جھنجھری ساون آیا (وغیرہ وغیرہ)

طلعت۔ اب کی دور پہلے سے زیادہ زوردار ہے۔

شوکت۔ اچھا تو پھر ؏ ایک لڑکی بگھارتی ہے دال۔ ؏

بی بی مینڈکی ری تو تو پانی میں کی رانی

؏ جس محلے میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتا تھا ایک سوداگر (وغیرہ)

پھر سناؤں!؟

طلعت۔ ہا ہا نہیں نہیں نہیں

شوکت۔ اچھا وغیرہ وغیرہ پر کچھ کہہ ڈالوں

اوشا۔ اخبار میں اشتہار دینا ہوگا۔

طلعت۔ ایک ڈاکٹر کی سخت ضرورت ہے

——(دونوں کی ہنسی)——

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

اوشا۔ یہ کون؟

طلعت۔ ذرا دیکھنا اوشا

——(ذرا سا وقفہ)——

اوشا۔ نمستے ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر۔ نمستے۔ وہ مسز طلعت کہاں ہیں؟

اوشا۔ تشریف لائیے۔

——(ذرا سا وقفہ)——

طلعت۔ آئیے آئیے تشریف لائیے۔ ادھی یہاں بیٹھئے ادھر

ڈاکٹر۔ آپ کیسی ہیں مسز طلعت؟

طلعت۔ شکریہ۔ میں تو بالکل اچھی ہوں مگر— مگر۔ آپ ان سے

ملئے "یہ ہیں میرے دیور۔ شوکت"

ڈاکٹر۔ اچھا تو یہ ہیں آپ کے دیور؟ نمستے شوکت صاحب

شوکت۔ آداب عرض آداب عرض

ڈاکٹر۔ مسٹر شوکت (مجھے معاف کیجئے گا۔) آپ مجھے شاعر معلوم ہوتے ہیں

شوکت۔ (خوش ہوکر) شاعر؟ ابھی آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں شاعر ہوں

ڈاکٹر۔ آپ دیکھنے ہی سے شاعر لگتے ہیں

شوکت۔ تو ضرور آپ کو شاعری سننے کا شوق ہوگا۔

ڈاکٹر۔ کبھی شوق تھا مگر میں ہندوستانی شاعری سمجھ نہیں سکتا۔ ڈاکٹری

پڑھنے کے لئے زیادہ ولایت میں رہا ہوں

شوکت۔ اجی ابھی سنئے ولایتی شاعری سوئزرلینڈ کی غزل روس کا آلھا اودل

امریکہ کی بیرا انڈونیشیا کا بھجن، فرانس کی کجری افغانستان کا ساون

جرمنی کی قوالی۔ کیا سناؤں

طلعت۔ ڈاکٹر صاحب یہ اچھے ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر۔ ابھی مجھے پوری طرح سمجھنے دیجئے مسز طلعت

شوکت۔ ہاں تو اجازت ہے؟ سنانا شروع کروں ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ آپ وہ کلنڈر دیکھئے

شوکت۔ جی ہاں جنگل کی بھینس کھڑی ہے کلنڈر میں

ڈاکٹر۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں

شوکت۔ بھینس

اے بھینس

نرگسی آنکھیں

جیسے آنکھیں میرے محبوب کی

تشریح کلام غالب

(ابن مریم ہوا کرے کوئی کے باب میں)

برق آشیانوی

آفس جانے کے لئے تیار ہو کر جب ہم بس اسٹینڈ پہنچے تو معلوم ہوا کہ صبح صبح ہڑتالی طلباء نے بطور ناشتہ دو عدد بسوں کو جلا کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے دیگر تمام بسیں بند ہیں۔ دوپہر میں لنچ کے طور پر طلباء کا پروگرام ریلوں کو آگ لگانے کا تھا اور رات میں ڈنر کے مینو (Menu) میں بازاروں کو لوٹنا اور دوکانوں کو آتش نمرود میں تبدیل کرنا شامل تھا۔ بسوں کا چلنا بند تھا تو موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر سائیکل رکشا اور آٹو رکشا والوں نے اپنے کرائے دوچند کے بجائے سہ چند کر کے غرض مند مسافروں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس لوٹ کھسوٹ سے گھبرا کر ہم گھر واپس لوٹے اور کپڑے بدل کر آرام کے ساتھ لیٹنا ہی چاہتے تھے کہ اجمل آ دھمکے اور دیوان غالب کھول کر "مطالبہ" کیا کہ سمجھائیے اس شعر کا مطلب ـــ

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہم جانتے تھے کہ اجمل طالب علم ہیں اور آج کل طلباء کا کوئی بھی مطالبہ پورا نہ کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ باہر بازار لٹ رہے تھے اگر اجمل بھلا گھر لوٹنے اور آگ لگا دینے پر اتر آئیں اور اس وقت ہم ان کا مطالبہ پورا نہ کریں تو پھر حکومت میں اور ہم میں فرق ہی کیا باقی رہے گا۔ وہ تو حکومت کا کام ہے کہ جب تک بسوں پر پتھراؤ کر کے آگ نہ لگائی جائے، بازاروں کو آگ لگا کر دوکانیں نہ لوٹی جائیں اور ریلوں کی آمدورفت بند نہ کر دی جائے طلباء کے مطالبے پورے نہ کرے۔ ہم ٹھہرے غریب آدمی گھر تو گھر اگر صرف ہماری جیب ہی لوٹ لی جائے تو پھر کئی دنوں تک کھانا نہ ملے۔ ہم نے حالات کی سنگینی کو پل بھر میں بھانپ لیا اور ہتھیار ڈالدئے۔ اجمل نے ہتھیار اٹھا لئے کہ اپنے ہاتھ میں رکھے رہیں تاکہ اگر ہم کسی وجہ سے مطالبہ پورا نہ کر سکیں تو ان سے کام لے سکیں۔ اسلئے ہم نے شروع کر دیا۔ شعر کا مطلب سمجھانا ـــ

شہر کا [illegible] ماحول [illegible] تھی۔ مرزا غالب علی الصبح دس بجے بیدار ہوئے کیونکہ وہ صبح دیر تک سوتے رہنے کے مخالف تھے۔ اور ہر ایک کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ شاعری کرنا اور صبح کی تک سونا نحوست ہے۔ اس سے ہر بے وقوف انسان کو پرہیز کرنا چاہئے۔ رات میں دو چار شعر موزوں ہوئے تھے تو انھوں نے ازار بند کو گرہ دے لی تھی۔ ارادہ کیا کہ ان اشعار کو اب کاغذ پر لکھ لیں۔ اور ازاربند کی گرہیں کھول دیں۔ ابھی دو ایک گرہیں کھولی ہی تھیں کہ اچانک قدرت کا دوسرا پیغام آیا۔ SECOND CALL OF NATURE
اور اس قدر شدید تقاضہ ہوا کہ فرشتے کے پیچھے فرشتہ دوڑ کر آنے لگا کہ فوراً چلئے ورنہ مقام موجود پر ہی فراغت کا اندیشہ ہے۔ مرزا صاحب ازار بند کو چھوڑ کر دوڑے حاضری دینے کی غرض سے بعد فراغت واپس ہوئے کچھ ہی منٹ گزرے تھے کہ پھر ایک حکم وصول ہوا کہ آپ کی فوری طلبی ہوئی ہے۔ پھر حاضر دربار ہوئے۔ اور باریاب ہو کر لوٹے ہی تھے کہ تیسرا فرمان آ گیا۔ اس پر مرزا صاحب گھبرائے ان سے زیادہ بیگم پریشان ہوئیں کہ مرزا صاحب بیت الخلاء سے واپس آ کر لوٹا رکھنے بھی نہ پاتے ہیں کہ پھر بھر کر لے جاتے ہیں چنانچہ تیسری حاضری سے واپسی پر بیگم نے حال دریافت کیا تو مرزا صاحب نے جو حال بتلایا اس سے بیگم پریشان ہوئیں۔ پالکی میں سوار کر کے کہاروں کے ساتھ مرزا صاحب کو قریب کے ایک خانگی ڈاکٹر کے پاس روانہ کیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو کیا بیماری ہے تو مرزا صاحب نے برق آشیانوی کے شعر میں سوال کا جواب دیا اس لئے کہ فضول قسم کے سوالات کا جواب اپنے اعلیٰ درجہ کے اشعار میں دینا ان کی شان کے خلاف تھا بہرحال جواب میں فرمایا ـــ

میں مریض عشق ہوں اور جگر کا بیمار ہوں
اب یہ حالت ہے کہ مرنے کیلئے تیار ہوں

مرزا صاحب آگے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر نے مداخلت کی

سینے میں دل کی حرکت کا دب جانا عجیب بات ہے۔ میری رائے لیں
اس کیس کو ہارٹ اسپیشلسٹ کے حوالے کر دینا چاہیے۔ چنانچہ
اس نے چٹھی پر لکھ دیا۔

REFERRED TO HEART SPECIALIST

اس کے بعد وارڈ بوائے مرزا صاحب کو اسٹریچر پر لٹا کر امراض قلب
کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس ڈاکٹر نے مرزا صاحب کے سینے سے
آلہ لگا کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ سینے میں دل کی دھڑکن کی کوئی آواز
ہی نہیں ہے۔ مرزا صاحب کو حیرت سے دیکھا اور چٹھی پر یہ لکھ کر
ریڈیالوجسٹ RADIOLOGIST کے پاس روانہ کر دیا کہ
مریض کا ای۔ سی۔ جی (E.C.G) الیکٹرو کارڈیو گرام لیا جائے۔ ریڈیالوجسٹ
نے مرزا صاحب کو ایک میز پر لٹا کر کچھ ایسی کارروائی شروع کر دی
کہ مرزا صاحب نے سمجھ لیا کہ اب صلیب پر چڑھا دیا گیا ہے۔
کیونکہ مرزا صاحب کے ہاتھ اور پاؤں وغیرہ بالکل کس دئے گئے تھے
اب صرف ہاتھ پیروں میں کیلیں ٹھونکنا باقی تھا۔ جس کے انتظار
میں مرزا صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ لیکن جب کوئی کیل نہیں ٹھونکی
گئی تو شکر بجا لایا۔ البتہ صلیب پر سے اتارنے کے بعد ایک
ننھی سی ہتھوڑی سے مرزا صاحب کی کہنی کو ٹھونک بجا کر دیکھا گیا
آخر میں ریڈیالوجسٹ نے رپورٹ لکھ دی۔

HEART NOT PRESENT IN THE BODY

یعنی جسم میں دل موجود نہیں ہے۔" رپورٹ لیکر جب وارڈ بوائے
دل کے ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو وہ حیران رہ گیا لیکن چونکہ ساڑھے
دس بج چکے تھے۔ ڈاکٹر کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا تھا اس نے
چٹھی پر لکھ دیا "PLEASE ADMIT" اور چلا گیا۔
ڈاکٹر صاحب کو شریک دواخانہ کر لیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد
نرس ایک سوئی اور پچکاری کے ذریعہ مرزا صاحب کا خون
معائنہ کرنے کی غرض سے لینا چاہا۔ پہلے تو (VEIN) وہ
رگ مشکل سے ملی جس میں خون دوڑتا ہے اور جب رگ ملی تو نرس
نے خون کھینچنا چاہا۔ لیکن خون کا ایک قطرہ بھی SYRINGE
یعنی پچکاری میں نہیں آیا۔ نرس حیران رہ گئی اور مرزا صاحب کو
سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ مرزا صاحب نے سوال کو بھانپ لیا
اور فرمایا ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مرزا صاحب رات بھر دواخانے میں رہے۔ صبح میں نرس نے خون
کے بارے میں بڑے ڈاکٹر کو رپورٹ دی جو صبح سویرے وارڈ کے
مریضوں کو دیکھنے آیا تھا کہ مریض کے جسم میں ہی خون ہی نہیں ہے۔
ڈاکٹر نے دل کے بارے میں رپورٹ پڑھی اور پھر خون کا حال بھی
معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کوئی معائنہ کئے بغیر لکھ دیا کہ مریض
تندرست ہے۔ باقی باتوں سے فی الحال کوئی بحث نہیں چنانچہ
مریض کو فوراً خارج کر دیا جائے۔ مرزا صاحب کو جب بتلایا گیا
کہ وہ تندرست ہیں اور انھیں کوئی بیماری نہیں ہے تو مرزا صاحب نے شعر
فرمایا ؎

ڈاکٹر کو یہ مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم سمجھاتے ہیں کہتے ہیں کہ حال اچھا ہے

اور فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کل سے اجابتوں نے نڈھال کر دیا ہے
کمزوری سے قریب المرگ ہو گیا ہوں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "
وہ تو کم ہو گئیں۔ کمزوری بھی دو ایک دن میں کم ہو جائے گی۔ آپ
گھر جا کر آرام کیجئے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔ مرزا صاحب بڑبڑانے لگے۔ کہ
عجیب ڈاکٹروں سے سابقہ پڑا ہے۔ نہ کوئی ہمارا مرض سمجھتا ہے اور
نہ ہی علاج کرتا ہے نرس نے یہ سن کر کہا "جناب یہ ڈاکٹر صاحب
اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ آپ کو
کوئی مرض نہیں ہے تو پھر آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" مرزا صاحب
نے فرمایا ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

نرس نے کچھ جواب نہ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد مرزا صاحب کو اسپتال سے
خارج کر دیا گیا۔ گھر پہنچے تو بیگم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مرزا صاحب خیر و عافیت سے
گھر واپس آ گئے۔ بیگم نے پوچھا کیا دوا تجویز ہوئی ہے تو مرزا صاحب نے فرمایا
ہمارے تمام امراض کی صرف ایک ہی دوا ہے۔ شراب اور گلاب کا عرق۔
بیگم نے لاحول پڑھی اور ظہر کی نماز کے لئے چلی گئیں۔

محبت

از:- راحیل بانو

یہاں آ گئے تھے۔ ابھی بمشکل چار دن ہی تو ہوئے تھے لیکن وہ جیسے پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔ کہاں اس کی وہ شوخ اور البیلی طبیعت اور کہاں یہ خاموشی... یہ ویرانی... کہنے کو اس کی خالہ کا گھر تھا... سگی نہیں تھیں تو کیا ہوا۔ امی اور اس سے کتنی بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ کتنے اصرار سے بلایا تھا۔ اور اس کی امی نے چھٹیاں شروع ہوتے ہی یہاں آنے کا پروگرام بنا ڈالا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے اسے بھی ساتھ لے آئی تھیں۔ نئی جگہ جانے اور نئے ساتھیوں سے ملنے کی جو خوشی تھی وہ تو گھٹ کر رہ گئی تھی... پہلے ہی دن اسے گھر کا ماحول بہت افسردہ سا لگا... اتنا بڑا گھر لیکن رہنے والے جیسے گنتی میں ایک کے برابر... خالو ابا کو اپنے لمبے چوڑے کاروبار سے فرصت تو ملتی نہیں کہ گھر میں زیادہ وقت گزارتے۔ اتنے دنوں میں اس نے صرف ایکبار ان کی شکل دیکھی تھی... بھاری بھرکم بڑی بڑی مونچھوں والے خالو ابا... وہ سہم کر رہ گئی تھی جب خالہ جان نے مسکرا کر اسے انکے سامنے بلایا تھا... ڈرتے ڈرتے اس نے سلام کر لیا تھا اور امی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ خالو ابا سے زیادہ اچھی تو خالہ لگی تھیں۔ سیدھی سادی پرخلوص خالہ... نہ جانے کیوں ہر پل دکھی دکھی سی لگتیں... ہنستے وقت وہ انھیں بڑے غور سے دیکھتی... دل کو چیر دینے والی وہ ہنسی... کتنی حسرت زدہ ہوتی تھی... اسے لگتا جیسے کہ گویا تمام ہی غم بکھرے ہوں۔ خالہ کو کون سا دکھ نہ تھا۔ خالو کی لاپرواہی اور سرد مہری۔ ہاں اس سے بھی بڑا ایک دکھ تھا جو انھیں کھائے جا رہا تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی کوثر کا غم۔ جو اپاہج تھی۔ فالج کی ماری کوثر... جو پلنگ پہ لیٹے لیٹے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ہر ایک کو تکا کرتی۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کتنی کتنی آرزوؤں کے سائے لہرایا کرتے... اس سے آنکھیں چار کرتے ہوئے وحشت کی جھرجھری سی آ جاتی۔ وہ مجبور بیچاری سی آنکھیں۔ راحت ہر ممکن کوشش کرتی کہ اسکے پاس بیٹھ کر اس کی دلداری کرے۔ دنیا بھر کی باتیں سنائے لیکن ان آنکھوں سے وہ وحشت زدہ سی ہو جاتی...

...... گھر کا ایک اور اہم فرد تھا... شہباز اونچا قد۔ فربہ بدن۔ گھنگریالے بال جو گردن کا کافی حصہ ڈھکے رہتے۔ چہرے پر شباب بھی بچپنے کی معصومیت جھلکتی... لیکن کوثر کی طرح ہی ویسی ہی پراسرار آنکھیں۔ وہ حتی الامکان اس سے کترانے کی کوشش کرتا... اگر سامنا بھی ہو جاتا۔ تو وہ ایک شان بے اعتنائی سے ایک نگاہ غلط ڈال کر گزر جاتا اور کبھی کبھی تو نظر ڈالنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کے نظرانداز کر دینے کا یہ انداز کبھی کبھی اسے جھنجھلا دیتا لیکن پھر وہ خدا کا شکر بجا لاتی کہ اچھا ہوا اس نے نہیں دیکھا ورنہ جہاں اس کی وہ پراسرار آنکھیں اس کی طرف اٹھیں وہ وہیں سہم کر رہ جاتی۔ بڑی دیر تک اس کا ننھا سا دل دھڑکا کرتا... وہ کسی سے کیا کہتی۔ اپنا دکھڑا وہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی بوکھلا کر امی سے واپس چلنے کی ضد کرنے لگتی تو امی چپکے سے اسے سمجھاتیں اور ٹھیک سے رہنے کی تلقین کرتیں۔ وہ ان نصیحتوں سے اور جھنجھلا اٹھتی اور پھر رات گئے گھر کے تمام مکینوں کے بارے میں سوچتے سوچتے سو جاتی... ---- پھر صبح نمودار ہوتی اور دن حسب معمول گزر جاتا۔ اس کو ہر گھڑی خالہ سے باتیں کرنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر وہ بھی ان کے قریب جا بیٹھتی پھر اکتا کر کوثر کے پاس چلی آتی۔ یونہی میٹھی طرح طرح کی باتیں کئے جاتی۔ اس کی فرمائش پر کبھی افسانے پڑھ کر سناتی کبھی کوئی غزل گنگناتی۔ اور پھر جب کوثر تھک کر سو جاتی تو اسے سناٹے اتنے بڑے مکان میں کسی بے قرار روح کی طرح ٹکریں مارنے کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا... اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اوب جاتی تو یہاں سے وہاں... وہاں سے یہاں۔ سارے مکان میں گھوما کرتی... اور اگر اتفاق سے شہباز کا سامنا ہو جاتا تو باقی دن اس کا موڈ بھی خراب ہو جاتا... نہ جانے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے مجھے وہ رو کر سوچتی اور سب پر چڑ جاتی... تنگ آکر اس نے گھر کے مختلف کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی... کبھی خالہ کا ہاتھ

گذرے لمحے یاد آتے۔ پہلے اسے اس گھر سے جانے کی کتنی جلدی مچی ہوئی تھی اور اب گھر چھوڑنے کا غم ہو رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار یہاں سے وہاں ... کبھی مکان میں کبھی باغ میں یونہی بے مقصد گھوم رہی تھی ... امی سامان درست کرنے میں لگی تھیں وہ کھوئی کھوئی سی کھلی ہوئی الماری کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی ... نہ جانے کتنی دیر وہ وہاں بیٹھی رہی کہ اچانک وہ چونک پڑی کوئی چیز اس کے پیروں کے قریب آ گری تھی۔ نیلے رنگ کی ایک ڈائری ... اس نے جھک کر اسے اٹھایا۔ شہباز سامنے کھڑا تھا۔ کھویا کھویا۔ غمزدہ سرخ آنکھیں تھیں اور بال پریشان۔ ایک لمحہ ٹھہر کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اندر کی طرف مڑ گیا۔ وہ ہکا بکا بیٹھی کبھی ڈائری کو دیکھتی کبھی اس طرف جدھر شہباز گیا تھا۔ بڑی ہمت کر کے اس نے ڈائری کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا پسینے میں ڈوبی ہوئی وہ ورق پہ ورق پلٹتی گئی۔ اس کی آنکھیں کبھی حیرت سے پھیل جاتیں کبھی بے طرح برسنے لگتیں ..... وہ سارے اسرار جو اس کے لئے طلسم تھے ... جو شہباز کے رویہ میں تھے سب ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔ سارے احساسات سمٹ کر صرف ایک نام بن گئے ... مینا آپا۔ بڑی محبت۔ بہت احترام اور عزت سے یہ نام اس کے ہونٹوں پہ مچل اٹھا ... اس نام سے ... اس ہستی سے وہ آج واقف ہوئی تھی۔ جو آج بھی۔ مر کر بھی شہباز کی روح میں بسی ہوئی تھی .... مینا آپا۔ شہباز کے جگری دوست کی بڑی بہن جنہوں نے شہباز کو اپنا چھوٹا بھائی بنایا تھا جو اس پر سو جان سے نثار ہوتی تھیں اور شہباز اپنی مینا آپا کے صدقے ... ان سے تعلق رکھنے والی ایک ایک بات شہباز نے اپنی ڈائری میں نوٹ کی تھی۔ اس کی محبت اور گرمئ خلوص کی خوشبو ایک ایک لفظ سے امڈ رہی تھی ... موت کے ظالم ہاتھوں نے مینا آپا کو اس سے چھین تو لیا تھا لیکن شہباز کے دل میں ... اس کی روح میں وہ آج بھی زندہ تھیں۔ شہباز کو جس محبت کے سرچشمے کی تلاش تھی وہ اسے مینا آپا کے وجود میں مجسم مل چکا تھا۔ لیکن اچانک ہی وہ چشمہ سوکھ گیا تھا ...... اور یہ بات آج تک شہباز کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی کہ وہ جس سے بھی محبت کرتا ہے اسے زندگی راس نہیں آتی یا پھر اسے کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ کوثر پہلے ایسی نہ تھی۔ دونوں بھائی بہن کی محبت ایک مثال تھی۔ اچانک نہ جانے کیسے کوثر ٹائیفائڈ کا شکار ہو گئی اور شہباز پھر ایک دکھ کے سمندر میں ڈوب گیا۔ پھر راحت اس گھر میں آئی اور شہباز کا دل راحت آپا کہنے کے لئے مچل اٹھا لیکن وہ مجبور تھا۔ خدانخواستہ اس کی محبت ..... کہیں راحت کے لئے عذاب نہ بن جائے۔ اس لئے وہ اپنے پیار کو سرد مہری کے پردے میں چھپاتا رہا ...... راحت گو عمر میں اس سے بڑی نہ تھی لیکن تعلیم میں اس سے آگے ہی تھی۔ شہباز نے ڈائری میں بڑی عزت اور تقدیس کے ساتھ اسے راحت آپا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اپنی بدتمیزی کی اصل وجہ کا اعتراف کیا تھا۔ اور معافی کا خواستگار تھا۔ راحت کی آنکھیں فرط محبت سے بھر آئیں اس کا حساس دل تڑپ اٹھا۔ وہ ساری کدورت گویا دھلنے لگی تھی جس نے ایک عرصہ سے اس کے دل کو آلودہ کر رکھا تھا ... اسے یاد آیا کہ کئی بار کافی رات گذر جانے کے بعد بھی شہباز کے کمرے کی بتی جلتی ہی رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ادھر گذرتے ہوئے اسکے کمرے میں جھانکتی تو اسے کھویا کھویا ایک ہی زاویہ میں دیر تک بیٹھا دیکھتی۔ کتابیں سامنے کھلی ہوتیں۔ لیکن وہ ہاتھوں میں ٹھوڑی ٹکائے نہ جانے دیواروں میں کیا تلاش کرتا ہوتا۔ اس عالم بے خودی کی وجہ وہ آج سمجھ پائی تھی۔ وہ ڈائری ہاتھ میں لئے شہباز کے کمرے تک چلی آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا ... شہباز دیوان کے قریب کھڑا بڑی محویت کے عالم میں کسی تصویر کو تک رہا تھا۔ اسے راحت کے داخل ہونے کی کچھ خبر نہ ہوئی ..... راحت نے قریب پہنچ کر دیکھا۔ ایک خوبصورت سی لڑکی کی تصویر تھی۔ بائیس تئیس برس کی عمر — محبت بھری آنکھیں معصوم سا چہرہ۔ شاید یہی تھیں مینا آپا ... راحت کا سر احترام سے جھک گیا۔ اس نے دھیرے سے شہباز کو مخاطب کیا ... بھیا۔ شہباز تیزی سے پلٹا اور اسے اپنے سامنے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ندامت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ راحت نے پہلی بار اسے بغور دیکھا۔ وہ خوبصورت سی شبیہ۔ گہری آنکھیں آنسوؤں سے پر تھیں — بڑی ہمت کر کے اس نے ڈائری اس کی جانب بڑھائی اور بولی — بھیا —

(صفحہ ۴۴ [illegible])

سے محبت تھی۔ جس نے اپنی اَنے ایسی ڈالی کہ مجھے ان سے جدا کر دیا۔ جیسے ہم زندہ جدا ہونے کے بجائے مر کے جدا ہو جائیں۔ میں نے تمہاری ممی کے ساتھ ایسی کون سی برائی کی تھی۔ جان چھڑکتی تھی ان پر۔ اس کا بدلہ یہ دیا:

ترنم کو اب ثمر اور تابش سے نفرت تھی۔ ان کی برائی اسے بری نہیں لگی۔ بلکہ وہ سوچنے لگی کس طرح حقارت اور نفرت سے تابش نے اسے اپنے پاس سے بھگا دیا تھا۔ صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ کوئی بات اسکی امانت کی اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اور وہ۔ خود۔ ہمیشہ تابش کی محبت کا دم بھرتی رہی تھی۔ اسکی ہر ممکن مدد سے پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ اس نے خود بھی تو اس سے عہد و پیمان کیے تھے۔ کیا وہ سب کچھ بھول گیا تھا یا جان بوجھ کر اس سے اتنی بے پناہ نفرت کی تھی۔ سب ہی سے تو خندہ پیشانی سے ملتا تھا۔ صرف اسی سے بیعاشی اور نفرت کی وجہ کیا تھی؟!!"

فرحت نے چائے بنائی اور سموسے وغیرہ سے اس کے آگے رکھ دی۔

لیکن جو شعلے ترنم کے دل میں ناچ رہے تھے۔ ان کا شور اتنا شدید تھا کہ ترنم کے اپنے شعور کی آواز ان میں دب کر رہ گئی تھی!۔

وہ اس جابر عورت کی مکمل مثال بن چکی تھی جس کا انتقام تباہ کن ہوتا ہے!۔

خرم۔۔ میرے ساتھ باہر چلو گے! اس نے پوچھا

باہر!؟ فرحت آنکھیں نکال کر بڑبڑائیں۔

وہ چلو: خرم تو جو اس تھا اٹھ کھڑا ہوا: آج تمہیں مجھ پر ترس آیا ہے۔ میں تو سوچتا ہی رہتا ہوں۔ کبھی نہ کبھی تمہارا دل ضرور پگھلے گا۔ آخر خدا نے میری سن لی۔ چلو کہاں جانا چاہتی ہو!؟

بکواس مت کرو۔ بس چلو!:

چائے یونہی دھری کی دھری رہ گئی! فرحت حیرت سے گنگ بیٹھی رہ گئیں!۔ ترنم زبردستی خرم کو

بھیجا ہے۔۔ اب وہ خرم سے شادی کرنے میں پل بھر کی بھی تاخیر نہیں چاہتی۔

زندہ دفن کر دوں گی۔ ترنم کو۔ وہ ہے کہاں:: ناجرہ کا خون کھولنے لگا!

ہمارا زمانہ تھا زمانہ گیا۔ ناجرہ:: فرحت نے کہا: اب اگر تم نئی روشنی کے پڑھے لکھے لڑکی کو اپنی مرضی سے باندھ کر رکھنا چاہو گی تو وہ بغاوت کر دیں گے۔ میں ترنم کو نہیں کہتی مگر وہ بھی اسی زمانے کی ہے۔ اپنے انتخاب کا اسے حق ہے۔ تم اسی صورت میں خوش رہو گی۔ جب اسے اسکی مرضی پر چھوڑ دو!۔"

میرا دماغ خراب نہ کرو۔ فرحت۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ اسکے باپ آئیں تو تم یہ تقریر ان کے سامنے کرنا"۔

کہاں ہیں ساجد بھائی۔

ہسپتال گئے ہیں۔!

کیوں۔ تابش تو اچھے ہیں۔؟

خدا کرے کہ اچھے ہوں۔ ابھی تک وہ نہیں آئے۔

تو میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔ شام تک خرم کا ارادہ تھا کہ منگنی کی رسم لیکر آئے گا۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں ساجد بھائی سے بھی پوچھ لوں!:

ان کے ہاتھوں ترنم کی موت لکھی ہے!: ناجرہ نے دانت پیس کر کہا اور ان کی طرف سے پیٹھ پھیر لی۔ فرحت نے بالکل برا نہیں مانا۔ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھیں۔ بہت کم فراخدل فاتح ایسے ہوتے ہیں۔ جو مفتوح کے حال زار پر ہنسنے لگا تھیں!۔

ترنم اپنے کمرے میں تھی۔ اس کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ وہ والدین کے سامنے نکلے۔ بہت بڑی جسارت کر گزری تھی!۔ نہ وہ باہر نکلی نہ ناشتہ کیا!۔ چھپی بیٹھی رہی نہ ساجد صاحب نے اسے یاد کیا نہ ناجرہ نے ناشتے پر بلایا۔

اب فرحت کی زبانی پیار و سلام کی بات سن کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے

اپنے ساتھ لے کے چلی گئی!۔

راستے میں وہ پھر خشک اور بے مروت بن گئی۔ لیکن خرم پر خوشی کے مارے بخار سوار تھا۔ بے تکان بول رہا تھا۔!

وہ اس وقت حواسوں میں آیا۔ جب خود کو تابش کے وارڈ کے سامنے کھڑا دیکھا۔

"مگر کیوں۔ یہاں کیوں؟" وہ بوکھلایا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں۔ وہ یہیں رہتا ہے!"

"تو اس سے کیا۔"

"ہم اس سے ملیں گے۔ اور تم اس سے باتوں باتوں میں کہنا کہ۔ بہت جلد ہماری منگنی ہونے والی ہے۔"

"کیا۔ کیا مطلب؟" خرم اچھل پڑا۔

"میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ کیا تمہیں منظور نہیں۔"

"شادی مرگ ہو جاؤں گا۔ ترنم۔ ایسا بھونڈا مذاق نہ کرو۔"

"خدا غارت کرے۔ جو میری بات کو مذاق سمجھے۔"

"لیکن تم اسکے سامنے یہ کیوں کہلوانا چاہتی ہو!"

"تمہیں میرا فیصلہ پسند نہیں ہے؟"

"واہ۔ میں نے ہرگز نہیں کہا۔"

"تو پھر کیوں دم نکلا جاتا ہے۔"

"لیکن وہ بیمار ہے ترنم۔"

"یا تو اچھا ہو جائے گا۔ یا مر جائے گا۔!"

خرم دم بخود اسے تکتا رہا!۔

ترنم نے پردہ سرکایا۔ پلنگ پر پاؤں لٹکائے۔ تابش بیٹھا نظر آیا۔ اسکے پاس شمسہ بیگم

رات کی سیاہی دھیرے دھیرے گہری ہوتی گئی۔ ان کی امیدوں کی طرح۔!

صبح کو دن کے دس بج گئے!۔

دھوپ پھیکی پھیکی دیواروں پر چھا گئی تھی۔ عجیب سی اداسی فضا میں گھلی ملی تھی!۔

ماجدہ بیگم اور شمسہ بیگم دل سے ناشتہ کر کے باہر نکلیں اور دھوپ کے رخ بیٹھ کر سبزی بنانے لگیں۔ شمسہ گم صم تھیں۔ ماجدہ کے دل میں دہیم ورجا کے گھونسے دوڑ رہے تھے۔ یقیناً کوئی بات ہے اور بری بات ہو۔ تبھی تو اب تک ساجد صاحب واپس نہیں آئے!۔ مگر انھوں نے کوئی بات شمسہ سے نہیں کی!۔

خانم لوگوں نے فرحت کی آمد کی خبر سنائی۔

شمسہ بیگم پتہ نہیں کن دنیاؤں میں گم تھیں۔ ساکت صامت۔ دم بخود۔ ماجدہ نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"آئی ہیں تو آ جائیں۔ کیا وہ پوچھ پوچھ کے آیا کرتی ہیں۔!"

"اے سبحان۔ تکلف تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" فرحت کھلکھلاتی ہوئی اندر آئیں۔ ماجدہ کے لپٹ گئیں۔ "بھیا پا رخصت ہوا۔ اب تو لڑائی کا رشتہ ہو گیا ہے!۔"

"مجھے اس وقت مذاق اچھا نہیں لگ رہا۔ فرحت۔" وہ سرد لہجے میں بولیں۔ "مذاق مجھے بھی پسند نہیں۔" فرحت شال اتار کر تخت پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

"تو پھر یہ کیا بکواس ہے۔؟"

"بھابی۔ یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں۔ پوچھ لو ترنم سے۔ وہ کل بھی ہمارے پاس آئی تھی۔ شام کو بھی۔ اسی نے خرم سے ضد کر کے مجھے سویرے یہاں

ہوں۔ کیا ہے۔!

کیا تم اپنی امی کو اس بات پر آمادہ کر سکتے ہو کہ۔ وہ جلد از جلد ہماری شادی کر دیں؟

حیرتوں کے بم پھینک رہی ہو مجھ پر۔ ترنم۔ کیا بات ہے؟ یا تو تمہیں مجھ سے اتنی نفرت تھی کہ تم چڑ جاتی تھیں حد ہے!"

"ہزار بار کہہ چکے ہو۔ یہ ایک جملہ... تم میری بات کا جواب دو:

یہ تو میری دلی خواہش ہے۔ ترنم۔ امی کی بھی پرانی آرزو ہے مگر تمہارے والدین ہماری خواہش ہمیشہ ٹھکراتے رہے تھے۔!

"تم گھر جا کر فرحت آنٹی کو ہمارے پاس بھیجو اور تاکید کر دو کہ وہ ممی اور ڈیڈی سے منظوری لے کر ہی اٹھیں:

کوئی بات ضرور ہے۔ ترنم۔ تم بہت پُراسرار ہو۔۔!"

ٹھیک ہے۔ فرحت آنٹی کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔ اچھا خدا حافظ:

وہ ایک موڑ پر یک لخت اس سے الگ ہو گئی!۔

شاہد گھر میں واپس آیا۔ متفکر نظر آ رہا تھا۔

بیٹے میری کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ اچانک دونوں آئے کیوں اور چلے کیسے گئے!:

شمسہ بیگم نے پوچھا۔

دونوں بہت پریشان تھے۔ خالہ اماں: شاہد ہونٹ چباتا ہوا بولا: یا پھر انہیں خوشی نے ان کے دماغ الٹ دیے ہیں!"

کون سی ایسی خوشی ہے۔ شاہد۔ کیا خرم نے کچھ نہیں کہا تم سے؟ میں تو سمجھتی تھی کہ ترنم کو بدولت اہتمام کرنے کا ہی چاہتا ہے۔ شاہد نے کہا: وہ خرم سے شادی کرنے جا رہی ہے:

کیا!؟ شمسہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

جی ہاں! شاہد یہی خبر سنانے آئے تھے دونوں: شاہد تابش کے دل و دماغ کے پرخچے

لیکن شاہد کے دل کے غاروں میں قطرہ قطرہ آنسو ٹپک رہے تھے اور [illegible] تاریکیوں کا راج تھا

جب وہ ساجد صاحب کے گھر پہنچا!۔

وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ فرصت ہی کہاں تھی غیر ضروری آمد سے ان سب کے [illegible]۔

ساجد صاحب اپنی خوابگاہ میں تھے۔

شمسہ بیگم کو ہاجرہ اپنے پاس لے آئی تھیں۔ شمسہ بیگم کے دل میں تابش کی بیماری سے پہلے کے شکوے تو ترنم کی بیجا جسارت اور خرم کی تبدیلی قسمت پر کہاں غور کرتیں۔ بے جان جسم کی مانند ہاجرہ بیگم کے ساتھ چلی آئی تھیں۔ ہاجرہ کو اپنی بیٹی کی نالائقی اور دیدہ دلیری کی ان سے معذرت بھی کرنی تھی!۔ دونوں کے دلوں میں لاوے پک رہے تھے لیکن وہ چپکے چپکے آپس میں باتیں کئے جا رہی تھیں۔

ترنم اپنے کمرے میں تھی اور بہت سراسیمہ تھی کہ ان کی باتوں کا رخ کہیں شمسہ پر جا رہے اس کی سن گن لے چکی تھی۔ مگر ابھی تک کچھ بھی نہ سن سکی تھی!۔

شمسہ بیگم کو دھیان نہیں تھا ایسے موقع پر شادی بیاہ کا تذکرہ نکالا کر بیٹھیں اور ہاجرہ جان بوجھ کر گریز کر رہی تھیں!۔ اتنے میں نیم تاریک برآمدے میں ساجد صاحب کا بھاری بھرکم ہیولا دکھائی دیا۔

ہاجرہ: کھنکھار کر بوجھل آواز میں اضطراب سے کہا: شمسہ کو ان کے گھر جانے نہ دینا۔ میں ذرا ہسپتال کا ایک چکر لگا کر ابھی آتا ہوں۔

خیریت تو ہے۔ ساجد بھائی: شمسہ بیگم بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئیں: شاہد یہاں کیوں آئے تھے

دواؤں کے بل کے سلسلے میں بات کرنی ہے: ساجد صاحب نے فی البدیہہ بہانہ بنا دیا: جو ڈاکٹر صاحب اب تک علاج کر رہے تھے وہ دوسرے شہر منتقل ہو کر جا رہے ہیں۔ بعض اوقات جانا پڑتا ہے:

اچھا اچھا: شمسہ بیگم نے اطمینان کی سانس لی اور دل تھام لیا: میں بتانے کیا کچھ تھی

اڑاتا ہوا بولا: یہاں بہت سے لوگوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ بوکھلا کر دفعان ہو گئے۔ میں پہلے
سمجھتا تھا کہ خرم بہت اچھا لڑکا ہے۔ لیکن وہ کم بخت اتنا احمق ہے کہ اپنے سلوک کا اپنے
منھ سے اظہار کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسی لیے اس سے دوستی ختم کر دی۔

خیر اللہ مبارک کرے: شمسہ بیگم نے آہ بھر کر رنجیدہ لہجے میں کہا: میں کیا سوچ بیٹھی تھی
خدا نے کیا کیا۔ اسکی مرضی سب کی مرضی۔ مگر مجھے ماجرہ کی بے حسی اور ساجد بھائی کی بے مروتی
پر بہت افسوس ہوا ہے۔ وہ تو جانتے ہیں۔ میرا تابی ہسپتال میں پڑا ہے۔ میں ان
کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی بیٹی کی منگنی کر رہے ہیں۔۔ انھیں خرم سے
اچھا لڑکا نہ مل سکا! مجھے اسکے گن بالکل پسند نہیں:

ہیں کیا: شاہد نے منھ بنا کر کہا: آپ سر پکڑ کر رو دیں گی۔ خرم بیٹھے پیچھے ہزاروں
برائیاں کرتا تھا۔ ترنم کی منھ پھٹ ہے۔ گستاخ ہے۔ مغرور ہے۔ اور ترنم صاحبہ انھیں
کو انھیں خرم کا نام سننا پسند نہیں تھا۔ پھر اب یہ کیا ہوا ہے؟ سب کا سب اللہ کی مرضی پر چھوڑ دو۔

میں فرحت کی کیا غیبت کروں: شمسہ بیگم اپنی رو میں بولیں۔ انھیں تو ماجرہ پسند تھیں نہ
ایک آنکھ ترنم اچھی لگتی تھی۔ اللہ کے آگے توبہ ہے۔ سینکڑوں برائیاں فرحت نے ساجد بھائی
اور ماجرہ کی مجھ سے کی تھیں۔ کوئی بات اٹھا نہیں رکھی تھی! میں نے نہ تو ماجرہ سے کچھ کہا نہ
ساجد بھائی سے۔ کیوں خوامخواہ دل برے ہوتے۔ لڑائیاں ہوتیں۔ دونوں سہیلیاں شاید
پھر ایک ہو جائیں برسوں میں بھی نہیں۔

ارے کیا ساجد صاحب کو بھی خیال نہیں کہ تابش کو تو کم از کم گھر آ لینے دیتے! شاید بڑا
آدمی کے حلقہ تک کون پہنچا ہے: شمسہ بیگم نے سر تھام لیا: منھ پر وہ ہمارا دم بھرتے تھے
اور شاید دل میں سوچتے تھے کہ کوئی ناگہانی آفت آئے کہ ہم درمیان سے ہٹ جائیں تو وہ
اپنی بیٹی کی منگنی کر جائیں۔ ارے۔ کیا میں ان کے ہاتھ پکڑ لیتی۔ ان کی بھاگیر مار لیتی۔ ہماری
دوستی تو آٹھ سال پرانی ہے۔ اسے بھی ان میاں بیوی نے اگر کھٹے پر مارا۔ خدا کا غضب

گی۔ وہ مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ شاہد۔ اس سے کہہ دو۔ مجھ سے بدلہ لینے کی خاطر۔ وہ اپنے
آپکو جھکا۔ جلیبی کی طرح بند کرے۔ خرم سے اسے نفرت تھی۔ شاہد۔ میں تو۔ میں تو جا ہی رہا
ہوں۔ وہ اپنے لیے کسی اچھے ساتھی کو تلاش کر لے۔ شاہد۔ کہہ دو۔ اس سے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں
دیر ہو جائے:

ترنم کے سلسلے میں کہہ رہے ہو تابش: پاگل ہو کر شاہد نے پوچھا۔
ہاں: اسکی حلق میں ہوا سائیں سائیں کرنے لگی۔

اسکا نام مت لو۔ وہ بے وفا نکلی: شاہد غصہ سے بلا سوچا: تم خاندانی محبت میں آ جایا کرتے
کرتے کرتے اس انجام کو پہنچ چکے ہو۔ وہ خود غرض بے وفا لڑکی شادی رچا رہی ہے۔ ستانے آئی
تھی تمہیں۔ ظالم سنگدل مخلوق۔ اسے ذرا دھیان نہیں آیا۔ تم بیمار رہو۔ اس کا تصور اپنے دل میں
چھپائے رکھا تھا۔ کیا وہ ایسی ہی بے حس ہے!:

لیکن تابش نے پھر کچھ نہیں کہا۔

اتنے میں پھر ڈیوٹی ڈاکٹر اپنے کسی ساتھی کو لے کر کمرے میں آیا۔ دونوں نے مل کر اسے دیکھا
بھالا اور آپس میں انگریزی میں گفتگو کرنے لگے کہ شاہد کے پلے ایک بات نہیں پڑی۔ مگر
جب وہ جانے لگے تب اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

اب کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟۔
شاک۔ یکبارگی دماغ نے اپنا فعل کرنا بند کر دیا ہے۔
کیا؟: شاہد سناٹے میں رہ گیا۔
دماغی فالج۔ ان کے پاس کون کون تھا؟۔؟

بے وفا مکار لڑکی۔ میں تجھ سے بدلہ لیے بغیر نہیں رہوں گا!: شاہد نے سوچا اور اسکی
مٹھیاں کس گئیں۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ زمین پر بکھرا آسمان چمک رہا تھا۔ زمین کا تاریک حصہ شفق سے ملی دھندلی روشنی میں ڈوبا تھا

آنکھوں سے ایک ایک کو گھورتے اور دانت پیستے ہوئے بولے: "وہ تو اچھا ہو رہا تھا۔ اس کے گھر آنے میں تھوڑی ہی سی دیر تھی۔ وہ یکایک کیسے ختم ہو گیا۔ ہاجرہ تم بتاؤ۔ خرحت زبان کھولو۔ خدا کی قسم۔ میں کسی کو معاف نہیں کروں گا:"

ترنم کاغذی تصویر کی طرح دروازے میں نظر آئی۔

شاہد نے شمسہ بیگم کو تخت پر لٹا دیا۔ پھر قہر بھری نظروں سے ترنم کو گھورنے لگا۔ اس کے بعد دفعتاً اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"یہ ہے وہ مخلص اور وفا شعار ہستی! جس نے بچپن سے لے کر اب تک قدم قدم پر اسے سہارا دیا تھا۔ جینے کا حوصلہ سکھایا تھا۔ اور یکایک جس نے اسے موت کی چٹانوں پر پھینک کر اس کا وجود پاش پاش کر دیا۔ ہاں انکل۔ یہی وہ نرم دل مہربان ساتھی تھی اس بدنصیب کی ساسی نے اس بدقسمت کو مژدہ سنایا تھا کہ وہ۔ خرم سے شادی کر رہی ہے! وہ ناشاد نامراد اس کے لب و لہجہ کی تاب نہ لا سکا۔ تبھی اس کی زبان بند ہو گئی مگر اپنی بند ہوتی ہوئی زبان سے وہ اعتراف کر رہا تھا کہ۔ اپنی نفرت کا اظہار اس نے اپنی بیماری کی وجہ سے کیا تھا۔"

شاہد آواز سے رونے لگا۔

اسے دکھ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ترنم سے وابستہ ہو کر اس کی زندگی کی بربادی کا باعث بنے۔ ترنم کو اس سے جذباتی انسیت تھی۔ وہ اس کا قرب تلاش کرتی تھی۔ تابش کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حضرت رساں سانسیں ترنم کی سانسوں سے مل سکیں۔ اسی لیے جراثیم ترنم تک پہنچیں۔ بس۔ وہ بے چارہ اپنی جان پر اپنی محبت پر قربان ہو گیا۔ حسرت ترنم کی بہتری کی خاطر۔ کاش اسے احساس ہوتا۔ کاش ترنم اس کا کھوکھلا لہجہ بھی اس کی [illegible] تم ہی ہو۔ ترنم: مٹھیاں کس کر اور دانت پر دانت

جکڑ کر ساجد صاحب بولے: "خدا گواہ ہے کہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا اگر تم میری بیٹی ہو تو میں نے اس کو بھی اپنا بیٹا کہا تھا۔"

ترنم بید مجنوں کی طرح کانپتی ہوئی اپنے بوجھل وجود کو گھسیٹتی ہوئی شاہد کے پاس آئی اور اپنی کھوکھلی آواز میں بولی۔

"بھیا۔ اب وہ کیسے ہیں؟"

"ان کی لاش آ رہی ہے!" شاہد نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

"لاش آ رہی ہے؟" ترنم نے دہرایا۔ بالکل غیر جذباتی لہجے میں۔

"ایسا نہ کہو شاہد!" ہاجرہ نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"ہونی ہو کر رہی۔ ہاجرہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بیٹے کی نعش پر نظر پڑے گی اور شمسہ بھی ختم ہو جائیں گی!" ساجد صاحب بولے۔

اتنے میں ایمبولنس کا ہارن گونجا۔

دفعتاً ترنم چہک کر بولی: "جھوٹے کہیں کے۔ ارے وہ تو آ گئے۔ ان کے دشمنوں کی لاش آئے۔ شونہیں تو کیا وہ مجھ سے خفا ہو سکتے ہیں؟"

اور تیر کی طرح دوڑ کر پھاٹک کھول دیا۔

قدرت کا کرشمہ بھی عجیب ہے۔

شمسہ بیگم نے بیٹے کی آخری رسوم دیکھیں۔ مگر ان کا دل نہیں رکا۔ عمر بھر کا صدمہ جھیلنے کو وہ زندہ رہیں۔ بیماروں سے بدتر۔ وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئیں لیکن ترنم پر احساس ندامت۔ پشیمانی، پچھتاوے اور تابش کی ناگہانی موت نے ایسا زبردست اور دیرپا اثر چھوڑا تھا کہ وہ یکبارگی سکتے میں رہ گئی۔ ایک آنسو بھی اس کی خشک آنکھوں کو تر نہ کر سکا۔

وہ مبہوت ہو گئی۔

تبصرات

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا چاہئیں)

دل گزیدہ | مسیح انجم صاحب کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ سائز [illegible] صفحات ۱۳۲۔ مجلد مع گرد پوش۔ کتابت و طباعت بہت ہی اعلیٰ نہ معمولی۔ قیمت چھ روپیہ۔ ناشر زندہ دلان حیدرآباد ۲۰- مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد۔

۱۴ مزاحیہ مضامین اور تین تعارفی مضامین کا یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ وہ لوگ بھی اسے ضرور پڑھیں جو محرم میں پیدا ہوئے ہوں اور ہنسنا یا تو اچھا نہ سمجھتے ہوں یا انھیں ہنسی نہ آتی ہو۔ اور جو لوگ ہنسنے اور مسکرانے کے عادی ہیں ان کے لئے تو یہ مجموعہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہر مضمون نہایت دلچسپ ہے۔ میں خود انھیں کے متعدد مضامین پہلے ہی شگوفہ میں پڑھ چکا تھا۔

مسیح انجم کے مضامین سلیس اور سیدھی سادی زبان میں ہوتے ہیں اور وہ واقعات ایسے زیر بحث لائے جاتے ہیں جو ہماری زندگی میں برابر پیش آتے رہتے ہیں۔ کتاب کا پہلا ہی مضمون "مشترکہ مکان" اتنا دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسے کرایہ دار کی کہانی ہے جو مالک مکان ہی کے ساتھ ایک حصہ میں رہتا ہے۔ مالک مکان کے اعتراضات اور قواعد و ضوابط پڑھ کر شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ہنسی پر قابو رکھ سکے۔

اس دور میں جبکہ کاتب اور پریس کی سخت دشواریاں ہیں ایسی کتاب چھپ جانا بھی غنیمت ہے۔ بائنڈنگ والے البتہ یہ سوچ کر جلدیں نہیں بنائیں کہ اس کا نام بھی کتاب میں چھپا ہے۔

جو نہ کرنا تھا | ناول از برق آشیانوی۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت -/6 ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ۔

مصنف کا نام پڑھ کر یہ سمجھا جائے گا کہ یہ ناول قہقہہ ساماں ہوگا اس لئے کہ برق آشیانوی اپنے مزاحیہ مضامین اور اپنی مزاحیہ شاعری کے باعث طنز و مزاح کی دنیا میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ ناول سنجیدہ ہے۔ اس میں ہنسنے ہنسانے کی کوئی بات ہی نہیں ہے اور یہ برق صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج و طبع کے خلاف ناول لکھ کر ایسا پاکیزہ اور معاشرتی ناول لکھ دیا۔

"جو نہ کرنا تھا" کی کہانی نہایت سبق آموز اور جذبات سے بھرپور ہے۔ اس میں پاکیزہ محبت کی ایک ایسی دلچسپ روداد پیش کی گئی ہے جو انجام تک ایک عجیب تجسس قائم رکھتی ہے اور قاری یہ نہیں سمجھ پاتا کہ ہیروئن اپنے تئیں کس کے سپرد کرے گی۔

آج کل جو ناول لکھے جاتے ہیں ان میں کے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں عشق و محبت کو اتنا گمراہ کن پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے پڑھنے سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ "جو نہ کرنا تھا" ابتدا سے انتہا تک ایک رومانی ناول ہے لیکن اس کا رومان اخلاق کو بگاڑنے کے بجائے سنوارنے والا ہے۔ محبت کرنے والوں کا جذبۂ ایثار قابل ستائش نظر آتا ہے۔

ناول ہر گھر میں بلا تکلف پڑھا جا سکتا ہے۔

مرد و زن کا رشتہ

ایک دن بولیں پیمبر سے بتول
مرد و زن میں کیا ہے نسبت اے رسول
تب کہا سلطانِ دیں نے یہ سخن
مرد ہے چوں جان و زن ہے چوں بدن
زن ہو طالع مرد کے ہر آن پر
تن ہو جیسے جان کے فرمان پر
تن رضا میں جان کی ہے جس طرح
ہو رضا میں مرد کی، زن اس طرح
جس طرح سے جان کا حق تن پہ ہے
اس طرح بس مرد کا حق زن پہ ہے
جان سے تن کو ہے عزت آبرو
مرد سے زن کو ہے عزت آبرو
جان جانے سے بدن بیکار ہے
مرد کے مرنے سے زن بیکار ہے
چاہیے خوش دل رہیں یوں مرد و زن
جس طرح مل کر ہیں رہتے جان و تن

مرسلہ: سعیدہ خانم (پٹنہ)

مرحومہ بڑی ہی خلیق، ملنسار تھیں۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل دے۔

• کاظمہ الیاس (کولار) نہایت افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری پیاری خالہ مرحومہ بانو (اہلیہ سلیمان ذکریا سیٹھ۔ مدراس) چند دن کی علالت کے بعد ۱۲ اگست ۱۹۷۶ء بروز جمعہ انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ میرے فرزند مسعود سلمہ کے ولیمہ میں شرکت کے لئے کولار تشریف لائی تھیں مگر موت نے شرکت کی مہلت نہ دی۔ بڑی نیک اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ حوا کی بیٹیں دعائے مغفرت کریں۔

بقیہ پسندیدہ اشعار بسلسلہ صفحہ ۳۱

فقط اس آسرے پر رات کاٹی شمع نے رو کر
کہ شاید صبح تک زندہ مرا پروانہ ہو جائے

مرسلہ: مس نیلوفر گورے (بدا پور)

کام لیتا ضبط سے کیوں خاک جل کر ہو گیا
ہیچ ہے میری نظر میں عشق پروانہ ابھی

مرسلہ: مس بدر شاہین (آگرہ)

تری عالی خیالی سے ہو کس کو عشق کی جرأت
خدا کا شکر ہے، ہم شمع بے پروانہ رکھتے ہیں

مرسلہ: مہر افروز (لکھنیاں)

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

مرسلہ: شگفتہ داریا (کلکتہ)

آہ تخلص بھوپالی

قسیم جہوری

حکیم عبدالقوی صاحب ایڈیٹر صدق جدید کی زبانی یہ خبر ملی کہ ۲ اگست کو بھوپال کے مشہور طنز و مزاح نگار جناب تخلص بھوپالی حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال فرما گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم سے جن حضرات کو ملنے کا موقع ملا ہوگا۔ انھیں علم ہوگا کہ ان کی شخصیت اردو ادب کے لئے کتنی قیمتی تھی۔ مرحوم نے صد ہا مزاحیہ مضامین اور خاکے لکھے ہیں۔ پاندان والی خالہ پر تخلص صاحب کے مضامین کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے تھے اور بیحد پسند کئے گئے تھے۔ اسی طرح غفور میاں پر ان کے شائع شدہ مضامین بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسوس کہ تخلص صاحب نے ان کتب کی اشاعت خود ہی کی تھی کسی پبلشر سے معاملت نہیں کی تھی اس لئے ایک ایک اڈیشن کے بعد ہی وہ کتب نایاب ہو گئیں۔

تخلص صاحب نے بھوپال پنچ کے نام سے ایک ہفتہ وار مزاحیہ اخبار بھی نکالا تھا جو حکومت کی سختیوں کے باعث بند ہو گیا تھا۔ اس کے بعد "یتیم خانہ" کے نام سے ایک اور پرچہ مرحوم نے نکالا، لیکن وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔

تخلص صاحب کانگرس کے سخت مخالفین میں تھے۔ پاندان والی خالہ کی زبان سے اس کے بخیے ادھیڑا کرتے تھے۔ لیکن۔ لکھتے بدمزگی تھے، اس لئے ان کے اخبارات زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے۔

مجھ سے تخلص صاحب کی پہلی ملاقات بھوپال کے اسٹیشن پر ہوئی تھی جب میں ممبئی جا رہا تھا۔ بھوپال آنے کی ان کی دعوت افسوس کہ پوری نہ ہو سکی اور وہ اس دنیا سے روٹھ گئے۔ لکھنؤ میں ان کے بہترین دوست ڈاکٹر اشتیاق حسین رضوی صاحب تھے۔ قیام وہیں فرماتے تھے۔ ملنے والوں میں اقبال صاحب سابق سپرنٹنڈنٹ بلرام پور اسٹیٹ اور یہ حقیر خاص درجہ رکھتے تھے۔ جب بھی آتے ملنے ضرور آتے۔ چند ہی ماہ قبل مرحوم لکھنؤ آئے تھے۔ ان کی صحت خراب تھی اور بہت نحیف و نزار ہو گئے تھے، لیکن تیور وہی تھے جو جوانی میں تھے۔ پہلی ملاقات میں مجھے

بقیہ کالم اول پر X

X

انھیں پہچاننے میں دشواری ہوئی تھی، اس لئے کہ وہ ادیب سے زیادہ ملٹری کے کوئی افسر معلوم ہوتے تھے۔

تخلص صاحب مزاح نگار ہی نہیں تھے۔ ان کا علم مجلسی بھی ایسا تھا کہ جس محفل میں ہوتے، لوگوں کو اتنا ہنساتے کہ پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ افسوس آج یہ مجاہد شخصیت ہم میں باقی نہیں رہ گئی۔ ایسے لوگ دنیا میں مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم کی بیویاں دو تھیں جو بقید حیات ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ البتہ بیٹی عفت بانو کا نام یاد ہے، اس لئے کہ حریم انھیں کے نام جاتا ہے

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ شعر پیارے مقررہ عنوان پر ہو اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔
اکتوبر کے لئے عنوان ہے "اشک" اور نومبر کے لئے "دیدار"۔ ادارہ

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی

مرسلہ: قمر نگار جلیلی (آمبور)

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

مرسلہ۔ شبانہ شکیل (سید علی گوڑہ)
کشور مصباح بہانپور

مرسلہ۔ اخلاق احمد میمن (کاریگر شوری)

اے شمع نہ رو اتنا اب خاک سے مل مل کر
نادان نہ آئے گا، اب لوٹ کے پروانہ

مرسلہ:۔ فردوس نواب (آگرہ)

زندہ جل مرنا اسی کا ہاں اسی کا کام تھا
دیر تک دیکھا کئے حیرت سے پروانے کو ہم

مرسلہ: نجم النساء یوسف (لالبتی)

شمع جل جانے سے پہلے رونق محفل نہ تھی
خاک تھا بس کچھ نہ تھا پروانہ جل جانے کے بعد

مرسلہ: عقیلہ ہارون بالوجی
(جنجیرہ مرود)

اب وفا ہے نہ جفا یاد وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانے کی

مرسلہ: صبیحہ سلطانہ صبا (چھپرہ)

شمع تو روشن کر تو پہلے آئے گا پروانہ بھی
[illegible]

مرسلہ۔ [illegible] (میسور)

قتل پروانہ تم اک پل میں نہ جلنا سیکھو
تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو

مرسلہ۔ رحمت نور (جمشید پور)
دعا گو صدیقہ احمدی تاج (آمپور)

ہمیشہ عیش و عشرت میں زمانہ ساتھ دیتا ہے
بجھی جب شمع تو نزدیک پروانے نہیں آتے

مرسلہ:۔ تبسم سلطانہ (چھپرا)

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں

مرسلہ:۔ مس روبینہ شمسی (آگرہ)

وہ شمع ہوئی روشن وہ آ گئے پروانے
آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے

مرسلہ۔ مس شاہدہ بانو۔ عظیم آباد (کستی پور)

پروانہ گرد شمع پھرا اور جل گیا
پھر بھی نگاہ شوق میں ناکام ہی رہا

مرسلہ۔ مس قمر فاطمہ پیاسے (آگرہ)

تمہیں معلوم ہے کچھ، کیوں گرے پڑتے ہیں پروانے
تمہاری شمع محفل کہہ رہی ہے داستاں میری

مرسلہ:۔ فاطمہ زہرہ (بہار شریف)

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مرسلہ:۔ ماجدہ نسرین قادری
دکا پھسا

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

مرسلہ۔ مس عطیہ فاروقی (کرد چھالو)

مرسلہ۔ مسز عذرا کلام مدی۔ بیگم سرائے

سچ شمع خلوص بھی اک جرم عاشقی
پروانہ جل کے شمع کو بدنام کر گیا

مرسلہ: نصرت بیگم [illegible]
(بقیہ صفحہ ۱۳۰ کالم اول پر) [illegible]

تعمیراتی کام میں —

ٹیلیفون نمبر آفس:- ۲۲۵۷۹

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر رہائش:- ۲۵۱۳۳

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

گزشتہ ۴۶ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں

ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۷۷ء نمبر ۱۰

معاونین:- شوکت جہاں بیگم غزالہ — جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	اکیس روپیہ
مخصوص خریداری	-	سترہ روپیہ
معمولی خریداری	-	پندرہ روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد
غیر ممالک سے بقدر ۳۰ روپیہ یا دو پونڈ بذریعہ بینک ڈرافٹ پہلی اپریل سے
طلب فرمائیں گے ہم شکر گزار ہوں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کا نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
• حریم ہر انگریزی ماہ کی ۱۰ تاریخ کو روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں ۱۵ تاریخ سے پہلے کی گئی شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔
خط و کتابت کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس اور ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

نسیم انہونوی مالک و ناشر سرفراز قومی پریس لکھنؤ .... نے شائع کیا

ایک بھابھی صاحبہ نے لکھا ہے۔

"میری والدہ آپ کے حریم کی پرستار ہیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ حریم کو اپنے گھر میں آتے دیکھ رہی ہوں۔ حالانکہ میرا بس چلے تو اسے گھر میں آتے ہی جلا دوں۔ اس لئے کہ اکثر میں نے آپ کے لمحات پڑھے ہیں۔ ابتدا میں میری امی تاکید کرکے مجھے لمحات پڑھنے پر مجبور کرتی تھیں۔ اس وقت میں لمحات میں جو کچھ لکھا ہوتا تھا، میری سمجھ میں نہ آتا تھا اس لئے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، لیکن جب سے میں ہوشمند ہوئی ہوں اور یونی ورسٹی میں پڑھنے لگی ہوں۔ آپ کے لمحات کو بکواس سمجھتی ہوں، اس لئے کہ آپ اسی جنس کے ایک فرد ہیں جو اخلاق و تہذیب سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ جس کا کام صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ لڑکیوں کو چھیڑتا رہے، ان پر آوازے کستا رہے اور موقع مل سکے تو انھیں تباہ و برباد کردے۔ آپ لمحات میں ہمیں تو بہت کچھ سمجھاتے ہیں۔ نصیحت فضیحت کرتے ہیں، لیکن ان لچوں اور لفنگوں کو نہیں سمجھاتے، جن کی وجہ سے ہمیں راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔ کاش میں اس ملک کی ڈکٹیٹر ہوتی۔ یقین کیجئے کہ میں چن چن کر ایک ایک مرد کو مروا دیتی تاکہ عورتیں آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکیں اور انھیں قدم قدم پر ان بداخلاق مردوں کے زہر بھرے جملے نہ سننا پڑتے اور ہماری جنس کو کسی طرح کا خطرہ نہ رہتا ـــــ"

خط میں اور بھی بہت سی باتیں لکھی ہیں، لیکن میں انھیں چھاپ کر طول کرنا نہیں چاہتا۔ جو مقصد ہماری بھولی بھالی بھابھی کا ہے وہ تحریر سے واضح ہوگیا ہے۔

خط کسی بہن کا ہوتا تو جواب کچھ اور طرح سے دیتا مگر بھابھی تو مثل میری بیٹی کے ہے۔ میرے بچے بھی تو کبھی کبھی پابندیوں پر جھنجھلا جایا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ بھابھی تو مجھے بہت ہی ناسمجھ اور معصوم معلوم ہوتی ہیں۔ انھیں جواب نہیں دے سکتا۔ سمجھا ہی سکتا ہوں۔

اس حقیقت سے مجھے بھی انکار نہیں کہ عورت کے سلسلہ میں مرد بڑا ہی بداخلاق واقع ہوا ہے۔ لیکن اس کی یہ بداخلاقی حال کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ بالکل ان گوشت خور جانوروں کی طرح جو اپنے سے کمزور جانوروں کو دیکھتے ہی حملہ کر دیتے ہیں اور انھیں کھا پی کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ جانور ازل سے اسی فطرت کے واقع ہوتے ہیں یا بنائے گئے ہیں۔ کیا دنیا کی کوئی طاقت ان کی فطرت بدل سکتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ باز چڑیوں کو دیکھے اور جھپٹا نہ مارے۔ بلی چوہے کو دیکھے اور اس پر حملہ نہ کرے۔ اسی طرح مرد بھی یہی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے کہ وہ عورتوں کے سلسلہ میں اخلاق و انسانیت سے گذر جاتا ہے۔ جانور تو عموماً بھوک کی حالت ہی میں اپنے شکار پر حملہ کرتے ہیں۔ لیکن مرد کی یہ بھوک جو عورت کی ہستی سے تعلق رکھتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک عورت ایک ہی شوہر سے مطمئن رہتی ہے۔ اس کے تصور میں کبھی یہ بات کبھی نہیں آتی کہ وہ بیک وقت دو چار شوہروں سے رشتہ قائم کرے۔ اس کے برخلاف مرد کے دس بیس بیویاں ہوں تو بھی اسے قرار نہیں آسکتا۔ اردو میں ایک لفظ ہے بدنیت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں کتنا ہی کھلا پلا دیا جائے لیکن ان کی نیت نہیں بھرتی۔ انھیں بدنیت کہا جاتا ہے۔ مرد کا بھی یہی حال ہے۔ عورت کے سلسلہ میں بدنیت سے بہتر کوئی لفظ اس کے لئے نہیں کہا جا سکتا۔

میری معصوم بھابھی یہ سمجھتی ہیں کہ آجکل کا ہی مرد ایسا ہوگیا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ مرد ہمیشہ سے ہی ایسا رہا ہے اور یہ اسکی

فطرت ہے اور صرف اسی لئے ہمارے نبی برحق حضرت محمد صلعم نے مردوں اور عورتوں کے درمیان پردہ کی دیوار کھڑی کی تھی۔ محرم و نامحرم کی حدود قائم کی تھیں جسے افسوس کہ انگریزی تہذیب نے رفتہ رفتہ ختم کر دیا ہے اس لئے کہ ان کی تہذیب ساری دنیا پر ایک آندھی کی طرح چھا گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ بھانجی صاحبہ کی والدہ محترمہ کو مردوں کی ذات سے ایسا شکوہ نہ ہوگا، اس لئے کہ انھوں نے غالباً یونیورسٹی کی شکل نہ دیکھی ہوگی۔ پردہ کرتی ہوں گی اور گھر سے بلا ضرورت بن ٹھن کر بے محابہ نکلتی ہوں گی۔ یہ شکایت تو یونیورسٹی تک پہنچ جانے کے طفیل ہے۔ درندوں کے مسکن میں جانے کے بعد یہ شکوہ کرنا کہ یہ جانور گوشت کاٹنے دوڑتے ہیں۔ بڑی ہی بچکانہ بات ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میری بھانجی صاحبہ نقل کر کے پاس ہوتی ہوئی یونیورسٹی تک پہنچ گئی ہیں۔ ورنہ وہ اس طرح کا خط نہ لکھتیں۔ انھیں نفسیات کا علم ضرور ہو گیا ہوتا اور مردوں کی شکایت کرنے کے بجائے وہ جو اس بات پر شرمسار ہوتیں کہ کیوں انھوں نے یہ راستہ اختیار کیا جہاں قدم قدم پر خطرات ہی ہوں۔ جہاں راہزن ہی راہزن ہوں۔

بلا شبہ میں انھیں نصیحت فضیحت نہیں کرتا، اس لئے کہ انھیں سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی ڈاکو یا چور سے یہ کہا جائے کہ بھائی یہ کام برا ہے، اسے چھوڑ دو۔ حالانکہ چوروں اور ڈاکوؤں پر اس طرح کے سمجھانے کا تو کچھ اثر ہو بھی سکتا ہے۔ اس لئے کہ چوری اور ڈکیتی ان کی فطرت نہیں۔ عموماً حالات سے مجبوری انھیں ایسا کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ لیکن مرد کی یہ باتیں جن کا شکوہ میری بھانجی نے کیا کہ اس کی فطرت میں شامل ہیں اور فطرت بدلا نہیں کرتی۔ اسی لئے میں چوروں کو نصیحت فضیحت کرنے سے زیادہ بہتر یہی سمجھتا رہا کہ اپنی بہنوں ہی کو سمجھاؤں کہ وہ ان چوروں سے ہوشیار رہیں ان سے دور رہیں ان کے داؤں میں نہ پھنسیں۔ شاید آپ نے بھی دیکھا اور سنا ہو کہ راتوں میں پولیس کے سپاہی پہرہ دیتے ہوئے بلند آواز سے کہتے رہتے ہیں "جاگتے رہو" کبھی یہ کہتے نہیں سنا "چورو بھاگ جاؤ" اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ چور بھاگ نہیں سکتے ہاں اپنا مال بچانے کے لئے مالدار لوگ جاگتے رہ سکتے ہیں۔

اب رہا میری بھانجی صاحبہ کا یہ کہنا کہ اگر وہ ڈکٹیٹر ہوتیں تو چن چن کر ایک ایک مرد کو مروا دیتیں بہت ہی بچکانہ بات ہے اول تو اگر وہ ڈکٹیٹر بن جائیں تو مردوں کو مروانے کا کام انھیں مردوں ہی سے لینا پڑے گا عورتیں کتنی ہی ترقی پسند اور تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں یہ کام نہ کر سکیں گی اور مرد خود اپنی ہی جنس کو ختم کر دے کیسے ممکن ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ طفلانہ بات یہ ہے کہ دنیا سے مردوں کا خاتمہ کرا دیا جاتا اور عورتیں آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکتیں۔ یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے میری معصوم بھانجی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بعد نسل انسانی ختم ہو جائیگی۔

حریمی بہنوں بھائیوں اور بھانجیوں سے

عید کے سلسلہ میں کافی عید کارڈ مجھے وصول ہوئے۔ اصولی طور پر مجھے فرداً فرداً سب کو شکریہ کا خط لکھنا چاہیے لیکن میں ایسا نہیں کر سکا اس لئے کہ صدہا خطوط لکھنا آسان نہیں۔ پھر اخراجات کا بھی سوال آتا ہے۔ اس لئے میں نے جس طرح سب کو حریم ہی کے ذریعہ عید کی مبارک باد دی تھی اسی طرح سب کی عید مبارک کا شکریہ بھی حریم ہی کے ذریعے ادا کر رہا ہوں۔ نسیم انہولوی

مشورے

- بہن شمع نور الصباح صاحبہ نے لکھا ہے کہ حریم میں سوال جواب کا کالم قائم کیا جائے جواباً عرض ہے کہ یہ کالم قائم ہے سوالات کبھی آتے ہیں تو جواب بھی دیا جاتا ہے۔
- بہن عصمہ خاتون نے تحریر فرمایا ہے کہ حریم کے متعلق حریمی بہنوں کی رائیں ہر ماہ شائع کی جائیں۔ رائیں اتنی آجاتی ہیں کہ انھیں شائع کرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ افسانہ اچھا ہے۔ وہ نظم پسند آئی۔ وغیرہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دو چار ٹھوس اور مفید رائیں شائع کی جائیں تو پھر جن کی رائیں نہیں شائع کی جائیں انھیں شکوہ ہوتا ہے

حریم آپ کو تاخیر سے ملے گا

- یہ پرچہ یقیناً آپ کو تاخیر سے ملے گا۔ اس لئے کہ کاپیاں پریس جا چکی تھیں کہ اچانک لکھنؤ میں پھر مسلمانوں کے باہمی خلفشار کے باعث کرفیو لگ گیا خصوصیت سے مغربی شہر کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی جس پریس میں حریم چھپتا تھا وہ بھی کرفیو کی زد میں تھا اس وقت تک کرفیو لگا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب کھلے گا اور حریم کب تک

چھپ سکے گا۔ بہر حال ہماری کوشش ہوگی کہ جلد سے جلد اسے چھپوا کر روانہ کیا جا سکے۔ امید ہے حریمی بہنیں اس تاخیر کو محسوس نہ فرمائیں گی۔ حالات ایسے ہیں کہ آئندہ کیلئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عقل سلیم دے۔ اور انھیں میل و محبت عام کرا دے کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک اللہ ایک رسولؐ اور ایک قرآن کے ماننے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آئیں اور قتل و غارت گری کے بھی مرتکب ہوں۔

اچھے اچھے ناول

کشمکش	حمیدہ جبیں	13/-
آگ کے طور کو	مینا ناز	15/-
پھولوں کی زنجیر	دیبا خانم	12/-
زین	عابدہ شیریں	20/-
لغزش	رضیہ بٹ	20/-
رفاقتیں کیسی	"	15/-
تمکنت	عفت رضا	11/-
درد کا ساحل	سرور جہاں	12/-
شمع	اے آر خاتون	15/-
سارے جہاں کا درد	رفیقہ منظور الامین	10/-
خزاں کے بعد	زبیدہ خاتون	6/-
نزہت آرا بیگم	"	4/75
تاباں	سرور جہاں	9/-
تزئین	"	8/-
گودڑ کا لال	والدہ افضال علی	20/-
سراب زندگی	نسیم انہونوی	7/50
نجمہ	سعیدہ جمیل	6/-
پیچ و خم	نجم اعزاز	6/30
نشاط غم	ساجدہ نازلی	18/-
مہا	سلمیٰ کنول	13/-
اکیلی	"	9/-
آنسو ہی ملے	وسیم بانو قدوائی	4/50

زندگی کے لئے

مس انجم فرح بی اے

ہر اہتمام ہے دو دن کی زندگی کے لئے
مگر سکون نہیں پھر بھی آدمی کے لئے

نہ کھا فریب وفا اُس کا یہ بے وفا دنیا
کبھی کسی کے لئے ہے کبھی کسی کے لئے

تمام عمر خوشی کی تلاش میں گزری
تمام عمر ترستے رہے خوشی کے لئے

کبھی اُٹھے تھے جو خورشید زندگی بنکر
ترس رہے ہیں وہ تاروں کی روشنی کے لئے

یہ دورِ شمس و قمر یہ فروغ علم و ہنر
زمین پھر بھی ترستی ہے روشنی کے لئے

ستم طرازیٔ دورِ خرد معاذ اللہ
کہ آدمی ہی مصیبت ہے آدمی کے لئے

خوشی کی چھاؤں ہو یا غم کی دھوپ ہو سر پہ
یہ زندگی ہے فقط تیری بندگی کے لئے

رہے حیات کی تاریکیوں میں اے فرح
چراغ دل ہے میرے پاس روشنی کے لئے

شیر خرما

بمق آشیانوی

ایک بنتا ہے شیر یعنی دودھ اور دوسرا ہوتا ہے خرما یعنی کھجور اور جب یہ دونوں شیر و شکر ہو کر گلے ملتے ہیں تو بن جاتا ہے شیر خورما۔ جو حلق سے اتر جاتا ہے تو ایک دو نہیں گلے ملتے ہیں بلکہ پورے رمضان شریف کے پورے روزے رکھنے کے بعد شوال کی پہلی تاریخ یعنی عید کے روز جب صبح کھانے کے لئے بیٹھتے ہیں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی میں صبح طلوع آفتاب کے کچھ ہی بعد آج ہی کھانے بیٹھے ہیں کیونکہ مہینہ بھر آخر شب چار بجے یا اس سے پہلے ہی کھانے کے عادی ہو چکے ہیں جس قدر اس کا احساس ہوتا ہے اس سے زیادہ اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غرض صبح عید کے لذیذ پکوان کے بعد سب سے زیادہ لذیذ شیر خورما حلق سے اترتا ہے تو دل پکار اٹھتا ہے

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن ۝

(پس تم خدا کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

ہم اپنے گھر کی نفسیات کا اتنا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں کہ اپنے گھر کی حد تک، کہہ سکتے ہیں کہ ہم ماہر "نفسیات" ہیں چنانچہ شیر خورمے نے ہمارے منہ میں پہلا قدم رکھا نہیں کہ ہم نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ واہ وا۔ واہ کیا لذیذ شیر خورما ہے کہ اس کی تعریف کے لئے الفاظ ہی نہیں ملتے۔" پھر گفتگو کا رخ بدل کر ایک الگ قسم کی بحث شروع کر دیتے ہیں تاکہ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آجائے کہ ہماری نیت کیا ہے۔" حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان اتنی وسیع ہوتے ہوئے بھی بعض وقت اپنی تنگ دامانی پر روتی ہے۔ اب اس شیر خورمے کو لیجئے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کی دل کھول کر تعریف کی جائے لیکن الفاظ نہیں ملتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں "سبحان اللہ کیا شیر خورما ارشاد ہوا ہے" یا یوں کہہ سکتے ہیں ماشاء اللہ کیا شیر خورما نازل ہوا ہے" یا یوں کہہ لیجئے جزاک اللہ وہ شیر خورما ہوا ہے کہ جواب نہیں ہے" لیکن چونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور ابھی یونیورسٹی میں مزید "تعلیم یافت" بھی کر رہے ہیں (تعلیم کا یافت کرنا ہماری اپنی جدت ہے۔ صحت اور عدم صحت کی بحث میں ہم اس لئے نہیں جاتے کہ خود ہماری صحت ہمیشہ سے "شمار عدم" موجود ہیں) چنانچہ اس یافتہ اور یافتگی کا اظہار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ شیر خورمے کی تعریف انگریزی زبان میں نہ کی جائے جیسا کہ ہم نے پہلے ہی یہ بات بتا دی ہے کہ ہمارے گھر کی کچھ خاص نفسیات ہیں جس کا ایک جز یہ بھی ہے کہ ہمارے بھائی جان صاحب اپنی یا کسی کارنامے کی تعریف کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتیں جب تک کہ انگریزی زبان کے چند جملے اور اگر جملے نہ ہو سکیں تو کم از کم الفاظ ہی استعمال نہ ہوں ہم انگریزی جملوں میں فی الحال تعریف کرنا اس لئے بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ جملہ ذرا سوچ سمجھ کر بنانا پڑتا ہے پھر بھی کوئی جملہ صحیح نہیں بنا سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھی طلبا نے کمرۂ امتحان میں پہرا دکھا کر ہمیں نقل کر کے کامیابی حاصل کرنے کی سہولت مہیا کر دی تھی نقل کر کے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ہماری تعلیم میں اصلیت باقی نہیں رہی۔ اس کا ہمیں غم بھی نہیں ہے اس لئے جب ملک میں تمام اشیا یہاں تک کہ کھانے والی چیزیں اور دوا دو یہ بھی اصلیت کھو چکی ہیں تو ہماری تعلیم میں اصلیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ غرض ہم بعض رٹے ہوئے الفاظ ہی پر اکتفا کرتے ہوئے تعریف شروع کر دیتے ہیں "کیا شیر خورما ہوا ہے بھائی جان کہ جس کو کہتے ہیں (How wonderful) یا یوں کہنا چاہئے کہ (Marvellously Delicious) بھائی جان میں تو کہتا ہوں کہ یہ (Grand gala) ہے۔ (Sheer Khurma and flour) اب جا کر صحیح سے بناتی آرہی ہیں لیکن یہ (Taste) کچھ اسپیشل ہے۔ یہ تو بالکل (Modern Type) کا ہے

عیدگاہ سے لے کر گھر تک بھیرو الدصاحب ایک بہت ہی جامع تقریر فرماتے ہیں۔ جس کا عنوان ہوتا ہے ـ

"مسعود کے زیادہ کھانے سے اس کی صحت پر مضر اثرات، اور حال اور آئندہ چل کر اس کے معاشی معاشرتی اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے نقصانات ـــ"

یہ عنوان اگرچہ کچھ طویل سا نظر آتا ہے۔ لیکن آج کل ہم نے دیکھا کہ کہانیوں اور مضامین کے عنوانات کبھی ایک اور کبھی دو سطروں میں قائم کئے جاتے ہیں تو ہمیں بھی شوق ہوا کہ والد صاحب کے تن و توش اور درازقامتی نیز ان کی عظمت و بزرگی کے اعتبار سے ان کی مختصر سی تقریر کا طویل سا عنوان قائم کریں۔ گھر پہونچنے تک تقریر تو ختم نہیں ہوتی البتہ اجلاس منتشر ہو جاتا ہے اور ہم بھابی صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر ایک مکاری کے ساتھ عرض کرتے ہیں ـــ عید مبارک ـــ"

(ختم شد۔)

کیا آپ کو علم ہے کہ

لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیب اور مشرقی تمدن کے لئے مشہور ہے جس کا کہیں جواب نہیں۔ گو یہ تہذیب اب زمانے کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹ گئی ہے پھر بھی ہاتھی لاکھ گھٹے تب بھی سوا لاکھ کا۔ گرتی حالت میں بھی ایک نمونہ ہے۔

لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے اور پھل وغیرہ جو دیکھنے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں۔ اصل اور نقل میں فرق نہیں محسوس ہوتا

آصف دولہ (جن کے متعلق مشہور تھا جس کو نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ) کا مشہور تاریخی امام باڑہ۔ چھوٹا امام باڑہ۔ ریذیڈنسی۔ مارٹین صاحب کی کوٹھی۔

بوٹانیکل گارڈن۔ بنارسی باغ اور زندہ عجائب گھر چڑیا گھر قیصر باغ۔ ریڑیا جسے کھٹیاں بھی کہتے ہیں۔ عطریات اور چکن کا کام اور ان سب سے زیادہ زردوزی۔

کامدانی۔ اور بادلہ وغیرہ کے کاریگر جن کا کام سارے ہندوستان میں مشہور ہے اور ان کاریگروں کا بہترین کام ـــ

ملکۂ حسن

(دلشاد حیدری دریاآبادی)

کردار

امجد علی خاں :- شہر کے معزز رئیس، ریٹائرڈ کرنل
نسیمہ :- امجد علی خاں کی اکلوتی بیٹی
آذر :- نسیمہ کا منگیتر
فریدہ :- نسیمہ کی عزیز ترین سہیلی
ثریا، دیبا، مینا :- نسیمہ کی سہیلیاں
سپھن رام :- چپراسی
غفور :- نوکر
شکورن :- نوکرانی
(ڈاکٹر گھوش، مسٹر ورما، رضیہ بیگم اور دوسرے افراد)

پہلا منظر

(ایک جدید و قدیم طرز کا خوبصورت عالی شان مکان - باہر کے ایک بڑے کمرے میں شمال کی جانب مسہری بچھی ہوئی ہے۔ امجد علی خاں گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہیں۔ چہرے سے نقاہت کے آثار نمایاں ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرصے سے وہ بیمار ہیں۔ بیماری کے باعث سرخ و سفید چہرہ پھیکا پڑ چکا ہے۔ بیماری بھر کم بدن دبلا ہو گیا ہے۔ کمرے کے فرش پر سبز اور نارنجی پھولوں والا بیش قیمت قالین بچھا ہے دیواروں پر کانشیل، ناظم احمد اور دوسرے کی بنائی ہوئی پینٹنگس آویزاں ہیں۔ ایک شیلف پر گلابی اور نیلے گلابوں کا شاداب گلدستہ رکھا ہے)

(آذر پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوتا ہے)

آذر :- آداب عرض ہے چچا میاں!
امجد خاں :- جیتے رہو میاں آؤ بیٹھو۔
آذر :- اب کیسی طبیعت ہے؟
امجد خاں :- (اداسی سے) میاں طبیعت کا کیا پوچھنا زندگی کی شام ہو چکی ہے

آذر :- خدا نہ کرے۔ آپ ضرور اچھے ہو جائیں گے ڈاکٹروں نے تو کافی اطمینان کا اظہار کیا ہے۔
امجد خاں :- (بیزاری سے) ارے ڈاکٹروں کی تو عادت ہوتی ہے جھوٹی تسلیاں دینے کی۔ جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ اچھا چھوڑو اس بات کو جو ہونا ہے سو ہوگا۔ سناؤ تمہارا رزلٹ کب نکلے گا؟
آذر :- رزلٹ نکلنے میں تو ابھی ایک مہینے کی دیر ہے۔
امجد خاں :- خدا کرے تم اوّل آؤ اور میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام کروں۔ اچھا تم کچھ لو گے نہیں چائے وائے؟ (برقی سوئچ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں)
آذر :- نہیں نہیں چچا میاں! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب اجازت دیجئے۔ کالج بھی جانا ہے۔
امجد خاں :- اچھا جاؤ۔ کل ضرور آنا۔
آذر :- جی ہاں ضرور آؤں گا۔
(آذر امجد صاحب کے کمرے سے نکل کر ایک پتلی سی گیلری سے ہو کر اندرونی دروازے کے قریب پہنچتا ہے۔ اندر سے سپھن رام نکلتا ہے)
سپھن رام :- میں ابھی آپ ہی کو بلانے جا رہا تھا۔
آذر :- کس نے بھیجا تھا؟
سپھن رام :- نسیمہ بی بی نے۔
آذر :- اچھا میں ابھی جاتا ہوں۔ تم ذرا چچا میاں کے کمرے میں جاؤ ایسا نہ ہو کہ ....
(سپھن رام دھیرے سے مسکرا دیتا ہے)

(نسیمہ کا کمرہ۔ اس میں تین دروازے ہیں۔ تیسرا دروازہ پائیں باغ میں کھلتا ہے۔ دروازوں اور دریچوں پر سبز پردے پڑے ہیں۔ میز پر بہت ساری کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں کارنس پر ——— گوتم بدھ، وینس اور شیکسپیئر کے مجسمے ساگون کی مسہری پر سفید ریشمی بستر اور فرش پر گلابی رنگ کا ریشمی غالیچہ

بچھا ہوا ہے۔ نسیمہ آسمانی رنگ کے غرارے، قمیض اور دوپٹے میں
ملبوس باغ میں کھلنے والے دروازے پر کھڑی ہے)

آذر :۔ (آہستہ سے) نسیمہ !

نسیمہ :۔ (مڑکر) اوہ ! آذر ! آؤ اندر چلے آؤ۔

آذر :۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اتنی اداس کیوں ہو نسیمہ ؟

نسیمہ :۔ (افسردگی سے) ابا میاں کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی
ہے۔ آذر ! خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

آذر :۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو وہ جلد اچھے ہو
جائیں گے۔

نسیمہ :۔ ان کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اب تو انھوں
نے دوا بھی کھانی چھوڑ دی ہے۔ شاید وہ اب بالکل ناامید...

آذر :۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ ارے۔ ارے یہ کیا ؟ تم رو رہی
ہو۔ اس قدر پریشان ہونے سے کیا ہوگا نسیمہ ؟

نسیمہ (سسکیاں لیتے ہوئے) میں بہت بدنصیب ہوں آذر ! پیدا ہوئی
تو ماں نے دنیا کو خیرباد کہا۔ ابا میاں نے میرے لیے اپنی
جوانی خاک میں ملا دی اور... اور اب.....

(نسیمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ آذر گھبرا کر اٹھ جاتا ہے)

آذر :۔ خدا کے لیے اتنے زور سے نہ روؤ۔ چچا میاں نے سن لیا
تو ؟ دیکھو ہر بات میں خدا کی مصلحت ہے انسان کے بس میں
کچھ نہیں ہے۔

(شکورن اندر آتی ہے)

شکورن :۔ چلیے بی بی آپ کو سرکار بلا رہے ہیں۔

آذر :۔ اچھا اب میں چلتا ہوں خدا حافظ !

(نسیمہ امجد صاحب کے کمرے میں آتی ہے)

امجد صاحب :۔ کیا کر رہی ہو بیٹی ؟

نسیمہ : کچھ بھی نہیں ابا جان۔

امجد صاحب :۔ (نسیمہ کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے)
تمھاری آنکھیں سرخ کیوں ہیں ؟

نسیمہ :۔ (گھبرا کر) کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ۔ میں ۔ میں
۔ میں کتاب پڑھ رہی تھی۔

امجد صاحب :۔ تمھیں معلوم ہے ابھی آذر آیا تھا۔

نسیمہ :۔ جی۔ جی ہاں شاید۔

سیوک رام :۔ (پردہ ہٹا کر) سرکار ! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔

امجد صاحب :۔ بھیج دو انھیں۔

ڈاکٹر گھوش :۔ آداب عرض ہے کرنل صاحب !

نسیمہ :۔ آداب انکل !

ڈاکٹر گھوش :۔ جیتی رہو بیٹی جیتی رہو ! (امجد صاحب سے مخاطب
ہوکر) ہاں بھئی کہو اب کیسی ہے طبیعت ؟

امجد صاحب :۔ اچھا تمھیں بھی میں ہی بتاؤں ؟ جو آتا ہے یہی
پوچھتا ہے کیسی ہے طبیعت ؟ آپ اچھے تو ہیں نا ؟ جواب دیتے
دیتے تھک گیا ہوں۔

ڈاکٹر گھوش :۔ (مسکرا کر) میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اپنی
بیماری کی طرف کچھ دھیان نہ دو۔

نسیمہ :۔ پھر بھی ایک بار معائنہ کر لیجیے انکل !

امجد صاحب :۔ نہیں بھائی ! آج یہ سب رہنے دو، جاؤ تم
کافی وغیرہ بھیجو۔

(نسیمہ چلی جاتی ہے)

امجد صاحب :۔ دیکھو ڈاکٹر ! تم میرا مرض مجھ سے چھپاتے
ہو یہ تو ٹھیک ہے لیکن خدا کے لیے نسیمہ سے کچھ نہ کہنا ورنہ
وہ رو رو کر اپنی جان ہلکان کرے گی۔

ڈاکٹر گھوش :۔ تم اتنے مایوس کیوں ہو گئے ہو ؟ جب سب ٹھیک
ہے تو میں کسی کو کیا بتاؤں گا ؟

امجد صاحب :۔ (ٹھنڈی آہ بھر کر) ٹھیک ۔ کیا کینسر کا مریض
کبھی ٹھیک ہوا ہے ؟

ڈاکٹر گھوش :۔ کون احمق کہتا ہے کہ تمھیں کینسر ہے

(امجد خاں پھیکی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتے ہیں)

وقفہ

[رات کے دس بج رہے ہیں۔ نسیمہ [illegible] کا گلاس لے کر
باپ کے کمرے میں آتی ہے]

امجد صاحب :۔ بیٹھو بیٹی ! اس وقت تو میں تم سے کچھ کہنا [illegible]

نسیمہ :۔ فرمایئے ابا میاں !

امجد صاحب :۔ آذر کا رزلٹ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ اس کے

بعد وہ لندن چلا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں جلد از جلد تمہاری منگنی کر دوں۔ تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے۔

(نسیمہ خاموش رہتی ہے)

امجد صاحب:۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے تو آذر بہت پسند ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔

نسیمہ:۔ کوئی اعتراض نہیں ابا میاں! لیکن آپ اچھے ہو جائیں یہ سارے کام تو ہوتے ہی رہیں گے۔

امجد صاحب:۔ میں جلد چاہتا ہوں بیٹی! موت و حیات کا کیا ٹھیک۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خوش فہمی میں مبتلا رہنا پسند نہیں کرتا۔

(نسیمہ آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے جلدی سے اٹھ جاتی ہے)

دوسرا منظر

[امجد صاحب کا مکان مہمانوں سے بھرا ہے۔ نوکر چاکر بھڑکیلے وردیوں میں ملبوس مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے ہیں نسیمہ منگنی کا گلابی جوڑا پہنے بیٹھی ہے۔ اس کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی ہے۔ میراثنیں ڈھولک پر گیت گا رہی ہیں]

فریدہ:۔ مبارک ہو نسیمہ

دیبا:۔ ہاں بھئی۔ ہماری طرف سے بھی مبارکباد قبول کرو کہ تم نے اتنا خوبصورت دولہا ڈھونڈھ لیا۔

ثریا:۔ (ہنس کر) مجھے تمہاری نیت ....

مینا:۔ شاید تم اپنے دل کی بات کہہ رہی ہو"

فریدہ:۔ اور یہی حال آذر کے دوستوں کا ہوگا بیچارے رشک کی آگ میں جل رہے ہوں گے۔

دیبا:۔ تمہیں بھی رشک ہو رہا ہے۔ خیر رشک کرنا بری بات نہیں۔ اچھی چیز پر سبھی کو رشک ہوتا ہے۔

وقفہ

(آذر اور سارے مہمان رخصت ہو چکے ہیں۔ رات کے تین بج رہے ہیں۔ کمرے میں صرف ڈاکٹر گھوش اور امجد علی خان باتیں کر رہے ہیں)

امجد صاحب:۔ آج میں کتنا خوش ہوں۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

ڈاکٹر گھوش:۔ ہاں۔ ایک عرصے بعد آج تمہارے چہرے پر مسرت اور اطمینان دیکھ رہا ہوں بےشک یہ بڑی خوشی کا دن ہے۔

امجد صاحب:۔ گھوش! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آذر کے لندن سے واپس آنے تک زندہ رہوں۔ تاکہ ان کی شادی بھی دھوم دھام سے کر سکوں؟"

ڈاکٹر گھوش:۔ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو بھئی! تم نسیمہ کی شادی ہی نہ کرو گے بلکہ اپنے نواسوں کو بھی کھلاؤ گے۔

امجد صاحب:۔ (دھیرے سے مسکرا کر) یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے ڈاکٹر!

ڈاکٹر گھوش:۔ کیوں نہیں! اچھا اب آرام کرو۔ خدا حافظ!

(ڈاکٹر گھوش چلے جاتے ہیں)

[صبح آذر لندن کے لیے روانہ ہو جاتا ہے]

(ایک سال بعد آذر کو نسیمہ کا ٹرنک کال موصول ہوتا ہے وہ فوراً ہندوستان چلا آتا ہے)

[آذر کوٹھی کی لان میں داخل ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر گھوش دوسری طرف سے آتے ہیں]

آذر:۔ (جلدی سے) کیا ہوا انکل؛ سب ٹھیک ہے نا؛

ڈاکٹر گھوش:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) تم آ گئے آذر! لیکن امجد تو تمہیں دیکھنے کی حسرت ہی لیے رخصت ہو گیا۔

آذر:۔ کیا ..... کیا چچا میاں ..... چچا میاں نے اُف۔ کب؛

ڈاکٹر گھوش:۔ اچانک طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہم لوگوں نے تمہیں فوراً ـــ ٹرنک کال کیا۔ لیکن افسوس.....

آذر:۔ (آہستہ سے) یہ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا۔ کاش میں لندن نہ جاتا!

(وہ بھاری بھاری قدموں سے اندر جاتا ہے۔ امجد کے کمرے میں نسیمہ چپ چاپ بیٹھی ہے)

آذر:۔ (نسیمہ کے پیچھے جا کر) نسیمہ!

نسیمہ:۔ (چونک کر) آذر!

(نسیمہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی ہے۔ آذر کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آتے ہیں)

آذر:۔ (کافی دیر کے بعد) خدا کے لیے اب نہ روؤ نسیمہ! ہونی کو کون روک سکا ہے۔ مجھے دیکھو چچا میاں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ وہ مجھے کتنا چاہتے تھے۔ لیکن میں بدنصیب انھیں کاندھا بھی نہ دے سکا۔

[دوسرا دن۔ صبح کے سات بجتے ہیں۔ آذر نسیمہ سے باتیں کر رہا ہے]

آذر:۔ تمھاری پھوپھی جان تو یہیں ہیں؟

نسیمہ:۔ ہاں اب وہ یہیں رہیں گی۔

آذر:۔ میں بھی سوچ رہا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ آگے کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟ افسوس کہ حالات ایسے نہیں ورنہ ہم ابھی شادی کر لیتے۔ (کچھ سوچ کر) کیوں نہ مزید تعلیم کے لیے تم بھی میرے ساتھ لندن چلی چلو۔

نسیمہ:۔ نہیں یہ مناسب نہ ہوگا۔

آذر:۔ مناسب کیوں نہ ہوگا؟

نسیمہ:۔ (جھنجھلا کر) بھلا تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ابا حضور کی امیدوں کا مرکز میں ہی تھی۔ مجھے ان کی روایات اور اصولوں کو نبھانا ہے اور پھر لوگ کیا کہیں گے کہ باپ کے مرتے ہی بیٹی پر پرزے نکال رہی ہے۔

آذر:۔ تو پھر تم کالج میں داخلہ لو۔ بی۔ اے کرنے کے بعد تم نے پڑھنا چھوڑ کیوں دیا۔

نسیمہ:۔ ابا میاں کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو بی۔ اے تک پڑھ لینا کافی ہے۔ لیکن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔

آذر:۔ تو پھر بسم اللہ! میں کل ہی سے تمھارے سارے کام مکمل کیے دیتا ہوں۔

[آذر کو لندن سے آئے ہوئے دو ماہ گزر چکے ہیں۔ دو روز بعد اسے واپس جانا ہے۔ وہ نسیمہ کے گھر آتا ہے]

آذر:۔ نسیمہ کہاں ہے خشکودن؟

خشکودن:۔ ابھی کالج سے واپس آئی ہیں میاں۔ غسل خانے میں ہیں۔

[نسیمہ تولیے سے بال جھٹکتی ہوئی باہر آتی ہے۔ اس نے سبز ریشم کی مرشد آبادی ساری باندھ رکھی ہے۔ رخساروں پر پانی کی بوندیں ابھی تک رہ گئی ہیں گویا گلاب پر شبنم کے قطرے]

(دونوں نیچے ہال میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں)

آذر:۔ پرسوں چھ بجے میری روانگی ہے۔ رخصت کرنے آؤ گی نا؟

نسیمہ:۔ (اداس ہو کر) اتنی جلدی کیا ہے کچھ دن اور رک جاؤ آذر!

آذر:۔ نہیں نہیں۔ جانا تو ضروری ہے۔ اداس ہونے کی کیا بات ہے؟ اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ تم بھی چلو۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

آذر:۔ اُوہ! آخر تم چپ کیوں ہو؟ کالج کی باتیں سناؤ۔ تمھاری سہیلیاں تو بہت خوش ہوئی ہوں گی۔

نسیمہ:۔ بہت خوش ہوئیں۔ خاص کر فریدہ، ثریا اور دیبا۔

آذر:۔ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟

نسیمہ:۔ کہو۔

آذر:۔ دیبا مجھے عجیب لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا یاد آتا ہے کہ کئی بار اسے یہاں کے بدنام ہوٹلوں میں دیکھ چکا ہوں۔

نسیمہ:۔ (چونک کر) تم نے کیسے دیکھا؟

آذر:۔ (گھبرا کر) ہم۔۔ میرا مطلب۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بس اتفاق سے

نسیمہ:۔ ہو سکتا ہے کہ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو۔

آذر:۔ نہیں اچھی طرح یاد ہے اور جو بیتا ہے تو مجھے بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔

نسیمہ:۔ (ہنستی ہے) تم بھی عجیب ہو۔ لڑکیوں پر خوب نظر رہتی ہے یہی ہے جناب کی پارسائی؟

آذر:۔ قسم لے لو نسیمہ! میں نے تو بچپن سے شیشۂ دل میں ایک ہی تصویر بسا رکھی ہے۔ لندن جیسے شہر میں رہ کر بھی کسی لڑکی سے متاثر نہ ہو سکا۔

نسیمہ:۔ (مسکرا کر) مجھے تو یقین نہیں۔

آذر:۔ تمھیں یقین ہو یا نہ ہو۔ سچائی سچائی ہوتی ہے۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ایسی لڑکیوں سے ہوشیار رہنا۔

نسیمہ:۔ کیا میں بیوقوف ہوں۔

آذر:۔ بیوقوف تو نہیں۔ لیکن معصوم ضرور ہو۔

نسیمہ :۔ اور تم بڑی عقلمند۔

آصفہ :۔ اس میں کیا شک ہے۔

تیسرا منظر

[آندر کو گئے بہت دن گزر چکے ہیں۔ ثریا نسیمہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے]

ثریا :۔ نسیمہ! سو رہی ہو کیا؟

نسیمہ :۔ نہیں تو۔

ثریا :۔ تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے؟ یہ کھلے کھلے گیسو — اڑی اڑی رنگت، اداس آنکھیں۔ کیا بات ہے بھئی؟

نسیمہ :۔ کچھ نہیں۔ بس یونہی۔

ثریا :۔ نہیں۔ یونہی کیسے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کوئی خواہ مخواہ اپنے اوپر یاسیت طاری کرلے۔ آخر کوئی وجہ بھی تو ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کر رہی ہو۔

نسیمہ :۔ تم احمق ہو۔

ثریا :۔ اور تم پاگل ہو۔

نسیمہ :۔ کون کہتا ہے؟

ثریا :۔ (ہنستی ہے) کون کہتا ہے؟ تمہاری صورت کہتی ہے۔

نسیمہ :۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

ثریا :۔ مجھ سے تمہارا یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔

نسیمہ :۔ کیسا حال؟ کیا میں بھیک مانگ رہی ہوں؟

ثریا :۔ تم تو نہیں۔ لیکن تمہاری زندگی تم سے بھیک مانگ رہی ہے

نسیمہ :۔ (اٹھ کر کھڑکی کا ایک پٹ بند کرتے ہوئے) زندگی اور موت کا فلسفہ تم کیا جانو۔ تمہاری زندگی تو صرف ہنگامے ہیں۔ مجھے کیوں پریشان کرتی ہو۔ جاؤ باہر ہنگاموں میں ڈوب جاؤ۔

ثریا :۔ دیوانوں جیسی باتیں نہ کرو۔

نسیمہ :۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

(ثریا اسے گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی جاتی ہے)

چوتھا منظر

(کالج میں، کامن روم میں فریدہ، ثریا اور مینا باتیں کر رہی ہیں)

مینا :۔ آجکل نسیمہ نے چھٹی لے رکھی ہے کیا۔ پیریوں سے نظر نہیں آئی۔

ثریا :۔ ارے اس کی بات نہ کرو۔ وہ تو دیوانی ہے دیوانی۔ دن رات آندر کو لمبے لمبے خط لکھتی ہے اور مجاز کی غزلیں اور فیض کی نظمیں پڑھ پڑھ کر سرد آہیں بھرتی ہے۔

مینا :۔ مجھ سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ آخر اسے ہوا کیا ہے؟

ثریا :۔ عشق۔ جسے کہتے ہیں خلل دماغ کا۔

فریدہ :۔ نہیں اس کی عادت الگ تھلگ رہنے کی ہے۔

مینا :۔ تم اسے سمجھاؤ۔

فریدہ :۔ کوشش کروں گی۔

وقفہ

(شام کے پانچ بج رہے ہیں۔ فریدہ، نسیمہ کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ سامنے سے رضیہ بیگم نکلتی ہیں)

فریدہ :۔ نسیمہ کہاں ہے پھوپھی جان؟

رضیہ بیگم :۔ اپنے کمرے میں ہے بیٹی۔

فریدہ :۔ اس وقت کمرے میں؟ (نسیمہ کے کمرے کا پردہ اٹھاتی ہے۔ نسیمہ میز پر جھکی کچھ لکھ رہی ہے۔ فریدہ چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

نسیمہ :۔ (ہاتھ پکڑ کر) بس۔ پہچان گئی۔ اتنی سڈول کلائیاں کس کی ہیں۔

فریدہ :۔ (قریب ہی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) آجکل تم کہاں رہ رہی نسیمہ؟

نسیمہ :۔ (حیرت سے) اپنے گھر میں۔

فریدہ :۔ تم نے گوشہ نشینی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟

نسیمہ :۔ کیسی گوشہ نشینی؟ میں گھومتی پھرتی ہوں۔ پڑھتی ہوں۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟

فریدہ :۔ بس یہی ہے زندگی (سنجیدگی سے) میں تجھ سے سچ کہتی ہوں نسیمہ کہ تجھ پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ پھر تو نے کیوں اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے۔

نسیمہ :۔ حالت سے تمہاری کیا مراد ہے؟

فریدہ :۔ تو نہیں جانتی کہ زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے

مقابلے میں مجھے یہ انعام ملا ہے — پرنسپل صاحب اور سب لوگوں نے بہت تعریف کی۔

رضیہ بیگم :۔ جیتی رہو بیٹی! خدا کرے تم اور آگے بڑھو لیکن اتنی رات گئے تک کہاں پھرتی رہتی ہو؟ یہ اچھی بات نہیں۔

نسیمہ :۔ اوہ! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں پھوپھی اماں۔ آئندہ ڈرامے کے بارے میں میٹنگ تھی جس کی صدر میں بھی ہوں۔

نوکر :۔ (اندر سے ایک بڑا پارسل لاکر دیتا ہے) لیجئے بی بی! آج یہ پارسل آیا ہے (کھیلیں نکالتے ہوئے) لگتا ہے آجر بابو نے بھیجا ہے۔

(نسیمہ پارسل کھولتی ہے۔ اندر سے اردو اور انگریزی کتابیں، گلابی اور نیلے رومالوں کا قیمتی سیٹ، یاقوت کا ایک خوبصورت ہار، بہت سے ٹیپ اور عید کارڈ کا بڑا سا لفافہ نکلتا ہے۔

نسیمہ کتابوں کے نام پڑھتی ہے :۔ HEATAND DUST غزالاں۔ تم تو واقف ہو " اور سنہری دہلیز "

رضیہ بیگم :۔ بیٹی خط تو پڑھو۔

نسیمہ :۔ (خط پڑھتے ہوئے) ہاں لکھا ہے "پھوپھی جان کو میرا بہت بہت سلام کہنا اور سب ٹھیک ہے"

رضیہ بیگم۔ (خوش ہوکر) خدا اس کی عمر دراز کرے دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔

(نسیمہ سب چیزیں اٹھا کر کمرے میں چلی جاتی ہے)

نسیمہ :۔ (خط کو پھر سے پڑھتے پڑھتے) جناب نے کیا شاعری کی ہے — "یہ کتاب جو ہے 'سنہری دہلیز' " یہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ اسے میں نے اس دن لیا تھا جب ہم اس مقدس بندھن میں بندھے تھے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ نسیمہ! شاید تم یقین نہ کرو لیکن میرے کئی دوست یہی کہتے ہیں — کہ کوئی مجنوں کو دیکھنا چاہے تو وہ آذر کو دیکھ لے؟ ... دیکھو مجنوں بنتا ہوگا نا —"

نسیمہ :۔ (بے ساختہ ہنستی ہے) واہ کیا بات ہے مجنوں صاحب کی۔

چھٹا منظر

(کالج کا باغ۔ سرو کے اونچے اونچے درخت ہوا میں ہل رہے ہیں کامنی کے نازک نازک پھول جھڑ جھڑ کر سبز گھاس پر گر رہے ہیں۔ کچھ لڑکیاں سرخ سرخ املیاں توڑ رہی ہیں۔ امتحان کا نتیجہ نکل چکا ہے نسیمہ سکنڈ ڈویژن لائی ہے۔ فریدہ اور مینا بھی کامیاب ہوگئی ہیں دیپا کو اس سال گولڈ میڈل ملا ہے)

نسیمہ :۔ حیرت ہے، دیپا کو گولڈ میڈل کیسے مل گیا؟

فریدہ :۔ محنت سے۔

نسیمہ :۔ دیپا نے کیا خاک محنت کی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو مینا نے کی اور سچ پوچھو تو اس سے بھی زیادہ محنت میں نے کی لیکن کیا بے اتفاقی ہے کہ میڈل ملنا چاہئے کسے اور مل گیا کس کو۔

فریدہ :۔ (معنی خیز انداز میں سر ہلا کر) ہاں ٹھیک ہے لیکن گولڈ میڈل حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی صرف محنت ہی کی نہیں بلکہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

نسیمہ :۔ کیا مطلب؟

فریدہ :۔ سفارش، ذریعہ (سرگوشی میں کہتی ہے)

نسیمہ :۔ (چونکتے ہوئے) تو کیا پرنسپل ورما ... بھی ...

فریدہ :۔ اور کیا۔ دنیا میں اسی طرح کام ہوتے ہیں۔ آخر حرج بھی کیا ہے۔

(نسیمہ چپ ہو جاتی ہے)

[شہر میں ایک چھوٹا سا مقابلۂ حسن ہے۔ نسیمہ بھی اس میں حصہ لیتی ہے۔ قرمزی رنگ کے مختصر سے لباس، سیاہ جھیل سی آنکھوں اور یاقوتی لب اور معصوم سے گلابی چہرے کے ساتھ وہ شعلۂ جوالہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بیوٹی کوئین کا تاج دیپا کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ نسیمہ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ وہ تڑپ کر ہال سے بھاگ کر چلی جاتی ہے]

(فریدہ اس کے [illegible])

(نسیمہ [illegible] منہ پھلا لیتی ہے)

فریدہ :۔ خیر تو ہے؟ کیا ہوا نسیمہ؟ بھاگ کیوں آئیں؟

نسیمہ :۔ ہر مقابلے میں ایک آنے والا [illegible] دیپا کی چال نے رکھا ہے۔ کیا خاک تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

فریدہ :۔ تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں جج بنی تھی۔

نسیمہ :۔ لیکن تم نے کہا تو تھا۔

فریدہ :۔ ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ تم میرے کہنے پر عمل کرتی نہیں ہو تو پھر الزام مجھ پر کیا؟ ورنہ یہ مقابلہ کیا تم مس انڈیا ہی نہیں مس یونیورس بھی بلکہ مس ورلڈ بھی بن سکتی ہو۔

(نسیمہ جھنجھلا کر منہ پھیر لیتی ہے)

فریدہ :۔ (سنجیدگی سے) اسے مذاق نہ سمجھو نسیمہ! سچ کہہ رہی ہوں دنیا تم سے زیادہ خوبصورت نہیں۔ واقعی اگر تم چاہو تو....

(نسیمہ اسے بے یقینی کے انداز میں مڑ کر دیکھتی ہے)

فریدہ :۔ میں اس وقت بالکل سنجیدہ ہوں۔

(دونوں میں بہت دیر تک آہستہ آہستہ باتیں ہوتی رہتی ہیں)

ساتواں منظر

[نسیمہ کی کوٹھی کا لان۔ ادھر اُدھر بہت سی چیزیں۔ کرسیاں میز، گلاس، برتن، پھول وغیرہ بکھرے پڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہاں پارٹی ہوئی تھی فریدہ اور نسیمہ ایک درخت کی اوٹ سے نکلتی ہیں]

فریدہ :۔ (ہنستے ہوئے) آج تو لطف آ گیا نسیمہ۔ بیچاری دینا جل کر خاک ہو گئی ہوگی۔

نسیمہ :۔ اسی لئے تو میں نے آج پارٹی دی ہے۔

فریدہ :۔ ویسے پچھلے سال اس نے اول آنے پر پارٹی دی تھی۔ لیکن اتنی شاندار نہیں۔

نسیمہ :۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں فریدہ!

فریدہ :۔ شکریہ تو میں تمہارا ادا کروں اس وقت جب تم آگے بڑھنے کے بعد بھی مجھے اسی طرح یاد رکھو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تو کامیابی کی منزلیں طے کرتی اوپر چڑھ جاؤ اور میں زینے پر کھڑی دیکھتی رہ جاؤں۔

نسیمہ :۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلے۔ اچھا آئندہ سال مس ورلڈ کا مقابلہ کہاں ہوگا؟

فریدہ :۔ سان فرانسسکو امریکہ میں۔ مگر تم کیوں سوچ رہی ہو کیا؟

نسیمہ :۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ تو بہت بڑی بات ہے۔

فریدہ :۔ تم سے بھی بڑی؟

نسیمہ :۔ بالکل۔

فریدہ :۔ نہیں وہ کچھ مشکل نہیں۔ اگر ورسوخ سے سب کچھ ہو سکتا ہے — پرنسپل وداما، مسٹر ملک اور مسٹر زیدی صاحب کوئی معمولی لوگ تو ہیں نہیں اور زیدی صاحب تو میرے ڈیڈی کے دوست بھی ہیں۔

نسیمہ :۔ لیکن ہندوستانیوں کا انتخاب مشکل ہے۔

فریدہ :۔ پھر وہی مشکل۔ اسے بھی ذریعہ ہونا چاہئے اور ایتا فاریا یا ریٹا فاریا ہندوستانی ہی تو تھیں۔ کیا یورپ سے آئی تھیں؟

(نسیمہ کے چہرے پر کشمکش کے اثرات۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے)

فریدہ :۔ پھر کیا کہتی ہو؟ ایسا نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

نسیمہ :۔ (مضطرب ہو کر) نہیں میں کل ہی مسٹر ملک سے بات کروں گی۔ سفارت خانے میں ان کا اہم مقام ہے۔ وہ ضرور کوشش کریں گے۔ تم بھی ذرا زیدی صاحب سے مل لینا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔

فریدہ :۔ (خوش ہو کر) شیور۔

(کالج کے باغ میں یوکلپٹس کے درختوں کے درمیان حوض کے پاس فریدہ اور مینا رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہی ہیں۔ دینا دبے پاؤں آتی ہے اور ان دونوں کو دیکھ کر شہتوتوں کے پیچھے چلی جاتی ہے جھاڑ کے پاس چھپ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

مینا :۔ تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے!

فریدہ :۔ ہاں بالکل۔

مینا :۔ لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔

فریدہ :۔ (فیصلہ کن انداز میں) ایسا ہی ہوگا۔

مینا :۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

فریدہ :۔ کوشش اور جدوجہد سے کیا نہیں ہو سکتا اور یہ تو بہت آسان ہے۔ نسیمہ کی اس حرکت کا آغاز پر خود اثر

نسیمہ :- (چونک کر) آؤ آؤ ڈارلنگ! ہائی ڈیر فوزیہ! خیریت تو ہے۔ ہانپ کیوں رہی ہو؟

فوزیہ :- (گہری گہری سانس لیتے ہوئے) دوڑتی ہوئی آرہی ہوں

نسیمہ :- کیا ہوا؟

فوزیہ :- تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔

نسیمہ :- (چونک کر) کیا مطلب؟

فوزیہ :- مجھے ابھی تمہارے خلاف ایک سازش کا پتہ چلا ہے۔

نسیمہ :- (حیرت سے) ہیں! کیسی سازش؟ کون کر رہا ہے میرے خلاف سازش؟

فوزیہ :- (ڈرامائی انداز میں) دیبا۔

نسیمہ :- مگر کیوں؟

فوزیہ :- احمق لڑکی! پہلے پوری بات تو سُن (سرگوشی میں) میں ابھی کالج سے آرہی ہوں۔ وہاں میں نے نیلم اور دیبا کو باتیں کرتے سُنا۔ دیبا نہیں چاہتی کہ تم مس ورلڈ کے مقابلے میں حصہ لو۔ دراصل وہ اپنا راستہ صاف کرنا چاہتی ہے۔

نسیمہ :- (گھبرا کر) کیا کہہ رہی تھی وہ؟

فوزیہ :- یہی کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ نسیمہ حسینۂ عالم بنے اور دیبا منہ دیکھتی رہ جائے، دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے گی میں یہ برداشت نہیں کر سکتی میں اسے اپنے راستے سے ہٹا کر دم لوں گی چاہے کچھ بھی ہو۔

نسیمہ :- (مارے طیش کے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) مگر وہ یہ سب کیسے کرے گی؟

فوزیہ :- (اِدھر اُدھر دیکھ کر) وہ آج تمہارے پاس آکر تمہیں میرے خلاف ورغلائے گی کہ میں تم سے آذر کو چھیننا چاہتی ہوں۔ اور مقابلہ حسن میں حصہ لینے کی طرف میری چال ہے تاکہ آذر تم سے ناراض ہو جائے اور تم اور وہ الگ الگ ہو جاؤ۔

نسیمہ :- (دانت پیس کر) مکار کمینی کہیں کی۔ چڑیل۔ آخر اسے یہ ہمت ہوئی کیسے؟

فوزیہ :- (مزید شہ دیتے) تم نہیں جانتیں۔ مس ورلڈ کا تاج لینے کے لیے کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بتاؤ تم اسے کیا جواب دو گی؟

نسیمہ :- میرا جواب وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔

فوزیہ :- (خوش ہوتے ہوئے) ہاں ذرا سنبھل کر رہنا تاکہ اسے کچھ شک نہ ہو

نسیمہ :- یہ کوئی معمولی بات نہیں جو نظر انداز کر دوں۔ وہ آئے تو سہی

فوزیہ :- (چہرہ بے پناہ خوشی سے سرخ ہو جاتا ہے) اچھا تو اب میں چلتی ہوں۔ ممی آتی ہی ہوں گی۔ گڈ بائی۔ (اندرونی دروازے سے چلی جاتی ہے)

[فوزیہ کے جاتے ہی اتنے میں کھلنے والے دروازے کا پردہ ہٹا کر دیبا آتی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ ہر چیز سنہری لگ رہی ہے۔ سرد ہوا چل رہی ہے۔ آتشدان میں شعلے لپک رہے ہیں۔ نسیمہ دریچہ بند کر کے جھٹکے سے مڑتی ہے۔ اسکی زلفوں میں سجا گلاب آتشدان میں گر کر جل کر راکھ ہو جاتا ہے]

(دیبا کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے نسیمہ کا خون کھول اٹھتا ہے لیکن ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ ہے)

نسیمہ :- اچھا عید کا چاند تو آج ہی نکل آیا وہ بھی ہمارے گھر میں۔

دیبا :- (مصنوعی مسکراہٹ سے بغیر کچھ کہے بیٹھ جاتی ہے) اچھا تم کب جا رہی ہو؟

نسیمہ :- منگل کے دن۔

دیبا :- لیکن تم کیوں جا رہی ہو نسیمہ؟

نسیمہ :- تم نہیں جانتیں تو اطلاعاً عرض ہے کہ مس ورلڈ کے مقابلے میں حصہ لینے کو۔

دیبا :- نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ تم کیوں مقابلۂ حسن میں حصہ لے رہی ہو؟

نسیمہ :- تم کیا چاہتی ہو نہ کروں شرکت؟

دیبا :- ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ بیوٹی کمپٹیشن میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دو۔

نسیمہ :- (غصے سے) آخر بات کیا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟

دیبا :- ایک بہت بری بات ہے نسیمہ! تم نہ جاؤ تو اچھا ہے۔

نسیمہ :- آخر کیوں نہ جاؤں؟

دیبا :- یہ راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔

نسیمہ :- (قہقہہ لگا کر) خوب! نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔

دیبا :- (کھسیا کر) ہاں یہ صحیح ہے۔ لیکن میرے حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ تمہاری بات اور ہے تمہیں کس چیز کی کمی ہے!

نسیمہ :- تمہیں کس چیز کی کمی تھی؟

دیبا :- روٹی کی۔ اپنا مقابلہ تم مجھ سے کیوں کرتی ہو؟ خدا نہ کرے میری پرچھائیں بھی تم پر پڑے۔

[تھوڑی دیر بعد فریدہ بھی چلی جاتی ہے۔ اب صرف بالم نسیم اور [illegible] اندر بیٹھ کر آنکھیں [illegible] ہے۔ بات کافی جا چکی ہے
نسیم [illegible] کر باہر جھانکتی ہے۔ شہر کی کہیں کہیں قمقمے
[illegible] روشنیاں، کچھ اندھیرے اجالے اور تاریں
کے اونچے اونچے پیڑ ایک خوابناک منظر پیش کر رہے ہیں۔ نسیم اس
نظارے سے محو سی ہو جاتی ہے۔ اچانک آسمان سے ایک ستارہ
ٹوٹ کر گرتا ہے اور ساتھ ہی بجلی بھی فیل ہو جاتی ہے۔ جھلملاتی روشنیاں
غائب ہو جاتی ہیں۔ نسیم جھنجھلا کر کھڑکی سے ہٹ جاتی ہے]

نسیم:۔ (بڑبڑاتے ہوئے) چلا گیا — ہونہہ! بے وقوف لڑکا
خود کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے۔ آخر میں اس کی خوشامد کیوں کروں
اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ مجھے دھیان نہیں دینا
چاہئے۔ چھوڑو بھی (سر کو جھٹک دیتی ہے) آج کا دن کتنا
خوبصورت ہے! ——— مسٹر جان اڈولف بھی
کیا آدمی ہیں — کیا چیز ہیں اور مسٹر جارج — آہ — ان
کی باتیں تو ایسی ہوتی ہیں جیسے ہر لمحہ جوانی کے نغمے۔ مگر اصل
کام تو ملک صاحب نے بلکہ فریدہ نے کیا ہے۔ کل صبح جب میں
اٹھوں گی تو ہزاروں لوگ، اخبار نویس، فوٹوگرافر میرا انتظار
کر رہے ہوں گے۔ مگر آذر ——— مجھے بار بار اس کا خیال
کیوں آ رہا ہے! — اتنی عزت اور شہرت کو ٹھکرانا حماقت ہی
تو ہے۔ امریکہ میں کیسی اچھی فضا ہے۔ کھلی کھلی۔ صاف صاف۔
نکھری نکھری — اور وہ دنیا حاسد کہتی تھی۔ طرح طرح کی
باتیں بنا کر منع کر رہی تھی (انگڑائی لیتے ہوئے) اب مجھے سو جانا
چاہیئے۔ لیکن نیند کیوں نہیں آتی (اٹھ کر دریچے کے پاس
جاتی ہے۔ میز پر کوئی چیز چمک رہی ہے۔ وہ اسے اٹھاتی ہے
چونک کر) یہ منگنی کی انگوٹھی — یہ تو آپا جان نے آذر کو پہنائی
تھی ——— (اس کے چہرے سے اضطراب ظاہر ہوتا ہے)
وہ مقدس دن! مگر اب تو وہ بندھن ٹوٹ گیا (اٹھ کر کھڑکی
کی الماری سے ایک کتاب نکالتی ہے "سنہری دہلیز" اس کے
صفحات سے آذر کا خط نکل آتا ہے) "یہ کتاب مجھے بے حد عزیز
ہے۔ سنبھال کر رکھنا۔ شاید تم یقین نہ کرو نسیم لیکن میرے سب
دوست مجھے کہتے ہیں — کوئی مجنوں کو دیکھنا چاہے تو آذر کو
دیکھ لے" (خط کا بیشتر حصہ ہے۔ کتاب بند کر کے) ہنسی نہیں
— اُف! یہ اچھا نہیں ہوا۔ آذر — میرے بچپن کا [illegible]
منگیتر — آپا جان کی پسند، میری پسند۔ لیکن میں نے عالم
[illegible] بڑے بڑے تاجر، بڑے صنعت کار مجھ سے شادی کرنے
کے لئے میری راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں — مجھے ایک معمولی
سے کلرک کی پرواہ نہ ہونی چاہئے — چار سال پہلے ایک
دن — آذر نے کہا تھا "نسیم! تم بہت بھولی [illegible]
— دنیا کی باتیں۔ سازش۔ فریدہ کی چال، اف — یہ کیسے
کیسے خیالات میرے ذہن میں آ رہے ہیں!

(پریشان ہو کر ریڈیو کھولتی ہے سارے پروگرام ختم ہو چکے ہیں
وہ دوسری طرف تپائی پر رکھا پرانی وضع کا ریڈیو کھولتی ہے۔ بیشتر
اسٹیشن بند ہو چکے ہیں — اناؤنسر کی آواز آتی ہے:۔
"یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے۔ اب آپ ملکۂ ترنم نورجہاں کی
آواز میں قتیل شفائی کا گیت سنیئے"

ملکۂ ترنم کی آواز آہستہ آہستہ ابھرتی ہے —

"آئینہ توڑ دے ، آئینہ توڑ دے
سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا
ترا من لٹا
تری آرائشوں کا چمن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے آئینہ توڑ دے"

نسیم منہ سے گیت سنتی ہے اور اٹھ کر ٹیپ ریکارڈر آن
کر دیتی ہے۔ گیت ٹیپ ہو جاتا ہے — وہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہل
رہی ہے۔ پچھلے واقعات تیزی سے اس کے ذہن میں ابھر رہے ہیں —
"آذر! تم مجھ سے کیوں ناراض ہو گئے۔ لیکن میں نے تمہیں خود ہی
ٹھکرا دیا۔ اف اس کا طنز سے کہنا — تم نے کیا قیمت ادا کی؟ —
قیمت — قیمت ... ... بدشگونی — سستی نہیں — مرزا
صاحبان — آذر کے خطوط — مجاز کی غزلیں —
سروجنی نائیڈو کی دلکش نظمیں ... ... وہ ان کی انگریزی نظموں کا
ترجمہ کتنے خوبصورت انداز میں سناتا تھا — لیکن قیمت ———
ملکۂ حسن بننے کی قیمت — مسٹر جان کی خواب گاہ — اوہ!
مس نسیم اس سرخ لباس میں تو آپ شیمپین کا چھلکتا ہوا جام لگتی
ہیں —

مس ورلڈ کے انتخاب سے دو دن پہلے کسی پریس کے نمائندہ نے اس سے انٹرویو کے لیے کہا تھا۔ وہ بولی "آپ رات کو کسی وقت آ سکتے ہیں۔ ابھی تو فرصت نہیں" اس نے جاتے جاتے مسکرا کر اس کی تعریف کی تھی "مس علی! آپ تو خود ایک دہکتی ہوئی نشیلی رات ہیں" — وہ دہکتی ہوئی رات کس کا عکس تھی؟ — دنیا کے آنسو — فریدہ کی مکاری — "میں تمہاری دشمن نہیں نسیم! خدا کے لیے نہ جاؤ" — "سنو نسیم! ابھی دنیا والے اگر تمہیں میرے خلاف بہکائے گی۔ اس نے تمہارے لیے سازش کی ہے" — لیکن سازش کا جال کس نے بنا — مالی نتیجہ — سوئمنگ — اسکیٹنگ — اقوالِ زریں — قرآن مجید کی آیتیں — گیتا کے اشلوک — سرکار دو عالم نے فرمایا "اگر تمہیں برے کام پر پچھتاوا ہو تو تم مومن ہو" گرفت — سراب — تشنگی — جھوٹی شہرت — بے معنی سپنے — کرشن جی نے ارجن سے کہا "ارجن! دنیا کیچڑ ہے لیکن اس کیچڑ میں رہتے ہوئے بھی اپنے من کو کنول کی طرح صاف ستھرا رکھو — اٹھ — (گیت اسی طرح بج رہا ہے)

آئینہ توڑ دے آئینہ توڑ دے

نسیم کانپتے ہوئے ہاتھوں سے HEAT AND DUST کے اوراق الٹتی ہے (بے چینی سے اپنے آپ سے) "کیا گزرے ہوئے وقت کو لوٹایا نہیں جا سکتا؟" — دنیا کی باتیں — قسمیں — اصرار

آئینہ توڑ دے

(نسیم فون اٹھانے کی کوشش کرتی ہے لیکن ریسیور ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے)

(لائٹ آف ہے۔ سارے شہر پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے)

نسیم :- (آذر کی تصویر سے مخاطب ہو کر) تم بہ ضد تھے اس بھلا تم نے خود کو کچھ کر لیا تو ...... ان کا حسن — نہیں نہیں میں کلا حسن نہیں — میں مس ورلڈ نہیں صرف نسیم ہوں۔ کرنل امجد علی خان کی اکلوتی بیٹی — آذر کی منگیتر —

(گیت بجتا ہی رہا ہے)

آئینہ توڑ دے۔ آئینہ توڑ دے

نسیم :- ہاں مجھے آئینہ توڑ دینا چاہیے۔ جس آئینے میں کچھ دکھائی نہ دے وہ ٹوٹ جائے تو اچھا ہے۔

(چہرے پر وحشت چھا جاتی ہے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی مسہری پر گر جاتی ہے)

(خاموشی چھا جاتی ہے)

نواں منظر

[صبح کا وقت۔ نسیم کے شاندار مکان میں اخبار نویس، ٹی۔ وی اور ریڈیو کے نمائندے، فوٹوگرافرز اور بہت سے لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ سامنے سے آذر آتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری رات شدید ذہنی کرب میں جھلستا رہا ہے]

آذر :- (سیون رام سے) نسیم ابھی تک سوئی ہوئی ہے؟

سیون رام :- ہاں حضور!

(آذر نسیم کے کمرے میں دستک دیتا ہے لیکن کوئی آواز نہیں۔ دھکا دینے سے دروازہ کھل جاتا ہے۔ نسیم سوئی ہوئی ہے)

آذر :- (قریب جا کر) نسیم! اب اٹھو نا۔ چھوڑو بھی جانے دو ساری باتیں — میں نے سوچ لیا ہے کسی بھی حال میں تم سے دور نہیں ہو سکتا — (رک کر) مجھ سے ناراض ہو گئیں؟ اٹھو بھی اب (منہ پر سے ریشمی چادر ہٹاتا ہے)

(نسیم کے گلے میں یاقوت کا بیش قیمت ہار جگمگا رہا ہے۔ انگلی میں منگنی کی انگوٹھی۔ مسہری پر بہت سے گلاب اور تحفے، رسالے، کتابیں، ہیرے کا بڑا سا گلدستہ، کپ اور خطوط بکھرے پڑے ہیں۔ نسیم کی آنکھیں بند ہیں۔ بدن سرد اور نیلا پڑ گیا ہے)

آذر :- (گھبرا کر اسے سنبھالتا ہے) یہ اٹھتی کیوں نہیں

(اس کا چہرہ اٹھاتا ہے)

آذر :- (سراسیمہ ہو کر) نسیم!!! (وحشت ناک چیخ مار کر نسیم کی لاش پر گر جاتا ہے)

(پولیس والا اور دوسرے لوگ جھک کر آذر کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں)

خوابوں کی دُنیا

ـــ از ـــ نزہت سعیدہ

ہائے کیسا دلفریب موسم ہے۔ ساون کی گھٹائیں چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر آرہی ہیں۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے اور بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا کو معطر کر رہی ہے۔ آموں کے جھنڈ میں چھپی کوئل کی کوک نے فضا میں نغماتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ایسے کیف آگیں موسم میں جب کہ ارمان مچلتے ہیں، آرزوئیں جنم لیتی ہیں، امنگیں انگڑائیاں لیتی ہیں اور دل بے اختیار جھوم اٹھتا ہے میں اس سہانے موسم سے لطف اندوز ہونے کے بجائے دریچے میں خاموش بیٹھی ماضی کے مرغزاروں کی سیر کر رہی ہوں۔ میری نگاہیں باغ کی خوبصورت روشوں پر جمی ہوئی ہیں۔ لیکن دماغ دور ـــ کہیں دور چکراتا پھر رہا ہے۔

آہ وہ بیتے ہوئے خوبصورت دن ـــ! جب ہر فکر سے آزاد ہم ہر ایک لمحے کا لطف اٹھاتے ہوئے زندگی کی شاہراہ پر اس شان بے نیازی سے گامزن تھے جیسے دکھ و پریشانی کے وجود سے یکسر بے نیاز ہوں۔ آج مجھے رہ رہ کر لڑکپن کے وہ دن یاد آرہے ہیں جو میں نے اپنی آبائی حویلی میں اپنی چچازاد بہن نغمہ کے ساتھ گزارے تھے کتنی محبت تھی ہم دونوں میں اور کتنا تضاد تھا ہماری فطرتوں میں۔ وہ ٹھہری تصوراتی دنیا میں بسنے والی ایک حساس لڑکی اور میں ٹھہری ایک حقیقت پسند سائنس کی طالبہ۔ وہ ہر وقت حسین خیالات کے تانوں بانوں میں الجھی رہتی جبکہ میں ہر دم اسے اس دنیا کی ٹھوس حقیقتوں سے روشناس کرانے کی کوشش کرتی رہتی۔ مجھے اسکی جذباتی اور رومانی باتوں سے الجھن ہوتی تو اسے میری حقیقت پسندی ایک آنکھ نہ بھاتی لیکن طبیعتوں کے اس بعد المشرقین کے باوجود ہماری دوستی... بے مثال اور ہماری محبت مستحکم تھی۔ ہمارا کوئی پروگرام ایک دوسرے کی شرکت کے بغیر نہ ہوتا تھا اور ہم ایک پل بھی ایک دوسرے کے بغیر چین نہ پاتے تھے۔

ماضی کے اوراق الٹتے الٹتے مجھے یکلخت برسات کی ایک ایسی ہی سہانی شام کی یاد آگئی ہے اور اس یاد کے ساتھ ہی مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی ہے۔ وہ شام جب کہ نغمہ کے اور میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ یادیں مجھے گھسیٹتی ہوئی ماضی کی اس دلفریب شام کی طرف لے جا رہی ہیں جو آج بھی میرے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے

اس روز موسم غیر معمولی طور پر کیف آگیں و سرور انگیز ہو گیا تھا موسم کی پہلی بارش نے فضا کو ایک عجیب نکھار و رعنائی سی بخش دی تھی۔ ایک عرصہ سے ظالم سورج کی جھلسا دینے والی شعاعوں کی تپش سہتے سہتے آج زمین ایک دم بارش کی بوندوں سے سیراب ہو گئی تھی پیڑ پودوں کے کمھلائے ہوئے چہرے بارش میں بھیگنے کے بعد جیسے کھل اٹھے تھے۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا اور ہر طرف خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں برآمدے میں بیٹھی موسم کی سحر آفرینی کا مزہ لے رہی تھی کہ نغمہ آدھمکی "ہائے فری ـ" اس سہانے موسم میں دیواروں کی بندش میں گھری بیٹھی ہے؟ اس وقت تو ہمیں قدرت کی لامحدود فضا میں نکل کر جھومنا چاہئے، خوشی سے ناچنا چاہئے اور ..." اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتی میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ "بس بس۔ یہ جھومنا ناچنا گانا سب تمہیں کو مبارک ہو۔ ہم تو یہیں بیٹھے بیٹھے موسم سے لطف اندوز ہوں گے۔

"یہیں سے؟" وہ حیرت سے بولی "یہاں سے کیا خاک لطف اٹھایا جا سکتا ہے؟ ذرا باہر نکل کر تو دیکھو کہ بارش نے کس طرح ہر ذی حس کو ایک نئی زندگی بخش دی ہے کیسے ایک ایک شجر کا حسن نکھار کر رکھ دیا ہے۔

اب چھوڑ بھی یہ شاعرانہ گفتگو۔ چل باورچی خانہ میں چلتے ہیں اور مزیدار پکوڑیاں تل کر موسم کا صحیح لطف اٹھاتے ہیں" میں نے کہا "ہائے فری تو اس عمر میں ہی کتنی ٹھوس اور خشک ہو گئی ہے۔

ہی ماوائی فضا میں سوچیں بھی تو کیونکر، یوں کہ؟ نہیں میں تجھے یہ غیر شاعرانہ کام ہرگز نہ کرنے دوں گی۔ چل میرے ساتھ۔" اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی وہ مجھے گھسیٹتی ہوئی باغ میں لے آئی سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے خود اس نکھری ہوئی فضا میں آکر ایک طمانیت کا احساس ہو رہا تھا لیکن اسے چھیڑنے کی خاطر میں نے اپنے اوپر بیزاری مسلط کرتے ہوئے کہا "آخر یہ بھی کوئی وقت ہے باغ میں چہل قدمی کرنے کا؟ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے کپڑے الگ خراب ہوں گے پر نغمہ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں وہ مسحور سی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے لبوں سے بے اختیار یہ جملے پھسلنے لگے "آہ یہ ساون کا موسم بھی کیسا ظالم ہوتا ہے نہ جانے دل کے کون سے تاروں کو چھیڑ دیتا ہے کہ ارمانوں میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ دل میں چھپی حسرتیں اپنی پوری شدت سے جاگ اٹھتی ہیں اور من کرتا ہے کہ پنکھ لگا کر آسمان کی وسعتوں میں اڑ جاؤں اور اڑتی ہوئی دور بہت دور سپنوں کی وادی تک پہنچ جاؤں۔" اس وقت اس کی شاعرانہ فطرت اپنے عروج پر تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "محترمہ ہوش میں آئیے۔ کہیں اڑنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں نہ توڑ بیٹھنا۔" اب نغمہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ خفا ہوتی ہوئی بولی "فرح۔ تم انتہائی خشک ہوتی جا رہی ہو۔ میں باز آئی تمہاری ہم نشینی سے" اور یہ کہتی ہوئی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔ لیکن مجھے اس کی خفگی بھلا کب گوارا تھی۔ میں بھی اسے منانے کے لئے اس کے پیچھے ہو لی چلتے چلتے نغمہ ایکدم ٹھٹھک سی گئی۔ اب ہم اپنے باغ کے سرے تک پہنچ گئے تھے۔ ہمارے باغ سے ملا ہوا پڑوس کی کوٹھی کا باغ تھا جو کہ ہمارے باغ سے کہیں زیادہ وسیع و خوبصورت تھا۔ دونوں باغوں کے بیچ صرف ایک دیوار تھی اور اس دیوار کا کچھ حصہ ڈھے گیا تھا۔ پڑوس والوں سے کوئی خاص دوستانہ مراسم نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے کبھی ان کے باغ میں جانے کی کوشش نہ کی تھی اور نہ ہی دیوار کے اس ڈھے ہوئے حصے کو کوئی اہمیت دی تھی۔ لیکن اب نغمہ اسی ٹوٹی ہوئی دیوار کے سامنے ٹھٹھک گئی تھی "اف کتنا پیارا منظر ہے" وہ سامنے دیکھ کر بڑبڑائی جیسے خوابوں کی دنیا میلوں تک پھیلتی ہوئی یہ سبز گھاس کی روشیں۔ حالانکہ دور دور تک پھیلی ہوئی اور جنگل تھی" اور یہ درختوں کے جھنڈ۔ اللہ جانے کیا یہ پُر اسرار خفیہ طلسماتی دنیا کا کوئی حسین دریچہ اپنی آغوش وا کئے ہمارا منتظر ہو۔" حالانکہ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار اور اینٹوں کے ملبے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ابھی میں یہ بے معنی باتیں ہی سن کر الجھ رہی تھی کہ نغمہ ایکدم دیوار کی جانب بڑھی "میں اس پار ضرور جاؤں گی نہ جانے کون سا خوشگوار حادثہ وہاں میرا منتظر ہے" لیکن اس سے پہلے کہ وہ دیوار کے اس طرف جاتی میں نے اسے تھام لیا۔ "تمہیں کچھ پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ کیا سوچیں گے وہ لوگ۔ اس طرح چوروں کی طرح ان کے باغ میں گھس رہی ہو۔"

"سوچیں گے کیا؟" وہ بولی "خوش ہو جائیں گے کہ کیسی باذوق لڑکی ہے جو کہ اس دلفریب موسم سے لطف اندوز ہونے کا ذوق سلیم رکھتی ہے"

میں جل ہی تو گئی "ہاں اور کیا؟ وہ تو پھولے نہیں سمائیں گے کہ تم نے ان کے باغ میں قدم رنجہ فرما کر ان کی عزت افزائی کی ہے" لیکن نغمہ میرے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ "ہاں اور ایک حسین و جمیل لڑکی نکل کر آئے گی اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے سارے باغ کی سیر کرائے گی اور پھر ایک خوبصورت کنج میں بٹھا کر تازہ انار کے عرق سے میری تواضع کرے گی۔" میں اچھی طرح جانتی تھی کہ پڑوس میں کوئی حسین و جمیل لڑکی نہیں رہتی لیکن اب نغمہ سے کون الجھتا لہذا اس کے پیچھے پیچھے میں بھی پڑوس کے باغ میں داخل ہو گئی کیونکہ میں اسے اکیلے تو نہیں جانے دے سکتی تھی۔ دیوار کی دوسری جانب امرود کے پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا۔ پیڑوں کی شاخیں امرودوں سے لدی ہوئی تھیں۔ نغمہ نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھائے ہی تھے کہ میں نے امرودوں کی طرف اشارہ کیا وہ ایکدم اپنی ساری شاعری بھول کر امرودوں کی طرف متوجہ ہو گئی کیونکہ امرود اسے بے حد مرغوب تھے جھٹ دوپٹہ اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر وہ درخت پر چڑھنے کو تیار ہو گئی میں نے اسے منع بھی کیا پر وہ نغمہ ہی کیا جو مان جائے۔ جلدی جلدی ایک ڈالی پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور امرود کھانے لگی۔ اب تو میرا بھی جی للچایا اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ کچھ دیر بعد میں نے نغمہ سے کہا کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لیکن وہ تو ایک بار پھر اپنی تصوراتی دنیا میں کھو چکی تھی۔ کہنے لگی "ارے رک تو سہی۔ دیکھ ابھی کوئی کنبا پیڑوں کے

کردا سعدی کا سا جوان رعنا ادھر نکل آئے گا۔ خیالات میں ڈوبا ہوا کوئی عشقیہ شعر زیر لب گنگنا تا ہوا جب وہ اس درخت کے نیچے پہونچے گا تو ایکدم ٹھٹھک جائے گا۔ دفعتاً اس کی نظر اوپر پڑ جائے گی اور وہ مسحور ومبہوت دم بخود کھڑا کا کھڑا رہ جائے گا۔" ہاں اور پھر ڈنڈا اٹھا کر ہماری تواضع شروع کر دے گا" میں جل کر بولی پھر کسی نوجوان کے بجائے ایک خادمہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں نے نغمہ کی توجہ ادھر مبذول کرائی تو وہ بولی" میرا خیال ہے کہ اس کوٹھی میں کوئی عمر رسیدہ خاتون رہتی ہوں گی۔ خود ہمارے خیر مقدم کو آنے سے معذور ہوں گی۔ لہٰذا خادمہ کو بھیج رہی ہوں گی کہ وہ ہمیں عزت کے ساتھ اندر لیکر جائے تاکہ وہ خاتون ہم سے ملاقات کر سکیں اور ہماری پر لطف باتوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

"نغمی یہ سب کچھ نہ ہوگا۔ خادمہ ہمیں یہاں سے بھگانے کو آرہی ہے اس سے پہلے کہ وہ ہماری بے عزتی کرے جلدی سے بھاگ چل" میں نے کہا۔ پر نغمہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ مجبوراً میں بھی بیٹھی رہی۔ اب خادمہ درخت کے قریب پہنچ چکی" کون ہیں آپ لوگ؟" اس نے رکھائی سے پوچھا اس سے پہلے کہ نغمہ کچھ کہتی میں نے کہا" ہم لوگ پڑوس میں رہتے ہیں"

بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں آپ لوگ فوراً چلی جائیے" خادمہ نے کہا اور زیر لب بڑبڑانے لگی۔ کہیں لڑکیاں بھی اس طرح دوسروں کے گھر گھس آتی ہیں۔ نغمہ ایکدم تصوراتی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آگئی اور ہم دونوں جلدی سے درخت پر سے کود کر اپنے باغ کی طرف بھاگے پیچھے سے خادمہ کی آواز بدستور آرہی تھی" چلی آئیں اپنا باغ سمجھ کر۔ نہ جانے کتنے امرود توڑ ڈالے"

جیسے ہی ہم اپنے باغ کی چار دیواری میں واپس پہونچے میں نے نغمہ کو ستانا شروع کیا

"نغمہ مزہ آیا تمہیں طلسماتی دنیا کی سیر کر کے؟ بڑی آئی بیچاری خوابوں کی دنیا میں جانے والی۔

اور وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگی" تو میں کیا کروں اگر اس کمبخت میں رہنے والے ہوں ہی ایسے سخت دل۔ لیکن ریتم کو بھی ماننا پڑے گا کہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی پر لطف تو ہم نے خوب اٹھایا اور میں یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ اب اس کج بحث کو کون قائل کرے

اور آج اتنے برسوں بعد بھی جب یہ واقعہ مجھے یاد آتا ہے تو لب بے اختیار تبسم ہو اٹھتے ہیں اور یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

تبصرا

• تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا چاہیئں

• رات کے ہزار ہاتھ۔ کلام سید علی ظہیر۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات ۲۰۰ اور قیمت پندرہ روپے۔ ناشر فردوسی پرنٹرس و پبلشرس۔ حیدرآباد
ملنے کا پتہ اردو اکاڈمی۔ آندھرا پردیش۔ حیدرآباد۔

شاید ہی اردو میں اتنی گراں کوئی کتاب چھپی ہو۔ اور نہ جانے کون آنکھ والے اسے خریدنے پر آمادہ ہو سکیں گے۔ اس لئے کہ ۲۰۰ صفحات کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ چند صفحات کے برابر بھی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک صفحہ پر یہ چھپا ہے۔

میرے آگے سمندر ہے۔
میرے پیچھے۔
ہزاروں سال کی یادوں کا صحرا۔
میں اک ٹیلے پر استادہ
تمہیں آواز دیتا ہوں

صفحہ ختم اب دوسرا ملاحظہ فرمائیں۔

گر دست آسمان سے گر کر۔
رات بھر میں نے بیٹھ رگڑا ہے۔
صبح دامانِ آسمان پہ ایک۔
خون کا دھبہ گواہی دیتا ہے۔

یہ ہے نمونہ کلام۔ آپ شاید کہیں مطلب سمجھا دوں۔ تو مطلب کیا سمجھاؤں گا، میں خود نہیں سمجھ سکا یہ سب کیا ہے اسے تو ظہیر صاحب خود ہی سمجھا سکتے ہیں بس اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ ترقی پسند کلام ہے۔ اسے سمجھنے بھی ترقی پسند ہی آئیں۔ ہم سے قدامت پرست اسے ہزار برس نہ سمجھ سکیں گے۔ نمونہ کلام تو صرف اس لیے دے دیا گیا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ پندرہ روپیہ میں اسی طرح کی ۵۰ منظومات آپ پڑھ سکیں گے۔ انھیں علی ظہیر صاحب نے ایک سلام "حسین شاہ شہیداں" کے نام شائع کیا ہے جس کا ایک بند نمونتاً شائع کر رہا ہوں۔

چلی ہے رسم شہادت ترے ہی مقتل سے
اٹھی ہے موجِ شجاعت ترے ہی مقتل سے
ملی ہے ہم کو صداقت ترے ہی مقتل سے
ہوئی امید شفاعت ترے ہی مقتل سے
ستاں پہ بولتے قرآں سلام ہو تجھ پر
حسین شاہ شہیداں سلام ہو تجھ پر

لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ سمجھ میں نہ آنے والی شاعری کرنے والا شاعر ایسا کلام بھی لکھ سکتا ہے۔ میں نے ایسی ہزار ہا عورتوں کو دیکھا ہے جو جامۂ انسانیت میں رہا کرتی تھیں۔ کوئی ان کے جسم کی جھلک بھی نہ دیکھ سکتا تھا مگر اسی ترقی پسندی کے تحت اب ان کا سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ لباس بھی ان پر شرماتا ہے۔ ایسا ہی انقلاب شاعری میں بھی رونما ہو تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔

چند بہتر باتیں

• بہترین آدمی وہ ہے جو اوروں کا آرام اپنے آرام میں چاہے
• بہتر رفیق راہ روشنی یا ستو ہے۔
• بہتر کلام وہ ہے جو تھوڑا ہو الفاظ میں اور بہت ہو معنی میں۔
• بہترین کلام وہ ہے جو کہنے والے نے سچ کہا ہو اور سننے والا کو نفع پہنچا ہو۔
• بہترین قول وہ ہے جو موافق حق نکلے ہو۔
• بہترین نعمت عقل ہے۔
• بیکاری سے بیگاری بہتر ہے۔
• اوسط کام سب کاموں میں بہتر ہے۔
• سچائی کی موت جھوٹ کی حیات سے بہتر ہے۔
• نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔

مرسلہ: ۔ی عظمت ترنم (آسبور)

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو صرف ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور مختصر سے مختصر الفاظ میں لکھی جائے اور نمبر خریداری کے ساتھ ہی پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی جائے۔ خبر کی اشاعت میں کتابت کی اتفاقیہ غلطی کی ذمہ داری ادارہ حریم پر نہ ہوگی ——— ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

• میرے محترم کرم فرما۔ اردو کے صاحب طرز مزاح نگار اور شاعر جناب خوشحال کلیم برقؔ آشیانوی صاحب نے میرے نواسے کاشف سلمہٗ کی ولادت کی قطعہ تاریخ لکھ کر روانہ کی ہے جو حسب ذیل ہے

قطعہ تاریخ ولادت فرزند منصور و نجم السحر سلمہا

سیدِ صاحب کی ولادت باسعادت کے سبب

ہے نسیم جانفزا در گلستان انبساط

سرپرستوں کو مبارک برقؔ کی جانب سے ہو

نونہال خوش جمال و طوطی باغ نشاط

۱۳۹۰ء

• مختار احمد صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل آفس لکھنؤ کی صاحبزادی فرزانہ سلمہا کو اللہ پاک نے ۱۱ اگست ۱۹۸۶ء بروز جمعرات بوقت دن ۱۱ بجکر دس منٹ پر پہلی بار اللہ پاک نے ایک پھول سی بچی عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور صاحب نصیب بنائے۔ ——— تسنیم انجو لوکی

• نجمہ اعجازی (مظفر پور) میرے چھوٹے بھائی مقبول احمد اعجازی ایڈوکیٹ و بھاوج سلطانہ اعجازی صاحبہ کے گلشن حیات میں ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء بوقت ۱۰ بجے دن پہلا پھول کھلا۔ دعا ہے کہ

اللہ پاک اسے عمر دراز بخشے صاحب نصیب بنائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے

• ملتفت ترنم (اسیور) ہمارے بہنوئی عبدالباقی کے گلشن حیات میں اللہ تعالیٰ نے پانچویں بار ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء بروز اتوار بوقت دن ایک نازک سی گڑیا عطا فرمائی۔ نام فرحانہ تبسم قرار پایا اللہ پاک عمر طویل دے اور والدین و بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے جائے۔

• رفعت صفی (جمشید پور) میری باجی فرحت مظفر اور نوشے بھائی ایم۔ اے۔ مظفر کے گلشن حیات میں ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء بروز اتوار بوقت ۴ بجے شام ٹاٹا مین ہاسپٹل جمشید پور میں ایک کلی کھلی۔ نام صدف رکھا گیا۔ اللہ پاک اقبال مند بنائے۔ آمین

• مس ہناز فریدی (مراد آباد) میرے بڑے بھائی محمد عالم فریدی کی زندگی کو پربہار بناتے ہوئے اللہ پاک نے پہلی مرتبہ ۲۴ فروری ۱۹۸۶ء بروز سنیچر بوقت صبح ۷ بجے ایک ننھی کلی کھلائی۔ نام فرزانہ فریدی قرار پایا خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے نیک صالح اور صاحب نصیب بنائے۔

• نرگس جمال (سیوڑی) میرے چچا سکندر الٰہی صاحب اور پیاری چاچی سلطانہ پروین صاحبہ کے چمن حیات میں ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء بوقت جمعرات ۱۱ بجے دن ایک گڑیا عطا فرمائی رب العزت سے دعا ہے کہ بچی عمر دراز پائے اور والدین کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔

• مسز زاہد محمود صاحبہ (ناگپور) کی صاحبزادی ناہید سلمہا کو اللہ پاک نے ۵ ستمبر ۱۹۸۶ء کی صبح پونے پانچ بجے ایک فرزند عطا فرمایا مجھے کلی مسرت ہوئی ہے میں بہن زاہد محمود صاحبہ کو نواسے کی مبارکباد پیش کرتا ہوں اللہ پاک نومولود کو عمر طویل بخشے اور فخر قوم بنائے۔

• افضل خبر کے ساتھ ڈاک ٹکٹ نہیں ہے نہ نمبر خریداری۔

پیغامات نشاط

میرے مرحوم دوست عبدالحق خاں صاحب کی بیٹی انجمن آرا سلمہا کی دختر نیک اختر فرحت اشرف سلمہا کی شادی نفیس احمد سلمہٗ پسر جناب صابر خاں صاحب ریٹائرڈ بی ایچ ای ایل بھوپال سے

کے ساتھ ۲۲ ستمبر ۹۰ء بوقت ۱۱ بجے دن بمقام نشیمن گنج لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ پاک دونوں کو خوش رکھے بھابی صاحبہ (اہلیہ عبدالحق خان صاحب) کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں

نسیم انہونوی

- میرے قدیم دوست اور ادارہ اکیڈمی لکھنؤ کے روح رواں جناب صباح الدین عمر صاحب کے فرزند صدیق سلمہ کی شادی ہمراہ شیلا سلمہا دختر نیک اختر جناب صلاح الدین عثمان صاحب) رتھا سینما ہال لکھنؤ ۲۰ ستمبر ۹۰ء بروز اتوار بوقت سہ پہر بحسن و خوبی انجام پائی۔ ۲۲ ستمبر کی شب میں صباح الدین عمر صاحب نے بارہ دری قیصر باغ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی جس میں ادبا، شعراء اور معززین شہر نے شرکت کی اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

- محمد یوسف صاحب (دانم بازی) کے فرزند ارجمند عزیزی محمد اسمٰعیل سلمہ کا عقد سلیم کوثر سلمہا دختر نیک اختر جناب خطیب فضل الرحمن صاحب کے ساتھ ۳۰ ستمبر ۹۰ء بروز یکشنبہ بوقت صبح ۱۱ بجے بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے نسیم انہونوی

- خریداری نمبر ۹۴۴۰۔ مرسلہ خبر شادی سمجھ میں نہیں آسکی صاف صاف لکھ کر دوبارہ روانہ کریں

- ۷۶۵۶ خبر بلا ٹکٹ وصول ہوئی

- مولوی عبدالعزیز صاحب (دانش چیمبن کرشنگیری) کی دختر نیک اختر منور فاطمہ سلمہا کا عقد مسعود عزیزی نثار احمد سلمہ (ابن جناب محمد غوث عرف بابا صاحب مرحوم تن جن گڈھ) کے ساتھ ۹ اکتوبر ۹۰ء بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے صبح بحسن و خوبی انجام پایا چودھری محمد نذیر صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں افسوس کہ دعوت خصوصی کے باوجود اتنا طویل سفر نہ کرسکا اس لئے کہ صحت بیحد خراب ہے۔ نسیم انہونوی

- زینب (مدراس) میرے بھائی آدم سیٹھ کی شادی خدیجہ دختر مرحوم یعقوب سیٹھ صاحب کے ساتھ اور میری بہن خدیجہ کی شادی سلیمان (فرزند مرحوم یعقوب سیٹھ صاحب) کے ساتھ بروز جمعہ بوقت ۸ بجے شب بمقام پانڈیچری بحسن و خوبی انجام پائی دعا ہے کہ اللہ پاک ان چاروں کی ازدواجی زندگی کو مسرتوں اور شادمانیوں سے سرشار کرے۔

- مرحوم سید قطب الدین جونپوری کی صاحبزادی ام شمیمہ سلمہا کی شادی محمد اعجاز الحق سلمہ (ابن جناب محمد نثار الحق) کے ساتھ بمقام پرنگلش ہوٹل لکھنؤ ۲۰ ستمبر ۹۰ء بروز جمعرات بعد نماز مغرب بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔ افسوس کہ خرابی صحت کے باعث میں شرکت نہ کرسکا نسیم انہونوی

انتقال پرملال کی خبریں

- بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شمس الحسن صاحب کی اہلیہ اور میری عزیزہ بھابی خدیجۃ الکبریٰ عرف امین فاطمہ (خوش گڈھی) بنت جناب مولوی عبدالرؤف صاحب وکیل مرحوم ۲ اکتوبر کو انتقال فرماگئیں۔ ۱۲ ½ بجے میں انھیں دیکھ کر آیا اور ۳ بجے انتقال کی خبر ملی اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مرحومہ بڑی خوش مزاج، ملنسار، اعزہ پرور اور علم دوست خاتون تھیں۔ مولود نورانی کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی تھی جسے میں نے ہی شائع کیا تھا

میت نماز جنازہ کے بعد لکھنؤ سے ۳ اکتوبر کی صبح خوش گڈھ جائے گی اور وہیں آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردی گئی۔

بندے نام اللہ کا نسیم انہونوی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت نوری بہنوں اور بھائیوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، معیاری سنجیدہ اور معلوماتی ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ نومبر کے لئے عنوان ہے "الزام" اور دسمبر کے لئے "رسوائی"

اللہ اللہ ذمہ داری ایک مشت خاک کی
غم اٹھانے کے لئے دنیا کا انسان ہو گیا

مرسلہ: عارفہ جمیل (اٹاوہ)

اللہ۔ اللہ میرے سوز محبت کا اثر
انکی پلکوں پہ بھی تارے سے چمک جاتے ہیں

مرسلہ: مہ جبین (حسان)

اللہ رے غرور کہ آئینہ دیکھ کر
اپنے ہی عکس سے ہے شکایت سلام کی

مرسلہ: قمر نیازی (آگرہ)

کشتۂ ناز بتاں روز ازل سے ہوں، مجھے
جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

مرسلہ: صوفیہ منظر (جمشید پور)

اللہ کا عزیز ہے ہر ایک روزہ دار
تسلیم حکم رب ہی سے مسلم کا ہے وقار

مرسلہ: رفیقہ یاسمین (بیلا سیتا مڑھی)

اللہ کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں
خیال رزق ہے، رزاق کا خیال نہیں

مرسلہ: حمیدہ فاروقی
(بنگلور)

پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ چاندنی درختوں پہ تسبیح نور ظہور

مرسلہ: ثمینہ منہاج
(جامعہ نگر کانپور)

اللہ اللہ جو مری خوشیوں میں تھے کل تک شریک
آج وہ ہی ہنس رہے ہیں میرے حال زار پہ

مرسلہ: کلیم النساء یوسف تاج (ممبئی)

کیا اب بھی مرے درد کا درماں نہیں ہوگا
اللہ! میرے حال پہ روتی ہیں دعائیں

مرسلہ: ماجدہ نسرین لاری (کانپور)

سامنے سبز گنبد کا منظر بھی ہو
لب پہ تکبیر اللہ اکبر بھی ہو

مرسلہ: سائرہ رحمت (آسنسول)

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

مرسلہ: مس انجم نرگس بی۔اے (آگرہ)

دنیا کی کسی چیز پہ مغرور نہیں ہیں
سب سے ہے بڑا تیرا سہارا مرے اللہ

مرسلہ: بیگم عائشہ صدیقہ اعجری ناز (آسنسول)

کفر کی رغبت بھی ہے دل میں بتوں کی چاہ بھی
کہتے جاتے ہیں مگر دل سے معاذ اللہ بھی

مرسلہ: عقیلہ ہارون بالاپی (فرخ آباد)

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرق ناک

مرسلہ: قمر نگار جلیلی (آسنسول)

اللہ سے مجبوری اللہ رے مختاری
ہم سر کو جھکاتے ہیں وہ تیغ کو کھینچے ہیں

مرسلہ: مس مدینہ شمسی (آگرہ)

سبھی خوبی، سبھی تعریف ہے اللہ کو زیبا
بزرگی ہے اسی آقائے حاکم جاہ کو زیبا

مرسلہ: [illegible] عظمت ترنم (آسنسول)

مہر اللہ رکھے تا قیامت
یونہی قائم گلستاں محمد

مرسلہ: مہر افروز
(دھنباد)

رات ایک تارہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

مرسلہ: مس زاہدہ فضلی (رامپور)

اللہ سے دید گنبدِ خضریٰ کی آرزو
اک بار دیکھ کر اسے سو بار دیکھئے

مرسلہ: بے بی (ارار یہ کورٹ)

اللہ سے حفیظ اسکا یہ ذوقِ خود آرائی
جب زلف سنواری ہے اک آئینہ توڑا ہے

مرسلہ: شگفتہ واریا (کلکتہ)

میرے سرکار کی فرقت میں جو رنجیدہ نہیں
تم ہی کہدو کہ وہ اللہ سے کیا دور نہیں

مرسلہ: مسز عبدالکلام رومی (بیگم سرائے)

اللہ تو سبکی سنتا ہے جرأت ہے شکیل اپنی اپنی
حالی نے زباں سے اف بھی نہ کی اقبال شکایت کر بیٹھے

مرسلہ: مس مینو رضوانہ (چیوارہ جنگیر)

تم ظلم کئے جاؤ ہم صبر کئے جائیں
اللہ تو حاکم ہے اللہ جزا دے گا

مس شائستہ شریف، مس بدر شاہین (آگرہ)

سبھی کو پریشانی میں اللہ یاد آتا ہے
سکوں ملتے ہی وہ نام خدا پھر بھول جاتا ہے

مرسلہ: مس ملکہ بانو (چکمگلور)

وہ پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

مرسلہ: نصرت پروین ضیا (ملک چک۔ الدہ)

اللہ حسن دے تو حیا بھی ضرور دے
کس کام کی وہ آنکھ کہ جس میں حیا نہ ہو

مرسلہ: افضل غلام ماکراسے (شری وردھن)

مذہب کے تصور کو بتا یہ بے راہ روی
اللہ رے مسلماں کی یہ آشفتہ مزاجی

مرسلہ فوزیہ شمسی آگرہ

کب کب سلام نہ کریں؟

مرسلہ: مس ملکہ بانو (چکمگلور)

جب کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو
جب کوئی نماز پڑھ رہا ہو
درس قرآن ہو رہا ہو
جمعہ کا خطبہ سن رہا ہو
اذان سن رہا ہو
استنجا کر رہا ہو
کھانا کھا رہا ہو
تو سلام نہ کریں۔

شفاف آدمی تھا بیٹی۔ اندر اور باہر سے اجلی۔ اللہ نے آگے کی بات دل میں اتار دی ہوگی۔

پھوپھی اماں۔ مجھے کوٹھی چھوڑتے بہت دکھ ہو رہا ہے۔

"یہ بیٹی تمہاری ہی رہے گی۔ فی الحال تمہارا چلنا بہت ضروری ہے بیٹی۔ ایک تو مرحوم کی وصیت ہے۔ دوسرے تم نرغہ اعدا میں ہو۔ میں نہیں جانتی یہ سب کون ہیں اور ان میں سے کسی کے یہاں جا کر تمہارا کیا حشر ہوگا... تم سونے کی چڑیا ہو بیٹی جسے یہی چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے آہنی قفس میں قید کر لیں۔"

جج صاحب کا خط پڑھ کر جیسے نے اپنے اندر ایک الوہی طمانیت محسوس کی۔ جیسے خدا کے ہاتھ شفاس کے دل پر ٹھنڈا اجالا رکھ دیا ہو۔ بار بار اس نے ایک ایک سطر پڑھی اور ہر بار ہر لفظ سے نئی روشنی حاصل کی۔ اسے اپنا مکان چھوڑتے افسوس اور صدمہ ضرور تھا مگر چونکہ یہ اس کے پیارے باپ کی خواہش تھی۔ وہ بخوشی ان کا حکم ماننے پر تیار ہوگئی۔

کوٹھی میں مقیم معزز خواتین نے جج صاحب کے فیصلہ سے آگاہ ہونے کے بعد ہنگامہ تو بہت مچایا لیکن بہر حال انہیں جبراً و قہراً کوٹھی چھوڑنی پڑی۔

تین ہی دن بعد کوٹھی میں اُلو بولنے لگے۔ منشی صاحب اپنے آدمیوں کے ساتھ مرحوم کا سامان ایک بڑے کمرے میں پیک اور مقفل کرانے میں مصروف رہے۔ پھوپھی اماں اپنے بھائی کی ایک ایک چیز بکسوں میں بند کراتی رہیں۔ جج صاحب کی کوئی چیز انھوں نے یہاں نہیں چھوڑی۔ البتہ چند لباس، گھڑی، جوتے اور کچھ سامان ان کے دیرینہ رفیق اور وفادار خادم منشی صاحب کو ضرور دے دیئے!

جیسی اپنے گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر انہیں اپنا درد دل سناتی اور ان کی غریب الوطنی پر رولا۔ پھر ایک دن نامعلوم عرصہ کے لیے رخصت ہو کر اس سے جدا ہونے والی تھی۔

(باقی آئندہ)

آگ میں پھول

○

عفت موہانی

قیمت

ناشر
نسیم بک ڈپو • لاٹوش روڈ لکھنؤ
ٹیلیفون: ۲۳۲۳۴-۲۵۵۰۹

باہتمام عزیز الرحمٰن پریس میں چھپکر شائع ہوئی

خدا انھیں سرسبز و شاد کام اور ہمیشہ با مراد رکھے۔ خدا حافظ و ناصر ہو!

تمہارا باپ

احتشام علی خاں

آنسو پونچھ کر پھوپھی اماں نے کہا: "بھیا کا تار ملا تھا۔ لیکن دیر ہو گئی۔ مصطفےٰ گھر پر نہیں تھے وہ شکار گاہ سے واپس آئے تو میں نکل سکی۔ اور پھر مجھے یہ کیا پتہ تھا کہ میں بدنصیب بھیا کے مرنے میں جاؤں گی۔ اطمینان سے آئی۔"

"آپ صاحبزادی کو لے جائیے بیگم صاحبہ!" منشی صاحب نے رائے دی: "میں کوٹھی کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اسے صاحب نے عطر ساز کو کرائے پر دے دی تھی۔ دس بارہ روز میں ان کا سیزن آغاز ہوگا۔ خدا کروٹ کروٹ صاحب کو جنت نصیب کرے وہ تو مجھ بڑے چراغ سحری کو بھی نقد پانچ ہزار اور پہلی طرف کے دو لوں کر گئے گئے۔ اللہ اللہ۔ میرے سامنے بچے سے وہ جوان ہوئے۔ چل بھی دیے۔ میں بیٹھا جولا ان کی موت پر آنسو بہانے کے لیے۔ کیا مالک کے کارخانے ہیں!"

"پھوپھی اماں۔ ہمارے گھر میں یہ سب لوگ کون بھرے ہوئے ہیں؟" جبیں نے پوچھا۔ "پتہ نہیں بیٹی۔ ہمارے رشتہ دار تو وہ نہیں ہیں۔ شاید تمہاری ماں کے عزیز ہیں۔"

"آپ ان سب کو آگاہ کر دیجیے کہ ہفتہ بھر کے اندر اندر کوٹھی خالی کر دی جائے۔" منشی جی نے کہا: "پتہ نہیں۔ کون لوگ ہیں۔ یہ صاحبزادی کے ننہال عزیز بیٹھے ہیں!"

"ایک بڑی خالہ بن بیٹھی ہیں اور دوسری امی کی عزیز سہیلی۔" جبیں نے کہا۔ "وہ جو کوئی ہوں۔ تمہیں تو چلنا ہے میرے ساتھ۔" پھر پھی اماں نے کہا: "یہ اچھا ہوا کہ میں آ گئی۔ اگر بھیا کے خط کو غیر اہم کہہ کر یہاں نہ آتی تو آج تم بہت پریشان ہوتیں!"

پھر بھی اماں۔ کیا لڑکی کو باپ کی موت کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے سارے ضروری کام اپنی نگرانی میں کر لیے۔ ہمارے لیے کرنے کو کچھ بھی نہیں۔"

میرے سارے ساتھی اور بیچارہ مگر میری زندگی ہی میں مجھے موت کا پیغام
مل چکا ہے۔ تم سے چھپا کر میں نے تمام تدابیر اختیار کیں۔ اپنے لیے نہیں بیٹی
میں تمہارے لیے جینا چاہتا تھا لیکن اس میں پروردگار عالم کی کوئی
مصلحت ہوگی کہ وہ مجھے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ بیٹی۔ میرے بعد
رونا دھونا۔ ہوش کھونا اور گرد و پیش سے غافل ہو کر اپنے آپ کو...
دولت کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا۔ اپنی مرضی اور عقل سے
کام نہ لینا۔ سخت نادانی، ناسمجھی اور غیر دانشمندی ہے! تم تعلیم یافتہ،
سمجھدار اور ذہین ہو۔ میری موت و جدائی کو ناگزیر سمجھ کر اپنے مستقبل
کا نصب العین بناؤ! کاش نرجس یہاں ہوتیں۔ انھیں دہلی سے آتے
آتے چند دن ضرور لگ جائیں گے۔ بہرحال وہ تمہاری حقیقی پھوپھی ہیں ان
کے ساتھ چلی جاؤ۔ خدا تمہیں ہر حال میں خوش رکھے۔ جہاں رکھے۔ بیٹی۔
ہر آدمی کو منزل تک پہونچنے کے لیے متعدد نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے
فراز پر پہنچ کر مغرور نہ ہونا۔ نشیب میں جا کر پست ہمت ہونا بھی اچھا نہیں
ایک بات اور کہتا جاؤں کہ۔ اب کسی کا قرض یا حق مجھ پر واجب الادا نہیں
ہے۔ یہ مکان، کالج کی عمارت، باغات اور نقد ساری جائداد۔
اب تمہاری اور صرف تمہاری ہے۔

میری بیٹا۔ میری بچی۔ تم ایک آہن دل انسان کی بیٹی ہو۔ جسے اپنے
فرشتہ موت پر دستخط کرتے ہوئے مطلق ہراس اور خوف نہیں۔ مایوسی۔
بزدلی اور بدبختی کو اپنے وجود کے پاس بھی آنے نہ دینا۔ بس مجھے اتنا
ہی کہنا تھا۔ میری پیاری بچی! اپنے باپ کی آخری نصیحت یاد رکھنا۔
[illegible] تمہارا [illegible] اور خدا کی یاد تمہاری [illegible] ہے

اپنی عزیز ترین چھوٹی بہنوں
یاسمین اختر اور پروین اختر
کے نام
خلوص و محبت جن پر ختم ہے

برحق ہے۔ میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ میرے بعد میری بچی کا کیا حشر ہوگا... ہاں دیکھئے اب یاد آیا۔ انھوں نے صاحبزادی کے نام ایک خط بھی دیا ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔ میں نے اپنے صندوق میں چھپا رکھا ہے۔ اس عرصہ میں کسی کو اتنا ہوش ہی نہ تھا۔ میں مناسب وقت کا منتظر تھا۔"

منشی چچا۔ ڈیڈی کا خط کہاں ہے؟" وہ بے چین ہوکر بولی۔

"ابھی لاتا ہوں۔ بیٹی۔ ابھی لایا" منشی صاحب نے کہا "ہاں تو۔ بیگم صاحب۔ جب صاحب کو یقین ہوگیا کہ وہ بچنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے اپنے وکیل سے لکھ کر وصیت تیار کرا لی۔ پرسوں ساری رات اور سارا دن نماز و تلاوت میں گزارا۔ پھر آج سے تین روز پیشتر صبح سویرے ہی دبی جان لیوا درد اٹھا۔ دل پکڑ کر بچھونے کا اندکا میں آیا۔ اور ڈاکٹر کو فون کرنے بھاگ رہا تھا کہ وہ بولے۔ اب اس کا آنا بے سود ہے مجھے یٰسین سناؤ۔ وہ مجھے زبانی یاد تھی۔ میں نے آرام سے بستر پر لٹا دیا۔ پھر یٰسین شریف آدھی ہی سنا سکا تھا کہ ایک ہچکی اٹھی آئی۔ منہ سے نکلا "یا اللہ۔ میری بچی" اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے سو گئے۔"

منشی صاحب نے بوڑھا چہرہ چھپا لیا اور بھاری بھاری سسکیوں سے رونے لگے۔ پھوپھی اماں کی حالت ابتر تھی۔ ان کے شانو پر پریشانی ٹپکے وہ بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

جج صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

میری پیاری بچی۔ جگر گوشہ عزیز جیتی..!!

سب سے پہلے میں تمھیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ کسی حال میں خدا کو نہ بھولو۔ ہر غم اور خوشی منجانب اللہ ہے۔ تم سمجھدار ہو۔ جانتی ہو کہ آدمی کی پیدائش یعنی کے بعد موت اٹل ہے۔ بیٹی۔ میں تم سے کہنا یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں بہت... نامبارک مرض میں مبتلا ہوں۔ تم سے کہتا تو تم گھبرا جاتیں۔ تم سے کیا بن پڑتا؟

حد تھی۔ وہ ان کے سینے سے لگ کر بلک بلک کے رو دی! بیگم خان بھی غدرت گریہ عظیم بے مونس کا عالم تھا۔ پھر جب طوفان آہ و فغاں تھما تو انھوں نے اس کے آنسو پونچھے اور صبر کی تلقین کی!

بڑے صاحب کے سو جانے کے بعد آدھی رات کو قدرے فرصت ملی تو بیگم خان اسے لیکر اپنے بھائی کے کمرے میں پہونچیں۔ منشی صاحب بھی آ گئے! کمرہ بند کر کے سینوں نے سکھ کی سانس لی!۔

پھوپھی اماں آہیں بھر رہی تھیں۔ ان کا شاندار حسین و جمیل چہرہ افسردگی اور صدموں کے پردوں تلے چھپا ہوا تھا۔

منشی صاحب۔ یہ اچانک بھیا کو کیا ہو گیا تھا؛ انھوں نے پوچھا۔

منشی صاحب کی اندر دھنسی ہوئی زرد زرد دھندلی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

کیا بتاؤں۔ نرجس بیٹا۔ چھوٹے صاحب کو بیوی بیٹے کی جدائی کھا گئی۔ چھ سال سے دل کے بیمار تھے۔ مجھے منع کر دیا تھا کہ ان کی بیماری کا چرچا نہ کروں۔ ان کے دل پر ورم آ گیا تھا۔ چھ مہینے پہلے صاحبزادی سے پوشیدہ رکھ کر اپنا علاج کرایا تھا۔ لیکن وہ مرض لاعلاج نکلا۔ اب تو کچھ ہفتوں پہلے تمام ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ آپ اپنی وصیت تیار کر لیں۔ کیونکہ آپ کا دل کسی وقت بھی بند ہو سکتا ہے۔ آج سے تین روز پہلے جب صاحبزادی بورڈنگ میں تھیں۔ ان کے دل میں شدید درد اٹھا۔ میں ان کے خاص ڈاکٹر کو بلا لایا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا بھالا۔ پھر صاف صاف ان سے کہہ دیا کہ یہ آخری مرتبہ ہے۔ اس کے بعد جو دورہ اٹھے گا وہ جان لے کر ہی ٹلے گا؛

ہائے نامراد ڈاکٹر۔ تو نے یہ کیوں کہا؛ پھوپھی اماں رونے لگیں۔ یہ اس کی منحوس زبان سے یہ نامرادی کا پیغام کیسے نکلا۔ کیا سوچا ہوگا میرے بھائی نے۔۔۔!

وہ بہت دلیر تھے۔ بیگم؛ منشی صاحب نے کہا؛ کہنے لگے کہ منشی صاحب موت

پہلی قسط

ضمیمہ حریم اکتوبر سنہ ۶ء

کل اس وقت تک یہاں سب کچھ جوں کا توں تھا مگر آج۔ ایک رات میں ایسا بھیانک انقلاب آ گیا تھا جیسے کوئی آدمی متواتر ڈراؤنا خواب دیکھتا رہے۔ جاگنے کی کوشش کرے مگر جاگ نہ سکے!۔

وہ باغ میں کھلنے والے دریچے میں بیٹھی تھی۔ آسمان صاف نیلا اور چمکیلا تھا دور افق میں باز اور چیل پرندے ہوا میں تیرتے ہوئے سرمئی دھبے سے نظر آ رہے تھے۔ فضا اتنی چمکیلی تھی کہ اس پر نظر جمانا دشوار ہو رہا تھا۔ گھاٹ کے کنارے سے سینی ٹوریم کی سفید عمارت دھوپ میں متاثر کن طریقے پر واضح ہو گئی تھی۔ اس کے سنہرے کلس سونے کی طرح جگمگا رہے تھے۔

باغ میں اتنا سناٹا تھا جیسے ہواؤں کے دل بھی سینے میں تھم چکے تھے۔ ہر درخت اپنی جگہ ساکت و دم بخود کھڑا تھا۔ روش پر مالی کی لڑکی ہرن کے بچے کے ساتھ بیٹھی دھوپ کھا رہی تھی!

اس کی پرنم آنکھیں کبھی یہاں کبھی وہاں بھٹکتی ہوئی فواروں پر ٹھہر گئیں۔ باغبان نے فوارے بند کر دیے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے فوارے سے البتہ پانی یوں ٹپک رہا تھا جیسے بیوہ کی آنکھ سے بے آواز آنسو۔

اندر بڑے بڑے ہال خاموش تھے۔ طویل و فراخ دالان گم صم تھے۔ کمرے مقفل کرا دیے
گئے تھے!۔ اداس کا ڈھیروں سامان سامنے والے دالان میں رکھا ہوا تھا!۔

آج مجھ سے میرا گھر چھوٹ رہا ہے۔ اس نے چھوٹی سی سانس لے کر پشت سے سر
ٹیک دیا اور بے معنی انداز میں سامنے دیکھنے لگی۔ دیوار پر اس کی ننھی سی بھتیجی نے چند
رنگین لکیریں بنا کر کھینچ دی تھیں۔ چھ سال پہلے۔ اور تب اس کی زندگی دلکش ماحول حسین اور گھر
آباد تھا۔ ماں باپ زندہ تھے۔ بھیا بھی سروس کر رہے تھے۔ وہ تین ہفتوں کی چھٹی پر
آئے ہوئے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ ان کا آنا آخری مرتبہ کا ہے۔ وہ بھابی اور بچی کو
بھی ساتھ لیتے آئے تھے وہ دن بے حد مصروف اور خوبصورت تھے۔ وہ دن بھر اپنی ننھی
بھتیجی کے ساتھ کھیلا کرتی۔ اسی نے تو یہ رنگین لکیریں دیوار پر کھینچ دی تھیں۔ آج وہ بے جان
لکیریں زبان حال سے ماضی کو دہرا رہی تھیں۔ تین ہفتوں بعد بھیا بھابی اور بچی چلے گئے
ایک مہینے کے اندر اندر بھیا کے پلین کے حادثے کی خبر ملی۔ جب ان کی نعش تابوت میں رکھ
کر دہلی سے حیدرآباد لائی گئی۔ تب۔ امی نے اپنے جوان بیٹے کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم
اور خون میں لت پت دیکھا۔ ان کے منہ سے ایک سسکی تک نہ نکلی۔ بس وہ سکتے کی
حالت میں بیٹے کی لاش پر گریں۔ پھر زندہ اٹھ نہ سکیں۔

کیسی کالی گھٹا - وحشت زدہ پر چھا گئی تھی۔

ماں بیٹے کے جنازے آگے پیچھے کوٹھی سے نکلے تھے!۔

ان دنوں وہ صرف سولہ سال کی تھی اور بے شعور بھی تھی۔ اسے اپنی امی اور
بھیا بہت بے قراری سے یاد آتے تھے۔ لیکن [illegible] ڈیڈی کی پر محبت آغوش میں بہل گئی۔
ڈیڈی کو لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں سے پیار تھا [illegible] ایک ہی تھی اولاد اب ایک ہی رہ گئی تھی۔
ڈیڈی بہت اچھے بہت پیارے تھے۔ ان کا دل بیک وقت باپ کا بھی تھا اور ماں کا
بھی۔ وہ اسے مدتوں گھر سے باہر لے لے پھرا کیے۔ اس عرصہ میں سعالی نے کیپٹن مسعود

کوٹھی میں اس کے بہتیرے عزیز تھے جنھیں اس نے اپنے باپ کی زندگی میں بس یا تو بھی
کبھی کبھار گھریلو تقریبوں پر دیکھا تھا۔ جن کا کوئی تذکرہ جج صاحب نے کبھی نہیں کیا
تھا۔ نہ کوئی ان کے گھر آیا تھا۔ لیکن جواب قریبی عزیزوں کی طرح کوٹھی میں آ دھمکے تھے!۔
خالہ خمسہ تھیں۔ نہایت بھاری تن و توش کی خاتون۔ خوب سرخ و سفید۔ چاندی
سونے میں لدی ہوئی۔ اپنے چار عدد دھما چوکڑی جنزادوں سمیت اس کی غمگساری کرنے آگئی تھیں
ممانی لیڈی شبیر۔ بڑی پر وقار بیوی تھیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ جج صاحب کی
بیوی کی بہت گہری سہیلی اور عزیز ترین رشتہ دار تھیں۔ لیکن جن کی شکل اب سے پہلے
اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی!۔

وہ سب سے برگشتہ سب سے بیزار تھی۔

بلا سے یہ سب گھر میں دندنائیں۔ ایک دن تو چلے ہی جائیں گے!۔
سب کو بخوبی احساس تھا۔ وہ سونے کی چڑیا تھی۔ لہٰذا اس بے سروسامانی کے
عالم میں سب ہی اسے اپنے یہاں لے جانے میں پیش پیش تھے۔
خالہ خمسہ کو یقین تھا کہ وہ اس کے ساتھ ضرور جائے گی۔ وہ اس کے ناشتہ کھانے
اور شب و روز کے متعلق خاص دھیان رکھتی تھیں۔
لیڈی شبیر اس کے صدقے قربان جاتیں۔ لیکن اسے سب کی شکلوں سے نفرت تھی
یہ سب لوگ زندہ ہیں۔ زندگی کی گرمی سے بھرپور۔ چلتے پھرتے۔ اور۔ اس کے ڈیڈی
وہ مر چکے تھے!۔

تیسرے دن اچانک پھوپھی اماں بیگم نواز علی خاں کوٹھی میں آگئیں۔ وہ جج صاحب
کی بڑی بہن تھیں۔ ان کے آتے ہی جیسے سلسلے جھلوں کے ہوئے تھے [illegible] ماند پڑ گئے
ان کو بھی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اپنے ڈیڈی کے خون کو اس نے
پہچان لیا۔ ان کی شخصیت میں بھی ویسی ہی خوشبو چھپی تھی جو ڈیڈی کے وجود کی

کیوں! ۔ آم ؟ ۔

جلدی کرو ۔ باہر ہوسٹل کی گاڑی منتظر ہے ۔

اس کا دل دھڑکنے لگا ۔ پتہ نہیں کیا بات ہے ۔ وہ باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی ۔ جب کار گیٹ سے نکل گئی تب میٹرن دوسری لڑکیوں کی طرف مڑیں۔

بڑا افسوسناک ہے ۔ ابھی فون آیا ہے ۔ آج چھ بجے جج صاحب کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا ۔ بیچاری ۔ غریب لڑکی ۔ !

اسے یاد نہیں تھا کہ کس نے نہایت مدھم آواز میں ڈیڈی کی دفعتہً موت کی اطلاع دے دی تھی ۔ وہ گھبرے خواب میں دوڑتی ہوئی اندر آئی ۔ دالان ہی کے بڑے تخت پر جج صاحب ابدی نیند سو رہے تھے ! ۔

ایک زہرگداز چیخ اس کے سینے سے نکلی ۔ ڈیڈی ۔ اور پھر وہ ان پر گر کر بے ہوش ہو گئی ۔

اسے پتہ نہیں چلا کہ اس کے پیارے ڈیڈی گھر سے کب گئے ۔ گھر میں کون کون تھا؟ جب اسے ہوش آیا تو بوڑھے شرافت حسین نے اسے اپنی کمزور باہوں میں سنبھال لیا ۔

کوٹھی پر بہت سے لوگ تھے ۔ مگر اسے معلوم ہو رہا تھا ۔ وہ کسی قبرستان میں کھڑی ہے ۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا ۔ آہٹ نہ آواز ۔ بے جان سناٹا ۔

وہ جج صاحب کے کمروں میں باؤلی روح کی طرح پھرتی رہی ۔

ڈیڈی آپ کہاں ہیں ۔

ان کا بستر بچھا تھا ۔ کتابیں سرہانے رکھی تھیں ۔ ایش ٹرے میں ادھ جلا سگار رکھا ہوا تھا ۔ سلیپنگ گاؤن مسہری کے پائے پر پڑا تھا ۔ ہر چیز میں ان کے ہاتھوں کی ان کے جسم کی گرمی ابھی تک باقی تھی ۔ وہ ایک ایک چیز آنکھوں سے لگا کر رو دی ۔ لیکن ۔ ۔

سے شادی کر لی اور بچی سمیت لندن چلی گئیں ۔ ڈیڈی کے دل پر دھکا لگا ! ۔ مگر وہ اپنی بچی کی خاطر منہ سے کچھ نہ بولے ۔ وہ اسے اپنی جان سے بڑھ کر چاہتے تھے ۔ وہ اسے یوں ٹریٹ کرتے جیسے وہ نوجوان لڑکی نہیں ۔ گہوارے میں جھولتی ہوئی ننھی سی بچی ہو ۔ وہ اس کا ہر کہا مان لیتے ۔ اس کی کوئی آرزو کوئی خواہش پوری کرنے سے پیچھے نہ ہٹتے ۔ وہ اس کے ساتھ نو عمر لڑکوں کی طرح کھیلتے بھی تھے ۔ ٹینس ، شہسواری اور آنکھ مچولی تک ۔ پھر اسے آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا کہ اس کے خاندار باوقار اور سنجیدہ ترین ڈیڈی صرف اسی کی خاطر اپنی شخصیت کے خول سے باہر آتے ہیں ۔ تب وہ بے حد محتاط ہو گئی ۔ اسے بھی عقل آ گئی تھی ۔ اب وہ اور ڈیڈی لازم و ملزوم تھے ! ۔

اسے اپنی لکھو کھلی مگر بے پناہ مصروفیتوں میں یہ دھیان تک نہیں آیا کہ اس کے ڈیڈی دل کے بیمار ہیں ۔ ان کے پچپن سال کے بھاری بھر کم جثے میں نہایت کمزور دل دھڑکتا ہے ۔ وہ کبھی سوچ نہ سکی کہ اس کے ڈیڈی بھی بیمار پڑ سکتے ہیں ۔ مر سکتے ہیں اور انھوں نے اپنے وفادار بوڑھے منشی شرافت حسین کو سخت تاکید کر دی تھی کہ بے بی کو ہرگز ان کی بیماری کی خبر نہ دی جائے ! ۔

گھر پر امتحان کے زمانے میں اس کا جی نہ لگتا ۔ وہ ہر سال آخری امتحان کے سامنے ہوسٹل چلی جاتی تھی ۔ یہ کالج اور ہوسٹل بھی ڈیڈی ہی کی ملکیت تھا ۔ وہاں اس کی سہیلیاں تھیں اور پھر ل کر اسٹڈی کرنے سے اسے سہولت بھی ملتی تھی ۔

ان دنوں اس کا آخری پرچہ تھا ۔

ہفتے کی شام وہ حسبِ معمول آئی ۔ حسب معمول اپنے ڈیڈی سے ملی ۔ وہ اس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے ۔ ڈارک براؤن عنبری میں سوٹ میں وہ ہمیشہ سے زیادہ بھاری بھرکم اور باوقار معلوم ہو رہے تھے ! ۔

انھوں نے اسے سینے سے لگا کر اس کی پیٹھ تھپکی تھی ۔

ابھی تک ان کے گرم و مضبوط ہاتھ کا لمس اس کی پشت پر زندہ تھا۔
رات کا کھانا دونوں نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس نے دیکھا کہ آج وہ خلافِ معمول خاموش تھے۔

"آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ ڈیڈی؟"

"نہیں تو۔" وہ جیسے زبردستی مسکرانے لگے تھے۔

"پھر آپ ہنستے کیوں نہیں؟" وہ بچوں کی طرح ٹھنکی!۔

وہ اس کی خاطر ہنسنے لگے۔

پھر وہ اسے اپنے ساتھ خواب گاہ میں لے گئے۔ آہنی الماری کھولی اور ایک موٹا سا فائل اسے تھما دیا۔

"یہ کیا ہے ڈیڈی؟" وہ متحیر تھی۔

"ہم ایک طویل سفر پر جانے والے ہیں۔ بیٹی۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری واپسی میں دیر لگ جائے۔ یہ سارے کاغذات اب تمہارے ہیں۔ انھیں حفاظت سے رکھنا کیونکہ یہ بہت اہم ہیں۔ منشی صاحب تمھیں سب باتیں سمجھا دیں گے۔"

"آپ طویل سفر پر جا رہے ہیں؟" وہ ڈر کر ان کا چہرہ تکنے لگی مگر آج ہمیشہ کی طرح جسٹس احتشام علی خاں نے مسکرا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ انھوں نے غیر محسوس سانس لی اور چہرہ موڑ لیا۔

"پھر آپ کب آئیں گے ڈیڈی۔ میں اکیلے کیسے رہوں گی۔" وہ مضطربانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ دیکھئے نا۔ میرا آخری پیپر بھی اب ختم ہو گیا۔ ہر سال ہم کسی ہل اسٹیشن پر جاتے ہی ہیں ڈیڈی!"

"کاروباری نوعیت کا سفر ہے بیٹی۔ ہمیں تنہا جانا ہے۔"

وہ بے پناہ اداسیوں میں ڈوب گئی۔ پتہ نہیں پھر ڈیڈی کب واپس آئیں [illegible]
بی۔ وہ [illegible]

اب کی بار اس نے دخت رز کو کھا نا معلوم سی اداسیوں میں ڈوبا دیکھا [illegible] سے سبز سائے در و دیوار پر منجمد ہو گئے تھے۔ جج صاحب نے اپنی لان کی کھڑکی کے پاس چھت پر سبز و سیاہ انگوروں کی بیلیں چڑھائی تھیں۔ انھوں نے بڑھتے پھیلتے دیواروں کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ اسی مناسبت سے ان کے کسی بیرسٹر دوست نے مذاق مذاق میں کوٹھی کا نام دخت رز رکھ دیا۔ انگور کی بیٹی۔ جج صاحب کو بھی یہ برمحل نام ایسا پسند آیا کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے کوٹھی دخت رز کے نام سے موسوم کر دی!۔
اتوار کی سہ پہر کو وہ اپنا سامان لانے ہوسٹل چلی گئی۔ جانے سے پہلے جج صاحب نے اس کی پیشانی چومی اور اتنی گرمجوشی سے اپنے سینے لگایا تھا کہ اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔

صبح کو وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ رات ہوسٹل کے برآمدے میں پڑوس کا کتا ڈراؤنی آواز میں روتا رہا تھا۔ اس کی طبیعت بے کیف تھی۔ دل ڈوبا ہوا تھا۔ اور وہ بالکل خوش نہیں تھی۔ رہ رہ کر اسے بے وجہ رونا آ رہا تھا۔ اس کی سہیلیاں آپس میں مذاق کر کے ہنس رہی تھیں۔ ان میں پروگرام بن رہے تھے۔ گرمی کی طویل چھٹیوں میں انھیں کہاں کہاں جانا ہے!۔
اور وہ بالکل خاموش مغموم سی بیٹھی تھی۔ سوٹ کیس ہولڈال اور اس کا بیگ اس کے قدموں میں رکھے ہوئے تھے!۔

تبھی پیٹرن اندر آئی۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔
لڑکیاں احتراماً کھڑی ہو گئیں۔

"بے بی جبین!۔"

"جی۔" وہ نروس ہو گئی۔

"تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنے گھر جانا ہے۔ سامان بعد کو بھجوا دیا جائے گا۔"

یہ لمعات اس وقت لکھ رہا ہوں جب ایک بار پھر آنکھ کے آپریشن کی تیاری ہو رہی ہے۔ صرف کھانسی دفع ہونے کی کسر ہے، اس لئے کہ کھانسی اس آپریشن کے لئے سخت مضر ہے۔ کھانسی اس شدت سے آ رہی ہے کہ دل ڈرا جا رہا ہے میرے معالج جناب ڈاکٹر حلیم پوری توجہ سے علاج کر رہے ہیں۔ لیکن صحت تو اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اسے منظور ہے تو انشاء اللہ تعالےٰ اس بار آپریشن ہو کر رہے گا۔ حریمی بہنیں اور بھانجیاں دعا کریں کہ آپریشن ہو جائے اور کامیاب ہو۔

یہ سطریں میں آج ۹ راکتوبر کو لکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ ابھی تک کا حریم بھی شائع نہیں ہو سکا۔ پریس شیعہ سنی بربریت کے تحت بند ہیں۔ کرفیو نے کبھی پابندیاں لگا رکھی تھیں اور لوگ اتنے دہشت زدہ ہو رہے ہیں کہ گھر دل سے مجبوری ہی نکلتے ہیں۔ کل یہ خوشخبری سنی ہے کہ سرفراز پریس کھولا گیا ہے، جہاں حریم چھپتا ہے۔ کل ہی ہنگاموں کا پہلا دن ہے کہ کوئی مسلمان مسلمان کے ہاتھوں مارا نہیں گیا۔ خدا کرے کہ یہ بربریت ختم ہو کر شہری زندگی معمول پر آجائے۔

کتنی شرمناک بات ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے تعصب اور ضد نے آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔ رسول، خلفا اور اماموں کے نصب العین کو پس پشت رکھکر انھیں کے لئے گناہ عظیم کیا جا رہا ہے۔ بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بنا کر۔ ان کی املاک جلا کر، لوٹ کر یہ لوگ طمانیت محسوس کر رہے ہیں جو امن و آشتی کے پیامبر بنکر دنیا سے فسق و فجور مٹانے کے لئے نکلے تھے۔ قرآن کی چند آیات پر دونوں فریق عمل کے لئے جانیں دینے اور جانیں لینے پر آمادہ ہیں۔

اللہ پاک لکھنؤ کے
شیعہ سنی
مسلمانوں کے جذبات اخوت اور محبت کو بیدار کرکے ان کے قلوب صاف کردے اور وہ صرف مسلمان بن کر رہیں۔
نسیم انہونوی

نہ جانیں کب ان مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی جو پہلے ہی سے اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ مستقبل کی بات سوچے بغیر قتل و غارتگری کے مرتکب ہو کر خود اپنی ہی جڑیں کھود رہے ہیں۔ مسلمان شیعہ ہو یا سنی بریلوی ہو یا دیوبندی۔ وہابی ہو یا کسی اور مسلک سے تعلق رکھتا ہو، ہوتا بہرحال مسلمان ہے، اس لئے کہ اللہ، رسول اور قرآن کے سب ہی ماننے والے ہیں۔ اس کے باوجود ایک سنی شیعہ کو مار کر خوش ہوتا ہے۔ ایک شیعہ سنی کو موت کے گھاٹ اتار کر پھولے نہیں سماتا۔ ایسا کرنے والے اس پاگل سے کم نہیں جو اپنے ہی گھر والوں کو اپنے پاگل پن کا شکار بناتا ہے۔

لکھنؤ میں شیعہ سنی قضیہ ایک عرصہ سے اخبار کو چھپنے کا موقع دے رہا ہے۔ ہم کس منھ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم دنیا کو امن و آشتی کا سبق دینے آئے ہیں کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ایثار و قربانی کا سبق کوئی ہم سے سیکھے ——

افسوس کہ تھوڑے سے لوگوں نے پوری ملت کے منھ پر کالک لگا دی ہے۔ جذبات کی رو میں بدترین فعل کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور بے نتیجہ —— اس لئے کہ اس طرح کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ سکون و اطمینان سے کوئی فرقہ کبھی اپنے مذہبی رسم ادا نہیں کر سکتا۔ حکومت کے فیصلے بھی جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتے۔ یہ فیصلے تو ہم خود ہی مل بیٹھ کر کر سکتے ہیں — دونوں کو چاہئے کہ جذبات کو بالائے طاق رکھکر معاملات کو اس طرح طے کریں کہ ایک بار پھر شیعہ سنی پچاس برس پہلے کے شیعہ سنیوں کی طرح پر مسرت مذہبی اور سماجی زندگی گذار سکیں۔ عقائد کے معمولی اختلافات کو بھول کر آپس میں شادی بیاہ کا سلسلہ پھر شروع کریں۔ مفاہمت، اخوت اور دوستی کا یہ سب سے کارآمد نسخہ ثابت ہو۔ اگر شیعہ لڑکیاں سنیوں کے

گھروں میں بیاہ کر جاتیں اور سنی لڑکیاں شیعوں کے گھروں میں بہو بن کر جاتیں پہلے یہ رواج عام تھا۔ خود میری دادی دو بہنیں تھیں ایک میرے دادا کے عقد میں آئی تھیں دوسری بہن لکھنؤ کے ایک شیعہ گھرانے میں بیاہ کر گئی تھیں۔ اس جگہ یہ بھی واضح کردوں کہ جب شادیاں ہوتی تھیں، تو خواتین کو آج کی جیسی آزادیاں نہ تھیں۔ انھوں نے لڑکیوں کے منھ بھی نہیں دیکھے تھے۔ کنواری لڑکیاں غیر عورتوں کے سامنے نہیں آتی تھیں۔ شادی بیاہ وغیرہ میں جاتیں تو گھر کی بڑی بوڑھیاں انھیں اپنے پاس بٹھائے رکھتی تھیں، مجال نہ تھی کہ وہ اٹھکر کہیں چلی جائیں یا نگاہ بھر کر کسی سمت دیکھ لیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ اس وقت لو میرج کا طریقہ رائج نہ تھا۔ نسبت جہاں بھی طے ہوگئی۔ شادی ہوگئی۔ ایک دو نہیں ایسے درجنوں گھرانوں سے میں خود واقف ہوں جہاں اس طرح کی شادیاں ہوئی تھیں۔ اس وقت کوئی یہ بات سوچتا ہی نہ تھا کہ کون شیعہ ہے کون سنی۔ آج پھر اگر یہ ہونے لگے تو خود بخود یہ فسادات کم ہوجائیں، اس لئے کہ وہ منافرت کی خلیج حائل ہوگئی ہے وہ پٹ جائے گی۔ واقعی ایک دوسرے کے رشتہ دار اور عزیز بنکر اس طرح کے نقصانات پہنچانے کی بات پھر کسی کے ذہن میں مشکل ہی سے آسکے گی۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں، میں محرم بھر برابر مجالس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس وقت ذاکرین ایسی مجالس نہیں پڑھا کرتے تھے جو دل آزار ہوں۔ ہر مجلس میں شیعہ سنی برابر کے شریک رہتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ مجالس کا انداز بدلا اور ذاکرین میں سے بیشتر نے دل آزاری کی باتیں شروع کردیں، اس لئے رفتہ رفتہ سنیوں نے مجالس میں جانا بند کردیا۔ میں خود ہی اب بس کبھی کبھی ایسی مجالس میں چلا جاتا ہوں جو کسی دوست کے انتقال کے سلسلے میں منعقد ہو۔

ہمارے شیعہ بھائیوں نے یہ انداز اختیار کرکے غلطی کی ہے، اس لئے کہ جو کچھ مجالس میں کہا جاتا ہے اس سے ہر شیعہ واقف و آگاہ ہوتا ہے۔ ایک دو نہیں ہر سال پچاسوں مجلسیں سنتے سنتے کوئی ایسا پہلو واقعات کربلا وغیرہ کا ایسا نہیں رہ گیا جس سے کوئی شیعہ واقف نہ ہو۔ ضرورت اس کی ہے کہ سنیوں کو بھی آگاہ کیا جائے۔ تاکہ جن واقعات کے سلسلہ میں غلط فہمیاں ہیں وہ شیعی نقطۂ نظر سے بھی ہمارے علم میں آسکیں اور اس سے [illegible] پہنچ سکتا ہے۔ کاش ایک بار پھر دونوں فرقوں کے لوگوں کے دل [illegible] ہوجائیں اور وہ تمام منافقات اور جھگڑا پیدا کرنے والی باتوں کو بھول کر اس طرح شیر و شکر ہوجائیں کہ شیعہ سنی میں تمیز کرنا دشوار ہوجائے۔

اکتوبر کے حریم میں تاخیر ہوئی

حریم کی زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ حریم اتنی تاخیر کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اکتوبر کے حریم کی کاپیاں پریس جاچکی تھیں کہ اچانک لکھنؤ میں شیعہ سنی ہنگامہ رونما ہوا اور اس شدت کے ساتھ ہوا کہ حکومت کو فوراً ہی کرفیو نافذ کرنا پڑا جس کا سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے باعث مغربی شہر لکھنؤ کی زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی تھی حریم جس پریس میں چھپتا ہے وہ اسی حلقہ میں ہے اس لئے ایسی کوئی صورت ممکن نہ ہوسکتی تھی کہ حریم کو مقررہ تاریخ پر شائع کیا جاسکتا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ وہ تاریخ کے بجائے حالات درست ہونے پر بڑی کوششوں سے حریم ۱۰ر اکتوبر کو بھیجا جاسکا۔ حریم کی تمام خریدار بہنوں کو حریم بروقت نہ ملنے کے سلسلہ میں جو زحمت انتظار ہوئی اس کے لئے معذرت کرنا بھی ضروری نہیں حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ مجھے خود انتہائی تکلیف پہونچی میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی کہ حریم ایک روز کی تاخیر سے بھی شائع نہ ہو لیکن موجودہ صورت حال ایسی تھی کہ میں بالکل مجبور ہوگیا تھا۔

اسی درمیان ۱۳ر اکتوبر کو خدا کا شکر ہے کہ لکھنؤ کے مشہور معالج ڈاکٹر حلیم صاحب کی کوشش سے میری کھانسی کی تکلیف گھٹتی جاتی رہی اور امراض چشم کے مشہور معالج و سرجن جناب ڈاکٹر کے۔ سی گرگ نے میری آنکھ کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا لیکن ساتویں شب نہ جانے کیسے میرا ہاتھ آنکھ پر اس زور سے پڑگیا کہ خون نکل آیا گرگ صاحب نے دیکھ کر بتایا کہ آنکھ میں چوٹ آگئی ہے اور اب جبکہ میں یہ نوٹ لکھوا رہا ہوں اسی زخم کا علاج ہورہا ہے۔ ڈاکٹر گرگ صاحب نے یقین دلایا ہے کہ اس چوٹ کا بینائی پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ زخم کی ابھی تک تکلیف باقی ہے اس لئے ٹانکے کٹ جانے کے باوجود پٹی بندھی رہتی ہے۔ حریمی بہنیں اور بھائی میری صحت کے لیے ہمیشہ دعا کرتی رہی ہیں امید ہے کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گی۔ اکتوبر کا حریم دیر سے ملنے کے سلسلہ میں تقریباً ۲ ہزار خطوط دفتر کو موصول ہوئے لیکن یہ تمام خطوط حریم کی روانگی کے بعد دفتر پہنچے اس لئے ان کا جواب دینا لا حاصل تھا جن بہنوں کو ۱۰ر اکتوبر تک اکتوبر کا حریم نہ ملا ہو وہ زحمت فرما کر ایک بار پھر دفتر کو اطلاع دیں تاکہ دوسرا پرچہ روانہ کیا جاسکے۔

تبصرات

ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہوتا ہے

اقبال اور شیش محل

مؤلف اخلاق اثر صاحب۔ سائز ۲۲×۱۷/۱۶ صفحات ۱۲۸ کور پر شیش محل اور اقبال کا فوٹو، کتابت، طباعت اوسط، قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ: اقبال لائبریری۔ ابراہیم پورہ بھوپال۔

یہ کتاب اقبال کے سلسلہ میں ایک اضافہ ہے اس میں بھوپال سے اقبال کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ اقبال اور شیش محل، بھوپال میں اقبال کی شاعری کا پس منظر، بھوپال میں اقبال کی شعری فکر کے عنوان پر مضامین کے ساتھ ہی شیش محل اور ریاض منزل کے فوٹوز بھی شامل ہیں علامہ سر اقبال نے اپنے دوران قیام بھوپال میں تیرہ نظمیں انھیں محلوں میں قیام کر کے کہی تھیں اس مجموعہ میں انھیں بھی شامل کیا گیا ہے اخلاق اثر صاحب نے اس مجموعہ کو ترتیب دے کر ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔

آخری سفر

مؤلف نادک حمزہ پوری۔ ناشر جاوید بکڈپو۔ ایم روڈ ہزاری باغ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۸۰۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

یہ کتاب اس آخری سفر سے متعلق ہے جو ہر انسان کو پیدا ہونے کے بعد پیش آنا یقینی ہوتا ہے اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ تجہیز و تکفین کے طریقوں کو یکجا کر دیا گیا ہے کتاب کو مرتب کرنے کے سلسلہ میں فتاویٰ عالمگیری درمختار۔ عین الہدایہ فتاویٰ اشرفیہ بہار شریعت وغیرہ سے مدد لی گئی ہے یہ ضروری نہیں کہ مسلمانوں میں مختلف عقائد رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ان سب کے لئے مفید ہو لیکن بہت سی باتیں اس کتاب میں درج ہیں جو تقریباً ہر مسلک کے مسلمانوں میں تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے ساتھ رائج ہیں۔

خصوصیت سے یہ کتاب سنی الجماعت مسلمانوں کے لئے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ ہر گھر میں موجود رہے تاکہ وقت ضرورت کام آسکے۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ روانہ فرمائیں

برق آشیانوی

طنز و مزاح

ایماندار بیوی

(محمد اسماعیل میرٹھی کی نظم "ایمان دار لڑکا" کی پیروڈی)

ایک بیوی ہے ذرا ایمان دار — آزمائش ہو چکی ہے ایک بار"
شیروانی میں رقم تنخواہ کی — بے حفاظت گھر کے اندر تھی دھری
نیک بی بی کا سنو یہ ماجرا — ایک پیسہ بھی نہ اس میں سے لیا
پوچھا شوہر نے کہ اے بیوی بتا — رونما یہ واقعہ کیسے ہوا۔؟
جیب تو نے کس لئے یوں چھوڑ دی — کیوں نہ لی تو نے رقم تنخواہ کی۔؟
بولی بیوی کس طرح لیتی بھلا — چوری میں کس طرح سے کرتی بھلا
دل میں سوچا ہائے میری بھول تھی — کیا خبر تھی جیب میں تنخواہ تھی
ڈھونڈ ڈالا کوٹ اور پتلون کو — میری اوندھی عقل پر [illegible]
بس تلاشی شیروانی چھوڑ دی — ہائے کیسی مجھ سے یہ غفلت ہوئی
خیر آئندہ یہ جیسے دیکھنا — ایک پیسہ بھی نہ چھوڑوں گی بھلا

[illegible] یہ [illegible] کا محاورہ ہے اس کا مطلب ہے کہ میری عقل پر [illegible]

حضرت ابراہیمؑ کو امامت کا منصب عطا ہوا

سید فضل الرحمان جعفری

یہ چار ہزار سال پرانی کہانی ہے۔ لیکن اتنی سچی کہ ہر سال اس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ کہانی اطاعتِ ربانی۔ اور ایثار قربانی کی بڑی روح پرور اور دل آویز کہانی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور تسلیم و رضا اور بندگی و سپردگی کی بڑی دلکش کہانی ہے۔ جو سناتی ہے کہ باطل کے خلاف حق کی آواز بلند کرنے والوں پر رحمت الٰہی سایہ فگن رہتی ہے۔ جو کہاتی ہے کہ حق بہر حال باطل پر غالب رہتا ہے۔ جو بتاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں ہر متاع عزیز قربان کر دینا ہی اصل کامرانی ہے اور یہ اسلام کی صداقت کی ایسی کہانی ہے جس کا نقش تاریخ اسلام میں لافانی ہے۔

یہ خدائے حکیم و دانا کی عجیب حکمت ہے کہ وہ اپنے ایک باغی بندے کو ایک لڑکا عطا کرتا ہے۔ نام ابراہیمؑ ہے۔ باپ کا نام آذر ہے۔ جو بت تراش بھی ہے اور بت فروش بھی۔ ملک کا بادشاہ نمرود ہے جو اپنی مملکت میں خدائی کا دعویدار ہے اور جس کی رعایا بتوں کی پرستار ہے۔ ابراہیم اللہ کا ایسا بندہ ہے جو حق کا متلاشی ہے۔ بڑا نڈر اور بے باک ہے۔ وہ بت پرستی کے اس گندے ماحول میں تنہا راہ حق کی جستجو میں ہے۔ وہ خود ساختہ خداؤں سے بیزار تھا۔ اس کی تلاش حق کی یہ کیفیت قرآن حکیم نے اسی طرح بیان کی ہے۔

"ابراہیم ستاروں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہی چمکنے والی چیز خدا ہے۔ لیکن جب وہ چھپ جاتے تو کہتے کہ جو چیز زوال پذیر ہو وہ کیوں کر خدا ہو سکتی ہے"۔ یہ جستجو جاری رہی۔ حتیٰ کہ انھوں نے ایک روز یہ اعلان کر دیا کہ:

"جن کو تم خدائی میں اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو ان سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ میں نے تو سب سے منہ موڑ کر اس ذات کو اپنی بندگی اور عبادت کے لیے خاص کر لیا ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ میں ہرگز شرک کرنے والا نہیں"۔

(القرآن)

اس اعلان سے نمرود کے سینے میں غیظ و غضب کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ابراہیم نمرود کی بارگاہ سلطانی میں پیش کیے گئے۔ نمرود نے کہا کہ میری خدائی تسلیم کرو ورنہ سزا پاؤ گے۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ "نمرود تو تو اپنی موت و حیات پر بھی قادر نہیں تو کیسے خدا ہو سکتا ہے؟ خدا تو وہ ہے جس کے قانون کی بندشوں میں جن و انس بھی ہیں اور چرند و پرند بھی اور آسمان و زمین بھی۔ اور میں خدا کے سوا کسی آستانے پر اپنا سر نہ جھکاؤں گا"۔

نمرود نے حکم دیا کہ "ابراہیم کو دہکتے ہوئے انگاروں میں ڈال کر جلا ڈالو"۔

وہ بڑا ہولناک اور دہشتناک منظر تھا۔ وہ سفاکی و بے رحمی کی بڑی جگر خراش صورت تھی۔ یہ آواز سن کر شجر و حجر کانپ اٹھے تھے اور در و دیوار لرزنے لگے تھے۔ لیکن ابراہیمؑ کے سینے میں عشق ربانی کی جو شمع روشن تھی، وہ ان کا سہارا بنی ہوئی تھی اور ان کا دل نمرود کے انسانیت سوز فیصلے سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ وہ بڑی بے رحمی سے انگاروں میں پھینک دیے گئے۔ اور نمرود مطمئن ہو گیا کہ وہ اپنے حریف سے نجات پا گیا اور اب اس کی خدائی میں خلل ڈالنے والی کوئی ہستی روئے زمین پر باقی نہیں رہی لیکن عدم سے عالم وجود میں لانے والے خدائے برحق نے آگ کو حکم دیا کہ:

"اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیمؑ کے لیے سلامتی بن جا۔" (القرآن)

نمرود نے اور اس کے ملک کے لاکھوں انسانوں نے دیکھا کہ وہی آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے اور ابراہیمؑ صحیح سلامت بیٹھے ہیں۔

وہ آگ جو ابراہیمؑ کو جلانے کے لیے سلگائی تھی۔ اس نے گلزار کا روپ دھار لیا تھا اور ابراہیمؑ اس میں صحیح و سالم بیٹھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر بے شمار انسان رب ابراہیمؑ پر ایمان لے آئے۔ لیکن نمرود بدستور خدائی کا دعویدار بنا رہا۔

ابراہیمؑ اب خدا کے حکم سے حق کی تبلیغ کے لیے اپنے وطن عراق سے نکلے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان پر نازل ہوتی رہیں اللہ نے انھیں ایک صالح فرزند کی بشارت دی پھر دنیا نے فلک کی آنکھ نے دیکھا کہ ۹۵ برس کی عمر میں ایک سعید فرزند تولد ہوا۔ ایک طرف انعام ربانی کا یہ سلسلہ تھا۔ دوسری طرف امتحان و آزمائش بھی جاری تھی۔ اس لیے کہ اسلام کی تاریخ اسی طرح بنی ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ابراہیمؑ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اکلوتے فرزند کے حلقوم پر چھری پھیر رہے ہیں۔ بیدار ہوئے تو بیٹے سے خواب بیان کیا۔ یہ خواب تین رات تک مسلسل دکھائی دیتا رہا۔ ابراہیمؑ ہر خواب پر اونٹوں کی قربانی کرتے رہے تھے۔ لیکن آخر میں اللہ نے فرمایا۔

"اے ابراہیمؑ! ہم تیرے بیٹے کی قربانی چاہتے ہیں"

ایک تابعدار اور اطاعت گزار غلام کی طرح حکم ربانی کی تعمیل شروع کر دی۔ فرزند سے کہا تو وہ بولا "آپ کو جو حکم ہوا ہے۔ بلا تامل کیجیے۔ آپ انشاء اللہ۔

"آپ کو جو حکم ہوا ہے۔ بلا تامل کیجیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"

(القرآن)

باپ نے فرزند کو ذبح کرنے کے لیے لٹایا، رحمت حق جلیل نے آواز دی۔

"ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا"

(القرآن)

اس امتحان کی کامیابی پر ابراہیمؑ کو "خلیل اللہ" کا لقب ملا۔ اور قرآن حکیم میں نوازشات ربانی اور انعامات الٰہی کا ذکر اس طرح آیا۔

"ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں حقیقت میں تھا یہ ایک بڑا امتحان اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا" (القرآن)

ان آزمائشوں میں جب ابراہیمؑ پورے اترے تو پھر اللہ جلیل نے ان کو تمام انسانوں کے لیے امامت کا شرف عطا فرما لیا اب وہ اسلام کی عالمگیر تحریک کے پیشوا اور رہنما تھے اور امام الموحدین بن گئے تھے۔ حکم خداوندی ہوا کہ مکہ مکرمہ میں جا کر کعبہ کی تعمیر کی جائے۔ اللہ کا یہ فرماں بردار بندہ اٹھا اور مکے پہنچ کر اس نے خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کر دی۔ منشائے ایزدی یہ تھا کہ اس گھر کا طواف کرنے کے لیے سال میں ایک بار پوری دنیا کے مسلمان اکٹھا ہوں۔ مکے کی سنسان وادی میں فلک کی آنکھ نے یہ منظر دیکھا کہ ابراہیمؑ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ کعبے کی تعمیر کر رہے ہیں اور ان کی روح پکار رہی ہے کہ:۔

"میری نماز، میرا طریقہ، میری زندگی، میری موت اللہ کی راہ میں قربان ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے والوں میں سب سے پہلی پیش ہوں۔

(الانعام)

وہ دنیا جو ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی تھی جہاں فسق و فجور کی حکمرانی تھی جہاں کفر و عصیان کا بازار گرم تھا اب وہاں اللہ کا نام لینے والے، اس کی اطاعت و بندگی کرنے والے، اور اسی کے آستانے پر سر عبودیت جھکانے والے پیدا ہو گئے تھے۔ اب اسلام کا ایک مرکز از سر نو بن گیا تھا۔ اب کعبہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا کعبۂ مقصود بن گیا تھا اب مکہ تمام مسلمانوں کی سب سے بڑی زیارت گاہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جہاں سے اسلام کی تبلیغ و ارشاد کا کام شروع ہوا۔ اور جہاں سے علم و عرفان کی روشنی دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ اور جہاں سالی

میں ایک بار تمام مسلمانان عالم کو حج کے لیے جمع ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔ یہ حج خدا سے حد درجہ کی اطاعت و بندگی کا ایسا عملی اقرار ہے جس میں رشد و ہدایت کی بے شمار مصلحتیں پوشیدہ ہیں، جس میں عالمگیر وحدت اور مساوات کی بے حساب روحانی عظمتیں پنہاں ہیں۔ جس میں اخلاق و تقویٰ، نیکی و پارسائی اور عزت و کامرانی کی ہزاروں سعادتیں پنہاں ہیں۔ یہ باطنی محاسن اور روحانی برکتوں کا ایسا نظام ہے جس سے انسانیت کی اعلیٰ قدریں اجاگر ہوتی ہیں۔ اور دنیا امن و سلامتی کا گہوارہ بنتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی تمام قربانیوں سے دنیا کو یہی سبق دیا ہے کہ انسان کی عظمت کا راز تسلیم و رضا اور بندگی و سرافگندگی میں مضمر ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں بے چون و چرا سر تسلیم خم کرنا اور اطاعت و استقامت اختیار کرنا۔ راہ خدا میں سرفروشی اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنا مسلمان کا اصل شیوہ ہے۔ اسی میں اس کے لیے عزت و کامرانی ہے۔ اور یہی اس کے لیے وجہ مسرت و شادمانی ہے۔

اللہ جل و قدیر نے اسماعیل ذبیح اللہ کی اس کھلی ہوئی آزمائش میں کامیابی کا یہ بدلہ مرحمت فرمایا کہ قیامت تک کے لیے قربانی کی رسم کو قائم کر دیا اور تمام آنے والی قوموں میں اس عظیم واقعہ کا ذکر جاری کر دیا۔

"پس سلام ہو حق کی راہ میں اپنی قربانی کرنے والے ابراہیم خلیل پر۔ ہم مقام احسان تک پہنچنے والوں کو بقائے دوام کا ایسا ہی بدلہ عطا فرماتے ہیں بے شک وہ ہمارے حقیقی بندوں میں تھا" -

---

کیا آپ کو علم ہے کہ

لکھنؤ کس لئے مشہور ہے

اگر نہیں تو ہم آپ کو بتاتے ہیں

لکھنؤ اپنی مخصوص تہذیب اور مشرقی تمدن کے لئے مشہور ہے جس کا کہیں جواب نہیں۔ گو یہ تہذیب اب زمانے کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹ گئی ہے پھر بھی ہاتھی لاکھ گھٹے تب بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ گری حالت میں بھی ایک نمونہ ہے۔

لکھنؤ کے مٹی کے کھلونے اور پھل و میوہ جو دیکھنے والوں کو متحیر کردیتے ہیں۔ اصل اور نقل میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔

آصف الدولہ (جن کے متعلق مشہور تھا، جس کو نہ دے مولا، اسے دے آصف الدولہ) کا مشہور تاریخی امام باڑہ۔ چھوٹا امام باڑہ ریزیڈنسی۔ مارٹین صاحب کی کوٹھی۔

بوٹانیکل گارڈن۔ بنارسی باغ اور زندہ عجائب گھر۔ چھتر منزل قیصر باغ۔ ریوڑیاں جسے کٹھیاں بھی کہتے ہیں۔ عطریات اور چکن کا کام اور ان سب سے زیادہ زردوزی۔ کامدانی۔ اور بادلہ وغیرہ کے کاریگر جن کا کام سارے ہندوستان میں مشہور ہے اور ان کاریگروں کا بہترین کام

طنز و مزاح

بیگم آشیانوی

خدا بچائے۔ ڈاکٹروں سے

اعوذ باللہ من الدکتور الحکیم (دکتور لفظ ڈاکٹر کا معرب تلفظ ہے یعنی اللہ ہم پناہ مانگتے ہیں ایسے ڈاکٹر سے جس کو دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ حکمت والا ہے۔ (یہاں حکمت سے مراد علم طب ہے)

بندۂ خدا تو یہاں تک بھی عرض پرداز ہے کہ اے اللہ ہم ان تمام ڈاکٹروں سے پناہ مانگتے ہیں جن کے خزانے علم و حکمت کے بجائے تو نے دولت و ثروت سے بھر دئے ہیں۔ اور بے شمار انسانوں کے نحیف و ناتواں جسم اور زار و نزار جانیں ان کے حوالے کر دی ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے ڈاکٹروں نے جتنی معصوم جانیں اپنے فن پر قربان کر دی ہیں ان کی تعداد کے لحاظ سے روزِ حساب ہر ڈاکٹر کو خالقِ جن و انس کے حضور میں مرزا غالب کا ایک شعر تھوڑے سے تغلب و تصرف کے ساتھ گڑگڑا کر عرض کرنا پڑے گا۔

آتا ہے قتل و خونِ بشر کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اگر کسی ڈاکٹر کے ہاتھ سے ہونے والے قتل کو قانونی شکل دی جاکر تعزیری جرم قرار دیا جاتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس ڈاکٹر کو اس کی زندگی میں کم از کم ایک ہزار بار پھانسی پر لٹکایا جاتا اور دس ہزار مرتبہ حبس دوام کی سزا دی جاتی۔ لیکن تھوڑی سی تعریف اس کے لئے ہے (کیونکہ ساری تعریف تو خدا ہی کے لئے) جو میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کا وہ عہدہ دار مجاز ہے جس نے ہر ڈاکٹر کو ایک کاغذ کا پرزہ عطا فرما کر یہ اجازت دے دی کہ جاؤ لقمان اب تم جتنے چاہو دن دہاڑے قتل کر سکتے ہو۔ لیکن اس کاغذ کے پرزے کو (جس کا نام ایم بی بی ایس کا سرٹیفکیٹ ہے) محفوظ رکھو تاکہ سند رہے اور بروقت کام آئے۔ اگر کسی مرحوم (یا مقتول) کے پسماندگان نے تم سے یہ شکایت کی کہ اے بے رحم ڈاکٹر تو نے ہمارے عزیز کی جان لے لی تو ان کو مرزا غالب کا یہ شعر سنا دو ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(جہاں تک ڈاکٹروں کا تعلق ہے وہ تو ایک ایک پائی کر کے ڈاکٹر کو ادا کیا جاتا ہے)

[illegible] بندۂ خدا عرض کرتا ہے کہ [illegible] کی شادی (یعنی بندۂ خدا کی ڈاکٹری نہیں) اس زمانے میں ہوئی تھی جبکہ تعداد ازدواج پر پابندی نہ تھی اور شرع کے لحاظ سے چار بیویاں رکھنے پر کوئی کیا اعتراض ہو سکتا تھا البتہ حکومت وقت کو بھی اعتراض نہ تھا۔ اور غیر شرعی طور پر آٹھ دس بیویاں رکھ لیتا تو کوئی اس کو پوچھنے والا نہ تھا کہ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ جب وہ منہ کھول کر بتا دیتا کہ ایک دانت بھی نہیں ہے تو اس سوال کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی کہ پیٹ میں آنت بھی ہے یا نہیں۔ اور کوئی پلٹ کر یہ نہیں پوچھتا تھا کہ جب تیرے منہ دانت ہے نہ پیٹ میں آنت تو پھر تیرے گھر میں اتنی بیویاں کیوں ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانے میں روپے کے آٹھ سیر چاول تھے اور سولہ سیر گیہوں۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں فیملی پلاننگ کی اسکیم نافذ نہ ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شکم مادر میں بھی نہ تھی۔ اور ریڈیو پر کسی کو یہ ترانہ سنائی نہ دیتا تھا۔

لڑکیاں ہوں یا لڑکے۔ بچے دو ہی اچھے

غرض بندۂ خدا کی بے شرمی بیویوں جس کی زرخیزی کو دیکھ کر قدیم ہندوستان کی یاد آجاتی تھی جس کے جنگل چندن اور مٹی سونا ہوتی تھی جس پر کسی فلمی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

میرے دیش کی دھرتی اگلے ہیرے موتی

اور ہر دختر وطن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا۔

مرے دیش کی استری، اگلے بیٹا بیٹی

پھر ہر استری اتنے بیٹا بیٹی اگلتی تھی کہ جس کے بارے میں بندۂ خدا کا کہنا ہے کہ آج اگر کوئی اس کے گھر کی آبادی پر نظر ڈالے تو اس کی بینائی کے پرخچے سامان نظر آجائیں۔

آگے چل کر بندۂ خدا عرض پرداز ہے کہ اس کی [illegible] ایک

پیٹ کے مرض میں مبتلا ہو گئی جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔ لیکن
سیول سرجن نے دعویٰ کیا کہ میرے پاس ہے۔ تکلیف اس خاتون کو
یہ تھی کہ ہمیشہ سر میں درد رہتا تھا۔ اور دماغ میں ہمیشہ کوئی کیڑا سا کلبلاتا
رہتا تھا۔ جس کو کل ہند مشتی نائٹس میں جانے سے سکون نصیب ہوتا تھا۔
اور ملاد سیلا جانے سے سکون کم بلکہ مکمل آرام محسوس ہوتا تھا۔ بندۂ
خدا بیوی کے اس مہلک مرض سے بہت گھبرایا تو سیول سرجن نے اسکو
تسلی دی اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس خاتون کے دماغ
میں ایک ایسی رگ ابھر آئی ہے جس کو آپریشن کر کے نکال پھینکنا ضروری
ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ مرض بڑھ جائے گا اور یہ خاتون روزانہ ایک شو
دیکھنے کے بجائے مارننگ شو سے لے کر سکنڈ شو تک روزانہ چار مرتبہ
سینما دیکھنے لگے گی۔ چونکہ بندۂ خدا کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کی
بیوی ڈاکٹر کی اس ابتدائی تشخیص سے مطمئن نہ ہوگی اور آپریشن کے لئے راضی
ہونا قطعی طور پر دشوار ہے۔ اس لئے اس کو یہ باور کرایا گیا کہ وہ اندر
ہی اندر گھلتی جا رہی ہے اور اس کا وزن دن بدن گھٹتا جا رہا ہے۔
اور یہ جو آٹو وزن پیما WEIGHTING MACHINE اس
کا وزن ہر ہفتہ دو پونڈ اضافہ بتلاتا ہے تو یہ آج کل کے دیسی کارخانوں کا
قصور ہے کہ دیسی مشینیں تیار کرتے ہیں جو درست نتائج ہی نہیں بلکہ
الٹی بتاتی ہیں۔ اس پر خاتون کو یقین آگیا اور وہ آپریشن کے لئے تیار
ہو گئی سرجن نے اس کا آپریشن کر کے دماغ کی زائد رگ کاٹ دی۔ تقریباً
پندرہ دن میں آپریشن کا زخم وغیرہ بھر گیا جب مریض کو نقل و حرکت
اور بات چیت کی اجازت دی گئی تو اس نے پانی لینے کے لئے جگ پر گلاس
کو اوندھا دیا۔ پلنگ پر سے بستر اٹھا کر پلنگ کے نیچے ڈال دیا۔ بلانکٹ بچھا کر
توشک اوڑھنے کی کوشش کی۔ ضمیریں الٹی استعمال کر کے خود کو شوہر اور بندۂ
خدا کو بیوی کہنے لگی۔ ساری کے بجائے پتلون پہننے کی خواہش کی۔ البتہ
بلاؤز کی جگہ بش شرٹ پہننا اس لئے نہیں چاہا کہ آج کل بلاؤز اور
بش شرٹ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب سرجن کو اس کی رپورٹ دی
گئی تو اس نے فوراً اکسرے نکلوایا۔ تب پتہ چلا کہ کھوپڑی میں بھیجا الٹا
رکھ دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے خاتون تمام کام الٹے کر رہی ہے۔ چنانچہ
پھر آپریشن کر کے دوبارہ بھیجے کو سیدھا کیا گیا۔

اس کے بعد بندۂ خدا عرض کرتا ہے کہ اس کی چوتھی بیوی کے چار دن کے
فرزند کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا اور سرجن نے اس کا آپریشن کیا۔
جس جگہ درد تھا وہ تو کم ہو گیا لیکن دوسرے مقام پر ایک نئی چبھن سی
محسوس ہونے لگی۔ سرجن نے یہ کہہ کر مریض کو خارج کر دیا۔ کہ آپریشن کا زخم
تازہ ہے اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کچھ دنوں کے بعد کوئی تکلیف باقی نہ
رہے گی۔ اور جوں جوں وقت گزرتا تھا کہ اس نئی تکلیف میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔
تب فوٹو لیا گیا تو معلوم ہوا کہ آپریشن کے آلات میں سے ایک ننھا سا آلہ
مریض کے پیٹ ہی میں رہ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر نرس (NURSE) ان کی
خدمت میں حاضر ہوئی اور مطالبہ کیا کہ اس ہینڈل کی گمشدگی کی وجہ
سے جو قیمت نرس کی تنخواہ سے کاٹ لی گئی تھی وہ اس کو واپس دلوائی جائے۔

بندۂ خدا ایک اور واقعہ بیان کرتا ہے۔ صداقت برگردن راوی
کہ اس کی دوسری بیوی کے ساتویں شیرخوار فرزند کے مثانہ میں کوئی خرابی
ہو گئی سرجن نے آپریشن کی رائے دی۔ جب مریض کو آپریشن تھیٹر میں لایا گیا تو
سرجن نے اس کا پیٹ چیر ڈالا۔ اور تمام آنتوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔
لیکن وہاں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ مریض کا اکسرے دیکھا تو پتہ چلا کہ جس اکسرے
کو دیکھ کر آپریشن کیا گیا وہ اس مریض کا نہیں ہے۔ چنانچہ مریض کا صحیح
اکسرے منگوا کر مثانہ کا آپریشن شروع کیا۔ اس دوران میں ننھا سا مریض داعی
اجل کو لبیک کہہ کر چل بسا۔ ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ مرض اور مریض دونوں
کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ جب مریض
کے سرپرستوں نے ڈاکٹر کے نام پر چیخنا چلانا شروع کر دیا تو ڈاکٹر نے انہیں
یہ شعر سنا کر زبان بند کر دی ؎

ڈاکٹر لاکھ بھلا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

نتیجہ بندۂ خدا کی اس تمام بکواس کا یہ ہے کہ ہر مریض ڈاکٹر
کے پاس اس یقین سے جانے لگا ہے کہ ڈاکٹر اس کو سیدھے دار البقا
کو روانہ کر دے گا اور کوئی مریض اس کے ہاتھ سے بچ کر خیر و عافیت
کے ساتھ دار الفنا (یعنی مریض کا گھر) کو واپس آجائے تو اس کو حسن
اتفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آخر میں بندۂ خدا عرض کرتا ہے کہ
بچے کی ماں کب تک دعا مانگے گی ایک نہ ایک روز کسی نہ کسی ڈاکٹر
کے پاس جانا ہی پڑتا ہے۔

ہر دلعزیزی

محمود نیازی

ہر دلعزیزی مقبولیت عام کو کہتے ہیں یعنی وہ صفت جو دوسرے لوگوں کو خوش کر کے اپنی طرف مائل کرتی ہے ہر دلعزیز آدمی سب کا منظور نظر، محبوب خلائق، مقبول زمانہ اور ہر کسی کو پیارا ہوتا ہے

ناسخ نے دیکھا ہے جو تجھے کہتے ہیں اے ہر دلعزیز
ماہ مصر اعجاز سے زندہ دوبارہ ہو گیا

میر حسن نے .... کیوں کر نہ چاہے اس کو ہر ایک جان کی طرح
خواہش میں اس کی سب ہیں وہ ہر دلعزیز ہے

ہر دلعزیزی کے لئے دولت مند ہونا یا خوبصورت ہونا بھی ضروری نہیں ہے اگر کوئی شخص انتہائی مفلس اور بدصورت ہے لیکن اس کی شخصیت دل لبھانے والی ہے تو وہ ہر دلعزیز ہو سکتا ہے ایسا شخص جہاں جاتا ہے لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ ہر محفل میں اس کی آؤ بھگت ہوتی ہے اور اس کو ممتاز جگہ دی جاتی ہے۔ وہ سب کا پیارا ہوتا ہے اور اس کا دشمن کوئی نہیں ہوتا۔ یہ خوبی حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے اس کے لئے صرف خود غرضی کو چھوڑنا پڑتا ہے جو شخص اپنے آرام کا خیال نہیں رکھتا لوگوں کو پریشان نہیں کرتا اپنے پرائے کا غم کھاتا ہے اور مصیبت میں ہر ایک کے کام آتا ہے وہ بہت جلد ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔ ؎

جس دل میں دیکھئے تو ہماری ہی جا ہے
جو آنکھ ہے سو تک رہی ہم کو مدام ہے

ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے شخص سے ملاقات ہو تو اس کو یہ محسوس کرا دیا جائے کہ اس کی بہتری کا سب سے زیادہ خیال ہم کو ہی ہے اور ہمارے دل میں اس کے لئے مہربانی کے جذبات ہیں اس کام کے لئے تھوڑے سے ایثار نفس کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر اس کے ساتھ کم سخنی، خوش خلقی اور شائستگی کے جذبات کا اظہار ہوا تو مقصد جلد حاصل ہو جاتا ہے۔ سرد مہری، کج خلقی، غرور، تکبر، حسد اور احساس برتری کے جذبات ہر دلعزیزی کے دشمن ہیں ان سے چھٹکارا پانا بھی ضروری ہے ؎

جب تلک غرور کی دستار تیرے سر پہ ہے
سرزنش کی ٹھوکری سے سر کو اپنے کوٹ جا

آداب معاشرت اور اخلاقیات کی موٹی موٹی باتیں تو سب ہی جانتے ہیں لیکن محسوسات کا اظہار اور چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کا خیال رکھنا ہی ہر دلعزیزی کا زینہ ہے عام طور پر لوگوں کو یہ انتظار رہتا ہے کہ پڑوس میں کوئی حادثہ ہو جب ہی اظہار ہمدردی کیا جائے یا کسی کی لڑکی کی شادی ہو اسی وقت اپنی خدمات پیش کی جائیں مگر لوگ یہ نہیں جانتے کہ ایسے ہنگاموں میں کون اس بات پر دھیان دیتا ہے کہ کون آیا اور کس نے کیا کیا۔ ایسے موقعوں پر تو دوست دشمن سب ہی آ جاتے ہیں ہر دلعزیزی کے لئے تو چھوٹی اور معمولی باتوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ کسی راہ گیر کی گری ہوئی چیز اٹھا کر دینا، معمولی تکلیفوں میں بھی اظہار ہمدردی کرنا۔ محلہ والوں اور ہمسایوں کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال رکھنا۔ بعض وقت نمک کی بہت تھوڑی مقدار دینا، سلائی کی چند تیلیاں، پنسل کا تار، سوپ اور تیلی کو دینا اور ضرورت کے وقت تھوڑا بہت ادھار دینا ہی ہر دلعزیزی کا سبب بن سکتا ہے بظاہر یہ بہت معمولی اور حقیر باتیں ہیں مگر عام طور پر ان کی ہی قدر ہوتی ہے۔ جو لوگ بڑے موقعوں کا انتظار نہ کر کے چھوٹے چھوٹے کام کیا کرتے رہتے ہیں وہ بہت جلد ہر دلعزیز ہو جاتے ہیں۔

ہر دلعزیز ہونے کے لئے کم گوئی اور شیریں بیانی بھی [illegible] ہے۔ کچھ لوگ اپنے گھر میں رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ گھر سے نکلے تو کام پر چلے گئے اور وہاں سے آئے تو پھر گھر میں گھس گئے کوئی شخص ملنے آیا تو اس کو ٹال دیا ایسے لوگ بہت جلد لوگوں کی نظروں سے گر جاتے ہیں لوگ دکھ درد میں دوسروں کے شریک ہوتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں بلکہ الٹے خلاف لوگوں کے دلوں میں ایک قسم کی نفرت

خیالات پیدا ہوجاتے ہیں عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر دلعزیز ہونے کے لئے دوسروں کو مغالطہ دینے والی ریاکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی برائی کرنا اپنے نوکروں اولاد یا دولت کے زور سے لوگوں میں رعب پیدا کرکے مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرنا یہ طریقے بالکل غلط ہیں جس طرح کاغذ کی ہانڈی صرف ایک بار چولہے پر چڑھتی ہے اسی طرح جعلی ریاکاری نقش پردازی اور فریب کا بھانڈا بھی جلد ہی پھوٹ جاتا ہے۔ ایسے شخص کا اعتبار ہمیشہ کے لئے اٹھ جاتا ہے اور لوگ اس سے دل نفرت کرنے لگتے ہیں ہر دلعزیزی کے لئے سچائی اخلوص ایثار نیک نیتی اور دیانت داری میں پائیداری ہونا ضروری ہے دوسروں کے کاموں میں دلچسپی کا سطحی اظہار اور زبانی جمع خرچ سے بھی کچھ نہیں ہوتا ان کے کاموں میں عملاً اور دل سے دلچسپی لینا ضروری ہے ہر دلعزیزی کے لئے صرف دل کی صفائی سے ہی کام نہیں چلتا زبان پر بھی قابو رکھنا چاہیئے۔ بعض لوگوں کے دل صاف ہوتے ہیں مگر ان کی زبان زہریلی ہوتی ہے۔ ان کی بے عقلی اور لاپرواہی سے بات کا جو زخم لگ جاتا ہے وہ کبھی نہیں بھرتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک صاحب بیچارے ایماندار اور نیک ہیں مگر ان کی باتیں کڑوی کسیلی اور زہر میں بجھی ہوتی ہیں۔ وہ جب بھی کسی سے ملتے ہیں تو ملاقاتی کی سب سے بڑی کمزوری یا کسی پوشیدہ عیب کا ذکر ضرور کر دیتے ہیں اسی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

ہر دلعزیز ہونے کے لئے ایک بڑا گر یہ ہے کہ لوگوں کے نام ان کی صورتیں اور ان کے خاندانی حالات یاد رکھیں جائیں۔ جب بھی کسی سے ملاقات ہو تو اس کی شکل و صورت غور سے دیکھنا چاہیئے تاکہ اس کی صورت پوری طور پر ذہن میں محفوظ ہو جائے مثلاً چہرہ کی بناوٹ آنکھ یا ناک کی ساخت بالوں کا رنگ قد وغیرہ پر بھی زیادہ دھیان دیا جائے دوسری ملاقات میں یہ چیزیں بہت کام دیتی ہیں اور ملنے والا یہ سمجھتا ہے کہ مجھکو خوب یاد رکھا۔ اس کے علاوہ ہر شخص سے تپاک اور گرمجوشی سے ملنا چاہیئے اور ہر بات پوری توجہ سے سننا چاہیئے بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی عزیز یا رشتہ دار ملنے آئے تو غرور و نخوت سے پیش آتے ہیں اور کوئی بڑا افسر یا بڑا آدمی آجائے تو اس کے ساتھ زیادہ گرمجوشی دکھاتے ہیں ایسے لوگوں کی ہر دلعزیزی کا مصنوعی خول بہت جلد اتر جاتا ہے اور لوگ ان کے مصنوعی عجز اور انکساری کو بھی تکبر پر محمول کرنے لگتے ہیں دراصل اسے عجز اور بے ساختہ فرعون تو ہم ہے۔

جسے تو نیک کہتا ہے وہ لوگوں [illegible]

ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر انسان [illegible] یا ماتحت۔ چھوٹے ولے کے ساتھ قدر و عزت ہو۔ [illegible] جائے گرمجوشی سے مصافحہ کیا جائے اور پوری توجہ سے اس کی بات سنی جائے اس سے ارتباط پیدا ہوتا ہے اور [illegible] سا پیدا ہو جاتا ہے مختصر طور پر یہ کہنا ہے کہ صرف وہی شخص ہر دلعزیز ہو سکتا ہے جس کے دل میں بلا کسی امتیاز کے دوسروں کے لئے حقیقی محبت مہربانی خلوص اور نیکی کے جذبات ہوں ایسے لوگ جہاں بھی جاتے ہیں لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں۔

آؤ پڑوسن باتیں کریں!

مناظر عاشق ہرگانوی

"آؤ بہن۔ بیٹھو، کتنے دن بعد نظر آئی ہو" صفیہ نے نورجہاں کا استقبال کیا۔

"ہاں، دیکھو نا، فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ بچوں کا امتحان چل رہا تھا اور سوئی کے ابا جی ان دنوں آفس کے کام سے بہت الجھے ہوئے تھے" نورجہاں چارپائی پر بیٹھتی ہوئی شروع ہو گئیں۔

"یہ پریشانی تو میرے ساتھ بھی ہے۔ میرے یہاں بھی یہی سب کچھ چل رہا ہے۔ ساتھ ہی برسات کا موسم بچوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ کسی کو زکام ہے، کوئی کھانسی میں مبتلا ہے اور کوئی بخار میں پھنک رہا ہے [illegible] کھڑا ستایا۔"

"میرا گھر تو ابھی ان موسمی بیماریوں سے محفوظ ہے میں نے قبل ہی احتیاطی تدابیر کرا دی تھیں"

"یہ غلطی ہم سے ہوئی ہے کہ پہلے سے دھیان نہیں دیا۔ انّو کے ابا گھر کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ میں اکیلی بازار کروں، بچوں کو دیکھوں، گھر گرہستی سنبھالوں یا موسم کا خیال کروں"

"لیکن اس میں انّو کے ابا کا بھی قصور نہیں ہے۔ ان کی مصروفیت کا اگر ہم جائزہ لیں تو وہ قابل معافی قرار پائیں گے"

"او بہن، تم تو ان مردوں کی حمایت میں بولنے لگیں۔ عورتیں گھر کی زینت ہوتی ہیں۔ گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی ان کی زندگی خوبصورت ہوتی ہے"

"میں حمایت ضرور کر رہی ہوں، مگر اس میں صداقت کتنی ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جہاں تک گھر کے اندر رہنے کا سوال ہے، میں تمہارے خیالات سے متفق ہوں۔ مگر آج کا زمانہ دیکھو۔ گرانی اتنی ہے کہ ہزار بارہ سو میں مہینہ پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں ہم نوکر نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر نوکر نہیں رکھ سکتے تو گھر کے باہر کا کام کون کرے؟ بچے ابھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ صبح اٹھ کر ہی پڑھائی کی طرف دھیان دیتے ہیں۔ میں ناشتہ بنانے میں لگ جاتی ہوں۔ سوئی کے ابا بھی جانے غسل کرنے اور دو چار دوستوں کو فون کرنے میں ہی اتنا وقت لے لیتے ہیں کہ ان کے آفس جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ شام کو بچے اسکول سے آتے ہیں تو کھیلنے لگ جاتے ہیں۔ شام کے وقت تھوڑی دیر کھیلنا ان کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ ساڑھے چھ بجے کے بعد وہ سب پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ سوئی کے ابا اپنے ملنے جلنے والوں کے یہاں چلے جاتے ہیں۔ کلب وہ نہیں جاتے، سنیما بہت کم دیکھتے ہیں۔ ادھر ادھر گھومنے میں وقت نہیں گذارتے مگر میں دوستوں کے یہاں یا رشتہ داروں کے یہاں سے منع نہیں کر سکتی۔ سماج میں رہنے کے لئے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا ہی ہوگا۔ اگر میں سوئی کے ابا سے کہوں کہ آپ آفس نہ جائیے یا آفس کے وقت سے تھوڑا وقت گھر کے لئے نکالئے تو یہ کسی بھی صورت سے مناسب نہیں ہوگا۔ یا یہ کہوں کہ صبح سویرے اٹھ کر اور شام کو آفس سے آکر بازار سے سودا سلف لا دیجئے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ آخر میرا بھی تو کچھ فرض ہے۔ صرف گھر کا کھانا پکا دینے یا بچوں کو پیدا کر دینے کا نام بیوی نہیں ہے۔ لفظ بیوی کا مفہوم بہت وسعت رکھتا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال، گھر گرہستی سنبھالنا، شوہر کے آرام و راحت کا خیال رکھنا یہ تین کام تو اولیت رکھتے ہیں۔ ہاں، گھریلو کاموں میں کبھی کبھی شوہر سے بھی مدد لے لینی چاہئیے۔ اس سے بیوی کو خوشی ہوتی ہے۔ سوئی کے ابا کبھی کبھی گھر کا کوئی کام زبردستی کر دیتے ہیں تو یقین جانو بہن، میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے"

"تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ انّو کے ابا گھر کے کام نہیں کرتے۔ میں تو ان سے بازار بھی کراتی ہوں" صفیہ نے فخریہ انداز میں کہا۔ پھر ذرا آگے کھسک کر جوش بھرے لہجے میں بولیں۔ "ایک راز کی بات جانتی ہو۔ انّو کے ابا اکثر میرا بلاؤز اور بچی کے کپڑے تک دھو دیتے ہیں"

"اچھی! توبہ" نورجہاں نے ناک پر انگلی رکھ لی۔ "کیسی گندی عادت ہے یہ۔ اور بہن تم یہ سب کیسے سہتی ہو؟ تمہیں تو منع کرنا چاہیئے"

"میں کیوں منع کروں۔ میرا کام آسان ہو جاتا ہے اور [illegible]

کردوں، واہ "

"میں تو اسے بے شرمی کہوں گی۔ مرد کو ہمیشہ اپنے دائرے میں رہنا چاہئیے۔ بیوی کو بھی وہ اسی حالت میں اچھا لگتا ہے "۔۔۔

" یہ تمہاری باتیں ہیں۔ میرے خیالات تم سے الگ ہیں " صفیہ نے تھوڑا برا مانتے ہوئے کہا۔ " جب للن کے ابا کو برا نہیں لگتا مجھے برا نہیں لگتا ہے تو تمہیں کیوں فکر ہونے لگی "

" برا ماننے کی بات نہیں " نورجہاں نے سمجھایا۔ " دوسروں کی اچھی باتیں کرنا نا عقلمندی کی علامت ہے۔ یہ مسئلہ تمہارے ساتھ ہے۔ ایسے دوسرے گھروں میں دہرایا نہیں جاتا۔ دوسرے گھروں میں عیب سمجھا جاتا ہے۔ اب اس عیب کو تمہارے بچے سیکھیں گے اور بڑے ہو کر اپنائیں گے۔ دوسرے لوگ سنیں گے یا دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ برائی زیادہ تر گھروں سے ہی پھیلتی ہے۔ اور بری باتوں کو بچے جلدی ذہن نشین کر لیتے ہیں "

" مگر تم اسے برا کہنے پر کیوں تلی ہوئی ہو " صفیہ نے ناگواری سے کہا۔

" اس لئے کہ یہ باتیں بری ہیں۔ مردوں کا درجہ اونچا ہوتا ہے۔ اسے مردوں کو سمجھنا چاہئیے اور عورتیں بھی اس مرتبے کو نہ بھولیں۔ میں ایک مثال دیتی ہوں۔ سوئٹی کے انکل میرے یہاں بیٹھے ہوئے تھے باتوں باتوں میں وہ چوڑیوں کا ذکر لے بیٹھے اور ہم سب کے ہاتھ کی ناپ بتانے لگے۔ شہلا نے یہ سب سنا تو انھیں زور زور سے ڈانٹنے لگی۔ آپ کو یہ عورتوں والی عادت زیب نہیں دیتی۔ پڑھ لکھ کر ایسی گری ہوئی باتیں کرتے شرم آنی چاہئیے۔ آئندہ سے میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیجئے گا نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا ہاں "

سوئٹی کے انکل کتنے شریف ہیں تم نے دیکھا ہوگا۔ شہلا نے سب کے سامنے انھیں ٹوک دیا اور وہ کھسیانے ہو کر رہ گئے۔ میرے خیال میں شہلا نے انھیں صحیح ٹوکا۔ مردوں کو اپنی شان کی باتیں کرنی چاہئیں "

" بہن، تمہاری باتیں بڑی مشکل سے میرے حلق سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ عورتوں کو گھر کے اندر رہنا چاہئیے، دوسرے مردوں سے پردہ کرنا چاہئیے ۔۔۔۔ اور ہاں، مرد، میرا مطلب ہے شوہر اگر چوڑی لا کر دے تو کیوں نہیں لینا چاہئیے، بیچارے انکل چوڑی کا ذکر کر رہے تھے تو شہلا کو نہیں ڈانٹنا چاہئیے۔ بہن، میرا تو کوئی دیور بھی نہیں ہے ورنہ وہ بھی مجھے چوڑیاں لا کر دیتا "

" ارے، تم نے میری باتوں کو سمجھا ہی نہیں۔ میں نے یہ کب کہا کہ شوہر یا دیور چوڑی لا کر دے تو نہ لینا چاہئیے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ مردوں کو خواہ مخواہ عورتوں کے بیچ زنانہ گفتگو نہیں کرنی چاہئیے۔ اور جہاں تک عورتوں کے پردہ کا سوال ہے تو پردہ عورت کا زیور ہوتا ہے۔ لیکن یہ پردہ حیا کا ہونا چاہئیے نہ کہ صرف چہرے یا جسم کا۔ گھر کے اندر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا یہ بہانہ ہے "

" کیا۔۔ کیا کہہ رہی ہو۔ یعنی کہ تم کہنا چاہتی ہو میں نکمی ہوں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہوں "

" یہ میں نے کب کہا " نورجہاں گھبرا کر بولیں " میں تو صرف مثال دے رہی تھی اور اپنے خیالات پیش کر رہی تھی "

" بڑی آئیں مثال دینے والی اور اپنے خیالات پیش کرنے والی۔ اتنا ہی شوق ہے تو کوئی اسکول کھول کر بیٹھ رہو اور جاہلوں کے حلق میں اپنے خیالات ٹھونسو۔ تم میرے گھر بیٹھی ہو ورنہ بتا دیتی کہ پھوہڑ اور نکما کہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ ایک بار للن کے ابا نے مجھے پھوہڑ کہہ دیا تھا، اس کا نشان وہ آج تک اپنی پیشانی پر لیے گھوم رہے ہیں۔ جب میں نے للن کے ابا کو کچھ نہیں سمجھا تو تم کس کھیت کی مولی ہو "

" دیکھو بہن، خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہو۔ میں یہاں لڑنے نہیں آئی تھی۔ باتیں کرنے آئی تھی۔ تم نے بلا وجہ ۔۔۔۔ "

" دیکھو، اب مجھے جاہل نہ کہہ دینا ورنہ میں زمین آسمان ایک کردوں گی۔ تمہاری جلی کٹی باتیں بہت دیر سے سن رہی ہوں اور برداشت کرتی آ رہی ہوں "

" اچھا تو میں چلی "

" ضرور جاؤ اور ایسے خیالات لے کر آئندہ میرے یہاں مت آنا "

نورجہاں خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں اور سوچنے لگیں کہ اپنی گرہستی کو جہنم بنانے میں صفیہ کا ہاتھ ہے، للن کے ابا کا ہاتھ ہے یا ان کے ماں باپ کا ہاتھ ہے جنھوں نے ان کی تربیت ہی ایسے ڈھنگ سے کی ہے جہاں اندھی عقل کی حکمرانی ہوتی ہے!

مسیحا
افسانہ

نفیسہ یوسف

"ڈاکٹر صاحب اس وقت اس کی طبیعت سخت خراب ہے اس کو دورہ پڑ گیا ہے میں اس کو آپ کے مطب میں لا نہیں سکتا۔ حارث سخت گھبرایا ہوا تھا۔

"آپ فکر مت کریں حارث صاحب آپ کے کہنے کے مطابق وہ دو ڈھائی گھنٹہ میں نارمل ہو جائیں گی تو آپ ایسا کریں کل سہ پہر انھیں میرے پاس لے آئیں۔ ادھر سے فون پر ڈاکٹر نے جواب دیا۔

حارث کے بے حد اصرار پر منیر چلی تو آئی تھی مگر سخت گھبرا رہی تھی۔

آئیے آئیے مسٹر حارث اور منیر صاحبہ۔ ڈاکٹر نے نہایت خوش اخلاقی سے ان کا خیر مقدم کیا تشریف رکھیے۔

ادھر ادھر کی چند منٹ گفتگو کے بعد حارث تو اٹھ گیا اسے ضروری کام سے جانا تھا۔ میں ساڑھے پانچ بجے آپ کو واپس پر لیتا جاؤں گا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیوی کو تسلی دی جو اکیلی رہ جانے پر گھبرا رہی تھی۔

"منیر بتائیے آپ کی شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا؟" ڈاکٹر خاصا بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔

جی چار سال ہونے میں ڈاکٹر صاحب۔ وہ آہستگی سے بولی۔

ڈاکٹر صاحب سلمان کہیے۔ ڈاکٹر نے ٹوکا دیکھیے میں ماہر نفسیات ہوں میرا اور آپ کا رشتہ ڈاکٹر اور مریض کا نہیں دو دوستوں کا ہے جو ایک دوسرے کو اپنا دکھ سناتے ہیں اور دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں میں آپ کو آپ کے نام سے اور آپ مجھے میرے نام سے پکارا کریں گی۔

منیر اس خوش اخلاق اور خوش پوش ڈاکٹر سے مرعوب سی ہو گئی۔ بے حد شریف اور نہایت شائستہ اور ایسے لوگ اسے بہت بھاتے تھے۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں منیر؟"

ایک بچہ ہے اس نے جواب دیا۔

اچھا، بتائیں گی آپ کو دورے سے یہ تکلیف کب شروع ہوئی۔ میرا مطلب ہے یہ جو آپ روتی رہتی ہیں دو دو گھنٹے غلطی رہتی ہیں اور۔

مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں وہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی۔

اوہ آپ ناراض ہو گئیں منیر میں ایک دوست کے ناطے آپ سے پوچھ رہا تھا نہیں بتانا چاہتیں تو کوئی حرج نہیں، ڈاکٹر لاپروائی سے سگریٹ سلگانے لگا۔

کیا آپ اپنی تکلیف اور پریشانیاں اپنے شوہر کو نہیں بتاتیں حالانکہ وہ بتا رہے تھے آپ کی شادی پسند سے ہوئی تھی اور ایک دوسرے کو چاہتے بھی بہت ہیں آپ لوگ اچھے دوست بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب!! وہ چیخ پڑی۔

اوہ سوری سوری۔ ڈاکٹر حیران تھا کہ اس میں بگڑنے کی کیا بات تھی مگر اس لڑکی کا علاج کیسے ہو وہ تو کچھ بتانے پر تیار ہی نہ تھی۔

اچھا دیکھیے آپ سے سوال جواب ختم ہم نے چائے منگائی ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں تب تک میں اپنا کام ختم کر لوں ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا تو اس نے خدا کا

شکر ادا کیا اور آرام سے بیٹھ گئی۔

کمرہ بڑی نفاست اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا کمرے میں بڑا سا گلدان رکھا تھا جس میں تازہ پھول مہک رہے تھے زمین پر خوبصورت سا قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے کی دیوار دلکش رنگ پردے دروازے اور کھڑکیوں میں لٹک رہے تھے اور جس صوفے پر وہ خود بیٹھی تھی وہ بھی خوبصورت تھا اور یہاں ڈاکٹر باتیں بھی تو بہت اچھی کرتا ہے بالکل دوستوں کی طرح شفقت اور خلوص بھرا ہوا اس کا سراپا بھی کتنا خوبصورت ہے باتیں کرنے کا انداز کتنا شائستہ ہے ایسے لوگ کتنے اچھے لگتے ہیں۔

وہ بھی تو بالکل ایسا ہی تھا وحید ..... اور وحید کا یاد آتا تھا وہ بے قرار ہو گئی مجھے اس کے متعلق نہیں سوچنا چاہئے میرا تو سب کچھ حارث ہی ہے پھر یہ کون چور دروازے سے میرے ذہن میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس شخص کی مجرم ہوں۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

چلے جاؤ میری یادوں سے' چلے جاؤ میرے دل سے چلے جاؤ۔ میں یہاں اس دل میں صرف حارث ہی کو بسانا چاہتی ہوں وہ میری محبت ہے میرا شوہر ہے، میرے بچے کا باپ ہے۔

ڈاکٹر نے پردہ ہٹا کر اندر دیکھا رسالے کے ٹکڑے فرش میں بکھرے ہوئے تھے میز الٹی پڑی تھی۔ صوفے کے کشن ادھر ادھر لڑھک رہے تھے اور وحشت زدہ سی کمرے میں گھوم رہی تھی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تیزی سے اندر چلا آیا۔

عنبر بیٹھ جاؤ۔ اس نے عنبر کے قریب جا کر کہا۔

عنبر نے اسے التجا بھری نظر سے دیکھا۔

بیٹھ جاؤ عنبر اور آرام سے بیٹھ کر سوچو۔ ڈاکٹر نے دونوں کاندھے تھام کے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔

اپنے ذہن پر بار مت ڈالو جو سوچنا چاہتی ہو سوچ مت زبان سے کہہ دو اپنے دل کی بات زبان پہ لے جاؤ۔ تاکہ تمہارے دماغ پہ پڑا ہوا بوجھ کم ہو جائے

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی ڈاکٹر۔

تم مجھے اپنا دوست سمجھو تم مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہو ہر بات کہہ سکتی ہو وہ بھی جسے تم سوچتے ہوئے ڈرتی ہو میں تمہارا رازداں ہوں تمہاری بات تمہارا راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ ڈاکٹر پھر بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے بہت مشکل سے زبان کھولی۔

میں ایک اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی ہوں کالج میں پڑھتی اور نہایت شوخ اور شریر تھی میری منگنی بچپن ہی میں میرے خالہ زاد بھائی سے ہو گئی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ حارث اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے۔ اس دوران مجھ پہ افسانے پڑھنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ مجھے وحید کے افسانے نہ جانے کتنے اچھے لگے۔ پھر یوں ہوا کہ رسالے کی معرفت میں نے اسے ایک تعریفی خط لکھ دیا۔ خلاف توقع اس کا جواب آ گیا۔

اس کے بعد ہم دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ میں اس کی گرویدہ ہوتی جاتی تھی ان دیکھے میں اس کی پرستار ہو گئی۔ وہ اتنے خوبصورت الفاظ اور ایسے پیارے جملے لکھتا تھا کہ میرا دل چاہتا خط کا مضمون کبھی ختم نہ ہو۔ پھر میں نے اسے اپنی ایک خوبصورت رنگین تصویر بھیجی جس کے جواب میں اس نے لکھا کہ میں شاعر نہیں ہوں کہ تمہاری تعریف میں غزل کہوں نہ میں یہ کہہ سکوں گا کہ تمہاری آنکھوں میں جگنو چمکتے ہیں اور تمہارے گالوں پر گلاب کھلتے ہیں تمہارے بال گھٹاؤں جیسے ہیں لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ تمہاری شخصیت بھرپور ہے، تم خوبصورت پیکر میں ڈھلی ہوئی ہو۔ دل چاہتا ہے۔ تمہیں دیکھوں۔ اور بس دیکھتا رہوں۔ آنکھوں کے رستے تمہیں دل میں اتار لوں۔ ہاں ایک بات اور عنبر مجھے آزمانے کی کوشش مت کرنا میں ہار جاؤں گا۔

ڈاکٹر میں اس کے خط پڑھ کر مسرور ہو جاتی۔ کیسا انوکھا تھا وہ عجیب عجیب گہری گہری دل کش پیاری باتیں کہہ کر

کی نوبت نہیں آئی۔ ایک دن اطمینان سے گذرا مگر اگلے دن ایسی بات
ہو گئی کہ بستر بوریا سمیٹنا پڑا۔ اسی طرح مختلف محلوں میں ایک ایک
دو دو ہفتہ رہتا ہوں مگر اب تو محلے چھوڑ کر شہر چھوڑنے کی نوبت آ گئی
ہے کیا اس لحاظ سے میرا نام مناسب نہیں ہے؟

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا: "تم دلچسپ مذاق کرتے ہو تمہارے اس
مذاق کے جواب میں میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمہارا مذاق مہاجر ہے
تو مجھے محلہ کہہ کر پکارو۔ دلچسپ بات ہوگی نا۔" یہ کہہ کر وہ زور زور
قہقہے لگانے لگا۔

مجھے ڈر ہوا کہ نصف شب میں محلے والے کے قہقہے کی آواز سن کر
اس کے بھائی بند دوڑے چلے آئیں۔ میں نے اپنے اس خوف کا
اظہار کیا تو وہ اور زور زور سے ہنسنے لگا پھر بولا "تم مطمئن رہو میرے
قہقہوں کی آواز سن کر کوئی نہیں آئے گا۔ یہ سب باتیں ہم نے آپس
میں پہلے سے طے کر رکھی ہیں۔ بقیہ محلے والے اپنے اپنے گھروں میں دم
سادھے بیٹھے ہیں۔ وہ سب صبح کے منتظر ہیں۔ صبح ہوتے ہی وہ
میرے گھر پر اکٹھے ہوں گے۔ اب یہ بات میری مرضی پر منحصر ہے کہ میں
ان کو کس حد تک تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔ ہاں تو بھائی
مہاجر کیا تم اپنے بھائی محلے والے کو اپنی بیوی بچوں کے بارے میں
کچھ نہیں بتاؤ گے؟ اگر تم کنوارے ہو تو ہم سب مل کر بخوشی تمہارا گھر
آباد کر سکتے ہیں۔ مگر تمہارا اور کوئی مسئلہ ہے تو ہمیں بتاؤ ہم تمہاری
مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے اپنی قمیص اور دیگر چھوٹی موٹی چیزیں صندوق میں
بند کرتے ہوئے کہا: "اس محلے میں میرے رہنے کی میعاد پوری ہو
چکی ہے سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا
میرے خیال میں تم میرے دوست ہو۔ کیونکہ تمہاری وجہ سے مجھے اپنے
بارے میں محلے والوں کے خیالات کا علم ہوا ہے۔ اس احسان کا
بدلہ چکانے کے لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے بارے
میں چند باتیں بتا دوں۔ تاکہ تم رات کو چین سے سو سکو میں تمہارا
پچھلے تین ماہ کی نیند کا حساب بھی بیباک کر دوں گا۔"

جب میں صندوق میں آخری قمیص رکھ چکا تو اسے بند کر کے
اُس کے اوپر بیٹھ گیا میں نے کہا "تم میرے دوست ہو خدا را میرے
سامنے شادی کا نام نہ لو۔ میری داستان بڑی طویل ہے مگر وقت
کم ہے۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ مگر
اس محبت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب والدین میری شادی کر
چکے تھے اپنی محبت کے لئے دعا مانگتے ہوئے ۲۰ برس ہو گئے اور جب
جینا محال ہو گیا تو میں نے چپکے سے اس لڑکی سے شادی کر لی جس سے
مجھے محبت تھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک اور واقعہ
رونما ہوا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ مجھے تیسری شادی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس
مرتبہ ایک لڑکی کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ تیسری شادی کے بعد مجھے
اندازہ ہوا کہ میں اکیلا آدمی تین بیویوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا
اس بوجھ کو بانٹنے کے لئے میں نے ایک کمانے والی عورت سے
شادی کی تاکہ گھر کا کاروبار آسانی سے چلے۔ چوتھی بیوی کے آنے سے
مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی ناک خوبصورت نہیں
ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میں نے ایک اور شادی کی۔ اس لڑکی
کی ناک بڑی خوبصورت تھی۔ مگر وہ زبان دراز ثابت ہوئی۔ اس کی زبان
درازی سے میری دوسری بیویاں ہی نہیں میں بھی نالاں تھا۔ زبان دراز
بیوی سے مقابلے کے لئے میں نے ایک اور انتہائی لڑاکا عورت سے
شادی کی تاکہ یہ دونوں آپس میں محاذ آرا رہیں۔ مگر لڑاکا عورت کی
آنکھیں اچھی نہیں تھیں۔ اس کے بعد میں مجبور ہو کر خوبصورت ہاتھ، پیر،
آنکھ، ناک، کان، ہونٹ اور بال اکٹھے کرنے لگا جب یہ مجموعہ اتنا پھیلا
کہ سمٹنا مشکل ہو گیا تو میں نے اس کے بوجھ تلے اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس
کیا وہ سب موقع پاتے ہی میرے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑ جاتیں۔ اس خطرہ
سے بچنے کے لئے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تو مجھے اپنی بیویوں کی تعداد بھی
یاد نہیں ہے۔ اسی بھاگ دوڑ میں، میں تمہارے محلے تک آ پہنچا۔

میری تمام بیویاں آپس میں لڑتی ہیں کمانے والی ان کو پالتی ہے جن
کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جن حسین نقوش کی خاطر
میں نے اتنی شادیاں کی ہیں۔ اگر ان کو یکجا کر دوں تو ایک خیالی اور مثالی
عورت بن سکتی ہے میرا مسئلہ کوئی نہیں ہے۔ ہاں یہ خیال اکثر پریشان
کرتا ہے کہ اگر میں محبت نہ کرتا اور حسین نقوش جمع کرنے کے شغل کو اپناتا
تب حالات کیا رخ اختیار کرتے۔"

بشکریہ اخبار خواتین

میں آپ کا دل ہوں

جناب عبداللہ خاور

مجھے "دل ناداں" کہنا کوئی دانائی کی بات نہیں کیونکہ آپ سے حماقت یا حماقت سرزد کروانا میرا کام نہیں، بلکہ دماغ کا ہے اسی طرح مجھے "دل بے قرار" کہنا صرف جزوی طور پر صحیح ہے کہ میں رکتا کبھی نہیں۔ بے قراری کا جو جذباتی اور نفسیاتی مفہوم ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ جن صاحب نے فرمایا تھا "دل بے قرار سو جا" تو انھوں نے اپنی موت کو دعوت دی تھی، اگر میں ان کی دعوت قبول کر لیتا تو وہ وقت سے بہت پہلے آں جہانی ہو جاتے۔ لکھنؤ میڈیکل کالج میں کسی زمانہ میں عضویاتی ادویاتی، نمائش ہوئی تھی۔ اس میں مجھے بھی ایک شوکیس کی زینت بنایا گیا تھا۔ ایک نوجوان ڈاکٹر نے محض تفنن طبع کے طور پر میرے شوکیس پر یہ تختی لگا دی تھی۔

"یہاں کیوپڈ نہیں رہتا"

حقیقت یہ ہے کہ میں سرے سے رومانی کردار ہوں ہی نہیں: خواہ مشرق و مغرب کے تمام شعرا اور ادیب کچھ بھی کہتے رہیں، البتہ آپ کے حیاتی نظام کی کارگزاریاں مجھ پر فوری ردعمل پیدا کرتی ہیں میری بڑھتی ہوئی دھڑکن ہجر و وصال کے جذباتی اور حیاتی عمل اور اسباب سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ سب دماغ کی کارگزاری ہے جو صدیوں سے دل کے ساتھ منسوب کی جا رہی ہیں۔

میں نازک بھی نہیں جیسا کہ عام خیال ہے۔ اس کے برعکس میں آپ کا سب سے محکم عضو ہوں۔ اس تمہید کا مطلب یہ تھا کہ آپ میرے معاملے میں حساس رہنا ترک کر دیں تو میرے اور آپ کے لئے بہت مفید ہوگا۔

تو صاحب مجھے دل کہتے ہیں۔ میرا وزن ۱۱ اونس، رنگ سرخ قدرے بھوراپن لئے ہوئے اور شکل کسی حد تک برگ پان سے ملتی ہوتی ہے۔ میں آپ کے سینہ کے وسط میں رباطا یا تسموں سے بندھا ہوا لٹکتا رہتا ہوں۔ میری لمبائی ۵ انچ اور میرے چوڑے حصہ کا قطر ۳ انچ ہوتا ہے۔

میں ایک سخت گوشت چوخانہ پمپ یا ؤسس ہوں جس کے دو پمپ ہیں، ایک پھیپھڑوں میں خون پہنچانے کے لئے دوسرا بدن میں لے جانے کے لئے۔ ہر روز میں ساٹھ ہزار میل لمبی وریدوں نسیجوں اور نالیوں میں خون پمپ کرتا ہوں۔ یہ پمپنگ اتنی بہت ہے کہ اس کی قوت سے چار ہزار گیلن کا ٹینک بھرا جا سکتا ہے اب بھی آپ مجھے نازک عضو کہیں گے؟ آپ کی اس ۵۰ سالہ عمر میں آپ کا تین لاکھ ٹن خون پمپ کر چکا ہوں۔ میں دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹانگوں کے عضلات سے دوگنا سخت کام کرتا ہوں ہیوی ویٹ باکسر کے بازوؤں سے کہیں زیادہ محنت کرتا ہوں اگر محمد علی میری رفتار پر اپنے بازوؤں کو حرکت دیں تو ان کے بازو دنوں میں حلوا بن جائیں۔ کچھ اندازہ ہوا آپ کو میری قوت کا ایک انسان کی ستر سالہ اوسط عمر کے ہر لمحے پر میرا کام جاری رہتا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ میں آرام بالکل نہیں کرتا دو دھڑکنوں کے درمیان کا وقفہ میرے آرام کے لئے ہوتا ہے

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میرا بایاں بطن LEFT VENTRICLE بدن سے خون کھینچنے اور واپس بھیجنے میں ایک تہائی سیکنڈ لیتا ہے۔ اس کے بعد مجھے آدھے سیکنڈ کا وقفہ ملتا ہے۔ نیز جب آپ سو جاتے ہیں تو بہت سی عروقی شعری غیر فعال ہو جاتی ہیں۔ اس طرح مجھے ان کو خون نہیں بھیجنا پڑتا۔ لہٰذا میری دھڑکن ۷۰ ضربات فی منٹ سے ۵۵ ضربات تک آ جاتی ہے۔ اس طرح بھی مجھے آرام مل جاتا ہے۔

آپ میرے بارے میں کم سوچتے ہیں۔ یہ اچھا ہے میں نہیں چاہتا کہ آپ ان اعصابیوں کی طرح ہو جائیں جو ہر وقت بلا مقصد

بائے دل پکارا کرتے ہیں۔ یہی تشویش حقیقی تشویش کے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی میرا احتراقی نظام IGNITION SYSTEM غیر مربوط ہو جاتا ہے بالکل جیسے آپ کی کار کا اگنیشن ۔ میں اپنی بجلی خود پیدا کرتا ہوں اور عضلات کے عمل کو تحریک دینے کے لئے تسویقاتی لہریں IMPULSES بھیجتا ہوں۔ کبھی کبھی میرا الشلن جھٹک بھی جاتا ہے اور ایک ضرب دوسری ضرب پر چڑھ جاتی ہے۔ سننے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ میں ڈگمگا رہا ہوں، لیکن میں ڈگمگاتا نہیں ہوں، بلکہ یہ بھی میرے معمول کا ایک حصہ ہے۔

کبھی کبھی آپ برا خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑتے ہیں اور میری زبردست دھڑکنیں سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں، خواب میں آپ بھاگ رہے تھے۔ میں بھی بھاگ رہا تھا، یعنی اتنی ہی محنت کر رہا تھا جتنی آپ واقعی دوڑ لگانے میں کرتے ہیں۔ البتہ اس وقت تشویش میں مبتلا ہو جائیں تو میری رفتار اور بڑھ جائے گی۔ اگر خود پرسکون ہو جائیں تو میں بھی معمول پر آجاؤں گا۔ لیکن اگر آپ پرسکون ہونے میں ناکام ہو جائیں تو بھی مجھے معمول پر لانے کا ایک طریقہ ہے۔ عصب راجع VAGUS NERVES کا سلسلہ میرے بریک کا کام کرتا ہے۔ یہ اعصاب کانوں کے درمیان گردن کے پچھلے حصے سے گزرتے ہیں۔ یہاں پر ہلکی پلکی مالش کیجئے تو میری دھڑکنیں سست پڑ جائیں گی۔

آپ مجھ پر بہت سے الزامات لگاتے رہتے ہیں۔ تھکاوٹ سے لے کر چکر آنے تک، ہر چیز مجھ سے منسوب کرتے ہیں۔ تھکاوٹ سے تو میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔ رہی سنسناہٹ اور چکر تو آپ کے کانوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی آپ طویل مدت تک میز پر جھکے رہتے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً سینہ میں سخت درد ہونے لگتا ہے۔ اسے حملہ قلب نہ سمجھیں۔ یہ درد نظام ہضم سے تعلق رکھتا ہے۔ جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہوں تو درد کا سگنل صرف ہیجانی اشتعال یا سخت محنت کے وقت بھیجتا ہوں۔ اس سگنل کا مطلب یہ ہے کہ جو کام مجھ سے لیا جا رہا ہے، اس کے لئے مجھے مناسب توانائی نہیں پہنچائی جا رہی ہے۔

میں توانائی خون کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہوں۔ میں خود آپ کے بدن کا ایک تہائی جزو ہوں، لیکن مجھے آپ کے کل خون کا بیسواں حصہ اپنی توانائی کے لئے درکار ہوتا ہے، جس میں دوسرے اعضا کے مقابلے میں دس گنا توانائی زیادہ صرف کرتا ہوں لیکن آپ کو حیرت ہوگی میں یہ توانائی خون سے نہیں کھینچتا جو میرے چار خانوں سے گزرتا رہتا ہے۔ مجھے یہ تغذیہ میری دو اکلیلی شریانوں سے ملتا ہے جو ننھے پودے کے ڈنٹھل کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ یہی میرا نازک مقام ہے۔ یہاں پر تکلیف پیدا ہو جانے سے اکثر اموات واقع ہو جاتی ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ اچانک یہ تکلیف کیسے پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک امکان یہ ہے کہ ابتدائی زندگی میں اور پیدائش کے وقت سے اکلیلی شریانوں میں چربی جمع ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے ...... شریان بند ہو سکتی ہے۔ یا چربی کی کوئی بھی مقدار شریان میں پھنس کر خون کی راہ مسدود کر سکتی ہے۔ اس طرح اچانک حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شریان بند ہو جاتی ہے تو قلب کے جس حصے کو وہ غذا مہیا کرتی ہے وہ حصہ مر جاتا ہے۔ اس سے ریشوں کا چکتا سا پیدا ہو جاتا ہے جو بسا اوقات مٹر کے برابر یا ٹینس بال کے برابر ہوتا ہے۔ بیماری کی سنگینی کا انحصار اس پر ہے کہ شریان کا مسدود حصہ کہاں پر ہے اور کتنا بڑا ہے۔ اکثر چھوٹے مسدود حصے کو میں خود چند ہفتے تکالیف اٹھا کر ٹھیک کر لیتا ہوں، لیکن اس کا داغ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔

بعض لوگ قلب کے موروثی مریض ہوتے ہیں ان کا مکمل علاج تو بہت مشکل ہے، لیکن وہ احتیاطی تدابیر کے ذریعہ سے خطرے کے امکان کو کم سے کم ضرور کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلا مسئلہ موٹاپے کا ہے۔ لوگ اس کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں، لیکن مسئلہ ہے بڑا سنگین! ایک پونڈ زائد چربی جو آپ کے بدن پر چڑھتی ہے اس میں دو سو میل لمبی شریانیں ہوتی ہیں جن میں مجھے خون پہنچانا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ میرے اضافی کام اور زائد تر محنت کا اندازہ کیجئے۔

یہیں سے بلڈ پریشر کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ادھیڑ عمر کے آدمی کے بلڈ پریشر کی اوپری حد ۱۴۰/۹۰ ہوتی ہے۔ ...

نشاط کے کام کی گنجائش ہے اور وہ اس وقت کا دباؤ ہوتا ہے جب میں کام کا وقفہ حاصل کرتا ہوں نہ یہ پہلا عدد زیادہ اہم ہے یہ گنجائش اس سے مختص نہ رہے گی، وہ میرے اضافی کام کو ظاہر کرے گی، یعنی میرے قدرتی آرام کا وقفہ کم سے کم ہوتا جائے گا اور آرام کے بغیر دل کا سفر زندگی کی طرف نہیں، دوسری طرف ہوتا ہے۔

ہائی بلڈ پریشر کا تریاق یہ ہے کہ وزن کم کیا جائے کہ وزن کا فوری اثر بلڈ پریشر پر دیکھا جا سکتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ سگریٹ ترک کر دی جائے۔ آپ جو روزانہ چالیس سگریٹیں پیتے ہیں یہ میرے خلاف بہت شدید و تند کارروائی ہے یہ شریانوں کو سکوڑ دیتی ہے، خصوصاً ہاتھوں اور پیروں کی شریانوں کو۔ شریانوں کے سکڑنے سے میری پمپنگ پر دباؤ بڑھتا ہے نکوٹین مجھے تحریک بھی دیتی ہے جس کی وجہ سے میری دھڑکن ۷۲ فی منٹ سے بڑھ کر ۸۰ فی منٹ ہو جاتی ہے۔ اس سے میرے چوبیس گھنٹے کے اضافی کام کا اندازہ لگائیے۔ آپ کہتے ہیں کہ اب سگریٹ کیا چھوڑی جائے جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ لیکن آپ یہ تسلیم تو کریں گے کہ نکوٹین جو میری رفتار بڑھا رہی ہے اس میں تو اعتدال آ جائے گا اور اس اعتدال سے آپ کے لئے خطرہ کتنا کم ہو جائے گا۔ تیسری احتیاط یہ ہے کہ ہر معاملہ پر جھلانا اور تشویش میں مبتلا ہونا چھوڑ دیں۔ طیش اور تشویش کے عالم میں غدد فوق الکلیہ ADRENAL GLANDS ایسے مادے پیدا کرنے لگتے ہیں جو نکوٹین کی طرح میرے فعل اور محنت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

نکتے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ آرام کریں گے تو میں آرام کروں گا۔ کام کے بعد ذرا سا اونگھ لینا کافی ہوتا ہے۔ ہلکا تفریحی مطالعہ بھی آرام و سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن تفریحی مطالعہ کی تعریف سے تمام سنسنی خیز، جنسی اور قتل و غارت گری پر مشتمل تحریریں خارج ہیں۔ ان سے اشتعال، خوف اور شہوت کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں جو میرے لئے مضر ہیں ورزش اور سخت محنت کے ایسے کام جو عادت اور معمول میں شامل نہیں، میرے لئے تکلیف دہ ہوتے ہیں، البتہ اگر باقاعدہ ورزش کا آپ اپنے نظام جسمانی کو عادی بنا لیں تو یہ میرے لئے بہت مفید ہوگا۔ ایک یا دو میل روزانہ پیدل چلنا تھوڑی دفتر کی ایک سے دو منزلیں لفٹ کے بجائے زینے سے طے کرنا، ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتیں ہیں جو میرے لئے باعث رحمت ثابت ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میری بعض شریانوں میں کچھ چربی پیدا ہونی شروع ہو گئی ہے، لیکن باقاعدہ ورزش خون کے لئے نئے راستے بنا لیتی ہے ایسی صورت میں اگر ایک شریان بند ہو جائے تو مجھے تغذیہ دینے کے لئے دوسری شریانیں موجود رہتی ہیں۔

آخری احتیاط کا تعلق غذا سے ہے۔ میں نہیں کہتا کہ آپ "غذائی حساس" یا وہمی بن جائیں اور اپنے کام و دہن کو بہت سے ذائقوں سے محروم کر لیں۔

بس یہ واضح ہو کہ چربی میری راہوں کو مسدود کرتی ہے جو اشخاص اپنے حراروں کا ۴۵ فیصد حصہ چربی سے حاصل کرتے ہیں، بند شریان سے فوری موت کا ۵۰ فیصد امکان ان کے لئے موجود ہے۔ کاش آپ خود اپنے جسم میں جھانک کر دیکھیں کہ بھاری چربیلی غذا نوش کرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ خون میں ننھے شحماتی ذرے سرخ خلیات میں چپک کر رواں دواں خون کو لیس دار گاڑھا مادہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ خون کے بجائے یہی ملغوبہ مجھے شریانوں میں ٹھونسنا پڑتا ہے یہ عمل کوہ کنی کے مترادف ہے۔

میں مطالبات کے لئے نعرے لگانے والوں میں سے نہیں ہوں میں تو بہر حال اپنی امکانی حد تک بہترین کام کرتا ہوں، لیکن اگر آپ بھی مدد کریں تو میرا کام بہتر ہوگا۔ (بشکریہ ہمدرد صحت، کراچی)

دنیا میں جہنم

اردو کے مشہور شاعر و ادیب جناب امین سلونوی نے ایسے پُر لطف مجموعہ کا جو بیویوں نے اپنے شوہروں کو سنائے۔ یہ معمولی معمولی باتوں پر دیئے گئے۔ مثلاً دیا سلائی کی ڈبیہ نہ لانے پر۔ دفتر سے دیر میں آنے پر، پسند کا نہ خریدنے پر وغیرہ۔

بہت سے گھروں میں، جناب شوہر نامدار ضبط و صبر کے عادی ہوتے ہیں۔ وہاں بیویاں ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں ان کا دماغ کھاتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب ایسی ہی خواتین کو ذہن میں رکھ کر امین صاحب نے لکھی ہے۔

قیمت مجلد چار روپیہ پچاس پیسے

حریمی دسترخوان

کلیجی۔ اشیاء: کلیجی درمیانہ سائز کی ایک عدد، لہسن ایک گٹھی، پیاز آدھ پاؤ، نمک، سرخ مرچ حسب ذائقہ، گھی تین چھٹانک، ہرا دھنیا حسب ضرورت۔

ترکیب:۔ کلیجی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں اور اسے خوب دھولیں اب اس کو کھلے پانی میں اس کے ہاتھ ہوتے ڈال کر ایک اُبال دے لیں اس سے اس کا خون خشک ہوجائے گا۔ پھر پانی سے نکال کر علیحدہ رکھ لیں۔ اب پیاز لچھے دار کاٹ لیں اور لہسن پیس لیں۔ پیاز کو گھی میں بھون کر بادامی کرلیں اور پسا ہوا لہسن اور نمک مرچ ڈال کر سالن کی طرح تیار کریں۔ اب اس میں کلیجی کے ٹکڑے ڈال کر بھونیں جب بھن جائے تو اس میں تین کپ پانی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر گلنے کے لئے رکھ دیں جب گل جائے تو لیموں کرا اور ہرا دھنیا ڈال کر اتارلیں۔

رانِ مسلّم

اشیاء:۔ چھوٹے بکرے کی ران ایک جس کا وزن سیر سوا سیر سے زیادہ نہ ہو، یا دست کا ایک سیر بھر کا ٹکڑا ہو جسے صاف کرالیں۔ سرکہ چائے کی ایک پیالی، کالی مرچ چوتھائی چھٹانک، ادرک آدھی چھٹانک، گھی آدھ پاؤ، نمک حسب ذائقہ

ترکیب:۔ گوشت کا ٹکڑا یا ران کو کانٹے سے اچھی طرح گود لیں۔ ادرک باریک پیس لیں اس میں کالی مرچ اور نمک پیس کر ملادیں۔ یہ سرکہ ران کے اوپر اچھی طرح مل لیں جو بچے وہ بھی اسی پر ڈال دیں اور ایک دو گھنٹے تک ایسا ہی پڑا رہنے دیں پھر ایک دیگچی میں گھی ڈال کر اس پر ران یا گوشت کا ٹکڑا ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر سرخ ہونے دیں۔ جب سرخ ہوجائے تو اس میں پانی ڈال دیں تاکہ وہ ٹکڑا گل جائے، گلنے پر اُسے دوبارہ سرخ کریں اور نکال کر مسلّم ڈش میں پیش کریں۔

تکہ بوٹی۔ اشیاء۔ گوشت دست کا بغیر ہڈی کے آدھ سیر، اس کے برابر کے چوکور ٹکڑے ایک انچ مربع بنالیں، دہی ایک چھٹانک، گرم مسالہ سب پسا ہوا، ایک چائے کے چمچے کے برابر، نمک، سرخ مرچ حسب ذائقہ، ادرک چوتھائی چھٹانک، لہسن چھ جوے، سوکھا دھنیا، سفید زیرہ پسا ہوا ایک چمچے کے برابر، گھی ایک چھٹانک۔

ترکیب:۔ گوشت کے ٹکڑوں کو ابال لیں وہ نیم گلے ہوں تو پانی خشک کرکے اتارلیں۔ سب مسالہ پیس کر دہی میں ملادیں اور گوشت کے ٹکڑوں کو ٹھنڈا کرکے ان پر اچھی طرح لگادیں۔ یہ ٹکڑے سیخ پر چڑھادیں اور کوئلوں پر کباب کی طرح سینک کر سرخ کرلیں ساتھ ساتھ ان پر ذرا ذرا گھی ٹپکاتے جائیں سرخ ہونے پر اتارلیں اور کٹی ہوئی پیاز اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

چانپ۔ اشیاء:۔ چانپ کا گوشت آدھ سیر، گھی ایک پاؤ، ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ، سرخ مرچ، نمک پسی ہوئی، حسب پسند گرم مسالہ پسا ہوا، ایک چمچی برابر، سوکھا دھنیا سفید زیرہ پسا ہوا ایک چمچے کے برابر، کھٹائی پسی ہوئی آدھی چھٹانک، دہی آدھ پاؤ۔

ترکیب:۔ چانپ کو دھو کر ایک دیگچی میں پانی ڈال کر اُبالنے کے لئے چولہے پر رکھ دیں۔ پانی اتنا ڈالیں کہ چانپ اسی پانی میں ابل جائے اور پانی خشک ہوجائے۔ اب سل پر ایک ایک چانپ کو ڈال کر بٹے سے ہلکا ہلکا کچل لیں۔ ایک برتن میں دہی کو پھینٹ لیں اور کچلے ہوئے چانپوں پر دہی لگاکر تقریباً آدھ گھنٹے تک رکھ دیں۔ اتنی دیر میں آپ تمام گرم مسالہ اور سوکھا مسالہ ملاکر چٹنی کی طرح پیس لیں۔ اس چٹنی کو ایک کھلے منہ کے برتن یا بڑے تسلے میں ڈال دیں۔ اور دہی سے چانپوں کو نکال کر چٹنی میں ڈال دیں۔ سیدھے توے پر چانپوں کو ڈالیں اور ایک ایک چائے کا چمچہ گھی کا ڈالتے جائیں۔ لیکن یاد رکھیں زیادہ گھی نہ ڈالیں ورنہ چانپوں کا مزہ خراب ہوجائے گا۔ چانپ سرخ ہونے پر اتارلیں اور گرم گرم کھائیں انتہائی لذیذ ہوں گے اسی ترکیب سے آپ تکہ بوٹی اور گردے وغیرہ بھی بناسکتے ہیں۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی وسیلہ ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو صرف ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور مختصر سے مختصر الفاظ میں لکھی جائے اور نمبر خریداری کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی جائے خبر کی اشاعت میں کتابت کی اتفاقیہ غلطی کی ذمہ داری ادارہ حریم پر نہ ہوگی۔ ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

- عقیلہ اردن پالوی (امروز بنجرہ) میری پیاری آپا شفیقہ اور بہنوئی ہاشم بڑے کے گلشن حیات میں ۲۳ ستمبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ بوقت ۹ بجے دن اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ایک پھول کھلایا نام شرجیل قرار پایا اللہ پاک اس کی عمر میں برکت دے اور فخر قوم بنائے۔
- فرحت لطیف قاضی (مسقط سلطنت عمان) میری نند رقیہ بیگم ظہیرالدین قاضی ناسک کے گلشن حیات میں ۳۰ جولائی ۱۹۸۲ء بروز ہفتہ صبح ۱۱ بجے پہلی کلی کھلی نام نازنین رکھا گیا اللہ پاک نومولود بچی کو صاحب نصیب کرے۔
- عقیلہ سلیم قادری (اگر ڈاکٹا) میری عزیز نند فرحت لطیف قاضی ساکن مسقط کو ۱۰ اگست ۱۹۸۲ء بروز یکشنبہ بوقت شام ۷ بجکر کچھ منٹ پر ۷ منٹ پڑھے نہیں جا سکے ۱ ایک شمع روشن ہوئی نام درشہوار رکھا گیا خداوند بنت نیک بخت کو صاحب نصیب فرمائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے (آمین)۔
- مہر فیروز صفیہ راحت (ملکاپور) میری پیاری بہن رقیہ افروز اور بہنوئی جیلانی صاحب کے چمن حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ پاک نے ۷ بیٹیوں کے بعد بروز اتوار ۱۹ ستمبر بوقت ایک بجے دن چاند سا بیٹا عطا فرمایا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نومولود کو نیک صالح اور فرمانبردار بنائے اور عمر طویل عطا فرمائے۔
- نرگس جمال (ساکن شولا بھی) میری پھوپھی زاد بہن شہناز ناہید پروین اور نئے بھائی افضال احمد صاحب کے گلشن حیات میں ۲ جون ۱۹۸۲ء بروز منگل بمقام کلکتہ پہلی بار ایک کلی کھلی اللہ پاک سے دعا ہے کہ اس کلی کو ہمیشہ شاداب رکھے۔ اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- انیس قادر (مدراس) میرے پھوپھو زاد بھائی جعفر سیٹھ و بھابی سلمہ جعفر کو اللہ پاک نے ۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء بروز منگل بوقت ۵۱/۲ بجے صبح ایک پیاری گڑیا عطا فرمائی نام جاوید رکھا گیا اللہ تعالیٰ نومولود کو عمر نوح عطا فرمائے اور صاحب نصیب کرے۔ آمین۔
- ایچ راحت جہاں (بنگلور) میرے بھیا ایچ محمد عارف اور بھابی مہر النساء کے گلشن حیات میں پہلی بار ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء بروز اتوار دس بجے شب اللہ پاک نے ایک گڑیا عطا فرمائی۔ نام الفت جہاں قرار پایا دعا ہے کہ بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور بلند اقبال اور عمر دراز کرے۔
- سیما ترنم (دا ممبو) میرے پھوپھی زاد بھائی جاوید پاشاہ اور بھابی دلشاد پروین کو اللہ پاک نے ۱۴ اکتوبر بوقت صبح ایک پیاری سی گڑیا عطا فرمائی نام سمیہ پروین رکھا گیا اللہ پاک عمر دراز کرے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- خدیجہ بیگم (جن پٹن) میری عزیز بہن آمنہ بیگم اور بہنوئی سید ضیاء اللہ کے گلشن حیات میں ۲۰ اگست ۱۹۸۲ء بروز اتوار اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ایک پھول کھلایا نام سید صفی اللہ عرف سہیل قرار پایا۔ دعا ہے کہ بلند اقبال ہو اور والدین کو اس کی تمام خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔

شاہدہ رمز غوث (حیدر آباد) ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ ۷ بجکر ۳۰ منٹ صبح خدائے تعالیٰ نے پہلی بار ہمارے چمن زندگی میں ایک پھول کھلایا نام محمد عبد الیاسر طلعت عرف ذیشان احمد رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ عمر خضر عطا فرمائے اور بلند اقبال ہو۔

- محترمہ بیگم ڈاکٹر اکرام صاحب مرحوم بیجا درسے تحریر فرماتی ہیں کہ اللہ پاک نے ان کے بڑے بیٹے اسلم و بہو فریدہ طلعت کو ۲۱ مئی ۱۹۸۲ء کی شب میں ۱۰ بجے ایک فرزند عطا فرمایا نام ثاقب اکرام رکھا گیا اللہ پاک نومولود کو عمر خضر عطا فرمائے۔

پیغامات نشاط

- نور چشمی نجم السحر دختر نیک اختر جناب زاہد حسین صاحب (علی گڑھ) کی شادی ہمراہ نور چشم انور کمال (فرزند جناب نجیب صاحب) مورخہ ۱۰ محرم

• شکیلہ بانو (بلگرام) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہیں کہ ۱۰ دسمبر بروز اتوار ہمارے مشفق والد حکیم سید عبدالقادر عرف منے صاحب کا دوا خانہ ہانگی پیٹ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی والدہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• گوہر سنیچوری (رودولی) ۱۹ ستمبر بوقت ۸ بجے صبح والدہ صاحبہ کا پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

• ساہو نشاط (حیدرآباد) بڑے افسوس سے لکھ رہی ہیں کہ میرے والد محترم علی عبدالستار خاں عرف بادشاہ صاحب ۹ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات لکھنؤ میں ۳ بجے انتقال فرما گئے مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے۔ اور سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• یہ خبر بڑے رنج و افسوس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ میرے قدیم دوست مسٹر جمال احمد رضوی جو زمانہ تعلیم ہی میں میرا مارس سے نکلنے والے ماہانہ رسالہ سرینگر قلم ایڈیشن کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور اس کے بعد فارن سروس میں کامیاب زندگی گزار کر اب لکھنؤ ہی میں پرسکون زندگی گزار رہے تھے تکالیف قلب میں مبتلا ہو گئے بہ غرض علاج رہنے کے بعد اب وہ لندن اپنے بیٹے کے پاس گئے جہاں ماہرین قلب نے ان کا معائنہ کر کے آپریشن کیا تاکہ ان کی تکالیف جاتی رہیں لیکن افسوس کہ آپریشن کے بعد انہیں سکون ابدی حاصل ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی اہلیہ ان کا بیٹا اور ان کی بچی سب ان کے پاس تھے یہ خبر جب ہندوستان پہونچی تو ان کے اعزا اقربا اور دوستوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ جمال صاحب مرحوم بڑے ہی خلیق خوش مزاج اور نیک انسان تھے۔ ہر اعزاز حاصل کرنے کے باوجود ان میں غرور و تمکنت پیدا نہ ہوئی تھی وہ ہر ایک سے بڑی محبت کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔ جمال احمد رضوی مرحوم کا وطن نگینہ پونچھری تھا ان کے بھائی کمال احمد رضوی بڑے ہر دلعزیز قومی لیڈر رہ چکے ہیں انہیں اور جمال صاحب کے پسماندگان کے لئے دعا کرتا ہوں اللہ کرے خدا انہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور جمال کو غریق رحمت فرمائے۔

شریک غم ۔ نسیم انہونوی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں اور بھائیوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ شعر کا معیاری سنجیدہ اور موزوں ہونا ضروری ہے اور نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو دسمبر کے لئے عنوان ہے "رسوائی" اور جنوری ۸۲ء کے لئے پھول ہے۔

نور تجلی ہے تیرے رخسار کے لئے
آنکھیں میری کلیم ہیں دیدار کے لئے

مرسلہ کشور مصباح (کانپور)

تا حشر ملے گی مجھے دیدار کی دولت
ہو جاؤں اگر دفن سر راہ مدینہ

مرسلہ:۔ فوزیہ شمسی (آگرہ)

دیکھکر چاند عید کا ہم نے
تیرے دیدار کی دعا مانگی

مرسلہ:۔ نیلوفر گورے (جلالپور)

بیتاب نظر کی شوخی نے جلووں کا تکلف چھین لیا
پردے بھی شکستہ اٹھ جاتے ہیں دیدار بھی لٹ جاتے ہیں

مرسلہ:۔ قمر نگار جلیلی (آنپور)

میری نظریں اور دیدار آپ کا
یا خواب ہے یا قیامت ہے

مرسلہ نسیم بیگم بھوپالی

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے

مرسلہ مومنہ مختار (امبور)

وہ مدینہ جو کونین کا تاج ہے
جس کا دیدار مومن کی معراج ہے

مرسلہ عائکہ صدیقہ احمد (آنپور)

وہ اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر
کھلی جاتی ہے لاش فنا کی دیکھے جاؤ

مرسلہ۔ ماجرہ نسرین انصاری (کانپور)

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

مرسلہ۔ زینب (مدرسہ)

یاد پھر ان کی میرے دل میں ابھر آئی ہے
شوق دیدار نے پلکوں پہ سجائے موتی

مرسلہ۔ صوفیہ مظفر (جمشید پور)

بیوی۔ تمہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ لڑکی جوان ہو گئی۔ کب تک اسے گھر بٹھائے رکھو گے۔

شوہر۔ نہ جانے کتنے لڑکے دیکھ چکا ہوں مگر کوئی ملتا ہے کہ جاملتا ہے۔

بیوی۔ اس طرح اگر میرے ڈیڈی نے تلاش کی ہوتی تو میں اب تک کنواری ہی بیٹھی ہوتی۔

• ایک صاحب جنت کے دروازے پر پہنچے تو داروغہ جنت نے پوچھا کیا تم شادی شدہ تھے۔
انھوں نے کہا جی ہاں
داروغہ جنت نے کہا تم اندر جا سکتے ہو اس لئے کہ تم نے دنیا میں کافی زحمتیں برداشت کی ہیں۔
ایک دوسرے صاحب نے داخل ہونے کی کوشش کی۔ وہی سوال داروغہ جنت نے کیا تو انھوں نے کہا میں نے ایک نہیں دو شادیاں کی تھیں۔
داروغہ جنت نے کہا۔ تمہارے جیسے بیوقوفوں کے لئے جنت میں جگہ نہیں ہے۔

• مالکہ۔ تم نوکری چھوڑ کر جا رہی ہو۔ اب میرے شوہر کے لئے اتنا اچھا کھانا کون پکایا کرے گا۔
جوان نوکرانی۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اس گھر سے جا رہے ہیں۔

دو دوست بمبئی گھومنے آئے۔ ایک نے دوسرے دوست سے کہا "چلنے میں میری لال ٹوپی پر نگاہ رکھنا، کہیں ہم بچھڑ نہ جائیں۔"
دونوں ساتھی دن بھر گھومتے رہے۔ واپسی میں ایک نے دوسرے سے پھر کہا: "کہو یار کیسا رہا بمبئی شہر؟" دوسرے نے جواب دیا "بہت ہی اچھا" "تمہیں یہاں کی گھما گھمی، بلند عمارتیں، موٹر گاڑیوں کی ریل پیل، چوپاٹی کا ساحل وغیرہ بہت پسند آئیں ہوں گے۔ دوسرے نے کہا۔ "اجی یہ سب میں نے دیکھا کہاں؟" پہلے نے حیرت سے پوچھا۔ پھر تم کیا دیکھ رہے تھے۔ دوسرے نے کہا "تمہاری ٹوپی۔"

کنہیا لال کپور نے کسی تھرو پر خفا ہوتے ہوئے کہا میں تو آپ کو ایک شریف ہی آدمی سمجھتا تھا۔
"میں بھی آپ کو شریف آدمی ہی سمجھتا تھا۔" اس شخص نے پلٹ کے لہجے میں بے ساختہ ہی کہہ دیا۔
"تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، غلط فہمی دراصل مجھے ہی ہوئی تھی۔" کپور نے کمال عجز سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

اپندر ناتھ اشک افسانہ یا مضمون سننے کے بعد عموماً یہ تنقیدی جملہ اپنی زبان پر لایا کرتے۔
"اچھا ہے۔ لیکن اگر اس پر تھوڑی سی اور محنت کی جاتی تو بہتر ہو سکتا تھا۔" ایک بار جب انھوں نے کپور کے ایک مضمون پر بھی اسی انداز میں تبصرہ کیا تو کپور نے برجستہ کہا۔
اشک صاحب تاج محل بہت اچھا ہے لیکن شاہجہاں اگر اس پر تھوڑی سی محنت کرتا تو بہتر ہو سکتا تھا۔

پہلا دوست۔ کیوں یار جب تم رات کو تھیٹر دیکھ کر اپنے مکان پر پہنچے تو بیوی کے ساتھ کیسی گذری؟
دوسرا دوست۔ اس نے میرے اوپر پھول برسائے۔
پہلا دوست۔ اچھا جب ہی آپ کی پیشانی زخمی ہے۔
دوسرا دوست۔ ہاں یار! وہ جوشِ محبت میں اس قدر بیخود ہو گئیں کہ انھیں پھولوں کو گلدان سے نکالنے کا ہوش نہ رہا۔

باپ۔ بیٹا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بات بات پر قسم کھاتے ہو۔
بیٹا۔ "خدا کی قسم" ابا جان! یہ جھوٹ ہے۔

ایک فقیر آم والے کی دوکان پر گیا اور بولا "اللہ کے نام پر ایک آم دو" دوکاندار نے ایک خراب سا آم فقیر کو دے دیا۔ پھر فقیر نے جیب سے ایک روپیہ نکالا اور بولا "اس کا بھی ایک آم دو"
دوکاندار نے ایک اچھا سا آم روپے میں دے دیا۔
فقیر بولا: "اللہ میاں دیکھ لے اس شخص نے تجھ کو کیا دیا اور مجھے کیا دیا"

• ایک صاحب بازار سے تین طوطے خرید کر لائے۔ گھر آ کر انھوں نے دیکھا کہ ان میں سے صرف ایک طوطا بولتا ہے۔ باقی دونوں چپ رہتے ہیں۔ انھوں نے اس کی شکایت دکاندار سے کی تو اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "جناب بولنے والا طوطا صاحب لیڈر ہے باقی دونوں اس کے سکریٹری ہیں جو اسے بتاتے رہتے ہیں کہ اسے کیا بولنا ہے۔"

لگ آپس میں ملے نہیں ۔"

جینی نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا مگر وہ بالکل مٹس تھا۔ نہ رنگا نہ سنجیدگی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی!۔

پھر وہ واپس چلنے لگی تب اس نے کہا "آئیے میں آپ کو اپنے لائے ہوئے درخت دکھاؤں ۔"

"دیکھ لیے میں نے ۔"

"نیلے گلاب ؟"

"وہ بھی بہت اچھے لگے ۔"

"شکریہ ..." وہ اس طرح خوش نظر آنے لگا جیسے جینی نے اس کی اولاد کی تعریف کی ہو ۔

"مجھے آپ کے گلستان سے دلچسپی نہیں مگر براہ کرم اپنی لائبریری سے کتابیں پڑھنے کی اجازت ضرور دیجئے۔ جب تک کہ یونیورسٹی نہیں کھل جاتی ۔ میرا کوئی شغل ہی نہیں ہے ۔"

"یونیورسٹی ؟ ..." وہ حیران دکھائی دیا ۔ "یونیورسٹی سے آپ کو کیا کام ؟"

"کیوں ؟" جواباً وہ حیران ہوئی ۔ "کام کیوں نہ ہوتا ۔"

"آپ تو غالباً میٹرکولیٹ ہیں !"

"فقط گریجویٹ ۔" وہ اس کے بھولپن پر مسکرائی ۔

"سچ مچ ؟"

"بالکل ۔"

"کمال ہے جینی ۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ بہت سے بہت آپ میٹرک ہوں گی ۔" (باقی آئندہ)

انگور کی بیلی سچ مچ رو رہی تھی ۔ انگور پک چکے تھے ۔ ان کا سودا کرنے والے باغبان ابھی آئے نہیں تھے ۔ پکے ہوئے انگوروں کا رس ٹپک رہا تھا!!۔

اور جینی دریچے میں بیٹھی مسلسل سوچے جا رہی تھی ۔ یہ سب کچھ مدتوں تک یوں ہی قول رہے گا ۔ پر وہ یہاں نہ رہے گی! ۔ اس نے حسرت زدہ مایوسی کی ایک نگاہ اپنے باغ پر ڈالی ۔ وہ کرسی خشک پتوں سے اٹی پڑی تھی جس پر بڑے صاحب بیٹھا کرتے تھے پتھر کی بنچیں خالی پڑی تھیں ۔ روشوں پر خس و خاشاک کا ڈھیر تھا ۔ مالی کی کوٹھری سے کثیف دھواں اٹھ رہا تھا ۔ دو سینی قدیم کی عمارت کے کلس چمک رہے تھے ۔ روپہلی دھوپ ہر جگہ بدستور بکھر رہی تھی ۔!

"چلو بیٹی ۔ چلیں ۔!" پھوپھی اماں اس کے پاس آئیں ۔ "چل کے دیکھو ۔ کوئی ضروری چیز مقفل ہونے سے رہ تو نہیں گئی ۔"

بیدلی سے وہ اندر آئی ۔ اور ساکت سی ہو گئی ۔ اسے اپنا گھر اپنا معلوم ہی نہ ہوا ۔ در و دیوار سپاٹ ، ظروف اور تصویروں سے محروم ۔ چھتیں منقش ، جھاڑ فانوسوں سے خالی ۔ فرش قالین ، تخت ، صوفوں اور دیوانوں سے عاری تھا ۔ سب کچھ ایک ڈھنڈار ویرانے میں بدل چکا تھا ۔

منشی صاحب ایک طرف کھڑے آنکھیں پونچھ رہے تھے ۔

کبھی یہ جگہ کتنی بارونق ہوا کرتی تھی ۔" وہ بوڑھی آواز میں کہہ رہے تھے اور بچوں کے انداز میں رو رہے تھے ۔ "جینی بیٹا ۔ مجھے یقین ہے ۔ میں اب بہت دن زندہ نہ رہوں گا ۔ صاحب چلے گئے ۔ گھر کی یہ حالت ہے ۔ تم کو بھی آج کے بعد خدا جانے کب دیکھوں گا ۔ ایک مرتبہ مجھ سے گلے مل کر آنا ۔ بیٹیا ۔"

وہ بھرائی آواز میں رو دئے ان کا گریہ بیتاب پھر سے حشر اٹھا گیا ۔ جینی ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی ۔ پھوپھی اماں کی آنکھوں سے سیلاب امڈ نکلا ۔ ان

کانپا کیا یہ داد ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کی پلکیں بھی نم ہوگئیں۔
خدا خدا کرکے یہ طوفان اختتام تھا۔ منشی صاحب نے اپنی جیتی بیٹی کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ جینی کا دل ٹکڑے ہوا جا رہا تھا مگر وہ مجبور تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے مڑ کر ان والانوں کو دیکھا جہاں جج صاحب ٹہلا کرتے تھے تو ضرور اس کا دل رک جائے گا۔ وہ جلدی سے بڑے دروازے سے نکل کر بجائیں بجائیں کرتی ڈیوڑھی میں آگئی۔

معاف کیجئے گا۔ یہ حقیر سا نذرانہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں: عطر ساز نے متعدد عطروں سے سجا ہوا ایک گلدستہ نما عطردان اسے پیش کیا۔
بہت بہت شکریہ جناب: وہ خوش ہوگئی۔ یقیناً بڑے قیمتی اور نایاب عطر ہوں گے۔ بند عطردان مہک رہا تھا۔
لان پر گاڑی نے ہارن دیا۔ آگے پیچھے وہ نیچے اترے۔ منشی صاحب اسٹیشن تک ساتھ جا رہے تھے۔ پھوپھی اماں کی درخواست پر گاڑی پہلے قبرستان پہونچی۔ منشی صاحب نے جج صاحب کی قبر کی نشاندہی کی۔ الگ تھلگ ایک گوشے میں اونچی سی کچی قبر تھی۔ لال مٹی ابھی تازہ تھی۔ پھول ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ جینی کا دل الٹ آیا۔ پھوپھی اماں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھا اور زار زار روتی ہوئی قبر پر پیشانی ٹیک دی۔ منشی صاحب تو بات بات پر روتے تھے۔
جینی نے باپ کی قبر کی مٹی اٹھا کر چومی اسے آنکھوں سے بوسہ دیا۔
پھر ہچکیوں سسکیوں میں بولی۔ ڈیڈی۔ میں جا رہی ہوں۔ ڈیڈی خدا حافظ۔
قبرستان کے سناٹے نے جواب دیا۔
خدا حافظ۔ خدا حافظ۔
پھوپھی اماں نے منشی صاحب کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما دیئے۔

"محترمہ آپ نے میرا کلیجہ کیوں اپنے بالوں میں اٹکا رکھا ہے؟"
کہاں۔ نہیں تو:
یہ پھول!
آہا۔ گلاب کا سا نرم و نازک آپ کا کلیجہ نہیں ہوسکتا!:
"میں تو یہی سمجھتا ہوں:
جب تک ڈیڈی کا خط مجھے نہیں دکھا دیجئے گا۔ میں آپ کا کلیجہ اسی طرح توڑتی رہا کروں گی:
زہے نصیب زہے نصیب۔ میرا کلیجہ آپ کے بالوں میں۔ شکریہ شکریہ۔ مگر آپ نے اس بات پر کیونکر یقین کر لیا کہ سچ مچ ماموں جان کا خط میرے پاس ہوگا۔
"آپ ہی نے کہا تھا:
میری ہر بات پر یقین کر لینا ضعف ایمان کی دلیل ہے۔
پھوپھی اماں کو بھی یقین آیا تھا۔
"وہ پرانے زمانے کی بھولی بھالی خاتون ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا!:
آپ اب بھی سچ نہیں بول رہے ہیں۔
"جب میرا جھوٹ ایسا پختہ ہے کہ اس پر بڑے بڑے لوگ ایمان لا رہے ہیں تو اندازہ لگائیے کہ سچ کس قیامت کا زبردست ہوگا!:
"اچھی بات ہے مت دیجئے۔
نہیں سچ۔ مذاق نہیں کرتا۔ وہ تو میں نے آپ کو بے تکلف کرنے اور آپ کا موڈ تبدیل کرنے کے لیے یونہی ایک گپ ہانک دی تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔ ماموں جان کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا۔ وہ مجھے کیا جانتے تھے۔ برسوں سے تو ہم

"مجھے کیا پتہ ہے۔ تمہاری سب سہیلیوں کے یہاں ہوائی جہاز اور ریلیں تھی ہیں مگر میں چونکہ کبھی بھی چلا اس لیے وہ اب یہاں نہ آئیں۔"

"سہیلیاں نہیں ممی۔ گرل فرینڈ۔" مصطفےٰ نے تصحیح کی۔

"وہ کوئی بھی ہوں نگوڑیاں۔"

"یہ تو صاف انسلٹ ہے ممی۔" اس نے برا مانا۔

"کیا کہے گی کیا سوچے گی دل میں۔ اس کا پھوپھی زاد بھائی ایسا واہیات آدمی ہے اور پھر بیٹا لڑکیوں میں رہنا شان کے خلاف بات ہے.... تم نے دیکھا نہیں کہ وہ اس مرتبہ میں ایک وقت بھی نہ مسکرائی نہ ہنسی۔ اتنی سنجیدہ پر وقار لڑکی ہے۔"

"آپ کو کیا پتہ۔ ہوسکتا ہے کہ ان محترمہ کے دانت ایسے اور بدکھوبڑ ہوں کہ ہنستے ہوئے انہیں شرم آتی ہو۔"

"اور ماشاء اللہ تمہاری ایسی غیر سنجیدگی کی نہیں ہے۔"

"میں واقعی نانا ابن جاؤں گا۔ پھر آپ نہ کہیئے گا کہ ایک مرتبہ بھی ہنستے مسکراتے نہیں ہوتے۔"

"بن جاؤ۔ بن جاؤ۔"

دیر کا فرمل سرت اس نے پھوپھی اماں کو سیلوٹ کیا اور ایڑیوں پر گھوم کر کمرے سے نکلا چلا گیا۔

ماہاری سے باغ میں نظر پڑی۔

جینی باغ میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں یہ بڑا سرخ گلاب تھا۔ اس کی نگاہ بھی ملنے پھیر لی جو ٹہلتے کرکے جلد از جلد اس کے پاس آرہا تھا۔ جان بوجھ کر اس نے سہانا پھول سرخ میں اٹکا کر بالوں میں کھونس لیا۔

دوسرے لمحے مصطفےٰ اس کے پاس آیا۔

"بھیا۔ تبرک بنوا دینا۔ چہلم پر میں جینی اور مصطفےٰ کو یہاں بھیجوں گی۔ ان کے آخری فاتحے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔"

"اچھا بیٹی۔" منشی صاحب نے آہ بھر کر کہا۔

اسٹیشن پر وہ اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ دھواں اگلتی ریل ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ اس کے بعد اسٹیشن ویران ہوگیا۔!!

پھوپھی جان کے شوہر نوازعلی خاں بہت عرصہ پہلے انتقال کرگئے تھے۔ پہلے وہ ملٹری کے کنٹریکٹ لیتے تھے۔ اور خاصی دولت بنالی تھی۔ اس کے بعد ذاتی طور پر ٹائروں کا بزنس کیا اور دفعتہً بہت زیادہ دولت مند ہوگئے۔ اپنے بعد انہوں نے بیوی اور اکلوتے بیٹے کے لیے کثیر دولت، باغات، مکانات اور کرنٹ جائداد چھوڑی۔ ان کی بیوی میں انتظامی سوجھ بوجھ اور کاروباری صلاحیت خداداد تھی۔ ان کا کاروبار روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ جب تک ان کا لڑکا مصطفےٰ علی خاں چھوٹا تھا۔ سارا بزنس اور کاروبار بیگم ہی اپنے ہاتھ میں لیے رہیں۔ مصطفےٰ جب قانونی طور پر بالغ قرار دیا گیا تب ماں نے باپ کا کاروبار اسے سونپ دیا۔ وہ بھی ماں باپ کی طرح سے تجارتی سوجھ بوجھ اور سلیقہ لایا تھا۔ بڑی خوبی سے باپ کی جگہ سنبھالی تھی!

جینی اس گھر میں بالکل نئی تھی۔ پہلی ہی بار یہاں آئی تھی۔ لیکن اس نے گھر میں اور اپنی کوٹھی میں کوئی ایسا فرق نہیں پایا۔ اسے جیسا آرام دختہ دار میں ملتا تھا۔ ویسا ہی نیلو فر میں ملا۔ پتہ چلا کہ صاحب مکان بھی پھولوں کے دیوانے ہیں۔ گھر کے پیچھے اور سامنے لالہ زار تو کھلے ہی ہوئے تھے۔ جن پر مالی متعین تھے لیکن گھر کے اندر بھی رنگ برنگی گلدان

اور دیسی بدیسی پھولوں کی وہ بہار تھی کہ جدھر نظر اٹھتی اپنے سامنے نیا گل کھلا ہوا
پاتی۔ طرح طرح کی خوشبوئیں اسے سونگھنے کو ملیں۔ بیلا اور موتیا تو تھے ہی۔ جنگلی اور
ولایتی پھولوں کی خوشبوئیں بھی اپنا رنگ حسن رکھتی تھیں!۔
پھوپھی اماں نے اس کی حیرت پر خفیف سا مسکرا کر کہا تھا: ماموں کا شوق سمجھئے
کو ورثہ میں ملا ہے۔ پھولوں کا عاشق ہے۔ خود ہی باغبانی کرتا ہے۔ مجال نہیں کہ
اس کی اجازت کے بغیر کوئی ایک کلی تک توڑ لے۔ اب دیکھو۔ کسی کام سے علی گڑھ گیا
ہوا ہے۔ وہاں سے بھی جھاڑ جھنکاڑ سمیٹ لائے گا۔ کتنے گملے ہیں اس راہداری میں
میں کہتی ہوں پتہ نہیں ان کے نیچے کتنے بچھو اور کھن کھجورے ہوں گے۔"
مگر یہ سب کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ پھوپھی اماں۔ مجھے پتہ ہوتا کہ انہیں
اتنا شوق ہے تو میں اپنے باغ کے سیاہ اور نیلے گلاب کی قلمیں لے آتی "
"ارے بی بی۔ تمہیں یہاں سب گلاب ملیں گے۔ نیلے، لال، کالے۔ تم سمجھتی ہو
اس کم بخت کالے گلاب نہیں ہیں؟"
اچھا: وہ مسکرائی۔
"آج کل میں آتا ہوگا۔ بہت خوش ہوگی اس سے مل کے۔ اس نے ایک عمدہ
لائبریری بھی بنائی ہے۔ اچھی اچھی کتابیں ہیں وہاں۔ مگر کیا مجال کہ کسی کو پڑھنے
کے لیے دے دے"
ہوں گی چڑیا چڑے کی کہانی۔ چاند کی بڑھیا جیسی کتابیں۔ جینی نے سوچا۔
پھوپھی اماں نے اپنی ملازمہ لڑکی کو بلایا اور اسے نہانے دھونے لباس بدلنے
کی تاکید کر کے خود شکن آلود تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئیں۔
جینی نے بے حد توجہ اور دلچسپی سے ان کے گھر کی ایک ایک چیز دیکھی! شیشے
کی طرح جھلکتا ہوا فرش۔ عمدہ فرنیچر۔ شفاف قالین۔ بے غبار خوشنما راہداریاں، جالی دار

بات کاٹ کر اس نے وارننگ دینے کے انداز سے ہاتھ اٹھایا: خبردار جو تم نے ایسا
کوئی شکایت کا موقعہ نہ دینا۔ چھیڑنا ستانا نہیں۔ ورنہ ہو جائے گا جس دن دام سے بچھڑ
دریائے شور: وہ ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔
دیر کی تو دھوپ تیز ہو جائے گی: پھوپھی اماں بولیں۔
تو کیا ایسر جنسی سر پہ ہے؟؟: اس نے آنکھیں نکالیں: ارے ابھی میں تھکا ہوا آیا
ہوں۔ نہاؤں گا۔ سوؤں گا۔ آرام کروں گا۔ پھر شام کو دیکھا جائے گا!:
تمہارے ایسے بد دماغ کے ساتھ جانا کس کو ہے۔ جینی نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ
اس کے اپنے کالج میں لڑکیاں اس کی ہم نشینی کی کتنی تمنائی اور مشتاق رہا کرتی تھیں
اس کی حسین سنجیدگی۔ پروقار خوبصورتی اور لیے دیئے رہنے کی عادت سب کو
بے حد پسند آتی تھی۔ اگر وہ کسی لڑکی کو اپنا کچھ وقت دے دیتی تو وہ پھولی نہ سماتی
نہ کہ یہ پتھر ہے۔ خود غرض لاپرواہ کہیں کا۔ وہ کرسی سرکا کر کھڑی ہو گئی۔ اور بے حد
خشک لہجے میں بولی: ٹھیک ہے پھوپھی اماں۔ ابھی مجھے بھی اپنی چیزیں درست
کرنی ہیں۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا!: اور مصطفےٰ کی طرف دیکھے بغیر چل دی۔
صاحبزادی اپنی خوبصورت ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتیں: سر جھکا کر
مصطفےٰ نے کہا۔
ہوں۔ تو تم سمجھ رہے تھے کہ وہ تمہاری یونیورسٹی کی سی آفاقی کوئی چھوکری ہے۔
خبردار جب تک وہ یہاں ہے۔ مس رحیم۔ مس فرخندہ اور کوئی الا بلا گھر پر
نہ آئے:
"ارے کبھی ان معزز صاحبزادیوں کو آپ الا بلا بنا رہی ہیں: مصطفےٰ نے
حیرتناک لہجے میں کہا: آپ کو پتہ نہیں مس رحیم کا ایک نہایت ذمہ دست خاندان
جس میں بڑا گیا جا دو جنتے ہیں۔ اور فرخندہ کے والد احمد"

"کیا لکھا ہے"؟ اس نے بے چینی سے پھر پوچھا۔

"تم نے مجھ سے تذکرہ نہیں کیا"؟ پھوپھی اماں بھی حیران دکھائی دیں۔

"انکل نے مجھ سے رازداری کا وعدہ لے لیا تھا۔ ممی۔ مجھے افسوس ہے۔ میں وہ خط آپ کو دکھا نہیں سکتا!"۔

"مجھے بھی نہیں؟؟" جینی نے کہا۔

"بالکل نہیں"۔

جینی کو امید نہیں تھی کہ وہ اکھڑ اور بے دماغ آدمی یوں صاف جواب دے دیگا۔ غصے سے کھول کر خاموش ہو رہی۔ مصطفےٰ کے بھرے بھرے چہرے پر بڑا گہرا رنج محیط تھا۔ وہ اپنی ممی سے ماموں کی اچانک موت کی تفصیل پوچھتا رہا۔ جینی خاموش بیٹھی اپنے حیدرآباد والے گھر میں خیال شہسوار دوڑاتی رہی۔ کیا ہو رہا ہوگا وہاں اس وقت؟ اسے اپنا مطہر جان یاد آیا۔ پھر شمی چچا کا بوڑھا مشفق چہرہ نظروں تلے گھوما۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور سر اٹھایا۔

گھڑی دس بجا رہی تھی۔

"کیا اب پھر کہیں جانا ہے۔؟" پھوپھی اماں نے مصطفےٰ سے پوچھا۔

ایک نظر اس نے جینی پر ڈالی اور بے حد سنجیدگی سے بولا: "اب باہر کیا کام ہے؟"

"تو پھر میرا کام کرو"

"فرمایئے" اس نے اور زیادہ سنجیدگی سے جواب دیا: "اگر میں مناسب سمجھوں گا تو ضرور کروں گا"

فیصلہ کیا کہ پھوپھی اماں کو ہنسی آگئی: "تم تو پورے ۲۲ یا ۲۳ … کام کرنے سے پہلے سمجھتے ہو۔ ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ جینی بیٹا اپنے یہاں نئی ہے۔ اسے اپنے ساتھ دور دور تک گھما لاؤ۔ گھر خوار ہے"

نشین۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا کمرہ بھی روشن ہوادار اور بہت خوبصورت تھا۔ اس نے سوچا کہ اب اسے پتہ نہیں کب تک یہاں رہنا ہے۔ اپنا سارا سامان مناسب جگہوں پر سجاتی رہی!۔ ملازمہ لڑکی راحت کو پھوپھی اماں نے اس کی خدمت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ وہ نہایت سعادت مندی اور پھرتی سے اس کا ہاتھ بٹاتی رہی!۔

مصروفیت کے دوران جینی کو یونہی سا خیال آیا کہ پتہ نہیں پھوپھی اماں کا بچہ کب تک واپس آئے گا۔ وہ اس کا ہم مذاق ہوگا بھی کہ نہیں۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی عمر کیا ہے۔ اگر وہ ٹافی اور چوکلیٹ کھانے کی عمر کا ہوا تو پھر ضد کرے گا کہ اس کے لیے یہ چیزیں وہ کیوں نہ لائی۔

راحت سے اس کے متعلق استفسار کرتے اسے اچھا نہ لگا!۔

کچھ دیر بعد پھوپھی اماں نے اسے اپنے پاس بلا بھیجا۔ وہ بھی نہا دھو کر آگئی تھیں اور سلو اسپیڈ پنکھے کے نیچے بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھیں۔

ملازمہ ٹرالی میز پر چائے اور لوازمات سجا رہی تھی!۔ "بیٹی۔ گرمیوں میں بھی چائے ہی پیتی ہو کہ کچھ ٹھنڈی چیزیں۔"

وہ ہنستی ہوئی ان کے پہلو میں ٹک گئی: "نہیں پھوپھی اماں۔ آج تک مجھے چائے کا بدل نہیں مل سکا۔ میں گرمیوں میں بھی بلا ناغہ چار مرتبہ چائے پی لیتی ہوں"

"یہی حال میرا ہے" وہ بھی مسکرائیں۔ اور جھٹ ان کا ہاتھ پکڑ کر میز کے پاس سرک گئیں۔ آس پاس سے بھانت بھانت کی خوشبوئیں ناک میں سرسرا رہی تھیں۔ پنکھا ان کی مہک کو چاروں طرف پھیلانے میں مدد دے رہا تھا۔ خوشبو پانے کی خوشی سے ہنسی آگئی۔

"پھوپھی اماں آپ کا گھر تو بہت ہی خوبصورت ہے"

وہ بے زاری سے بولیں: "توبہ کر دیتی۔ کبھی کبھی تو یہ خوشبوئیں سر میں درد کر دیتی ہیں۔"

"آپ کے کمرے میں بھی گلدان بھرے ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔"

چائے کے بعد انھوں نے پوچھا، کھانوں میں وہ کس قسم کی ڈشیں پسند کرتی ہیں۔ پھر وہ اپنی بوا سے باتیں کرنے بیٹھ گئیں اور جینی اٹھ کر کمرے میں آ گئی —

تنہائی میں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ اپنے ٹیپ ریکارڈ سے رج صاحب کی بھاری دلنشیں آواز سنتی رہی۔ انہیں غالب و اقبال اور رومی کے ان گنت اشعار یاد تھے۔ جب کبھی جینی ان سے ٹیپ میں آواز بھرنے کی فرمائش کرتی تھی وہ اقبال کے اشعار سناتے تھے! کبھی رومی کی مثنوی۔ !ان کی آواز سنتے سنتے پھر اس کا دل بھر آیا۔ دیر تک وہ ڈیڈی کو یاد کر کے روتی رہی۔ کیسا انقلاب آ گیا تھا۔ اگر ڈیڈی زندہ ہوتے تو وہ سکون سے اپنے گھر میں رہتی ہوتی۔ جب سر شام کا سرمئی دھندلکا در و دیوار پر چھا گیا تب اس نے نفی صاحب کو تفصیلی خط لکھا! انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بخیریت دہلی پہونچ گئی ہے اور پھوپھی اماں کے آغوش شفقت میں نہایت آرام سے ہے۔ اس نے اپنے نفی چچا کو صبر و ضبط سے رہنے کی تلقین کی اور پھر راحت کے ساتھ باغ میں چلی آئی۔ راحت نے فوارے پر نصب کیا ہوا بڑا بلب آن کر دیا۔ عجیب سماں بندھ گیا۔ پانی بلب پر نثار ہو کر نیچے گرتا اور رنگین لکیریں بناتا ہوا منتشر ہو جاتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے اس کی کسلمندی دور کر دی۔ وہ راحت سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ راحت بڑی بھولی بھالی تھی۔ لیکن وہ چاہنے پر بھی اس سے [illegible] کہ مصطفےٰ کیسے ہیں، کب آئیں گے۔ عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

دل میں وہ سخت شرمندہ تھی۔ اس نے یہ تک نہیں سوچا کہ پھوپھا جان کو ختم ہوئے چند سال گذر چکے۔ پھوپھی اماں خود بھی اس کے ڈیڈی سے پانچ چھ برس بڑی تھیں۔ پھوپھا ان کا بچہ ننھا سا کیسے ہو سکتا تھا! اپنی غلطی کے سخت احساس نے اس کے رخسار دہکا دیے وہ جلدی سے پیالی پر جھک گئی۔

مصطفےٰ آدمی بن کر برآمدے میں آ گیا۔ سفید کلی جیسے پریس کیے ہوئے پاجامہ اور زرد رنگ کے خوش رنگ قمیص میں وہ خاصہ تنومند اور تندرست لگ رہا تھا! اس نے کرسی کھسکائی اور جینی کے پاس ہی ٹک گیا۔

پھر کیتلی جھانکی اور برا سا منہ بنا کر بولا: "اچھامی۔ بس دیکھ لیا۔ یہی قدر ہے ہماری آپ کے دل میں۔ آپ کو پتہ تھا کہ آج میں تشریف لاؤں گا۔ کم از کم میرے لیے چائے کے نام پر شربت کیتلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ اچھا ہائے ہائے۔ ہوٹل کا راستہ لیتا ہوں۔"

عجیب وحشی ہے۔ جینی نے سوچا۔

ملازم کپ، نمبر چائے اور بادام کے بسکٹ لے آیا۔ پھوپھی اماں کے گھورنے پر اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ جینی سوچ رہی تھی۔ کیسا بد دماغ لاپرواہ آدمی ہے۔ پوچھا تک نہیں کہ وہ کون ہے۔ حتیٰ کہ بیزار ہو کر پھوپھی اماں نے کہا۔

"اچھا مو دیکھو۔ یہ اپنی جینی ہے۔ زینت افروز۔ تمہارے ماموں جان کی بچی۔ خبردار۔ میں کہے دیتی ہوں۔ اپنی بے تکی باتوں سے اس کا دل نہ دکھانا۔ یہ اب اپنے یہاں رہے گی۔"

"ڈلائٹیڈ۔ محترمہ زینت۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ماموں جان کی ناوقت وفات کا مجھے نہایت صدمہ ہے۔ پینے پھر تین ان کا تفصیلی خط میرے پاس بھی آیا تھا۔"

"آپ کے پاس؟" بے ساختہ جینی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

جلدی سے کہا: "میرا بھی یہی دستور ہے پھوپھی اماں۔ بلکہ وہاں تو میں اپنے ہاتھ سے ناشتہ تیار کرتی تھی۔"

دفعتاً بڑا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ اور جینی نے چونک کر دیکھا۔ دروازے میں ایک گھوڑے کا منہ دیکھ کر وہ اس طرح ٹوٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی کہ چیز گرتے گرتے بچی۔

"یہ کیا حرکت۔" پھوپھی اماں ناخوشگوار آواز میں چیخیں: "ہزار مرتبہ کہا ہے مجھے اس جانور کی گرم گرم سانسیں پسند نہیں ہیں۔ اوپر کیوں چڑھا لائے ہو۔"

سوار کود کر گھوڑے کی پشت سے اترا اور پھوپھی اماں سے لپٹ گیا۔

"صباح الخیر۔ ممی!"

"آدمی بنو آدمی!" انھوں نے غصے سے کہا۔

ملازم بھاگتا ہوا آیا اور گھوڑا لے گیا۔

"میرا تو دم گھٹ رہا تھا۔ بڑی بڑی گھاٹیاں، پہاڑ نالے آئی ایم سوری۔ نالے اور کھائیاں پھلانگتا ہوا آیا ہوں اس کے لیے آپ کے ننھے ننھے چار زینے پھلانگنا کیا مشکل ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر منہ اور ماتھے سے پسینہ پونچھ کر رومال دوسری کرسی پر پھینک کر چلا گیا جینی کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

"آؤ بیٹھو۔ بیٹی۔ یہ پھر اسی طرح بے ڈھنگے پن سے آیا ہے۔" پھوپھی اماں نے کھانس کر گلا صاف کیا: "معلوم نہیں۔ کب قرینہ سیکھے گا۔ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔"

"یہ کون آدمی ہے۔ پھوپھی اماں۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مصطفےٰ ہے بیٹی۔" انھوں نے چائے کی پیالی بھرتے ہوئے کہا: "لو کھاؤ۔ یہ سموسے تو یونہی رکھے ہیں۔"

"مصطفےٰ۔" وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔ "اُف خدا۔" اور وہ اپنی عقل کی بدحواسی پر... کہ پھوپھی اماں کے خورد سال بچے کے لیے چوکلیٹ اور ٹافیاں خریدنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ وہاں ہی

رات کے کھانے پر پھوپھی اماں نے کہا: "بیٹی اب تو خدا رکھے تمہیں پہیلی دینا ہے مجھے تو پتہ نہیں کہ تم کس جماعت میں پڑھتی ہو۔ بہرحال کچھ دنوں آرام کر کے تم آگے کسی کلاس میں داخلہ لے لو۔"

"میں نے پندرہ دن پہلے ہی بی۔ اے کا آخری امتحان دیا ہے۔ پھوپھی اماں۔ ابھی تو رزلٹ بھی نہیں نکلا۔ فی الحال تین مہینے کی چھٹیاں ہیں۔ رزلٹ آنے کے بعد آپ کی مرضی ہو تو ایم۔ اے میں داخلہ لوں گی۔ ڈیڈی کا خیال تھا کہ میں دو سال صنعتی ٹریننگ لیتی۔ میں سوزن کاری میں بالکل کوری ہوں۔ پھوپھی اماں۔" یہ کہتے کہتے وہ ذرا سا شرمائی۔

"ماں کا خیال صائب تھا۔ لڑکیوں کو سینا پرونا ضرور آنا چاہیئے۔ خیر ابھی بہت دن پڑے ہیں۔ مومو آجائے تو اس کے ساتھ دہلی کی سیر کرو۔ پھر سوچیں گے۔ تم ڈھنگ سے کھا نہیں رہی ہو بیٹی۔"

"کھا رہی ہوں۔ پھوپھی اماں۔" اس نے کہا پھر پوچھا: "مومو کون ہے؟"

"مصطفےٰ کو بچپن سے مومو کہتی ہوں۔" وہ پیار سے مسکرائیں: "شاید کل صبح آجائے۔"

"میں تو کسی کو پہچانتی ہی نہیں پھوپھی اماں۔ آپ بھی شاید بھیا کے حادثے کے وقت آئی تھیں اور میرا کون عزیز کہاں ہے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

"بیٹی تمھارا ددھیال اور ننھیال بہت دیکھا ہے۔" پھوپھی اماں نے بتایا: "کچھ بہت دنوں پہلے ابا جان اور خالو جان میں کسی بڑی جائیداد کے سلسلے میں بہت زبردست مقدمہ بازی ہوئی تھی۔ تمھاری امی میری خالہ زاد بہن تھیں۔ تمھاری نانی تو اپنی بیٹی کو شوہر سے الگ کرنے پر بھی تُل گئی تھیں۔ لیکن جب تمھاری امی ان کے خلاف ہو کر شوہر کی طرف ہو گئیں تو سب ان سے خفا ہو گئے۔ مقدمہ بازی میں اتنی

طوالت ہوگئی کہ اس دوران میں بہتیرے مرکھپ بھی گئے اس کے بعد جو باقی بچے وہ ادھر ادھر ہوگئے۔ تم ان دنوں پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔ تیس سال پہلے کی بات ہے۔ تم کیا جانو گی اپنے عزیزوں کو۔"

"ڈیڈی نے بھی مصالحت نہیں کی؟"

"ان کے مصالحت کی اہمیت کیا تھی۔ ان کی تب کسی نے سنی نہیں تھی۔ اور رشتہ داروں نے بھی آنا گوارہ نہیں کیا۔ پھر میری شادی ہوئی میں دہلی آگئی۔ تمہارے پھوپھا کاروبار کے سلسلے میں دوروں پر جاتے تھے۔ گھر پر میرا قیام ضروری ہوتا تھا۔ میں بھی حیدرآباد نہ جا سکی یہی وجہ ہے کہ مجھے دلہن اور انیاز کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہو سکا!"

کیا وقت تھا پھوپھی اماں اب بھی مجھے یاد ہے۔ تخت پر برابر برابر امی اور بھیا کی لاشیں پڑی تھیں۔ ڈیڈی کرسی پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں ننھی چچا کی بیوی کی گود میں بے ہوش پڑی تھی۔ لوگوں نے بعد کو بتایا کہ امی اور بھیا کے جنازے ساتھ ساتھ نکلے ہیں۔ وہ بھی نہ دیکھ سکی۔"

انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اسماء کی آنکھیں اذیت ناک یادوں میں غرق ہوگئیں۔ خوابگاہ میں جانے سے پہلے اس نے [illegible] تمام [illegible] پھوپھی اماں کے حوالے کردینے کا پھر اہمیت کا بوجھ اس کے سینے پر دھرے تھے۔ جو کہ اس نے کبھی وقت نہیں جانی جب ڈیڈی چلے گئے۔ یہ دولت ان کے کام نہ آئی تو پھر ان کی کیا حقیقت ہے؟!۔

آج پہلی رات تھی۔ جب وہ پرسکون ہوکر سوئی تھی۔

صبح سویرے ابھی جبکہ [illegible] اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راحت نے اسے آہستہ سے بیدار کیا۔

"صاحبزادی۔ نماز کا وقت جا رہا ہے۔ نماز کے بعد آپ بیگم صاحب کے پاس آئیے۔ آپ کی چائے میں وہیں لاؤں گی۔"

اس نے وضو کرتے ہوئے دائرہ نما پھول سے باہر جھانکا! دور شرق کے افق پر مدھم اجالے میں گھلا ملا سے ایک گھوڑا [illegible] دوڑا جا رہا تھا۔ پھر اسے سوار بھی دکھائی دیا۔ بڑی اچھی ورزش ہے۔ کیسے یہ [illegible] پروگرام [illegible] ہوگا۔

اس نے خوش ہوکر سوچا اور پھر جانماز پر آکھڑی ہوئی۔

دیر تک اس نے اپنے ڈیڈی کی مغفرت کی دعا مانگی پھر گاؤن پر [illegible] کرکے باہر نکلی۔ خاصہ سویرا ہوگیا تھا۔ سنورا اندھیرے میں سوتے ہوئے پودے اور پھول جاگ پڑے تھے۔ ان پر فرحت انگیز نکھار تھا۔ یہ جگہ جگہ سرخ گلاب اور شعلہ موگرے کے پھول برآمدہ معطر ہو رہا تھا۔ منڈیر کے پاس ناشتے کی [illegible] دلکش تھا۔ صبح کی دلکش ہوائیں چل رہی تھیں۔ کوئی جھونکا خس کی ٹٹی کو چھو کر ان کے پاس آتا اور ایک حسین خوشبو چھوڑ کر گزر جاتا۔

"تسلیم پھوپھی اماں۔" اس نے جھک کر انھیں سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی۔ سدا خوش رہو۔ کہو رات کو آرام سے سوئیں؟" انھوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس والی کرسی پر بٹھا لیا۔

"تکیے پر سر رکھنے کی دیر تھی پھوپھی اماں۔"

اس کا نکھرا ستھرا [illegible] چہرہ دیکھ کر پھوپھی اماں نے سوچا۔ لڑکے وہ جلد اپنے باپ کو [illegible] جانے۔

"بیٹی میرا اور بچوں کا دستور ہے کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کرتی ہوں تم اگر چاہو تو۔۔۔!"

"ڈیڈی تو ہمیشہ ساڑھے چھ بجے اٹھتے تھے ان کے ساتھ [illegible] اٹھ جاتی تھی!" اس نے

ٹیلیفون نمبر آفس :۔
۲۴۵۵۹
اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر رہائش :۔
۲۵۳۳۲
قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

حریم
لکھنؤ
ماہنامہ

گذشتہ ۴۶ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اُردو میں

ہندوستان کا سب سے پُرانا رسالہ ہے

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۵ — فہرست مضامین ماہ دسمبر ۷۷ء — نمبر ۱۲

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ — جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	انیس روپیہ
مخصوص خریداری		ستر روپیہ
معمولی خریداری		پندرہ روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر تین روپیہ زائد
غیر ممالک سے بقدر ۳۰ روپیہ یا دو پونڈ برائے ٹکٹ سیل اپریل سے
مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی لکھتے ہیں کسی کے نام مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
• حریم ہر انگریزی ماہ ۵ تاریخ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں ۱۵ تاریخ سے پہلے کی گئی شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جائے گا۔
خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں اخبار اور ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو ۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی — مالک و ناشر — سرفراز پریس لکھنؤ — پرنٹر ....

دنیا میں تقریباً ہر چیز کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ ایک تعمیر کا دوسرا تخریب، ایک فائدہ کا دوسرا نقصان کا۔ فلموں میں اکثر دکھایا جاتا ہے کہ چوریاں کس طرح کی جاتی ہیں ڈاکے کس طرح ڈالے جاتے ہیں۔ قتل کیسے کیا جاتا ہے فلموں کے ساتھ ہی یہ باتیں اکثر جاسوسی ناولوں کے ذریعہ بھی ہمارے علم میں آتی ہیں۔ بہت سے لوگ انھیں پڑھ کر ہوشیار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے کو کسی حد تک محفوظ رکھنے کے طریقے سیکھ جاتے ہیں لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس طرح کی باتوں کو پڑھ کر اور دیکھ کر خود بھی ایسے ہی اقدام کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی چیز تعمیری بھی ہو جاتی ہے اور تخریبی بھی۔ تعلیم نسواں بھی اسی طرح جہاں ایک طرف خواتین کے لئے سپر بنتی ہے اور وقت پڑنے پر انھیں [illegible] پیدا کرنے کے مواقع فراہم کر دیتی ہے وہیں یہی تعلیم متاہل زندگی میں کبھی کبھی زہر بھی گھول دیا کرتی ہے۔ حال ہی میں ایک ایسا واقعہ میرے علم میں آیا جس میں شوہر اور بیوی دونوں ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے بظاہر ان میں بہت زیادہ میل و محبت ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا شوہر سکریٹریٹ میں اچھے مشاہرہ پر ملازم تھے اور بیوی شادی ہونے سے پہلے ہی ایک کالج میں سروس کر چکی تھیں شادی کے بعد انھیں ملازمت کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی اس لئے کہ شوہر کی تنخواہ وغیرہ سے ایک اچھی زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ لیکن [illegible] بیوی نے رخصت لے کر اپنی زندگی شروع کی پر رخصت کا سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا اور [illegible] ملازمت ختم ہو جائے [illegible] پیدا ہوئی۔ بات [illegible] اختلاف گوارا [illegible] برداشت کر سکتی

تھیں لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی ملازمت پر چلی گئیں شوہر کو یہ بات پسند نہ تھی وہ اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی بیوی ملازمت کرے اس لئے بات اور زیادہ بڑھ گئی ان کا اصرار تھا کہ ملازمت چھوڑ کر ان کی حسب خواہش زندگی گزاریں لیکن بیوی نے اسے گوارہ نہ کیا۔ وہ جس حد تک رخصت لیتے ہوئے اپنی ملازمت کو برقرار رکھ سکتی تھیں وہ ختم ہو چکی تھی اور انھیں اندیشہ تھا کہ اگر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو پھر کبھی ایسی اچھی سروس نہ مل سکے گی۔ بات بڑھتے بڑھتے طول کھینچ گئی یہاں تک کہ بیوی نے علیحدگی اختیار کر لی [illegible] دونوں کسی کے دست نگر نہ تھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں بیوی کی تعلیم ہی علیحدگی کا باعث بنی اگر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ ہوتیں اور اچھی سروس سے متعلق نہ ہوتیں تو شاید اس آسانی سے شوہر کو چھوڑ دینا ممکن نہ ہوتا اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی ملازمت سے بے فکری کی زندگی گزار سکیں گی انھیں کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے گا اس کے باوجود جو سکون ایک شوہر کی موجودگی میں بیوی کو میسر ہوتا ہے وہ انھیں حاصل نہ ہو سکے گا۔

موجودہ زمانے میں جہاں مذہب کے اور اصولوں کو بھی حقیقت اور اعتقاد کے ساتھ نہیں مانتے یا کم مانتے ہیں وہیں اس مسئلہ کو بھی اس طرح حل نہیں کرتے جس طرح اسلام چاہتا ہے۔ بلاشبہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو کبھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ اسے ایک معیوب عمل خیال فرماتے تھے اس کے باوجود اسلام کا قانون یہ تھا اور ہے کہ اگر میاں بیوی میں ایسا اختلاف پیدا ہو جائے کہ وہ ایک ساتھ [illegible]

ان

تمام حرمی بہنوں
اور بھانجیوں کا
شکریہ، جنھوں نے
میری عیادت کے
لئے خطوط لکھے

نسیم انہونوی

شادی کرسکے اس سلسلہ میں مرد کو کافی آزاد رکھا گیا ہے وہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کرسکتا ہے مگر اس سلسلہ میں اسلام کے قوانین بہت سخت ہیں ان پر عمل کیا جائے تو ایک عورت کی موجودگی میں دوسری شادی بہت دشوار ہو جاتی ہے لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں اب صرف اتنا ہی خیال رہ گیا ہے کہ وہ ایک ساتھ چار شادیاں تک کرسکتے ہیں کیوں اور کیسے اس کے متعلق اسلامی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اتنا ہی نہیں وہ شادی کرکے بھی دوسری عورتوں سے تعلقات پیدا کرسکتا ہے اور کرتا رہتا ہے اس کے لئے ایسا کرنے میں خطرات حائل نہیں ہوتے لیکن ایک عورت کے لیے ایسا کرنا کمتر ہی ممکن ہوتا ہے۔ مستثنیات کو چھوڑ کر ہر عورت صرف ایک ہی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے اور رہتی ہے۔ اس طرح ناچاقی کی صورت میں ساری مصیبتیں عورت ہی کو اٹھانا پڑتی ہیں۔ مرد اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ضد پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بیوی کو آسانی سے طلاق نہیں دیتے اس طرح ایسی شریف خواتین ان آسائشوں سے محروم ہو جاتی ہیں جو ایک شوہر سے ہی ملتی ہیں۔ اگر میاں اور بیوی دونوں اپنے کو برابر حقوق کا مستحق سمجھنے لگیں اور کوئی بھی ایک دوسرے کے تابع رہنا گوارہ نہ کرسکے تو تعلقات خوشگوار نہیں رہتے۔

قدرت نے فطرتوں میں اختلاف رکھا ہے۔ مرد کی فطرت عورت سے جداگانہ ہے اسلام نے عورتوں کو بڑے بڑے حقوق دیتے ہوئے بھی مرد کا تابع ہو کر رہنے کی تعلیم دی ہے شاید اس لئے کہ مرد کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ عورت سے محبت تو کرسکتا ہے لیکن اس کا مطیع ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اللہ نے اسے قوی عطا فرمائے جن سے وہ عورت کی حفاظت کرسکتا ہے اور عورت کو ایسا نازک بنایا ہے کہ اس کے لئے مرد کی حفاظت کے بغیر زندگی گذارنا آسان نہیں رہتا بہت سے لوگ اپنی لاعلمی کے تحت مرد کی اس برتری کے لئے اسلام پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے مرد اور عورت کو ایک سا درجہ نہیں دیا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ عورت کو تمام مساوی حقوق دئیے گئے ہیں بلکہ ایک بات تو ایسی ہے جس میں اسے مرد پر فوقیت دی گئی ہے۔ اور بات یہ ہے کہ جنت طفل اولاد کے لئے ماں کے تحت ہے کون نہیں جانتا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ جنت باپ کے قدموں تلے ہوتی ہے۔ یہ اعزاز صرف عورت ہی کو بخشا گیا ہے۔

اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ عورت ایک ابدی زندگی کو جنت سے ہمکنار کرنے کی مختار بنائی گئی ہے۔

مساوی حقوق کے سلسلہ میں اگر دونوں ہی فریق کو تابع بنایا گیا ہوتا تو زندگی کی گاڑی کبھی خوشگواری کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی دو میں سے کسی ایک کو تابع اور ایک کو مطیع بنانا نہایت ضروری تھا۔ یہاں تابع مرد کو اس لئے بنایا گیا کہ اس کی فطرت اسی کی متقاضی ہے۔ اور یہ فطرت خدائے تعالیٰ نے بنائی ہے اس لئے ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کا یہی منشاء اور مقصد تھا۔

میں تعلیم کے خلاف نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ خواتین تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کی بہترین ایڈمنسٹریٹر (ناظم) بنیں اپنے بچوں کو ایسی تعلیم اور ایسی تربیت دیں کہ وہ فخر قوم و ملت بنیں اپنے گھروں کو نمونہ جنت بنائیں اور اپنی تعلیم کو ذریعہ آمدنی صرف اسی وقت بنائیں جب خدانخواستہ ان پر ایسا وقت آپڑے کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ جائے۔

حریمی بہنوں سے چند ضروری باتیں

یہ حریم سال رواں کا اخیر پرچہ ہے۔ اس کے بعد سال نو کا پہلا پرچہ حسب معمول سالنامہ ہوگا جو بہن عفت موہانی کے ناول "پت جھڑ کی بہار" پر مشتمل ہوگا یہ ناول بیحد دلچسپ سبق آموز اور اصلاحی ہے جو عفت بہن کی خواہش کے مطابق سالنامہ میں پیش کیا جارہا ہے۔ ناول ضخیم ہے اس لئے ادارہ کو اس کے شائع کرنے میں خسارہ ہوگا لیکن عفت بہن کا اصرار تھا کہ یہی ناول سالنامہ میں دیا جائے۔

ہماری کوشش ہوگی، بشرطیکہ لکھنؤ کے حالات سازگار رہے کہ سالنامہ کی روانگی ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۰ء سے شروع کردی جائے۔ تمام تر سالنامہ وی۔ پی یا رجسٹری سے روانہ ہوتا ہے اس لئے روانگی میں کئی روز صرف ہوتے ہیں بہرحال ۲۰ر جنوری ۱۹۸۱ء تک تمام سالنامہ سپرد ڈاک کردیے جائیں گے۔

بہت سی بہنوں نے لکھا ہے کہ سالنامہ میں قسطوار ناول کی قسط شائع نہ کی جائے اس لئے کہ اسے نکالنے کے لیے سالنامہ کی جلد توڑنا پڑتی ہے یہ مشورہ واقعی نہایت مناسب اور مفید ہے اس لئے سالنامہ میں آگ میں پھول کی قسط شامل نہ ہوگی سب بہنیں

نوٹ فرمالیں۔

حریم کی سالانہ قیمت منی آرڈر سے پندرہ روپیہ لی جاتی ہے وی۔پی منگانے کی صورت میں تین روپیہ محصول وی پی زیادہ لیا جاتا ہے۔ اکثر بہنیں اپنی سالانہ قیمت منی آرڈر سے ہی روانہ کرتی ہیں۔

جن بہنوں کی سالانہ خریداری دسمبر کے پرچہ تک ختم ہوجاتی ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ اگر وہ آئندہ کے لئے سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ کرنا چاہیں تو ۲۰ر دسمبر تک قطعی روانہ کردیں۔ تاکہ ۳۰ر دسمبر سے پہلے ہی منی آرڈر دفتر میں وصول ہوجائے اگر ایسا نہ ہوا تو ممکن ہے سالنامہ وی۔پی سے روانہ کردیا جائے۔ اور اس کے بعد منی آرڈر وصول ہو۔ اس صورت میں اکثر بہنیں وی۔پی واپس کردیتی ہیں اور دفتر کو محصول وی۔پی کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

تبدیلی پتہ کے سلسلے میں اکثر بہنیں اس کا خیال نہیں رکھتیں کہ اطلاع پرچہ روانہ ہونے سے قبل دفتر پہونچ جائے ایسی صورت میں دفتر کو دوبارہ پرچہ بھیجنا پڑتا ہے جن بہنوں کو پتہ تبدیل کرانا ہو وہ اس طرح اپنی اطلاع بھیجیں کہ ۲۵ر دسمبر تک دفتر میں وصول ہوجائے۔ جو بہنیں ایسا نہ کریں گی اور سالنامہ روانہ ہونے کے بعد اطلاع دیں گی انھیں دوبارہ محصول ڈاک ادا کرنا ہوگا۔

اکثر بہنیں یہ سمجھتی ہیں کہ سالنامہ کے ساتھ ہی جنوری کا معمولی پرچہ بھی شائع ہوتا ہے اور وہ اس کا تقاضا کرتی رہتی ہیں اس لئے سب بہنیں نوٹ کرلیں کہ جنوری میں صرف سالنامہ ہی شائع ہوتا ہے جو رجسٹری یا وی پی سے روانہ کیا جاتا ہے۔

ہر اس کاغذ پر جس میں لپیٹ کر حریم بھیجا جاتا ہے۔ حریم کا نمبر خریداری لکھ دیا جاتا ہے اس نمبر کو نوٹ کرکے حفاظت سے کہیں رکھ لیں اور جب کبھی حریم کے دفتر کو کسی طرح کی تحریر بھیجیں تو اس میں یہ نمبر خریداری ضرور لکھیں اس کے بغیر تعمیل یا جواب میں دشواری ہوگی۔

حریم کی خریدار بہنوں اور بھانجیوں کو چاہیئے کہ وہ اگر کوئی مضمون یا افسانہ وغیرہ حریم میں شائع ہونے کے لئے بھیجیں تو اس پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں مضامین اور افسانے بامقصد مفید معلوماتی یا اخلاقی ہوں ایسی کہانیاں جو صرف عشق و محبت پر مبنی ہوتی ہیں اور ان میں کوئی اخلاقی یا اصلاحی پہلو نہیں ہوتا انھیں شائع نہیں کیا جاتا۔ مضامین اور افسانے مختصر ہونا چاہئیں ان کے سلسلہ میں اگر جواب کی ضرورت ہو تو جواب کے لئے ٹکٹ وغیرہ روانہ فرمائیں۔ جو مضامین شائع نہیں کیے جاسکتے وہ اگر واپسی کے لئے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ آئے ہوں تو واپس کردیئے جاتے ہیں ورنہ انھیں تلف کردیا جاتا ہے۔ حریم کے صفحات کم ہیں مضامین بہت زیادہ آتے ہیں اس لئے قابل اشاعت مضامین بھی نمبر آنے پر ہی شائع کیے جاتے ہیں۔

حریم اگر کسی ماہ آپ کو نہ ملے تو ۲۰ر تاریخ تک انتظار کرنے کے بعد ہی دفتر کو شکایتی خط لکھیں دوسرا پرچہ بھیجدیا جائے گا۔ اگر کافی تاخیر کے بعد شکایتی خط لکھا گیا تو ہوسکتا ہے کہ دوسرا پرچہ نہ بھیجا جاسکے۔

اکثر بہنیں ایک ہی کاغذ پر بزم حریم کی خبریں پسندیدہ شعر اور تبدیلی پتہ وغیرہ کی ہدایات لکھکر روانہ فرماتی ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ ہر بات علیحدہ علیحدہ کاغذ پر لکھکر روانہ فرمائیں ورنہ ممکن ہے کہ سب باتوں کی تعمیل نہ ہوسکے۔ کاغذ کسی ایک فائل میں رکھ دیا جاتا ہے۔

آؤ پڑوسن باتیں کریں ۲

سائرہ خاتون ہرگانوی۔ ہرگانواں، بڑگھر، مونگیر — (بہار)

دوپہر کا وقت تھا۔ نورجہاں کھانا کھا کر تھوڑی دیر لیٹنے کی عادی ہیں مگر اس روز لیٹنے کو جی نہیں چاہا۔ وہ گھر کی کھڑکیاں بند کر کے اور دروازے میں تالا ڈال کر عفت کے کوارٹر پہنچ گئیں۔ عفت اسکول میں ٹیچر ہیں اور نورجہاں کے پڑوس میں رہتی ہیں۔

"آؤ بہن، خلاف توقع اس وقت کیسے آنا ہوا؟" عفت نے حیرت اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے نورجہاں کو بٹھایا۔

"دوپہر میں میں کہیں نہیں نکلتی، اسی لئے حیرت کا اظہار کر رہی ہو۔"

"ظاہر ہے۔ آپ کا قیلولہ تو پاس پڑوس میں مشہور ہے۔"

"ارے چھوڑو بھی۔ بس ذرا کمر سیدھی کر لیتی ہوں تو لوگ میری عادت سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"لیکن دوپہر میں آپ سوتی ضرور ہیں۔"

"کبھی کبھار۔ ورنہ آج کی دوپہر کو ہی لے لو۔ تمہارے پاس بیٹھی ہوں؟"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"دراصل، شام کو یا رات میں گھر سے نکلنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بچوں کی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ گھر گرہستی میں پھنسنے اور بچوں کی فوج آجانے کے بعد اپنی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔"

"[illegible] ہی نہیں اپنا آپ ختم ہو جاتا ہے۔ سب کچھ بچوں کے اور شوہر کے ذہن سے سوچنا پڑتا ہے۔"

"اس کے لئے خود کو عادی بنا لینا پڑتا ہے، کیا کیا جائے۔ دوسرا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"ارے میں تو یہ پوچھنا بھول ہی گئی کہ آج تم اسکول نہیں گئیں؟ کیا اسکول بند ہے؟ لیکن اون کی گڈی اور سوئی لی ہیں؟"

"نہیں اسکول بند نہیں ہے۔ میں نے چھٹی لی ہے۔ رات سے سر میں درد تھا۔ سوچا کہیں بخار نہ آجائے۔"

"جب سر میں درد ہے تو تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ لیکن تم ہو کہ آنکھ اور سر دونوں سے کام لے رہی ہو۔"

"ارے یہ تو بس یوں ہی بیکاری میں بیٹھی بیٹھی بور ہو رہی تھی اس لئے بُننے بیٹھ گئی۔"

"کیا بن رہی ہو؟"

"پُل اوور کا جدید ڈیزائن ہے۔"

"اوہو۔ کہاں سے سیکھی ہو؟"

"یہ اپنی مسرت باجی ہیں نا۔ پچھلے دنوں ہردوار ٹریننگ میں گئی ہوئی تھیں۔ وہاں سے سنیاسی بن کر آنے کی بجائے بُنائی سیکھ کر آئی ہیں اور کام کی باتیں لوگوں کو بتاتی پھر رہی ہیں۔ مجھے انہوں نے پُل اوور کے دو نئے ڈیزائن سکھائے ہیں۔"

"تب تو اس وقت میرا آنا سودمند ثابت ہوا۔ اب جاڑے کی شروعات ہو چکی ہے۔ میں بچوں کے لئے اور خود اپنے لئے سوئٹر بُننے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی۔ اب یہ ڈیزائن مجھے بتا دو۔ میں بھی بُنوں گی۔"

"بہت آسان ہے۔ دیکھیے:" عفت اٹھ کر نورجہاں کی بغل میں بیٹھ گئیں۔

"اس نمونے میں آٹھ سلائیاں ہیں (۱) پہلے ساری سیدھی سلائی بن لیجئے۔ (۲) پھر پہلا خانہ بنیے۔ دھاگہ سیدھی طرف کیے رہیے۔ ایک خانہ اتار دیجئے اور پھر ایک خانہ بن لیجئے۔ پوری سلائی اسی طرح بنائی جائے۔ (۳) ایک خانہ سیدھا دھاگہ آگے کر کے ایک خانہ بغیر بنے اتار دیجئے۔ پھر اون الٹی طرف کر کے ایک خانہ بن لیجئے۔ ساری سلائی اسی طرح مکمل کی جائے۔ (۴) ساری سلائی سیدھا بن لیجئے۔ (۵) ساری سلائی الٹا بن لیجئے۔ (۶) دو خانے سیدھے ملا کر بن کے ایک خانہ بغیر

بنے اتار لیجئے۔ ایک خانہ سیدھا بن لیجئے۔ ساری سلائی اسی طرح کیجئے (۷) دو سیدھے بن لیجئے۔ اون آگے کر کے ایک خانہ اتار لیجئے اور ایک بن لیجئے۔ پوری سلائی اسی طرح ہو (۸) اور پھر ساتویں سلائی بن لیجئے۔ دیکھا آپ نے۔ آٹھ سلائیوں پر یہ نمونہ مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلی سلائی سے آٹھویں دہرانے کی ضرورت ہے۔"

"یقیناً یہ تو آسان ہے۔ روبی اور گڈی بھی سیکھ سکتی ہیں۔ اور وہ دوسرا ڈیزائن؟"

"یہ بائیس سلائیوں پر مکمل ہوتا ہے۔"

"بائیس؟"

"ہاں، مگر یہ بھی نہایت آسان ہے۔ صرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ دیکھئے، بتاتی ہوں۔ کل ہی میں نے تیار کیا ہے۔"

عفت اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئیں اور جب لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں پل اوور کا جدید ترین نمونہ دیکھ کر نور جہاں کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ "آہا۔ کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ جواب نہیں اس کا۔ عفت، تم نے اون کا رنگ بہت اچھا لیا ہے اور ڈیزائن کا تو پوچھو ہی مت۔ بھئی، ذرا جلدی مجھے سمجھاؤ۔"

"دیکھئے۔ یہاں سے شروع کرتی ہوں (۱) پہلے نو خانے سیدھے بن لیجئے۔ تین الٹے۔ تین سیدھے۔ تین الٹے۔ نو خانے سیدھے، اسی طرح پوری سلائی بنئے (۲) نو خانے الٹے۔ تین سیدھے۔ تین الٹے۔ تین سیدھے۔ نو خانے الٹے۔ پوری سلائی اسی طرح کیجئے (۳) تیسری سلائی پہلی سلائی کی طرح دہرایئے (۴) چوتھی سلائی دوسری سلائی کی طرح بن لیجئے (۵) نو خانے الٹے۔ تین سیدھے تین الٹے۔ تین سیدھے، نو خانے الٹے۔ پوری سلائی اسی طرح (۶) نو خانے سیدھے، تین الٹے۔ تین سیدھے۔ تین الٹے۔ نو خانے سیدھے۔ اسی طرح پوری سلائی (۷) ساری سلائی پانچویں سلائی کی طرح (۸) آٹھویں سلائی چھٹی سلائی کی طرح بن لیجئے (۹) نو خانے سیدھے، تین الٹے، تین سیدھے، تین الٹے، نو خانے سیدھے۔ پوری سلائی اسی طرح (۱۰) دوسری سلائی کی طرح (۱۱) تیسری سلائی کی طرح (۱۲) چوتھی سلائی کی طرح (۱۳) تین الٹے، تین سیدھے، نو سیدھے۔ پوری سلائی اسی طرح بنئے (۱۴) تین سیدھے تین الٹے تین سیدھے، نو الٹے، پوری سلائی اسی طرح [illegible] تین سیدھے تین الٹے نو سیدھے پوری سلائی اسی طرح

(۱۵) تین سیدھے، تین الٹے، تین سیدھے، نو الٹے۔ پوری سلائی اسی طرح بن لیجئے (۱۶) تین الٹے، تین سیدھے، پندرہ الٹے، تین سیدھے تین الٹے۔ پوری سلائی اسی طرح دہرایئے۔ (۱۸) تین سیدھے، تین الٹے۔ پندرہ سیدھے۔ پوری سلائی اسی طرح (۱۹) تین الٹے، تین سیدھے، پندرہ الٹے پوری سلائی اسی طرح (۲۰) تین سیدھے تین الٹے، پندرہ سیدھے۔ پوری اسی طرح (۲۱) تیرھویں سلائی کی طرح دہرایئے اور (۲۲) چودھویں سلائی کی طرح بن لیجئے۔ یہ ہے ۲۲ سلائیوں میں مکمل نمونہ۔"

"زیادہ محنت اس میں بھی نہیں ہے۔ بس سلائیوں کو گننا ہے۔"

"ہاں اور کیا۔ مگر ڈیزائن غضب کا تیار ہوتا ہے۔"

"وہ تو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ شکریہ بہن۔"

"شکریہ کی کیا بات ہے۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ ہم آپ جیسی عورتیں بازار سے خرید کر نہیں لا سکتے بلکہ خود بھی بن کر پہنتی ہیں، اور بچوں، شوہروں کو پہناتی بھی ہیں۔ اس طرح اپنے ہاتھ کی گرمی، اپنے ہاتھ کا لمس انہیں دیتی ہی ہیں، ہنر کو بھی زندہ رکھتی ہیں۔ اس طرح کا ہنر ہم عورتوں کا زیور ہے، کیوں؟"

"یقیناً ان کے بغیر ہم آدھی ادھوری رہ جائیں گی۔"

"اسکول میں کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچیوں کو اس کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور یہ ضروری بھی ہے۔"

"سینا پرونا اور کھانا پکانا اگر لڑکیاں نہیں جانتی ہیں تو بی اے، ایم اے کرنا یا اس طرح کی تعلیم حاصل کرنا بیکار ہے۔ لڑکیاں جب محنت کرتی ہیں اور خود سے چیزیں بناتی اور سنبھالتی ہیں تو اس کا مزہ ہی دوسرا ہوتا ہے اور ان کی مسرت بھی دوسری ہوتی ہے۔"

"عفت تم تو اسکول سے منسلک ہو۔ اپنے خیالات بچیوں کے ذہن میں ضرور [illegible]

[illegible]

کا وقت ہو گیا ہے۔

"ارے میں تو چائے بلانا بھول گئی۔ باتوں میں ایسا ابھی کہ ہوش ہی نہ رہا۔ دو منٹ ٹھہریئے ابھی چائے منگاتی ہوں۔"

"بس اب رہنے دو۔ پھر کبھی سہی۔"

"اچھا خدا حافظ"!

"رائی کا پہاڑ"

عفت موہانی

صبح ہی سے بیگم ساجد کا موڈ خراب تھا۔ ایک تو ساری رات بچے نے ستایا تھا۔ دوسرے ساجد صاحب نے ان کے مزاج کا خیال نہ کرکے سیلنگ فین آن کر دیا تھا۔ وہ یوں ہوا پھینک رہا تھا کہ جیسے بیگم کے غصے کو ہوا دے رہا ہو! اب ان کا سر درد فی ہو رہا تھا۔ اوپر سے ساجد صاحب کا ترنم سونے پر سہاگہ تھا۔ وہ غسلخانہ میں گنگنا رہے تھے —

ارے ہاں۔ تو ری چھل بل ہے نیاری ____

ہونٹ بھینچ کر بیگم نے سوچا کہ اگر ایسا نہیں ہوگا تا کوئی ٹوکتا تو وہ اس کے منہ میں لوکا لگا دیتیں ایسی ذمہ دار پوسٹ ہولڈ کرتے ہیں۔ عمر بھی چالیس سے کم نہیں۔ مانا کہ آپ بڑے ہنس مکھ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب کہاں کہ ایسا لغویت گائیں۔ آہ۔ یہ مردوئے کبھی نہیں بدل سکتے۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ننھے منے گلاسوں میں نیپکین ٹھونسنے لگیں!۔

ہا آآہ۔ گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

غسلخانے سے دھن ابھری۔ بیگم کا پیمانہ چھلک اٹھا۔

"بس اب نکلیے۔ مجھے پتہ ہے کہ بیجو باورے اور تان سین نے آپ ہی سے گلے بازی سیکھی تھی"

ساجد صاحب تولیے سے سر پونچھتے اور ہنستے ہوئے برآمد ہوئے۔

"مجھے ہے بیگم کہ آپ فائن آرٹ کی قدر دان نہیں" وہ بولے "اچھا کچھ اور سناؤں"

"مجھے نزلہ ہے" وہ جھنجھلائیں "سر چکرا رہا ہے۔ آپ ناشتہ کرکے دفتر جائیے میں اب پڑ کے سوؤں گی"

"بیگم آج تو قمیص کے دامن سی دو۔ درزی کو دوں گا تو وہ ہفتہ بھر لگائے گا"

"دوسری قمیص پہن لیجئے۔

کیا تھا اتنے شوق سے۔

آپ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ مجھے زکام ہے

خدا رحم کرے۔ اگر تمہارا اپنا بنایا زکام ہوتا ہے تو ترک کردیا۔ میرے بالوں کا تذکرہ پچاس برسوں میں ایک دفعہ کی کہا لے آئے ہیں کہ ہفتوں تک اس کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔

پچاس برس کا تو ابھی میں بھی نہیں ہوا!

ہوئیے چاہے نہ ہوئیے۔ مجھے کیا۔

کوس رہی ہو مجھے۔

ہاں ہاں میں تو دشمن ہوں نا آپ کی۔

مطلب تمہارا یہ ہے کہ قمیص کے دامن نہ سیوگی!۔

دیکھیں گے"

کوئی ایسا نہیں جو میرا کہا مان لے۔ ایک مسز خورشید ہیں۔ اپنے میاں کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ ایک میں ہوں کہ —

لے آیئے کوئی مسز خورشید کی سی!

اتنا ایثار تو نہ کرو۔!

آپ تو دل سے چاہتے ہیں۔!

میں تو نہیں چاہتا مگر تمہاری مرضی ہے تو پھر سوچنا پڑے گا۔

سوچنا کاہے کا جب دل چاہے تو۔ اور وہ بڑبڑ کرنے بیٹھ گئیں۔

ساجد صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور بھاگ گئے۔

تو اس طرح بیگم کا موڈ ستیاناس ہو گیا۔ موقعہ کی تلاش میں تھیں کہ کوئی ان کے یہاں آنکلے یا وہ کسی کے یہاں جائیں اور دل کے پھپھولے میں بھری ہوا نکالیں۔

اتفاق ایسا ہی ہوا۔ وہ پہلی شوہی بیٹھی تھیں کہ انہیں مسز ارشاد کا ملازم بلانے آگیا۔

جلد جلد ساڑی بدلی اور بالوں پر برش کرکے وہ چل [illegible]

حریمی دسترخوان

مچھلی کا کٹلس اور آلو

اشیاء:۔ مچھلی عمدہ قسم کی آدھ سیر۔ انار دانہ آدھ پاؤ۔ لہسن ایک گٹھی۔ خشک دھنیا چائے کا ایک چمچہ۔ پسی ہوئی سرخ مرچ ایک چمچہ۔ نمک حسب ذائقہ۔ اجوائن تولہ بھر۔ پسی ہوئی کھٹائی چائے کے تین چمچے۔ آلو پاؤ بھر۔ بڑے ٹماٹر تین عدد [illegible] آدھ پاؤ۔ گھی حسب ضرورت۔

ترکیب:۔ مچھلی کے قتلوں کو دھو کر صاف اور خشک کریں اب انار دانہ۔ لہسن۔ خشک دھنیا۔ سرخ مرچیں۔ نمک اور اجوائن ملا کر اچھی طرح پیس لیں۔ یہ مسالہ مچھلی کے سارے قتلوں پر اچھی طرح لگائیں۔ پھر اس پر خشک آٹا لگا کر دھیمی آنچ پر تل لیں۔

مچھلی پک جائے تو آلوؤں کے لمبے لمبے قتلے کر کے انہیں بھی گھی میں تل لیں۔ تیار شدہ مچھلی کے قتلوں کو لمبی ڈش میں رکھ کر اس کے چاروں طرف آلو کے قتلے۔ ٹماٹر کے گول گول تراشے قرینے سے سجا دیں۔ گرم گرم پیش کریں۔ نہایت لذیذ ڈش تیار ہوگی۔

مچھلی اور مٹر وغیرہ

اشیاء:۔ مچھلی آدھ سیر بغیر کانٹے کی ابلی ہوئی صاف مٹر پھلیاں، سیم کے بیج یا کچنار کی کلیاں پاؤ بھر، پیاز کتری ہوئی آدھ پاؤ۔ ٹماٹر آدھ پاؤ۔ مرچ سرخ پسی ہوئی ایک چمچہ۔ دھنیا ایک چمچہ پسا ہوا۔ ہلدی ایک چوتھائی چمچہ پسی ہوئی۔ لہسن ایک پوتھی۔ نمک حسب ذائقہ۔ گھی حسب ضرورت۔ ہرا دھنیا ایک گٹھی۔ ادرک ایک انچ کا ٹکڑا۔ ہری مرچیں تین چار۔

ترکیب:۔ سب سے پہلے مچھلی کو نمک اور سرکہ لگا کر دھوئیں۔ مچھلی کے کانٹے نکالنے کے لیے ایک دیگچی میں پانی بھر کر [illegible] اس پر ایک کپڑا باندھ دیں۔ آگ پر دیگچی رکھ کر پانی میں جوش دیں پھر کپڑے کے اوپر مچھلی کو رکھ دیں اور اوپر سے کوئی دوسری دیگچی ڈھک دیں۔ دس منٹ بعد مچھلی کو دیکھیں جب مچھلی بھاپ میں گل جائے تو اسے اتار لیں اور مچھلی کے گوشت سے کانٹوں کو الگ کر دیں۔ مچھلی کا گوشت مسل کر باریک قیمے کے مانند کر لیں۔ اب گھی میں پیاز گلابی کر کے اس میں تمام مسالہ یعنی مرچیں۔ دھنیا۔ ہلدی اور لہسن و نمک ڈال کر بھونیں۔ گھی چھوڑ دے تو اس میں مٹر کی پھلیاں، سیم کے بیج یا کچنار کی کلیاں ڈال دیں۔ دھیمی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔ جب یہ گل جائیں تو پسا ہوا گرم مسالہ۔ ادرک کی ہوائیاں پھر مچھلی۔ ہری مرچیں اور ہرا دھنیا کتر کر ڈالیں۔ اس سالن کو خمیری روٹی کے ساتھ نوش کریں بہت لذت دے گی۔

چند ضروری ہدایات

گرم کھانوں کو ریفریجریٹر یا فریزر میں رکھنے سے قبل اچھی طرح ٹھنڈا کر لیں ورنہ فریج میں رکھے ہوئے دوسرے کھانوں کے درجۂ حرارت کے تبدیل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

فریج یا فریزر میں گرم برتنوں سمیت غذا کو رکھنے سے قبل انہیں جلد سے جلد سرد کر لیں۔ ان گرم برتنوں کو پانی سے بھرے تسلے میں رکھ کر ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔

اگر کمرے کی فضا گرم یا رطوبت آمیز ہو تو اس درجۂ حرارت میں آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونے والی غذا میں جراثیم بڑی تیزی سے پھیلتے پھولتے ہیں۔

غذاؤں کو فریج فریزر میں رکھنے سے قبل پلاسٹک کے تھیلوں میں لپیٹ دیں۔ ورنہ غذا خشک ہو جائے گی اور اس کی خوشبو فریزر میں رکھی ہوئی دوسری چیزوں میں رچ جائے گی۔

سلاد کی اشیاء کو فریج کے اس حصے میں رکھئے جو [illegible] کہا جاتا ہے۔ اسی میں سبزیاں اسٹور کی جاتی ہیں۔ ان اشیاء کو اسٹور کرنے سے قبل اچھی طرح دھو لیں اور پھر خشک کرنے کے بعد انہیں اسٹور کریں۔

اپنے فریج میں ایسے غذائی [illegible] کا درجۂ حرارت [illegible] استعمال کی [illegible]

([illegible])

بالوں کی حفاظت کیجئے

موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ اب سرد اور خشک ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ اس سے نہ صرف چہرے اور ہاتھ پاؤں کی جلد متاثر ہوتی ہے بلکہ یہ خشک ہوا بالوں کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے ان کی حفاظت کے لیے خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے

سر ڈھانپئے

سورج کی روشنی جہاں زندگی کی بقا اور نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ وہیں اس کی غیر بنفشی شعاعیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بالوں کا رنگ اڑا دیتی ہیں انھیں خشک اور کھردرا کرتی ہیں۔ سردی کے موسم میں اکثر خواتین دن کا بیشتر حصہ دھوپ میں بیٹھ کر گزارتی ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اپنے بال دوپٹے، اسکارف یا ٹوپی سے ڈھانپ لیا کریں۔ اگر آپ اپنے بال (BLEACH) کرتی ہیں۔ انھیں رنگتی ہیں یا پرم (PERM) کروانے کی شوقین ہیں تو آپ کو نسبتاً زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

دھونا نہ بھولیئے

خشک ہوا اور سورج کی شعاعوں کے علاوہ جو منفی بالوں کے لیے شدید نقصان دہ ہے وہ نمکین اور کلورین والا پانی ہے ساحل سمندر پر رہنے والی خواتین اگر ویک اینڈ پر سمندر پر جاتی ہیں۔ پکنک یا تفریح کے دوران اگر ان کے بال نمکین پانی سے بھیگے ہو جاتے ہیں تو یہ پانی بالوں میں خشک نہ ہونے دیں ورنہ بال سوکھ کر اسفنج کی مانند ہو جائیں گے۔ نمکین پانی سے سر میں خارش ہونے لگتی ہے۔ یہ چیز جلد کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ اگر آپ نے تمام دن سمندر پر گزارا ہے تو رات کے وقت بال میں کریم شیمپو کرنا نہ بھولیں اور کنڈیشنر استعمال کرنا نہ بھولیں۔ اس کے علاوہ جس روز آپ کو پانی میں کلورین کی مقدار زیادہ محسوس ہو۔ اس روز بال دھونے سے گریز کریں۔

تراشئے خراش

سردی کے موسم میں بالوں کی نوکیں اکثر پھٹ جاتی ہیں اگر آپ کے بال لمبے نہیں تو بھی آپ ان کی نوکیں ضرور ترا شتی رہیں۔ اگر آپ کے بال چھوٹے ہیں تو انھیں مہینے میں کم از کم ایک بار ضرور کٹوئیں۔

خاطر مدارات

بالوں کی جس قدر دیکھ بھال کی جائے وہ اسی قدر خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ اسکے لیے آپ کو زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ضروری اشیا آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے جدید ترین اور فیشن ایبل بیوٹی سیلونز میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ اشیاء ہیں۔ دہی، دودھ سرکہ، چائے، روغن زیتون۔

بال دھونے سے ایک گھنٹہ قبل ان میں دہی مل لیں۔ ایک گھنٹے کے بعد نیم گرم پانی سے دھو ڈالیں۔ آخر میں ایک بار شیمپو کر لیں۔ دہی نہ صرف بالوں کو پروٹین فراہم کرتا ہے بلکہ یہ ایک بہترین کلینزر ہے یہ بالوں کو نرم اور چمکدار کرتا ہے۔

دودھ ایک بہترین سٹنگ لوشن ہے۔ بالوں کے لیے دودھ کی سفارش کرنے والے کا کہنا ہے کہ دودھ بالوں کو غذا فراہم کرتا ہے انھیں مضبوط بناتا ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بالوں میں شیمپو کریں اسے اچھی طرح دھوئیں۔ اب گیلے بالوں میں دودھ لگا کر کنگھی کریں اور اپنے بال میں کرلرز ڈالیں۔

اگر آپ کے بال چکنے ہیں تو کریم نکلا ہوا دودھ استعمال کیجئے اگر نارمل یا خشک ہیں تو فل کریم دودھ استعمال کریں۔

اگر آپ کے بال بہت چکنے ہیں تو شیمپو کے بعد پانی میں لیموں کا عرق ڈال کر بال دھوئیں۔

سرکے سے بال نرم ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر اگر آپ بیئر ڈرائی استعمال کریں تو اس کے بعد سرکے کو پانی میں ملا کر بالوں میں ڈالیں۔

رعنا صدیقی

مجھ نے میرا دماغ معطر کر دیا ۔۔۔ دلہن بی بی تھیں جو چوکے سے اٹھ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔ "جان کر تو اس نے ایسا کیا نہیں ہے۔ جانے دو، کون سا بڑا نقصان ہو گیا ہے" پھر انھوں نے مجھے اپنے قریب کھینچ لیا۔ "دیکھو تو ذرا کیسی ڈری سہمی کھڑی ہے غریب! چہرہ پیلا پڑ گیا۔" انھوں نے میرے گال چھوئے تو میری جان میں جان آئی۔

دس روز ہی میں میرے دل میں ان کی محبت اور وقعت زیادہ ہو گئی۔ ان کا دل بڑا اچھا تھا، ان کا رتبہ بڑا اونچا تھا۔ دل کی بڑائی تو قائم رہی، رتبہ قسمت نے اپنا کم کیا، اتنا کم کہ ہیرے کو کوئلہ بھی بنا دیا۔

میر ہاشم علی کی فیاضی، وضعداری اور دلی اپنے جلو میں جو تباہی لائی تھی اس کا اندازہ کسی کو ان کی زندگی میں تو نہیں ہوا البتہ ان کے انتقال کے چند مہینوں بعد دو مہاجنوں کی جانب سے جب ڈھائی لاکھ کی نالش کا سمن آیا اور کاشانۂ ہاشم کے قرضے میں رہن ہونے کی خبر بڑے سرکار کے کان میں پڑی تو ان کا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ تیورا کر انھوں نے پشت سے لگے نیلے مخمل کے گاؤ تکیہ پر سر رکھ دیا۔ یہ سر پھر نہ اٹھ سکا۔ دو روز کے اندر وہ چٹ پٹ ہو گئے۔ کاشانۂ ہاشم پر قیامت ٹوٹ پڑی اور پھر تو چھوٹی بڑی قیامتیں ٹوٹتی رہیں۔ کچہری عدالت کی کھینچا تانی میں نہ پڑ کر خاندانی عزت و وقار کو باقی رکھنے اور کاشانۂ ہاشم کو بچانے کے لیے وہ زمین جائداد اور باغات جو میر ہاشم کی داد و دہش اور عالی حوصلگی کی نذر ہو جانے سے بچ رہے تھے ان کا بڑا حصہ اونے پونے فروخت کر کے زر نالش ادا کر دیا گیا۔ کاشانۂ ہاشم تو بچ گیا لیکن جس قدر جائداد باقی رہ گئی تھی اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ ملازموں اور ماماؤں کی فوج کی کفالت کر سکتی۔ چنانچہ جب روزہ ۲۰ نوکروں کو گھٹا کر ۵ کیا گیا، اور ناظم علی اور دلہن بی بی کے شوہر کو اتفاقاً اپنے ہاتھ سے پانی انڈیل کر پینا پڑا تو دلی جان کا کلیجہ پھٹ گیا۔ اس دوسری موت کے بعد تیسرا حادثہ خود ناظم علی کی موت تھی۔ ان کے گھر کی ایک خادمہ جس کو میر ہاشم علی نے پڑھا لکھا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنایا تھا، اس کا تقرر اس اسکول میں ہو گیا جس میں ناظم علی کی دو لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ناظم علی کو ان دونوں کا ادب سے اس کو "ماسٹرنی جی" کہنا ہی سوہانِ روح تھا۔ لیکن قیامت یہ ہوئی کہ ایک روز کسی غلطی پر بڑی لڑکی رقیہ کو اس نے مارا۔ رقیہ نے جب منہ بسور بسور کر یہ ماجرا بیان کیا تو ناظم علی کا غصہ دبی آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا۔ کل کی خیرن جو اب خیر النسا بن گئی تھی اس کی یہ مجال کہ میری بچیوں پر ہاتھ اٹھائے! وہ اسی رعب کے ساتھ اسکول کے آفس میں گھسے سمجھے کہ بس خیر النسا ان کے سامنے آتے ہی لرز اٹھے گی یا کانپ جائے گی۔

خیر النسا آئی تو ان تیور، دل کے ساتھ آئی جیسے وہ میر ناظم علی کو پہچانتی ہی نہیں ہے۔ اس نے دو انگلی ماتھے پر رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ناظم علی کا بس چلتا تو زمین میں سما جاتے۔ زمانے کی یہ نیرنگی دیکھ کر ان کا وجود اپنے ہی غم اور غصے کی آگ میں جل کر بھسم ہونے لگا۔

"تم نے رقیہ کو کس بات پر سزا دی تھی؟" انھوں نے پوچھا۔

"اس نے غلطی کی تھی۔ کیا آپ مجھ سے اس کا جواب طلب کرنے آئے ہیں۔؟"

"خیرن!!!" ناظم علی کانپ کر بولے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"کیا کہا؟ خیرن نہیں۔" "میرا نام خیر النسا ہے"

ناظم علی برف بن گئے۔ ان کا سارا ابال دودھ کا جھاگ بن گیا۔ کئی لمحے تک بے حس و حرکت وہ اس عہدہ کی کرسی کو دیکھتے رہے جو ان کی موجودگی کو نظر انداز کر کے سامنے رکھے رجسٹر کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔

وہ گھر واپس آ کر بستر پر یوں گر پڑے جیسے اپنی عزت وقار، دبدبہ، اپنی امارت، اپنا سب کچھ دفن کر آئے ہوں۔ یہ داغ ان کے دل کا ناسور بن گیا اور ایک ماہ کے اندر اندر وہ بھی خاندانی قبرستان میں جا سوئے۔

دلہن بی بی اب تنہا رہ گئیں۔ دونوں لڑکیوں رقیہ اور لاثانیہ کی شادی کے سلسلے میں بچی کچی جائداد کا رشتہ بھی

شہناز کنول

جما قصائی کے ۱۴ اولادوں میں سے صرف ایک ہی بچی تھی۔ اور یہ بھی یوں کہ ہوئی تھی کہ جب تیرہ بچوں کے بعد اس کی بیوی نے چودھویں بچے کی خبر دی تو جما کو کوئی خاص خوشی محسوس نہ کر سکا۔ دن گزرتے رہے اور جما نہ چاہتے ہوئے بھی بچے کا انتظار کرنے لگا۔

آخرکار وہ دن آ پہنچا جب اس کی بیوی دردوں میں پڑی ہوئی تھی۔ اور جما سر تھامے اکڑوں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اسے پھر ایک نئے غم کے لئے خود کو تیار کر لینا چاہیئے۔ آج بچہ ہونے والا ہے اور چند دن بعد یہ بھی ان تیرہ سے جا ملے گا۔ اندر سے بچے کے رونے کی آواز پر وہ کوٹھری کے دروازے کو گھورنے لگا پھر اس کی بہن نے آ کر بتایا کہ لڑکی ہوئی ہے۔ جما نے اپنی بہن سے کہا کہ بچی کو اسے لا کر دے، بہن بھائی کے دکھ کو جانتی تھی اندر گئی اور تولیہ میں لپٹی ننھی سی جان جما کے ہاتھوں میں تھما دی۔ جما نے چپل پیر میں ڈالا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ بہن حیران کھڑی دیکھتی ہی رہ گئی۔

جما سیدھا پیر بگی شریف کے مزار پر پہنچا اور بچی کو ان کے پیروں میں ڈال کر بولا "لو! آج میں خود ہی اپنا بچہ لے آیا۔ اللہ نے تیرہ بچے لے لئے آج تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ چودھواں بچہ ہوا ہے۔ اگر مارنا ہے تو ابھی جان لے لو شاید زیادہ غم نہ ہو بعد میں اس کے ہنستے بولتے فرمائش کرنے کی عمر میں لوگے تو وہ غم اب نہیں سہار سکوں گا۔ پیراں تیرے بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے تمہارا فیض آج بھی جاری ہے۔ آج میں تمہارے در پر آیا ہوں۔ یا تو اس بچی کی جان ابھی لے لو ورنہ اسے لمبی زندگی دو" وہ سو۔ اسی وقت مزار کے حجرے سے مجاور باہر نکلا اور جما کی باتیں سنکر بولا "بیراں کا امتحان لینے آیا ہے کیا؟" بچی کو اٹھا کر مصنوعی غصے سے فرش پر دے اور گھر جا الٹی سیدھی باتیں کرنے سے تقدیر کا لکھا تو مٹ نہیں جاتا۔ نجانے خدا کی کون سی مصلحت ہے جو تیرے بچے جیتے نہیں اب تو یہی دکھ ہے کہ مر جاتے ہیں اگر زندہ رہتے تو نجانے کونسے دکھوں میں تجھے مبتلا کر دیتے۔"

جما نے مجاور کے کہنے پر بچی کو گود میں اٹھایا اور بولا "نہیں حضرت جی میں تو اسی بات سے دکھی ہوں کہ تیرہ بچے پیدا کر کے بھی گھر سونا کا سونا ہی ہے۔ بچے ہوتے تو کوئی بھی دکھ نہ ہوتا۔"

مجاور نے مسکرا کر چٹکی بھر خاک بچی کے منہ میں ڈالی اور بولا "دنیا تو دکھ کا گہوارہ ہے تو اس میں خوشی ڈھونڈ رہا ہے ــــ پگلا ــــ چل اب گھر جا۔"

جما کو پیر بگی شریف سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ہر جمعرات کو درگاہ پر حاضری دیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ دنیا کا غم پیراں کے پاس آ کے بھول جاتا ہوں۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ جما کے بزرگوں نے بھی پیر بگی شریف کی سب سے زیادہ خدمت کی تھی اور اب جما کو ان کے مزار سے ایک دلی لگاؤ تھا۔ مزار کا مجاور ایک مجذوب سا آدمی تھا۔ گاؤں میں حضرت جی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسے سوائے درگاہ کی صفائی کے اور کسی کام سے دلچسپی نہیں تھی۔ ساری دنیا سے بیزار مجذوب مجاور اگر تھوڑا بہت مہربان تھا تو جما پر ورنہ اور کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ جما بھی کبھی اسی سے اپنے دکھ درد کہہ جاتا۔ پیر بگی شریف سے اتنی عقیدت کی بنا پر گاؤں والے جما کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ جہاں سے گزرتا سر جھکا کر سلام کرتے۔

جما گھر پہنچا تو بیوی نے پوچھا کہ کہاں چلے گئے تھے۔؟

"درگاہ پر گیا تھا" جما نے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا کر کہا۔

"اسے لے کر؟" بیوی نے کچھ حیرت سے بچی کی طرف دیکھ کر کہا۔

بچی نے پیروں چلنا سیکھا تو جما اسے گود میں اٹھا کر مارے خوشی کے نعرہ لگاتا ہوا درگاہ پہنچا اور مجاور کے پاس کھڑا کر کے بولا۔ "بچی کو ذرا چل کر تو دکھا حضرت کو ——" مجاور نے مسکرا کر بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا "بہت ہی پیاری بچی ہے —— ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا آپ نے" جما نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

"تجھے کیا بتائیں —— اس بچی کو دیکھ کر تجھ پر رحم آ گیا ہے۔ سردی ہو رہی ہے بچی کو گھر لے جا۔" تھوڑی دیر بیٹھ کر جما گھر واپس آ گیا۔ بچی کو سارے گھر میں بھاگتے دوڑتے دیکھ کر اس کی بیوی بولی "بچی کے لئے ایک اچھی سی پازیب لا دو۔" بچی کو پیروں چلتے دیکھ کر خود جما کا بھی عجیب حال ہو رہا تھا۔ اگلے ہی دن وہ شہر روانہ ہو گیا چوتھے روز جما گھنگھرو والی چاندی کی پازیب اور دوسری بہت سی چیزیں لے کر واپس لوٹا۔ تو اس کی بیوی نے کچھ دکھ بھرے انداز میں کہا کہ پرسوں رات حضرت جی چل بسے۔

"ارے —— جما حیران رہ گیا۔ کیا تکلیف ہوئی تھی؟"

"کوئی خاص نہیں بخار ہوا تھا۔ نصیبا تمہیں بلانے آیا تھا کہ حضرت جی تمہیں بلا رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ شہر گئے ہوئے ہیں۔" بچی کی ماں ڈبہ میں سے پازیب نکال کر دیکھنے میں مشغول ہو چکی تھی۔

جما تیزی سے درگاہ کی طرف دوڑ گیا۔ مگر وہاں سوائے ایک نئی قبر کے اور کچھ نظر آیا۔ فاتحہ پڑھ کر جما بھاری بھاری قدموں سے لوٹ آیا۔

اور پھر وقت گزرتا گیا۔ دن رات کا چکر چلتا رہا۔ اور بچی تیرہ برس کی ہو گئی۔ اچھا کھانا پینا اور بے پناہ لاڈ پیار کے ساتھ دنیا بھر کی خوشیاں اور بے فکری وہ تیرہ ہی برس میں حسن و جمال کا مجسمہ بن چکی تھی۔ ماں باپ ہر وقت اسی کو تکتے تھے۔ تیرہ بچوں کی ماں اس اکیلی پر لٹ رہی تھی۔ خوبصورت، صحت مند اکیلی بیٹی جو ہر طرح کے آرام کی عادی سکھی کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ جما کی ساری زندگی میں خوش قسمت ترین سمجھی جاتی تھی۔ جما اسے بالکل شہزادیوں کی طرح پال رہا تھا۔ پڑھانے لکھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی مگر جب ہوا قریب کے شہر میں لے جا کر انہیں کھیل دکھاتا۔

قریب کے قصبہ میں سرکس آیا تو سب سے پہلے بگی دیکھنے پہنچی ہر کھیل تماشہ دیکھنا بگی نے فرض سمجھ لیا تھا۔ اور پھر بگی جب بھی باپ کے ساتھ بازار جاتی قسم قسم کی فیشن کی چیزیں لے کر لوٹتی۔ گڑیا کی طرح سجی بنی بگی جب بازار میں سے گزرتی تو دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔ گلاب سیدہ رنگ۔ سیاہ ناگن سی چوٹی اور بھرا بھرا بدن وہ دیکھنے والوں کی نظروں میں کھٹک رہ جاتی۔

بگی کو اتنی آزادی دینے پر جما کی بہن اکثر بھائی بھاوج کو ٹوکتی تو جما فوراً بگڑ اٹھتا کہ تیرے باپ کی جاگیر بیچ اپنی بیٹی کو عیش نہیں کرا رہا ہوں بیٹی میری ہے جیسے جی چاہے پالوں گا۔ بہن بھی چپ ہو جاتی بھائی کے دکھ کو وہ بھی سمجھتی تھی لیکن بگی کا اس طرح گھومنا پھرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

گاؤں میں جما کی بہت عزت تھی اور یہ عزت اسے درگاہ سے عقیدت کی بنا پر ملی تھی۔ مرحوم حضرت جی کے التفات نے اس عزت میں اور اضافہ کر دیا تھا وہ جب بھی باہر نکلتا لوگ سر جھکا کر سلام کرتے اور وہ انکساری سے جواب دیتا ہوا گزر جاتا۔

جب بگی پندرہ برس کی ہوئی تو جما کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ رشتے کئی تھے مگر اسے کوئی جچ نہیں رہا تھا۔ گاؤں کے سارے ہی لڑکے اسے بگی کے مقابلے میں کم تر نظر آتے۔

ایک دن وہ درگاہ سے واپس آ رہا تھا۔ اب وہ روز درگاہ جاتا تھا۔ اپنی بیٹی کو دیکھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ حضرت جی نے اپنی عمر اس کی بچی کو دیدی ہے اور اس خیال سے اس کی عقیدت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ بگی کی شادی ہی کے بارے میں سوچتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ تصورات کی دنیا میں ایک خوبصورت لمبے چوڑے لڑکے کو دولہا بنے گھوڑے پر سوار دیکھنے لگا۔ بگی دلہن بنی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی بیٹی پیاری بیٹی وہ سوچنے لگا میں اپنی اکلوتی چاندی سی بیٹی کو دنیا کی ہر نعمت جہیز میں دوں گا۔ ہر خوشی اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ انہیں خیالوں میں گم وہ گھر میں داخل ہوا تو کمرے میں سے بگی کی ماں کے رونے کی آواز آئی وہ اندر پہنچا اور گھبرا کر بولا۔ کیا بات ہے کیوں رو رہی ہے۔ بگی کہاں ہے۔ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ اس کا دل کیوں نہیں جما کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اس کی بیوی نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر سسکتے ہوئے کہا "بگی نے

تو میں بتا دوں!"

"کیا مطلب صاف کیوں نہیں بولتی۔" بھاگو غصے میں آنے لگا۔

"گنگا ماں بننے والی ہے۔"

"اچھا —— بھاگو کے ہونٹوں پر ایک دم مسکراہٹ دوڑ گئی وہ ابھی تک اس کی شادی کے سپنے سے باہر نہیں آیا تھا۔

"کہاں گم ہو —— بیوی نے آنسو پونچھتے ہوئے حیرت سے کہا وہ ابھی کنواری ہے۔"

بھاگو جیسے گہری نیند سے جاگا۔ سارا گاؤں اسے دروازے پر نظر آیا سب اسے گالیاں دے رہے تھے۔ گنگی کو پتھر مار رہے تھے۔ اس کی ٹوپی پیروں تلے روندی جا رہی تھی اس کی آنکھیں پہلے گلابی ہوئیں اور پھر سرخ خون کبوتر، وہ جوتا پہن کر باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں تھا دھتورہ پیس رہا تھا۔ اس نے پسا دھتورہ دودھ میں ملا کر اپنی بیوی کو دیا اور آہستہ سے بولا۔ لے یہ لے جا کر گنگی کو پلا دے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔ پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اور درگاہ پر پہنچ کر گردن جھکا کر بولا۔

"حضرت جی آج تمہاری ہر بات سمجھ میں آ گئی۔ میں پگلا اس دنیا میں سکھ ڈھونڈنے چلا تھا —— پیران! تم نے ایک نیک احسان کے بدلے میری بیٹی کو زندگی دی تھی آج وہ واپس کرنے آیا ہوں۔"

لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ

اس گرانی کے زمانے میں غریب لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑا ہی شدید ہو گیا ہے۔ شادیاں خاندانی یا کی طرح ہوتی ہیں لگے بندھے کپڑوں کے بغیر دلہن کسی کو نہیں بھاتی لیکن سونے چاندی کی گرانی سے کپڑوں کو چمکانے اور بھڑکانے والی چیزیں بھی اتنی گراں ہو گئی ہیں کہ ان کا خریدنا آسان نہیں رہا۔ ایک دوپٹہ کے لئے معمولی سا لچکا بھی لیا جائے تو بیس پچیس روپیہ سے کم میں نہ آئے گا۔ پتلی سی کرن بھی آنچل میں لگائیے تو بیس روپیہ میں کم نہ آئے گی۔ شادیوں کے دسیوں جوڑوں کے لئے یہ سب لیا جائے تو سینکڑوں روپیہ صرف ہو جاتا ہے پھر شادی بیاہ پر ہی منحصر نہیں، خواتین اور لڑکیاں عام دنوں میں لچکے لگے دوپٹے استعمال کرتی ہیں۔ سورتی بیلیں اور چھاپ چکی وغیرہ لگا کر دوپٹے اور ساریاں پہنتی ہیں۔

ان مشکلات کا حل سائنسدانوں نے یوں نکالا ہے کہ اسٹیل کا سامان تیار کر دیا اور ایسا کہ چاندی سے زیادہ دلکش اور بھڑکیلا یہ کبھی نہیں کہ استعمال سے کالا پڑ جائے یا خراب ہو جائے اور دام نسبتاً بہت ہی کم۔ نائلون کے تارے سنہرے ستاروں کی مانند کرتے رہیں۔ یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ایک تولے میں لاتعداد چڑھتے ہیں ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ اس طرح کا تمام سامان آپ کو

اللہ پاک نے دو لڑکوں کے بعد ۱۴ر نومبر ۸۰ء بوقت صبح ۹ بجے ایک چاند سی بیٹی عطا فرمائی جس کا نام "قرۃ بیا" قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور صاحب نصیب ہو۔

پیغامات نشاط

● ولی الدین احمد صاحب کے فرزند ضیاء الدین احمد کرمانی فرخ شجاع سلمہٗ کی شادی عزیزہ فاطمہ سلمہا (دختر نیک اختر جناب الحاج مولانا حضرت شاہ مجتبیٰ حیدر صاحب قلندر قبلہ) کے ساتھ ۱۹ر اکتوبر ۸۰ء بروز شنبہ بمقام کاکوری بخیر و خوبی انجام پائی اور ۲۰ر اکتوبر کو بارہ دری قیصر باغ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی۔

● محمد احمد سلمہٗ (فرزند مرحوم ڈاکٹر محمد علی صاحب۔ شہرا) کی شادی نکہت سلمہا (دختر نیک اختر ایس مسعود حسین صاحب) کے ساتھ ۲ر نومبر ۸۰ء بروز اتوار بمقام کارلٹن ہوٹل لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی اس سلسلے میں اہلیہ صاحبہ مرحوم ڈاکٹر محمد علی نے کارلٹن ہوٹل لکھنؤ میں ۳ر نومبر کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی)

● محمد فہیم سلمہٗ (فرزند ابراہیم محمد کوسہ والا مرحوم) کی شادی ممتاز بیگم سلمہا (دختر حاجی اے۔ ستار حاجی سلیمان لکھنی والا) کے ساتھ ۶ر نومبر ۸۰ء بروز جمعرات بمقام لکھانی بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● ناز احمد صدیقی سلمہٗ (فرزند طفیل احمد صدیقی صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ) کی شادی نگہت فاطمہ سلمہا (دختر نیک اختر انوار الزماں ایڈوکیٹ باندہ) کے ساتھ ۹ر نومبر ۸۰ء کو بمقام باندہ بخیر و خوبی انجام پائی اس سلسلے میں ۱۱ر نومبر ۸۰ء کو طفیل احمد صاحب نے ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی۔

● رحمان شریف صاحب کی شادی خانہ آبادی نورجہاں سلمہا دختر (بی نفیسہ صاحب کوزن چھپارہ۔ کیرالا) کے ساتھ ۹ر نومبر کو کوئمبٹور میں بخوبی انجام پائی۔ خدا مبارک کرے۔ نسیم انہونوی)

● جناب انصار حسین صاحب (برادر پروفیسر احتشام حسین صاحب مرحوم) کی دختر نیک اختر شہناز سلمہا کی شادی نیر سلمہٗ (فرزند کلب عباس صاحب مرحوم) کے ساتھ بمقام گولہ گنج لکھنؤ ۸ر نومبر ۸۰ء بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ دونوں ہمیشہ شاد و خرم زندگی گزاریں۔

● (نسیم انہونوی)

● خریداری نمبر 53، 84، نمبر 3، 104 اور نمبر 150 جنکا زر سالانہ ختم ہوگیا ہے، ٹکٹ وصول ہونگے دو ماہ کے ٹکٹ لفافے میں رکھ کر فوراً روانہ کریں۔

● نسرین رضا (بیگم سرائے) "میری چھوٹی بہن ہمدم بانو رعنا دختر نیک اختر جناب شبیر رضا صاحب) کی شادی نیر حسین جعفری (فرزند جناب سید دلاور حسین صاحب جعفری) کے ساتھ ۱۹ر اکتوبر ۸۰ء کو بمقام بیگم سرائے بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس خوبصورت جوڑی کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔ (نسیم انہونوی)

● محمد ابراہیم صاحب کے فرزند اسحاق احمد کی شادی پروین جہاں (دختر اخلاق احمد) کے ساتھ ۲۸ر نومبر ۸۰ء کو انجام پائی۔ خدا مبارک کرے (نسیم انہونوی)

● نگہت پروین کانپور "میرے خالہ زاد بڑے بھائی محمد نسیم جاوید کا عقد مسنون مشرف جہاں عنبر کیساتھ مولانا احمد میاں فرنگی محلی نے ۹ر اکتوبر ۸۰ء بروز یکشنبہ کو پڑھایا۔ اس سلسلے میں بھائی محمد وسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ نے اپنی رہائش گاہ پر ۱۰ر اکتوبر کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔

● نزہت مجیب (جشنواد پور) "میری چچا زاد بہن اور عزیز سہیلی صبوحی پروین کی شادی منتظر عالم (فرزند جناب نفیس احمد کے ساتھ ۱۶ر اکتوبر کو بمقام اباکر پور بخیر و خوبی انجام پائی۔ خداوند عالم سے دعا ہے کہ بہن صبوحی اور نوشہ بھائی منتظر عالم کی زندگی سدا بہار رہے۔

● پروفیسر ایم اے صدیقی صاحب (علیگڑھ) کی بھتیجی صبیحہ سلمہا دختر مرحوم ڈاکٹر ایم۔ اے۔ صدیقی) کی شادی سروت سلمہٗ (فرزند حاجی ایس۔ امین اللہ صاحب) کے ساتھ ۲۴ر نومبر ۸۰ء بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی)

● حاجی مختار احمد صاحب (شموگہ) کی دختر نیک اختر کے ..... یاسمین صاحبہ بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ کی شادی منظور احمد سلمہٗ (فرزند محمد حسین صاحب) ۲۴ر نومبر ۸۰ء بنگلور کے ساتھ ...

• ایک شخص نے جنت کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی کیا تم شادی شدہ ہو؟"

جواب۔ جی ہاں

آواز۔ تم اندر آسکتے ہو، تم نے شادی کر کے دنیا میں کافی سزا پائی ہے۔

دوسرے نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی کیا تم شادی شدہ ہو؟

جواب۔ جی ہاں میری دو مرتبہ شادی ہو چکی ہے۔

آواز۔ یہاں بیوقوفوں کے لئے جگہ نہیں ہے، تم جا سکتے ہو۔

• باپ نے لڑکے کی اسکول رپورٹ پڑھتے ہوئے کہا حساب میں کمزور۔ انگریزی میں فیل۔ ہندی میں صفر۔ املا خراب، جملے غلط۔ آخر یہ سبب کیا ہے؟

لڑکا۔ ذرا آخری سطر پڑھ لیجئے۔ لکھا ہے "صحت بہترین"۔

• ایک یہودی تاجر دوسرے تاجر دوست سے: جب ایک دکاندار ایک ایسی چیز کو جس کی گاہک کو ضرورت ہو، فروخت کر دینے میں کامیاب ہو جائے تو یہ کارکردگی تجارت کی قابلیت کہی جائے گی۔ لیکن جب کوئی دکاندار کوئی ایسی چیز جس کی گاہک کو ضرورت نہ ہو، اس کے ہاتھ فروخت کر دے تو اسے تجارتی کمال کہا جائے گا۔

ساتھی تاجر نے متعجب کے لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری آخری بات نہیں سمجھا شاید؟"

یہودی تاجر نے جواب دیا مثلاً یہ کہ قطب شمالی و قطب جنوبی جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ اگر کوئی تاجر وہاں کے باشندوں کے [illegible] ضرورت [illegible] فروخت کر دے تو یہ [illegible]

• [illegible]

گیا اور شکایت کی۔ پولیس نے پوچھا کیا آپ [illegible]

"نہیں جناب [illegible]

[illegible] دو حصوں میں تقسیم [illegible]

ضرب دیں تو حاصل ضرب ۹ ہوگا۔

• ایک دوست دوسرے دوست کو مدتوں بعد ملا تو اس نے شکایت کی۔

"کیا بات ہے بہت عرصے بعد ملے ہو؟"

دوسرے نے جواب دیا: کیا بتاؤں دوست کاروبار میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔"

وہ صاحب بولے۔ میں آج کل روزگار کی تلاش میں ہوں۔ کیوں نہ تمہارا سر کھجا دیا کروں، ملازمت تو مل جائے گی۔

• باورچی خانے سے برتن ٹوٹنے کی آواز آئی تو خاتون خانہ نے چلا کر کہا "کیا ہوا الفیس! تم نے پھر کچھ توڑ دیا؟"

"ہاں بیگم صاحب، مگر آج تو قسمت بڑی مہربان تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"دو پلیٹیں دھونے سے پہلے ٹوٹ گئیں، ورنہ میری محنت ضائع ہو جاتی۔"

• ایک دوست جو کافی عرصے کے بعد ملاقات کے لئے گیا اسے [illegible] بھائی وہ تمہارا [illegible] کدھر گیا؟"

دوسرا دوست: کیا بتاؤں میں نے شادی کرلی اور وہ [illegible] ہو کر اڑ گیا۔

پہلا دوست: وہ کیسے؟

دوسرا دوست: بے چارہ باتیں کرنے میں بیگم کا مقابلہ نہ کر سکا۔

• تجریدی آرٹ کے ایک دلدادہ نقاد نے بڑی خوشی سے کہا: صاحب کیا تصویر بنائی ہے، رنگوں کا امتزاج جس خوبی سے [illegible] کھینچا آپ ہی کا کام ہے۔ یقین کیجئے [illegible] ایسے شاہکار کے سوا اور کوئی چیز نظروں میں جچتی ہی نہیں۔

فنکار نے سر اٹھا کر نقاد صاحب کو دیکھا اور ذرا پشیمان ہوتے ہوئے بولا۔ میں اپنا برش استعمال کرنے کے بعد [illegible] یہ داغ ہیں۔

• ایک طالب علم [illegible]